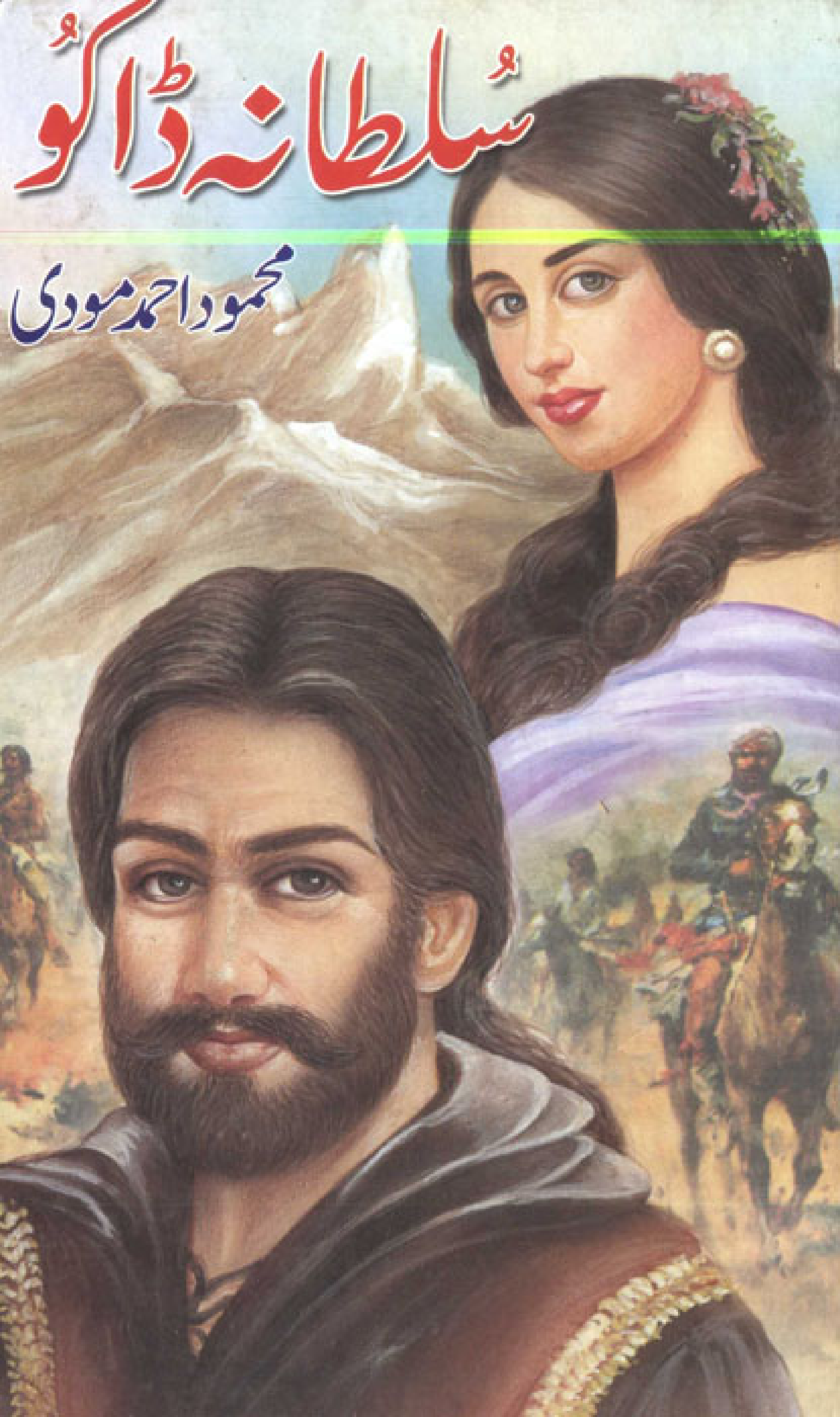


سُلطانہ ڈاکو
محمود احمد مودی

پیش لفظ

بہت سے لوگ سلطانہ ڈاکو کو ایک فرضی کردار سمجھتے ہیں۔ بعض لوگوں کے خیال میں انگریزی فکشن کے کردار رابن ہُڈ سے متاثر ہو کر یہ کردار تخلیق کیا گیا تھا..... لیکن ایسا نہیں ہے۔ یہ ایک حقیقی کردار ہے اور کوئی بہت زیادہ پرانی بات نہیں، جب یہ کردار غیر منقسم ہندوستان کی سرزمین پر موجود تھا۔ انگریزوں کے دورِ حکومت کی بہت سی فائلوں میں اس کا ریکارڈ موجود ہے اور سلطانہ ڈاکو کے سلسلے میں مختلف انگریزی افسروں کی محکمہ جاتی خط و کتابت کا ریکارڈ بھی محفوظ ہے۔ کچھ سال پہلے تک پاکستان اور ہندوستان میں چند ایسے بزرگ بھی موجود تھے جنہوں نے اتفاقاً سلطانہ ڈاکو کو پوری طرح یا اس کی کم از کم ایک جھلک ضرور دیکھی تھی۔

سلطانہ ڈاکو کون تھا؟ وہ 'سلطانہ' اور پھر ڈاکو کیسے بنا؟ یہ آپ اس کتاب کو پڑھ کر جان پائیں گے۔ یہ تخیل کی مدد سے لکھا گیا کوئی ناول، کہانی یا طویل افسانہ نہیں۔ یعنی اسے فکشن میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ایک حیرت انگیز حقیقی کردار کی سرگزشت اور اس کی سچی داستانِ حیات ہے..... اور آپ کو معلوم ہی ہے کہ حقیقت، افسانے سے زیادہ دلچسپ ہوتی ہے۔ آپ اسے پڑھنا شروع کریں گے تو یقیناً اس میں کھو جائیں گے۔ اور آپ کا تخیل آپ کو ان زمانوں میں اور ان مقامات پر لے جائے گا، جہاں سلطانہ ڈاکو کا راج تھا۔ اور جہاں مائیں اپنے بچوں کو سلطانہ ڈاکو کا نام لے کر ڈراتی تھیں۔ تاہم وہ ڈاکو ہونے کے باوجود آج کے دور کے ان ڈاکوؤں سے بہت بہتر تھا جن میں سے کچھ نے بڑے بڑے عہدوں کے نقاب پہنے ہوئے ہیں، کچھ نے سیاسی اور مذہبی رہنماؤں کا لبادہ اوڑھا ہوا ہے اور جنہوں نے اس ملک کے سادہ لوح، غریب اور کم علم عوام کو بے وقوف بنا کر، سال ہا سال سے ان کا خون چوس چوس کر انہیں قریب المرگ کر دیا ہے اور اس ملک کی جڑیں کھوکھلی کر دی ہیں۔

محمود احمد مودی

وہ دسمبر 1895ء کی ایک سرد رات تھی۔ ہندوستان کے ''نجیب آباد فورٹ'' میں اس وقت گہرا سکوت چھایا ہوا تھا۔ گشت پر مامور کسی سپاہی کے قدموں کی مدھم سی آواز کبھی کبھی سنائی دے جاتی تھی۔ قلعے کے اندر بیشتر زمین کچی تھی' اس لئے گشت کرتے ہوئے سپاہی کے قدموں کی آواز مدھم ہی رہتی تھی۔ اس رات گشت پر مامور سپاہی ایک دیوار کے ساتھ قطار در قطار بنے ہوئے جھونپڑی نما' نیم پختہ کمروں سے بہت دور چلا گیا تو اچانک ایک کمرے سے کسی عورت کی اذیت بھری چیخ ابھری۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ عورت بہت دیر سے کوئی تکلیف برداشت کر رہی تھی' لیکن جب تکلیف برداشت سے باہر ہوگئی تو اس کے حلق سے بے اختیار وہ درد بھری چیخ نکل گئی' جس نے رات کے سناٹے کو مجروح کر دیا تھا۔

عین اسی وقت اس کمرے کا بے ہنگم چوبی دروازہ کھڑکھڑاہٹ کی آواز کے ساتھ' ایک جھٹکے سے کھلا اور سانولے رنگ کا ایک دراز قد شخص گھبرائے ہوئے انداز میں باہر آ گیا۔ وہ مضبوط ہاتھ پیروں کا مالک تھا اور بوڑھا ہونے کے باوجود توانا دکھائی دیتا تھا۔

اس قلعے میں رہنے والے دوسرے زیادہ تر غریب اور دیہاتی لوگوں کی طرح اس کے جسم پر بھی پرانی سی دھوتی اور کُرتا تھا۔ پیروں میں جوتے یا چپلیں نہیں تھیں۔ اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں لگا ہوا سرمہ اس کے پپوٹوں تک پھیلا ہوا تھا۔

اس نے کمرے سے باہر آ کر وحشت زدہ انداز میں اِدھر اُدھر دیکھا اور اس کے لب یوں آہستگی سے تھرتھرائے جیسے وہ مدد کے لئے کسی کو پکارنے کا ارادہ کر رہا ہو' لیکن اس کی سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ کسے پکارے۔ عین اسی وقت سامنے سے ایک انگریز عورت ٹہلنے کے سے انداز میں آتی دکھائی دی۔ وہ پختہ عمر کی ایک باوقار عورت تھی' جس نے انگریز ہونے کے باوجود نجیب آباد کی مقامی عورتوں جیسا لباس پہنا ہوا تھا' تاہم یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ عورت کا تعلق اونچے طبقے سے تھا۔

کمرے سے نکلنے والے بوڑھے کی نظر ابھی انگریز عورت پر پڑی ہی تھی کہ اس کے عقب میں جھونپڑی نما کمرے کے کھلے دروازے سے ایک بار پھر عورت کی اذیت ناک چیخ ابھری۔ دروازہ کھلا ہونے کی وجہ سے اس بار چیخ پہلے سے کچھ بلند محسوس ہوئی تھی۔ انگریز عورت پہلی ہی چیخ سن کر بری طرح چونک اٹھی تھی۔ دوسری چیخ سن کر اس کے چہرے پر تشویش کے آثار نمایاں ہو گئے تھے اور وہ تیزی سے بوڑھے کی طرف آئی۔

''اوہ مین......!'' وہ تیزی سے بولی۔ ''تم کون ہے......اور یہ عورت کیوں چیختا ہے؟''

''میم صاب......!'' بوڑھا ہاتھ جوڑ کر گڑگڑانے کے سے انداز میں بولا۔ ''میں گلفام ہوں......گلفام......عرف گلفی......'' پھر اس نے پیچھے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ ''ہماری مدد کرو میم صاب......ہم بہت پریشانی میں ہیں۔''



طویل و عریض ''نجیب آباد فورٹ'' کو اس زمانے میں انگریز سرکار درحقیقت ایک قسم کی جیل کے طور پر استعمال کر رہی تھی۔ کئی ہزار افراد اس قلعے میں آباد تھے۔ ان پر جیل جیسی سختیاں تو نہیں تھیں اور نہ ہی وہ آہنی سلاخوں کے پیچھے کوٹھریوں میں بند تھے' لیکن ان کی حیثیت بہرحال قیدیوں جیسی ہی تھی۔ کم عمر لڑکوں' عورتوں اور بعض منتخب افراد کو ان میں چند گھنٹوں کے لئے باہر جانے کی اجازت مل جاتی تھی' لیکن اس کے لئے انہیں خصوصی ''پاس'' ملے ہوئے تھے' جن پر ان کی آمدورفت کا اندراج ہوتا تھا۔

پاس کے ذریعے باہر جانے والے لوگ باہر سے باہر ہی فرار ہونے کے بارے میں اس لئے نہیں سوچتے تھے کہ ان کا کوئی اور ٹھکانا نہیں تھا۔ دوسرے ان کے بارے میں تمام تفصیلات حتیٰ کہ ان کی انگلیوں کے نشانات تک اردگرد کے علاقوں کے تمام تھانوں اور پولیس چوکیوں میں موجود تھے۔ باہر جانے والوں کو خود بھی یقین ہوتا تھا کہ اگر وہ بھاگ گئے تو جلد ہی پکڑے جائیں گے اور پھر قلعے سے زیادہ بری جگہ......یعنی سچ مچ کی جیل بھیج دیئے جائیں گے۔ قلعے کے اندر جیسی تیسی زندگی تو گزر رہی تھی۔

قلعے میں موجود افراد کو روزانہ ہندو سپاہیوں اور انگریز آفیسر کی نگرانی میں آس پاس کی زمینوں پر مختلف کاموں اور کاشت کاری وغیرہ کے لئے لے جایا جاتا تھا اور شام ڈھلے مویشیوں کی طرح ایک ہجوم کی صورت میں' ہانک کر قلعے میں واپس لایا جاتا تھا' جہاں وہ قطار در قطار بنے

ہوئے جھونپڑی نما کمروں میں رہتے تھے اور کافی حد تک عام سے' غریب لوگوں کی طرح زندگی بسر کرتے تھے۔

ان میں سے زیادہ تر بیوی بچوں والے تھے اور جن کی بیوی یا بچے نہیں تھے وہ اپنے دیگر کسی رشتے دار مرد یا عورت کے ساتھ رہ رہے تھے۔ تنہا رہنے والوں کی تعداد بہت کم تھی۔ برطانوی فوج کا ایک ہندوستانی افسر آنند اس جیل نما قلعے کا نگران اور منتظم تھا۔ اس مقصد کے لئے اسے کچھ آدمیوں کا اسٹاف بھی ملا ہوا تھا۔ اس کا عہدہ ''ایڈجوٹنٹ'' کا تھا۔ عام طور پر یہ لوگ اس کے نام کے ساتھ اس کا عہدہ ضرور لگاتے تھے اور اسے ''ایڈجوٹنٹ آنند'' کہہ کر پکارتے تھے۔

کچھ مسلح افراد بھی آنند کی ماتحتی میں کام کرتے تھے۔ وہ قلعے کی حفاظت اور قیدیوں کو کنٹرول میں رکھنے پر مامور تھے۔ ان کے پاس توڑے اور بندوقیں ہوتی تھیں۔ کسی بھی قیدی کی کسی حرکت کی وجہ سے اگر قلعے کے ماحول میں گڑبڑ کا اندیشہ پیدا ہوتا تھا تو اس قیدی سے سختی سے نپٹا جاتا تھا۔ اس سے شدید مشقت لی جاتی تھی یا پھر اسے قلعے کے طویل و عریض احاطے میں کہیں زمین پر اوندھا لٹا کر اس کے کولہوں پر بید رسید کئے جاتے تھے اور باقی لوگوں کو اس کی ذلت' تکلیف کا تماشا دکھایا جاتا تھا۔

قلعے میں قید زیادہ تر افراد کا تعلق ''بھنتو'' قبیلے سے تھا۔ یہ ایک ایسا قبیلہ تھا' جس کے ہر فرد کو چور' ڈاکو یا قاتل سمجھا جاتا تھا۔ پورے ہندوستان میں یہ بات عام تھی اور انگریز بھی اس پر یقین رکھتے تھے کہ بھنتو قبیلے میں کوئی شریف آدمی پیدا ہی نہیں ہوتا۔ چوری' ڈکیتی' رہزنی......اور بوقت ضرورت قتل و غارت کے سوا ان کا کوئی پیشہ یا ذریعہ معاش نہیں تھا۔ بھنتو کا مطلب ہی چور' ڈاکو اور قاتل سمجھا جاتا تھا۔

کوئی پولیس والا جب کسی بھنتو کو کسی جرم میں یا محض شبے کی بنیاد پر پکڑتا تھا تو عدالت کے فیصلے سے پہلے ہی اسے اپنا فیصلہ سنا دیتا تھا۔ ''تیرے دادا' پردادا' چور ڈاکو...... تیرا باپ چور ڈاکو......تو چور ڈاکو......اور تمہارے قبیلے کی عورتوں کی کوکھ میں جو بچے ہیں' وہ بھی چور ڈاکو ہوں گے۔''

چنانچہ جتنے بھنتو انگریز سرکار کے قابو میں آسکے تھے' انہیں پکڑ کر نجیب آباد کے قلعے میں بند کر دیا گیا تھا اور مزید کی پکڑ دھکڑ جاری رہتی تھی۔ درحقیقت برسوں پہلے بھنتوؤں کیلئے ہی نجیب

آباد کے قلعے کو ایک غیر رسمی جیل کی شکل دی گئی تھی۔ تاہم اس کا مطلب یہ بھی نہیں تھا کہ تمام بھنتو صرف نجیب آباد کے قلعے میں ہی رہ رہے تھے۔ پورے روہیل کھنڈ میں مختلف مقامات پر ان کی بستیاں اور گاؤں آباد تھے۔ اس کے علاوہ بجنور، مراد آباد اور بریلی کے نواحی علاقوں میں بھی ان کی بستیاں تھیں۔ وہ بڑے منظم لوگ تھے۔ ہر علاقے کی اپنی ایک پنچایت تھی، جس کے سامنے تمام مسئلے پیش ہوتے تھے۔ پنچایت کے فیصلے پر اس علاقے کے تمام بھنتو آنکھیں بند کر کے عمل کرتے تھے۔

ان میں بہت سے بھنتو ایسے بھی ہوتے تھے، جو نجیب آباد کے قلعے میں شرافت سے سات سال گزارنے کے بعد "اچھے کردار" کا سرٹیفکیٹ حاصل کر کے باہر آئے ہوئے تھے۔ قلعے میں شریفانہ انداز میں سات سال گزرنے کے بعد انہیں باہر اپنی کسی آبادی میں آزادی کی زندگی گزارنے کا حق مل جاتا تھا۔ اگر وہ دوبارہ کسی جرم میں پکڑے جاتے تو ان کا اچھے کردار کا سرٹیفکیٹ منسوخ ہو جاتا اور انہیں دوبارہ قلعے میں بھیج دیا جاتا تھا۔ سرٹیفکیٹ حاصل کر کے قلعے سے باہر آنے والوں کو "نیک معاش" کہا جاتا تھا۔

ایڈجوٹنٹ آنند ایک سخت گیر آفیسر تھا اور ایک کامیاب جیلر کی طرح قلعے کا نظام سنبھالے ہوئے تھا۔ کبھی کبھی ایک انگریز لیفٹیننٹ کرنل جیکب فرننڈس قلعے کی انسپکشن کے لئے آتا تھا۔ تفصیلی معائنے کے لئے وہ کئی دن قلعے میں مقیم رہتا تھا۔ قلعے کی چار دیواری میں ہی ایک چھوٹا سا بنگلہ اس کے قیام کے لئے مخصوص تھا۔ درحقیقت وہی قلعے کے تمام معاملات میں مختارِ اعلیٰ تھا۔ وہ اپنے دورے کے بعد واپس جا کر رسمی طور پر انگریز پولیس کمشنر کو قلعے کے بارے میں رپورٹ دیتا تھا۔ وہ دورے پر آتا تو اس کی بیوی جولیا بھی اس کے ساتھ ہوتی۔

قلعے میں ان کا استقبال اس طرح ہوتا جیسے وہ کسی ملک کے بادشاہ اور ملکہ ہوں۔ ان کا تعلق بہرحال سفید فام حکمران طبقے سے تھا۔ قلعے میں رہنے والے ان پڑھ، غریب اور نیم جرائم پیشہ مقامی لوگوں کے لئے ان کی حیثیت واقعی بادشاہ اور ملکہ سے کم نہیں تھی۔ لیفٹیننٹ کرنل جیکب فرننڈس تو کسی حد تک سخت مزاج اور ذرا متکبر سا آدمی تھا، لیکن اس کی بیوی جولیا میں غرور اور تکبر نام کو بھی نہیں تھا۔ وہ جب اپنے شوہر کے ساتھ قلعے کے دورے پر آتی تو اکثر کسی اہتمام اور کرّ وفر کے بغیر ہی اِدھر اُدھر پھرتی رہتی۔ وہ قیدیوں سے بھی نہایت نرمی اور خوش مزاجی سے بات کرتی۔ ان کے مسائل معلوم کرتی اور ان کے کام آنے کی کوشش کرتی۔ وہ ان لوگوں کی زبان

سے کافی حد تک واقف تھی۔ اس وقت بوڑھے گلفام عرف گلفی کا جس انگریز عورت سے سامنا ہوا تھا، وہ جولیا فرننڈس ہی تھی، جو چہل قدمی کے لئے نکلی تھی۔ اسے سرد راتوں میں کھلی جگہوں میں چہل قدمی کرنا بہت اچھا لگتا تھا۔ گلفام بدستور اس کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑے تھا۔ وہ ایک بار پھر گڑگڑایا۔

"میم صاب...... ہماری مدد کریں......"

"بات کیا ہے؟ تم ہم سے کیا چاہتا ہے؟" جولیا نے ہمدردانہ لہجے میں پوچھا۔

گلفی نے کچے پکے کمرے کے کھلے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لجاجت سے کہا۔ "وہ...... جو عورت تکلیف سے چیخ رہی ہے...... میری بہو ہے...... میرے بیٹے کی بیوی...... وہ ماں بننے والی ہے...... وقت قریب ہے اور اس کے پاس کوئی عورت نہیں ہے...... آپ اسے سنبھال لیں میم صاب...... شری مہاراج آپ کا رتبہ اور اونچا کریں گے......"

جولیا کے چہرے پر قدرے اضطراب کے آثار نمودار ہو گئے۔ اس نے کمرے کے دروازے کی طرف دیکھا اور ذرا ہچکچاہٹ کے ساتھ بولی۔ "مجھے اس کام کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔ کیا قلعے میں کوئی دائی وغیرہ موجود نہیں ہے؟"

"نہیں میم صاب! کوئی باقاعدہ دائی تو نہیں ہے۔ ایک دو عورتوں کو ویسے ہی اس کام کا تجربہ ہے۔ بس وہی ضرورت کے وقت کام آتی ہیں...... لیکن میں ان میں سے کسی کو بلانا نہیں چاہتا۔ میرے بیٹے کے گھر میں یہ پہلا بچہ ہے۔ میں چاہتا ہوں وہ آپ کے ہاتھوں میں جنم لے۔ میں جب کمرے سے نکلا اور میری نظر آپ پر پڑی، میرے دل نے اسی وقت کہا کہ یہ بچہ آپ کے ہاتھوں میں جنم لے گا تو بڑا بھاگوان ہوگا۔ آپ کو اگر اس کام کا تجربہ نہیں ہے، تب بھی آپ یہاں کی جاہل عورتوں سے اچھی ہیں...... آپ میم صاب ہیں...... بس، یہ کام آپ کو کرنا ہوگا...... آپ کو آپ کے یسوع مسیح کا واسطہ......"

گلفی، جولیا کے پاؤں چھونے کے لئے جھکا، لیکن جولیا جلد ہی پیچھے ہٹ گئی اور بولی۔ "بس...... بس...... ہمارا پاؤں پکڑنے کی ضرورت نہیں...... ہم سے جو ہو سکا، ہم ضرور کرے گا...... لیکن دیکھو...... ہمارا کوئی ذمے داری نہیں ہے۔ اگر کوئی گڑبڑ ہو گیا تو تم ہم سے کچھ نہیں بولے گا۔"

"ہم آپ سے کیا بول سکتا ہے میم صاب...... آپ سرکار ہیں...... مالک ہیں...... اس

قلعے میں جتنے بھی قیدی موجود ہیں' ان سب کی جان بھی آپ کے ہاتھوں سے چلی جائے تو آپ کو کون کچھ بول سکتا ہے؟ اس وقت تو ہم خود آپ سے مدد مانگ رہے ہیں مائی باپ...... آپ کی بڑی مہربانی......'' گلفی نہایت عاجزی سے بولا۔

اس دوران آس پاس کے کمروں سے بھی کچھ لوگ نکل آئے تھے۔ ان میں مرد' عورتیں اور بچے بھی تھے۔ ان لوگوں کو جب بھی جولیا کو دیکھنے کا اتفاق ہوتا تھا' ان کے چہروں پر کچھ ایسے تاثرات ابھر آتے تھے' جیسے انہوں نے کسی آسمانی مخلوق کو دیکھ لیا ہو۔ اس وقت بھی وہ سب جولیا کے گرد گھیرا ڈالے' اسی طرح اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ گلفی کی بہو کی چیخیں اس دوران رک گئی تھیں' تاہم وہ اس انداز میں کراہ رہی تھی' جیسے تکلیف برداشت کرنے کی انتہائی کوشش کر رہی ہو۔

جمع ہو جانے والے لوگوں میں سے ایک قدرے عمر رسیدہ عورت آگے بڑھ کر گلفی کا بازو چھو کر اسے اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے بولی۔ ''وقت آ گیا ہے...... میں اندر جا کر کلپنا کی خبر لیتی ہوں۔ میں سب سنبھال لوں گی۔''

''نہیں...... نہیں......'' گلفی جلدی سے بولا۔

''تمہیں کچھ سنبھالنے کی ضرورت نہیں...... رام جی نے خاص طور پر میم صاب کو بھیجا ہے۔ سب کچھ یہ سنبھالیں گی۔ انہوں نے میری بنتی مان لی ہے۔''

''تم اس عورت کو میری مدد کے لئے اندر آنے دو۔ یہ پانی وغیرہ گرم کرے گی۔'' جولیا بولی۔ پھر وہ باقی لوگوں سے مخاطب ہوئی۔ ''تم سب لوگ اپنے اپنے کمروں میں جاؤ۔ گلفی تم بھی کسی اور کمرے میں جا کر انتظار کرو۔''

پھر اسے جیسے کچھ خیال آیا اور اس نے گلفی سے پوچھا۔ ''اس ہونے والے بچے کا باپ کہاں ہے؟''

گلفی کے سانولے چہرے پر کرب کی لہر ابھر آئی اور وہ سر جھکا کر شکستہ سے لہجے میں بولا۔ ''یہ تو کسی کو بھی معلوم نہیں کہ وہ کہاں ہے؟ چھ مہینے پہلے وہ ایک روز پاس لے کر یہاں سے رخصت ہوا تھا اور پھر لوٹ کر نہیں آیا۔ ہم جہاں جہاں تک اسے تلاش کرنے جا سکتے تھے' جاتے رہے لیکن اس کا کچھ پتا نہیں چلا۔ کئی ریلوے سٹیشنوں پر میں اور میری بہو دو دو دن بھوکے پیاسے بیٹھ کر انتظار کرتے رہے کہ شاید وہ کہیں سے آتا جاتا دکھائی دے جائے' لیکن اس کی

جھلک تک نظر نہیں آئی۔ اس کے بارے میں کوئی صحیح خبر مل جاتی یا ہمیں کہیں اس کی لاش ہی نظر آ جاتی تو دل کو صبر آ جاتا۔ ہم اس کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد بھی اس کی راہ تکتے رہتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے' وہ کسی واردات میں مارا گیا۔ کسی کا خیال ہے وہ گھر چھوڑ کر بھاگ گیا ہے اور کہیں بہت دور چلا گیا ہے' لیکن ہمیں معلوم ہے وہ اپنی بیوی اور اپنے ہونے والے بچے کو چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتا تھا۔ بس...... کچھ پتا نہیں' اسے زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔''

''اوہ...... بہت افسوس ہوا یہ سن کر......'' جولیا نے کہا۔ ''دعا کرو' وہ اپنے ہونے والے بچے کو دیکھنے آ جائے۔''

''ہم تو دعائیں کر کر کے تھک گئے ہیں میم صاب...... اور پتا نہیں ہم نے کتنی منتیں مانیں۔ کوئی بھی پوری نہیں ہوئی۔''

جولیا نے متاسفانہ سے انداز میں سر ہلایا اور گلفی کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ عمر رسیدہ بھنتو عورت کو اس نے ساتھ لے لیا تھا۔ کمرے کا دروازہ بند ہو گیا۔ آس پاس کے کمروں سے آنے والے لوگ واپس چلے گئے' لیکن گلفی ان میں سے کسی کے ساتھ نہیں گیا۔ وہ وہاں سے کچھ دور جا کر مضطربانہ انداز میں اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ کچھ دیر بعد گشت پر مامور سپاہی بھی اس کے پاس سے گزرا۔ وہ بھی صورتحال سے آگاہ ہو چکا تھا۔ چلتے چلتے مونچھ کو بل دے کر بولا۔ ''خوشخبری کا انتظار کر رہے ہو گلفی؟''

گلفی منہ سے کچھ نہیں بولا۔ بے دھیانی سے اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔ سپاہی ایک لمحے کیلئے رکتے ہوئے بولا۔ ''اُمید ہے تمہاری بہو کے ہاں بیٹا ہی ہو گا۔ ایک ڈاکو گھر سے چلا گیا ہے' دوسرا ڈاکو آ جائے گا۔''

گلفی اب بھی کچھ نہ بولا۔ صرف مسکرا دیا۔ بھنتو اس قسم کے تبصروں کا برا نہیں مناتے تھے۔ ڈاکو ہونا ان کے نزدیک فخر کی بات تھی۔ سپاہی آگے بڑھ گیا اور گلفی ایک بار پھر پودوں کی قطار کے پاس ٹہلنے لگا۔ کبھی کبھی وہ تشویش زدہ نظروں سے اپنے کمرے کی طرف دیکھنے لگتا تھا' جہاں سے مزید دو تین مرتبہ اس کی بہو کے کراہنے کی آواز سنائی دے چکی تھی۔

رات دھیرے دھیرے گزر رہی تھی۔ گلفی کو ٹہلتے ٹہلتے دو گھنٹے گزر گئے تو وہ تھک کر ایک منڈیر پر بیٹھ گیا۔ اسے سردی بھی لگ رہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اسے کسی پڑوسی کے کمرے میں چلے جانا چاہئے۔ وہ اس ارادے پر عمل نہ کر پایا۔ اسے اپنے بند کمرے سے کسی بچے کے رونے

کی مدھم سی آواز سنائی دی اور اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ وہ بے اختیار ایک بار پھر مضطربانہ انداز میں اٹھ کھڑا ہوا اور غیر ارادی طور پر کمرے کے قریب چلا گیا' جہاں اسے بچے کے رونے کی آواز خاصے واضح انداز میں سنائی دی۔

آخر کار مزید کچھ دیر بعد کوٹھری نما کمرے کا دروازہ کھل گیا اور جولیا وہاں کھڑی نظر آئی۔ اس کے چہرے پر تھکن نمایاں تھی۔ تھکن کے ساتھ ساتھ اس کے چہرے پر کوئی ایسا تاثر تھا' جس نے گلفی کو کچھ اور مضطرب کر دیا۔ وہ بے اختیار دروازے کے کچھ اور قریب چلا گیا۔ وہ پوچھنا چاہتا تھا۔

"کیا ہوا میم صاب......؟ لڑکا یا لڑکی......؟"

اس کے بجائے اس کے منہ سے نکلا۔

"کیا ہوا میم صاب...... آپ پریشان کیوں ہیں؟"

"ہم تمہاری بہو کو نہیں بچا سکا گلفی......" جولیا نے بوجھل آواز میں کہا۔

"ہم جو کر سکتا تھا' وہ ہم نے کیا......لیکن تم کو معلوم ہے' ہم ڈاکٹر نہیں ہے......اور تمہارا بہو کو ہاسپٹل لے جانے کا ٹائم بھی نہیں تھا۔"

گلفی صرف ایک لمحے کے لئے صدمے کی سی حالت میں خاموش رہا۔ شاید اس وقت اسے بہو کی زندگی یا موت کی زیادہ فکر نہیں تھی۔ دوسرے ہی لمحے وہ بول اٹھا۔ "رام بھلی کرے گا میم صاب...... میری بہو کی زندگی اتنی ہی ہو گی...... یہ بتائیں' کوئی نئی روح بھی اس سنسار میں آئی یا نہیں؟"

جولیا اس کا مطلب سمجھتے ہوئے بولی۔ "تم ایک پوتے کے دادا بن گئے ہو گلفی...... بہت صحت مند بچہ ہے...... ہمارا سمجھ میں نہیں آ رہا تم کو پوتے کا مبارکباد دیں یا بہو کی موت کا افسوس کرے......"

"آپ کچھ بھی نہ کریں میم صاب...... آپ نے جو کیا' ہم غریب لوگ تو اس کا بھی کوئی بدلہ نہیں دے سکتے۔ رام جی آپ کو ہمیشہ خوش رکھیں......" اس نے جھک کر جولیا کے پاؤں چھو لئے۔ اس بار جولیا کو پیچھے ہٹنے کا موقع نہ مل سکا۔

"ٹھیک ہے......ہم چلتا ہے۔"

جولیا نے کہا اور تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی اپنے چھوٹے سے بنگلے کی طرف روانہ ہو

گئی۔ اس کے گھر اطلاع پہنچ چکی تھی کہ اتنی دیر سے وہ کہاں تھی اور کیا کر رہی تھی۔ آس پاس کے کچھ لوگ بھی صورتحال سے آگاہ ہو چکے تھے اور گلفی کی مدد کے لئے آن پہنچے تھے۔ چند عورتیں اس کے کمرے میں چلی گئی تھیں۔ گلفی کی بہو کلپنا کی آخری رسوم کی تیاریاں ہونے لگی تھیں۔ مرد گلفی کو دلاسہ دے رہے تھے' حالانکہ وہ قطعی غمزدہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔



کلپنا کی موت سے قلعے کے صرف ایک گوشے میں ایک آدھ دن کے لئے معمولی سی ہلچل پیدا ہوئی تھی۔ اس کے بعد زندگی اسی طرح معمول پر آ گئی' جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہوا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس کی ارتھی اٹھنے اور پھر اس کی چتا نذر آتش ہونے کے بعد گھر واپس آتے ہی لوگوں نے اسے بھلا دیا ہو۔ یہ کوئی تعجب کی بات بھی نہیں تھی۔ کلپنا کون سی کوئی اہم عورت تھی۔ قلعے میں موجود بھنتوؤں کی اہمیت دوسروں کی نظر میں اور خاص طور پر انگریزوں کی نظر میں کیڑے مکوڑوں سے زیادہ نہیں تھی۔ خود گلفی نے اس کی موت کا کوئی خاص سوگ نہیں منایا تھا' البتہ اپنے گمشدہ بیٹے کا ذکر آنے پر وہ اب بھی اُداس ہو جاتا تھا۔

اس کے نوزائیدہ پوتے کی پرورش کی ذمے داری اس کے قریب ہی ایک کمرے میں رہنے والے ایک ادھیڑ عمر جوڑے نے لے لی تھی۔ جن کی اپنی کوئی اولاد نہیں تھی۔ گلفی نے ان کے مطالبے کے بغیر ہی ان سے وعدہ کیا تھا کہ وہ بچے کی پرورش کے سلسلے میں ہر ماہ کچھ نہ کچھ رقم انہیں دیتا رہے گا۔ چاہے وہ اسے بچے کی پرورش کے اخراجات سمجھ لیں یا کچھ لو......

وہ میاں بیوی جن کے نام سریتا اور دلبر تھے' گلفی سے کوئی رقم لینا نہیں چاہتے تھے' لیکن اس کے اصرار پر خاموش ہو گئے تھے۔ بچے کو پا کر وہ دونوں بے حد خوش تھے اور دل و جان سے اس کی دیکھ بھال کر رہے تھے۔ نوزائیدہ بچے کو دودھ پلانا ایک مسئلہ تھا' لیکن انہوں نے دوڑ بھاگ کر کے اس کا بھی کوئی نہ کوئی حل تلاش کر لیا تھا۔

اس روز گلفی انہی دونوں میاں بیوی کے کمرے میں بیٹھا تھا' جب دلبر نے حقہ گڑگڑاتے ہوئے ذرا چونک کر کہا۔

"ارے گلفی......تو نے ابھی تک اپنے پوتے کا کوئی نام تو رکھا نہیں......"

گلفی نے حقے کا کش لے کر پُرخیال انداز میں مونچھ کو بل دیا اور گویا کہیں دور دیکھتے ہوئے مسکرا کر بولا۔ "نام تو میں نے اسی وقت سوچ لیا تھا جب وہ پیدا ہوا تھا' لیکن میں نے

فیصلہ کیا تھا کہ اس کا نام رکھنے کی باقاعدہ چھوٹی موٹی خوشی کریں گے۔ قلعے کے اس حصے میں جتنے بھنتو آباد ہیں' ان سب کو بلائیں گے اور جلیبیاں بانٹیں گے...... تھوڑا بہت ناچ گانا کریں گے...... ہلا گلا کریں گے...... داروغہ جی سے اجازت میں لے لوں گا۔ ابھی میں اس لئے چپ تھا کہ کلپنا کی موت کو تین دن بھی نہیں گزرے۔ ابھی ہم ناچ گانا کرتے اچھے نہیں لگیں گے۔ بس ذرا دسواں ہو جانے دو۔ پھر دیکھنا میرے پوتے کا نام رکھے جانے کی رسم کیسی دھوم دھام سے ہو گی۔"

اس نے قربان جانے والے انداز میں پنگھوڑے میں لیٹے ہوئے اپنے ننھے سے پوتے کی طرف دیکھا' جو اپنے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بند کئے' انہیں اپنے پھولے پھولے گالوں کے قریب ٹکائے' دنیا مافیہا سے بے خبر سو رہا تھا۔ اپنے قریب بیٹھے تین افراد کے باتیں کرنے کی آوازوں سے بھی اس کی نیند میں کوئی خلل نہیں پڑ رہا تھا۔ دلبر نے اس کے لئے کہیں سے لکڑی کے ایک پرانے سے پنگھوڑے کا بھی بندوبست کر لیا تھا۔

دلبر کی بیوی سریتا بولی۔"گلفی چاچا...... کلپنا کے دسویں میں تو ابھی کئی دن ہیں۔ کم سے کم ہمیں تو بتا دو' تم نے اس بچے کا کیا نام سوچا ہے؟"

"ہاں...... ہاں...... کیوں نہیں...... تمہیں تو ضرور بتاؤں گا۔ آخر اب تم ہی ایک طرح سے اس بچے کی ماں ہو۔ تمہارا احسان میں کبھی نہیں بھلا سکتا۔" گلفی بولا۔ ایک لمحے کے توقف سے اس نے کہا۔"اس بچے کا نام ہو گا۔

"سلطان"...... تمہیں پتا ہے سلطان کا مطلب کیا ہے؟"

دونوں میاں بیوی نے ایک لمحے کے لئے ایک دوسرے کی طرف دیکھا' پھر نفی میں سر ہلا دیا۔ دلبر بولا۔"مطلب تو مجھے پتا نہیں...... لیکن یہ کچھ مسلمانوں والا نام لگتا ہے...... میرا خیال ہے بعض مسلمان بادشاہوں کا نام سلطان تھا......"

"ارے بے وقوف...... یہ مسلمان بادشاہوں کا نام نہیں...... بلکہ بادشاہ کو ہی سلطان کہتے ہیں...... اور میرا پوتا کسی بادشاہ سے کم نہیں ہو گا۔ اس لئے میں اس کا نام سلطان رکھوں گا۔ کوئی بھنتو کبھی سوچ سکتا تھا کہ اس کے گھر میں کوئی بچہ اتنی بڑی میم صاحب کے ہاتھوں میں جنم لے گا؟ بس اس سے ہی اندازہ لگا لو کہ وہ بادشاہ ہے...... بادشاہ......"

گلفی کے لہجے میں خوشی کے ساتھ ساتھ اتنا فخر تھا کہ دونوں میاں بیوی حیرت سے اس کی

طرف دیکھنے لگے۔ شاید وہ سوچ رہے تھے کہ گلفی نے بیٹھے بٹھائے شیخ چلی والے خواب دیکھنا شروع کر دیئے تھے۔ ایک بھنتو کا بیٹا بھلا بادشاہ کیسے بن سکتا تھا؟ اسے تو چور' ڈاکو اور قاتل ہی بننا تھا۔ سب لوگ...... حتیٰ کہ انگریز بھی یہی سمجھتے تھے کہ بھنتوؤں کے خون میں ہی کوئی ایسی بات تھی کہ وہ چور' ڈاکو اور قاتل کے سوا کچھ اور ہو ہی نہیں سکتے تھے۔ اگر وہ کوئی اور کام کرتے بھی تھے تو صرف دکھاوے کے لئے کرتے تھے یا پھر کسی مجبوری اور مصلحت کے تحت کرتے تھے۔ ان کا وہ کام عارضی ہوتا تھا۔ مجبوری یا مصلحت ختم ہوتے ہی وہ اسے خیر باد کہہ دیتے تھے۔ بعض لوگ تو کہتے تھے کہ بھنتوؤں کا خون ہی کسی اور رنگ کا ہوتا ہے' اگر وہ ہمیں لال دکھائی دیتا ہے تو یہ نظر کا دھوکا ہے۔ اصل میں اس کا رنگ کچھ اور ہوتا ہے۔ ہر بھنتو بچہ صرف دوسروں سے ہی نہیں' خود اپنے قبیلے کے لوگوں سے بھی اسی قسم کی باتیں سنتے ہوئے جوان ہوتا تھا۔

سریتا اور دلبر چند لمحے عجیب سی نظروں سے گلفی کی طرف دیکھتے رہے۔ پھر دلبر دھیمے لہجے میں بولا۔"نام تو خیر اچھا ہے...... شاید تمہارے پوتے کے لئے بھاگوان ثابت ہو......" پھر اس نے خود کلامی کے سے انداز میں زیر لب دہرایا۔"سلطان...... سلطان......" ایسا لگ رہا تھا' جیسے وہ اس نام کو ذہن نشین کر رہا ہو۔

"ہاں...... اچھی طرح دماغ میں بٹھا لو اس نام کو......" گلفی خوش ہوتے ہوئے بولا۔

"کوئی وقت آئے گا کہ یہ نام چاروں طرف گونجے گا...... اور اس وقت میں اس دنیا میں نہ ہوا تو اس نام کو سن کر تمہیں میری باتیں یاد آئیں گی۔ تم اپنے کانوں سے سنو گے...... ہر طرف اس نام کا ڈنکا بجے گا۔ اس وقت تمہیں اس بات پر فخر محسوس ہو گا کہ اس بچے نے جنم لینے کے بعد کچھ عرصہ تمہارے گھر میں پرورش پائی تھی۔"

گلفی نے ایک بار پھر والہانہ انداز میں اپنے پوتے کی طرف دیکھا۔ وہ بظاہر تو بچے کی طرف دیکھ رہا تھا' لیکن اس کی آنکھیں گویا مستقبل میں جھانک رہی تھیں اور ان آنکھوں میں ستارے جھلملا رہے تھے۔



دیکھتے ہی دیکھتے سلطان چار سال کا ہو گیا۔ وہ ایک صحت مند اور تیز طرار بچہ تھا۔ حالانکہ وہ نہایت غریبانہ ماحول میں پرورش پا رہا تھا اور اسے زیادہ تر ناقص خوراک ہی میسر آتی تھی' اس کے باوجود اس کی اٹھان اچھی تھی۔ سریتا اور دلبر تین سال تک اسے اپنے پاس رکھنے کے بعد قلعے

سے باہر جا چکے تھے۔ انہیں ''نیک معاش'' کا سرٹیفکیٹ مل گیا تھا۔ ان کے جانے کے بعد سے سلطان اپنے دادا کے پاس تھا۔ دادا کے لئے اب اس کی پرورش کوئی مسئلہ نہیں تھی۔

گلفی کے اس قلعے سے باہر جانے کے امکانات نہ ہونے کے برابر تھے' کیونکہ انگریزوں کے مقرر کردہ معیار کے مطابق ''اچھا چال چلن'' اختیار کرنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس کے نزدیک یہی کافی تھا کہ بوڑھا ہو جانے اور تنہا رہ جانے کی وجہ سے اس نے بہت سے خطرناک کام چھوڑ دیئے تھے۔ ورنہ وہ تو اپنے وقت کا بہت بڑا ڈاکو تھا۔ جوانی میں اس کے ساتھیوں نے اسے ''چھلاوہ'' نام دے رکھا تھا اور جن علاقوں میں وہ لوٹ مار کرتا تھا' ان میں بھی وہ اسی نام سے مشہور تھا۔

اس نے اپنی زندگی میں بہت مال' اسباب' سونا چاندی' ہیرے موتی لوٹے' لیکن وقت کی عجیب ستم ظریفی تھی کہ اب اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔ جب وہ قلعے سے باہر تھا تو گزرتے ہوئے ماہ و سال کے دوران کچھ ایسے اتفاقات ہوتے رہے کہ گروہ میں مال کا بٹوارا کرنے کے بعد اس کے پاس جو کچھ بھی بچا' وہ رفتہ رفتہ ہاتھ سے جاتا رہا۔ بڑھاپے میں وہ اپنے لڑکپن سے بھی زیادہ تہی دست تھا' تاہم اب بھی اسے جب کبھی باہر جانے کے لئے پاس میسر آ جاتا تھا تو وہ کوئی نہ کوئی چھوٹی موٹی واردات کرنے کا موقع تلاش کر ہی لیتا تھا۔ ان میں سے بعض وارداتوں کے سلسلے میں پولیس کی تفتیش کے دوران شکوک و شبہات کے سائے گلفی تک پہنچ ہی جاتے تھے۔ یہ چیز بھی اس کے قلعے سے باہر جانے کے راستے میں رکاوٹ بنی ہوئی تھی۔

بہرحال وہ قلعے میں بھی خوشی اور اطمینان سے رہ رہا تھا۔ وہ اپنے حال میں مست تھا اور پوتے کی رفاقت نے تو اس کی زندگی میں گویا ایک دلچسپ مصروفیت اور مقصدیت پیدا کر دی تھی۔ اس نے چار سال کی عمر میں پوتے کی ''تربیت'' شروع کر دی تھی۔ یہ تربیت اسے ڈاکو بنانے کے لئے تھی۔ وہ اٹھتے بیٹھتے یہی خواب دیکھتا تھا کہ اس کا پوتا بڑا ہو کر ایک ''نامی گرامی'' ڈاکو بنے گا۔

چار سال کا بچہ ابھی کوئی خاص گر تو نہیں سیکھ سکتا تھا' لیکن جس حد تک ممکن تھا گلفی نے اسے چھوٹے موٹے کام سکھانے کی کوششیں شروع کر دی تھیں۔ دوڑ بھاگ' چھوٹی موٹی رکاوٹیں پھلانگنا' سرد و گرم موسم کی سختیاں سہنا اور اس طرح کی دوسری بہت سی چیزوں کے لئے گلفی نے سلطان پر ''محنت'' شروع کر دی تھی۔ وہ دونوں جب بھی ساتھ ہوتے گلفی مستقل طور پر اس سے

باتیں کرتا رہتا تھا۔ وہ کمسن بچہ ان میں سے زیادہ تر باتیں سمجھ نہیں پاتا تھا' لیکن گلفی کو اس سے گویا کوئی غرض نہیں ہوتی تھی۔ اسے بس ایک سامع میسر آیا ہوا تھا۔ وہ اسے اپنی زندگی کے تجربات' وارداتوں کے قصے اور نہ جانے کیا کچھ سناتا رہتا تھا۔ حتیٰ کہ وہ اسے اپنی زندگی کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں اور دکھوں کے بارے میں بھی بتاتا رہتا۔ اس پر وہ کسی ردعمل کا اظہار کر دیتا۔ کبھی ہنس دیتا' کبھی پریشان ہو جاتا اور کبھی معصومانہ انداز میں پوچھ لیتا ورنہ زیادہ تر وہ اپنی آنکھوں میں معصوم سی حیرت لئے دادا کے چہرے کی طرف ہی دیکھتا رہتا۔

اس دوران ایک تبدیلی یہ آئی کہ قلعے کی چار دیواری میں سلطان کا نام بگڑ کر ''سلطانہ'' ہو گیا۔ اس طبقے کے لوگ عام طور پر ہر ایک کے نام میں ہی کوئی نہ کوئی تبدیلی یا اضافہ ضرور کر دیتے تھے۔ سلطان کو سلطانہ بنانے کے پیچھے ان کی نیت یہ ہرگز نہیں تھی کہ اس نام کو زنانہ رنگ دینا چاہتے تھے' بلکہ انہیں بس اپنی عادت کے مطابق نام کو بگاڑ کر کچھ نہ کچھ مختلف شکل ضرور دینی تھی۔ بعض لوگ اسے ''سلطانے'' کہہ کر بھی پکارتے تھے۔ وہ ایک خوش شکل' صحت مند اور ہنس مکھ بچہ تھا۔ اکثر لوگ اسے راستے میں روک کر پیار کرتے تھے اور قلعے کے اندرون میں کئی بار کسی نہ کسی گوشے سے صدا بلند ہوتی تھی۔ ''او سلطانہ......ادھر تو آ بات تو سن......''

کبھی کوئی پکارتا۔ ''اوئے سلطانہ کدھر بھاگا پھر رہا ہے؟ کبھی نچلا بھی بیٹھ جایا کر......''

گلفی خود بھی اپنے پوتے کو سلطانہ کہہ کر پکارنے لگا تھا۔ اس روز وہ ایک پرانے برگد کے نیچے بیٹھا اس سے باتیں کر رہا تھا۔ ''سلطانہ! تجھے اصل کام تو میں اس وقت سکھانا شروع کروں گا جب تو چھ سال کا ہو جائے گا لیکن تو میری باتیں ابھی سے غور سے سنتا رہا کر۔ انسان کا دماغ بڑے کمال کی چیز ہے۔ کچھ پتا نہیں' کس عمر میں سنی ہوئی باتیں اور دیکھی ہوئی چیزیں انسان کے دماغ میں بیٹھ جاتی ہیں۔ مجھے خود کبھی کبھی ایسا لگتا ہے کہ مجھے اس وقت کی بھی کچھ باتیں یاد ہیں جب شاید میں نے بولنا بھی شروع نہیں کیا تھا......''

گلفی نے ایک لمحے کے لئے خاموش ہو کر اپنے پوتے کی موٹی موٹی آنکھوں میں جھانکا۔ شاید وہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس کی باتیں سلطانہ کے ذہن نشین ہو رہی ہیں یا نہیں؟ سلطانہ اپنی مخصوص بچکانہ مسکراہٹ کے ساتھ بغور اس کی طرف دیکھ رہا تھا' جیسے اس کی باتیں سمجھنے کی پوری کوشش کر رہا ہو۔

گلفی اس کے پھولے پھولے گال تھپتھپا کر سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے بولا۔ ''یہ جو تیرے

گال ہیں نا...... ان کے اندر کئی چھوٹی موٹی چیزیں چھپانے کی گنجائش ہوتی ہے۔ جب تو بڑا ہو جائے گا تو یہ گنجائش اور بڑھ جائے گی۔ سونے چاندی کے سکے...... چھوٹی موٹی انگوٹھیاں وغیرہ ان میں چھپائی جا سکتی ہیں۔ بعض لوگ کلّے میں پان دبائے رکھتے ہیں۔ اسی طرح دونوں کلّوں میں پان کی جگہ دوسری چیزیں رکھی جا سکتی ہیں۔ کلّے میں دبے ہوئے پان کا تو پھر پتا چلتا ہے...... دیکھنے والے کو اندازہ ہو جاتا ہے کہ فلاں نے منہ میں پان دبایا ہوا ہے' لیکن میں تمہیں ایسا طریقہ سکھاؤں گا کہ کسی کو تمہارے منہ میں چھپی ہوئی چیزوں کا پتہ نہیں چلے گا۔ کچھ جگہ زبان اور تالو کے درمیان بھی ہوتی ہے۔ کچھ قیمتی چیزیں وہاں بھی چھپائی جا سکتی ہیں......"

پھر گلفی کی نظریں اپنے پوتے کے چہرے سے ہٹ گئیں اور وہ کھوئے کھوئے سے انداز میں ہوا میں گویا کسی غیر مرئی نقطے کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے ہونٹوں پر مدھم سی مسکراہٹ تھی۔ اس کی یہ کیفیت عموماً اس وقت ہوتی تھی جب وہ اپنے ماضی کی کسی یاد میں کھو جاتا تھا۔ اس کی آواز جیسے کچھ دور سے آنے لگی۔ "سلطانہ...... میرے بچے...... کبھی کبھی میں کسی ہتھیار کے بغیر بھی واردات پر نکلتا تھا۔ میرے پاس کوئی بندوق' طمنچہ' چھری یا تلوار نہیں ہوتی تھی۔ بس میرے گال میں ننھا سا ایک چاقو ہوتا تھا۔ یوں سمجھو' بند حالت میں وہ تمہاری انگلی جتنا لمبا ہوتا تھا۔ تمہیں پتا ہے' میں اس چاقو سے دو سیکنڈ میں انسانوں کا نرخرہ اس طرح ادھیڑ دیتا تھا' جیسے لوگ گھر میں پکانے کے لئے مرغی ذبح کرتے ہیں۔ خود میرے شکار کو بھی پتا نہیں چلتا تھا کہ کب اس کی گردن کٹ گئی۔ وہ سیکنڈ بعد زمین پر پڑا تڑپ رہا ہوتا تھا۔ ذرا سی دیر بعد ٹھنڈا ہو جاتا تھا۔"

سلطانہ یوں ہنس دیا' جیسے اس کے دادا نے اسے کوئی مزاحیہ بات سنائی ہو' جو اس کی سمجھ میں بھی آ گئی ہو۔ اس کی بچکانہ ہنسی سن کر گلفی دوبارہ اس کی طرف متوجہ ہوا اور بولا۔ "سات سال کی عمر میں' میں تمہیں سکھاؤں گا کہ اگر اچانک کوئی پولیس والا تمہارے ٹھکانے پر آ پہنچے تو اس سے بات کیسے کرتے ہیں۔ تمہیں اپنی آواز اور چہرے سے یہ ظاہر کرنا ہو گا جیسے تم ابھی ابھی سو کر اٹھے ہو۔ انگریز پولیس افسر کو چکر دینا زیادہ آسان ہوتا ہے۔ سات سال کی عمر میں ہی میں تمہیں بہت سی جنگلی جانوروں کی آوازیں نکالنا سکھاؤں گا۔ شیر کی دھاڑ...... اور پھر ایسے ہرن کی آواز' جسے شیر نے دبوچ لیا ہو...... مور' کوئل اور بلبل کی آواز...... یہ سب آوازیں نکالنا میں تمہیں سکھاؤں گا۔ ان سے بڑا فائدہ ہوتا ہے۔ کبھی یہ پولیس کا گھیرا توڑ کر نکلنے میں کام آتی ہیں اور کبھی اپنے ساتھیوں کو کوئی پیغام دینے میں۔ تم یہ آوازیں نکالنا سیکھو گے نا......؟"

ننھے سلطان نے شاید اس کی بات سمجھے بغیر ہی اثبات میں سر ہلا دیا۔ شاید وہ کم از کم یہ تو سمجھ ہی گیا تھا کہ اس سے کچھ پوچھا جا رہا تھا۔ اسے اثبات میں سر ہلاتے دیکھ کر گلفی کے چہرے پر طمانیت آ گئی۔ وہ سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے بولا۔ "اس کے علاوہ میں تمہیں یہ بھی سکھاؤں گا کہ اپنے آپ کو سکیڑ کر تنگ سے تنگ جگہوں سے کیسے نکلتے ہیں...... اور وہ بھی اس طرح کہ جسم نہ چھلنے پائے...... لیکن یاد رکھنا' تمہیں کبھی موٹے نہیں ہونا ہے۔ زیادہ کھانے کی عادت نہ ڈالنا۔ انسان دبلا ہو لیکن طاقتور اور لوہے کی طرح مضبوط ہو۔ سمجھ رہے ہو نا میری بات؟"

سلطان نے ایک بار پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ بے چارہ اکثر باتوں پر اثبات میں ہی سر ہلا دیتا تھا۔ گلفی اسے اثبات میں سر ہلاتے دیکھ کر خوش ہوتے ہوئے بولا۔ "میں تمہیں چھوٹی سے چھوٹی اور حد سے زیادہ تنگ جگہوں میں اس طرح چھپ کر بیٹھنا سکھاؤں گا جس طرح سانپ اپنے بل میں بیٹھتا ہے۔ تم چاہے کتنی ہی دیر اس جگہ چھپے بیٹھے رہو گے' لیکن تمہارا دم نہیں گھٹے گا۔ خطرہ ٹل جانے پر تم وہاں سے نکل جاؤ گے' لیکن یہ کام صرف اس وقت کرنا ہے جب تم محسوس کرو کہ اس خطرے کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اگر مقابلہ کر سکتے ہو تو ضرور کرو...... اور اگر کسی کو قتل کرنا ضروری ہو تو اس میں ایک لمحے کی بھی دیر نہ کرو۔ اگر تم ایک لمحے کے لئے بھی ہچکچاہٹ کا شکار ہو گئے تو عین ممکن ہے کہ تمہارا دشمن تمہیں قتل کر ڈالے۔ وار کرنے میں دشمن کو پہل کرنے کا موقع کبھی نہیں دینا۔ چار سو سال سے ہمارے خاندان کا یہی اصول چلا آ رہا ہے۔ ظاہر ہے' چار سو سال پرانا اصول غلط تو نہیں ہو سکتا۔ اگر مقابلہ دوبدو نہ ہو تو تم اپنے دشمن کو سنکھیا یا دھتورہ کھلا کر بھی مار سکتے ہو۔"

پھر گویا اسے کچھ یاد آیا اور وہ لکڑی کے بنچ پر پہلو بدل کر بولا۔ "اور ہاں...... اگر کبھی پولیس مقابلے میں تمہیں گولی لگ جائے یا کہیں سانپ کاٹ جائے تو فوراً برہما بوٹی تلاش کرنا۔ ہمارے علاقے اور بھابڑ کے جنگلوں میں یہ بوٹی جگہ جگہ پائی جاتی ہے۔ اس کے پتوں کا رس نچوڑ کر دو چار مرتبہ زخم پر ٹپکانا۔ زخم جلدی بھر جائے گا اور زہر نہیں پھیلے گا۔ یہ بھی یاد رکھنا کہ بارہ بور کی بندوق کی گولی پچاس ساٹھ گز سے زیادہ دور نہیں جاتی...... اور آج کل پولیس کو جو نئی بندوقیں ملی ہیں وہ فائر کرتے وقت دھواں بہت دیتی ہیں۔ اگر آپ کہیں چھپے ہوئے ہوں تو ان کی وجہ سے آپ کے ٹھکانے کا پتا چل جاتا ہے۔ ہم ڈاکوؤں کو زیادہ تر پولیس سے چھینا ہوا اسلحہ ہی استعمال کرنا ہوتا ہے' اس لئے ہمیں اس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات بھی ہونی چاہئے......"

گلفی اپنی دھن میں اس قسم کی باتیں کرتا رہتا تھا۔ وہ یہ سوچتا ہی نہیں تھا کہ چار سال کے بچے سلطانہ نے ابھی تو کسی بندوق کو ہاتھ لگا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔ گلفی کو اس بات سے بھی غرض نہیں تھی کہ سلطانہ اس وقت کھیل کود کے لئے اِدھر اُدھر جانے کو بے چین ہو رہا تھا اور بنچ پر اس کے برابر بیٹھا کسمسا رہا تھا۔ گلفی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''سال میں دو مرتبہ ایک پولیس پارٹی بجنور سے خاص طور پر یہاں آتی ہے۔ ایک انسپکٹر صاحب قلعے کے گیٹ کے پاس میز کرسی لگا کر بیٹھتے ہیں اور سارے بھنتوؤں کو قطاروں میں کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ جو بھنتو یہاں نئے آئے ہوئے ہیں اور جو بچے بارہ سال کے ہو چکے ہوتے ہیں' انہیں ٹین کے ایک بڑے سے ٹکڑے پر دونوں ہاتھ رکھنے کو کہا جاتا ہے۔ اس ٹین پر کوئی خاص سیاہی لگی ہوتی ہے جس سے ہاتھ کالے ہو جاتے ہیں۔ پھر وہ دونوں ہاتھ باری باری ایک صاف کاغذ پر رکھوائے جاتے ہیں۔ یوں سمجھو دونوں ہاتھوں کی تصویر کاغذ پر چھپ جاتی ہے۔ جس میں ہاتھ کی لکیریں صاف نظر آتی ہیں۔ انہی کاغذوں پر اس آدمی یا لڑکے کا نام' قد' حلیہ' پہچان کی خاص خاص نشانیاں...... یہ سب کچھ لکھ لیا جاتا ہے۔ یہ کاغذ پولیس کے ریکارڈ میں جمع ہو جاتے ہیں۔ آئندہ جہاں بھی واردات ہوتی ہے' وہاں پولیس انگلیوں کے نشان تلاش کرتی ہے اور ان کی مدد سے مجرم کا پتا چلانے کی کوشش کرتی ہے۔''

پھر گلفی کسی خیال کے تحت مسکراتے ہوئے بولا۔ ''لیکن سلطانہ...... تم فکر نہ کرو...... تم جب بارہ سال کے ہو گے اور بجنور کی پولیس یہاں آئے گی...... اگر میں اس وقت زندہ ہوا تو تمہیں کہیں اِدھر اُدھر چھپا دوں گا۔ میں تمہاری کوئی نشانی پولیس کے ریکارڈ میں جانے نہیں دوں گا۔ یہ آگے چل کر تمہارے حق میں بہت اچھا ہو گا۔''

آخر سلطانہ رہ نہیں سکا اور ٹانگیں بنچ سے نیچے لٹکاتے ہوئے بولا۔ ''دادا...... میں بھورے کے ساتھ کھیلنے جاؤں؟ وہ مجھے بلا رہا ہے۔'' اس نے دور ایک درخت کی طرف اشارہ کیا۔ اس درخت کی اوٹ سے ایک بچہ جھانک کر ان کی طرف دیکھ رہا تھا' لیکن شاید قریب آتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔ وہ ایک مسلمان بچہ تھا۔ اس کا پورا نام بھورے خان تھا۔

''او بے وقوف...... کھیلنے کے لئے تو پوری عمر پڑی ہے۔'' گلفی کچھ برا ماننے کے سے انداز میں بولا۔ ''تجھے اتنے کام کی باتیں بتا رہا ہوں۔ تجھے کھیلنے کی پڑی ہوئی ہے۔ آگے چل کر تو ایک ڈاکو کے طور پر جو زندگی گزارے گا' یوں سمجھ لے وہ بھی کھیل کود کی طرح ہی تو ہو گی۔ تو ہر

وقت جنگلوں' بیابانوں اور ہمالیہ کے پہاڑوں میں بھاگا پھرے گا۔ پولیس تیرے پیچھے ہو گی۔ یہ بھی تو ایک طرح کی آنکھ مچولی ہو گی...... بہت لمبی آنکھ مچولی......''

بات تو بچے کی سمجھ میں نہیں آئی' لیکن وہ اتنا ضرور سمجھ گیا کہ دادا ناراض ہو رہا تھا۔ وہ برا سا منہ بنا کر دوبارہ آلتی پالتی مار کر بنچ پر بیٹھ گیا اور گلفی کا لیکچر ایک بار پھر شروع ہو گیا۔ وقت گزرتے پتا نہیں چلتا۔ دیکھتے ہی دیکھتے تو تیرہ سال کا ہو جائے گا۔ پھر تجھے قلعے سے باہر جانے کیلئے پاس مل جایا کرے گا۔ بس...... پھر تجھے اپنا کام شروع کر دینا ہے۔ آس پاس کے شہروں' نجیب آباد' بجنور اور مراد آباد میں تجھے خوب شکار ملے گا' بلکہ اگر تو جلدی زیادہ ہمت والا ہو گیا تو دلی تک مار کر سکتا ہے...... اور پھر بیچ میں سیکڑوں گاؤں دیہات ہیں۔ ہر جگہ مال ہی مال ہے۔ شہروں میں تجھے ٹھاکر اور بنئے ملیں گے' جن کے پاس خوب روپیہ پیسا' سونا چاندی ہوتا ہے' جو انہوں نے گھروں میں بڑے اچھے طریقوں سے چھپا چھپا کر رکھا ہوتا ہے۔ تجھے ان سے سب نکلوانا ہے۔ بنئے عام طور پر بھنتو کو دیکھتے ہی پہچان لیتے ہیں اور اس کے سائے سے بھی بچتے ہیں۔ چور' ڈاکو کے علاوہ وہ اسے کم ذات بھی سمجھتے ہیں نا...... اگر تو انہیں ہاتھ لگائے گا تو اپنے اوپر گنگا جل کا چھپکا مار کر اپنے آپ کو پاک کریں گے۔ ان گدھوں کی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ سب انسانوں کا خون کا رنگ ایک ہی ہے اور چھری یا گولی لگنے سے سب کو ایک ہی جیسی تکلیف ہوتی ہے...... اور تیری تو خیر کیا بات ہے...... تو ان سے بہت اونچا انسان ہے۔ تیرا جنم ایک بہت بڑی میم صاحب کے ہاتھوں میں ہوا ہے۔ یہ بات تو اگر لاٹ صاحب کو معلوم ہو جائے تو وہ بھی تیری عزت کریں گے......''

سلطانہ اب باقاعدہ جماہیاں لینے لگا تھا اور شاید وہ دادا کی بات بالکل ہی نہیں سن رہا تھا' لیکن دادا نے جوشِ خطابت میں اپنا بیان جاری رکھا۔ ''بنئے بھول گئے ہیں کہ ہم بھنتو دراصل راجپوت ہیں۔ چار سو سال پہلے چتوڑ گڑھ سمیت پورے راجپوتانہ پر ہماری حکومت تھی۔ ہمارے اس وقت کے بزرگ راجے' مہاراجے' مغل بادشاہ کے ساتھ بیٹھ کر شطرنج کھیلا کرتے تھے۔ وہ تو شہنشاہ اکبر ہمارے مہاراجہ پرتاب سے ناراض ہو گیا اور اس نے راجپوتانہ اس سے چھین کر اسے بلدی گھاٹ کے جنگلوں میں دھکیل دیا۔ تب سے ہماری نسلیں ڈاکو بن گئیں ورنہ آج ہم بھی راجوں مہاراجوں میں شمار ہوتے......''

پھر گلفی کا لہجہ اچانک فلسفیانہ ہو گیا اور وہ ذرا دھیمی آواز میں بولا۔ ''ویسے...... میرے

بچے...... راجوں مہاراجوں' بادشاہوں اور ڈاکوؤں میں کوئی خاص فرق نہیں ہوتا۔ یہ سب دوسروں ہی کی دولت پر عیش کرتے ہیں۔ خود کہیں سے کچھ کما کر نہیں لاتے۔ دوسروں سے چھینتے ہیں۔ بس چھیننے کے طریقے الگ الگ ہیں۔ کچھ طریقے قانون کہلاتے ہیں' کچھ طریقے جرم بن جاتے ہیں۔''

وہ درخت کی اوٹ میں کھڑا ہوا بھورے خان اب مایوس ہو گیا۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ اس کے دوست سلطانہ کا دادا آج اسے نہیں چھوڑے گا۔ چنانچہ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا کسی اور طرف نکل گیا۔ سلطانہ کن انکھیوں سے ادھر ہی دیکھ رہا تھا۔ بھورے خان جب اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا تو وہ بھی مایوسی بھرے انداز میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔

گلفی کی بات جاری رہی اور اب اس کا لہجہ خوابناک سا ہو گیا۔ شاید اس نے جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھنا شروع کر دیا تھا۔

وہ کہہ رہا تھا۔ ''کوئی وقت آئے گا جب ہم ایک بار پھر راجپوتانہ پر راج کریں گے۔ آج ہم نجیب آباد کے قلعے میں قیدی ہیں' کل چتوڑ گڑھ کے قلعے پر ہمارا جھنڈا لہرائے گا اور بڑے بڑے ٹھاکر اور بنئے ہمارے سامنے کھڑے تھر تھر کانپ رہے ہوں گے۔ جب تک وہ وقت نہیں آتا' تب تک ہمیں لوٹ مار پر ہی گزارا کرنا ہے...... اور اس کے لئے کبھی کبھی لوگوں کا خون بھی بہانا پڑتا ہے۔ تو کل کا راجہ ہے اسی لئے تو میں نے تیرا نام سلطان رکھا تھا۔ جب تو سچ مچ سلطان بن جائے گا تو اپنے دادا کی باتیں بھول نہ جانا۔ یاد رکھنا کہ تیرے دادا نے تجھے اپنے خاندان' اپنے پیشے' اپنی تاریخ کے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا...... اور جو کچھ اسے آتا تھا' وہ سب کچھ سکھا بھی دیا تھا۔ یاد رکھنا ہے کہ تیرے دادا نے تجھے سب کچھ بتانا' سب کچھ سکھانا' بہت چھوٹی عمر سے ہی شروع کر دیا تھا۔ مجھے اس لئے تجھ کو سب کچھ بتانے اور سکھانے کی جلدی ہے کہ ہم جیسے لوگوں کی زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا۔ اب اپنے باپ کو ہی دیکھ لے...... ابھی اس کی عمر ہی کیا تھی' اسے تیری شکل بھی دیکھنا نصیب نہیں ہوئی۔ کیا پتا کل کو میں بھی اسی طرح قلعے سے نکلوں اور پھر لوٹ کر نہ آؤں...... تو دنیا میں بالکل اکیلا رہ جائے گا۔ میں چاہتا ہوں تو جس عمر میں بھی اکیلا رہ جائے' اس عمر میں ہی اس سنسار میں دھڑلے سے جینے اور زمانے سے دو دو ہاتھ کرنے کے قابل ہو۔ اگر تو ذرا بھی کمزور ہوا تو یہ دنیا بھیڑیے کی طرح تجھے کھا جائے گی۔''

یہ کہتے کہتے نہ جانے کیا ہوا کہ گلفی کی آواز گلے میں بالکل ہی پھنس کر رہ گئی۔ پھر اس نے

اپنی پیشانی مسلنے کے بہانے دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا لیا۔ دراصل اس کی آنکھوں میں نمی چھلک آئی تھی اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کا ننھا پوتا اس کی آنکھوں میں نمی دیکھے۔ گو کہ اسے معلوم تھا اگر اس کے کمسن پوتے نے اسکی آنکھوں میں نمی دیکھ بھی لی تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ وہ اس کا مطلب نہیں سمجھ سکے گا۔ پھر بھی گلفی نے غیر ارادی طور پر چہرے پر ہاتھ رکھ لئے تھے۔ وہ ایک ننھے بچے کے سامنے بھی کسی کمزوری کا اظہار کرنا نہیں چاہتا تھا۔

اس نے اس بات پر بھی توجہ نہیں دی کہ سلطانہ تو اس کی طرف دیکھ ہی نہیں رہا تھا۔ وہ تو اسی طرف دیکھ رہا تھا جدھر اس کا دوست بھورے خان گیا تھا۔



ننھا سلطان، جس کا نام بگڑ کر سلطانہ ہو چکا تھا، اپنے دادا گلفی کی اسی طرح کی باتیں سنتے سنتے دھیرے دھیرے بڑا ہو رہا تھا۔ دادا نے اس کی تربیت شروع کر دی تھی اور اس دوران بھی اس کے ماضی کے قصے جاری رہتے تھے۔ کبھی کبھی سلطانہ ہی کی کسی بچکانہ سی بات یا اس کے کسی معصوم سے سوال کی وجہ سے گویا دادا کی نظروں کے سامنے ماضی کے بہت سے دریچے وا ہو جاتے تھے۔ وہ بولنا شروع کرتا...... اور پھر بات سے بات نکلتی چلی آتی تھی۔

سلطانہ ذرا بڑا ہوا تو ایک بار اس نے پوچھ لیا۔ ”دادا...... میری دادی کہاں ہیں؟“

اپنی ماں کے بارے میں وہ جان چکا تھا کہ وہ اسے جنم دیتے ہوئے مر گئی تھی۔ اس کا سوال سن کر گلفی کی سرمئی آنکھیں ایک بار پھر ماضی کے دھندلکوں میں بھٹکنے لگیں۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد اس نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔ ”وہ کالی ماتا کے پاس واپس چلی گئی ہے بیٹا...... وہ بھی تیری ماں کی طرح جوانی میں مر گئی تھی۔ بھابڑ کا بخار اسے کھا گیا تھا۔“

ترائی کے علاقے میں پھیلے ہوئے بھابڑ کے جنگلات میں مکھیوں سے بھی موٹے مچھر پائے جاتے تھے۔ وہ اگر شہری آبادیوں کی طرف آتے تھے اور کسی کو کاٹ لیتے تھے تو اسے بہت تیز بخار ہو جاتا تھا۔ اس بخار کا نام بھی ”بھابڑ کا بخار“ پڑ گیا تھا۔ اکثر مریض علاج میسر آنے پر بھی اس سے جانبر نہیں ہو پاتے تھے۔

ایک لمحے کے توقف کے بعد گلفی نے کھوئے کھوئے سے لہجے میں سلسلۂ کلام جوڑا۔ ”وہ بھنتو قبیلے کی، اپنے وقت کی سب سے خوبصورت لڑکی تھی۔ میں نے پنچایت کے سامنے اس کے باپ کی خدمت میں ڈیڑھ سو روپے کا نذرانہ پیش کر کے اس سے شادی کی بات پکی تھی، حالانکہ اس زمانے میں اچھی خاصی بھنتو لڑکی کے باپ کو ساٹھ ستر روپے کا نذرانہ دے کر شادی کی بات پکی ہو جاتی تھی۔ شادی کے وقت تیری دادی کی عمر صرف چودہ سال تھی۔“

پھر گلفی کے ہونٹوں پر دھیمی سی مسکراہٹ ابھر آئی اور وہ سلطانہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”ویسے تیری دادی بھی اپنی جگہ بہت بڑی فنکار تھی۔ میلے ٹھیلے یا بھرے بازار سے گزرتے وقت نہ جانے کتنی عورتوں کے زیوروں اور مردوں کی جیبوں پر ہاتھ صاف کر دیتی تھی۔ ایک مرتبہ میں کافی دنوں کیلئے بیمار پڑ گیا تو اسے ہی ”کام“ کے لئے گھر سے نکلنا پڑا۔ وہ ایک بار جاتی تھی تو کافی دنوں کا خرچہ نکل آتا تھا۔ حالانکہ مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا تھا کہ اسے کام پر بھیجوں...... لیکن کیا کرتا...... مجبوری تھی...... میں بیمار پڑا تھا۔“

”دادا...... آپ کبھی پکڑے نہیں گئے؟“ سلطانہ نے گویا ایک نہایت اہم اور عقلمندانہ سوال کیا۔

”ارے بیٹا...... مجھے کون پکڑ سکتا تھا، میں تو چھلاوہ تھا...... میری تو شکل بھی کسی پولیس والے نے صحیح طرح نہیں دیکھی تھی۔ میرا گھوڑا ہوا سے باتیں کرتا تھا اور میں گھڑی دو گھڑی میں نہ جانے کہاں سے کہاں نکل جاتا تھا۔ رام پور کے نواب میری سرپرستی کرتے تھے، لیکن کبھی کبھی انہیں غصہ آتا تھا تو میری گرفتاری کا حکم بھی دے دیتے تھے۔ ایک بار تو انہوں نے سات سو سپاہیوں کو میری گرفتاری کا خاص طور پر حکم دے دیا تھا۔ ان سپاہیوں کا افسر ایک گورا صاحب تھا۔ انہوں نے اپنے سارے جتن کر لئے لیکن میں ان کے ہاتھ بھی نہیں آیا۔“

پھر گلفی کو جیسے کچھ یاد آیا اور وہ دل ہی دل میں اس بات سے محظوظ ہوتے ہوئے ہنس کر بولا۔ ”مجھے نواب صاحب کی اس حرکت پر غصہ آ گیا۔ میں نے سوچا، انہیں بھی سبق سکھانا چاہئے۔ میں نے ان کے محل میں ڈاکا ڈالنے کا پکا ارادہ کر لیا اور ایک رات کسی نہ کسی طرح ان کی خواب گاہ میں جا گھسا...... آہا...... کیا بتاؤں...... کیا کمرہ تھا وہ...... ہم جیسے لوگوں کے لئے تو وہ ایک کمرہ بھی کسی محل سے کم نہیں تھا۔“ گلفی ایک لمحے کے لئے خاموش ہو کر گویا اس کمرے کے تصور میں کھو گیا۔

پھر اس نے خوابناک سے لہجے میں سلسلۂ کلام جوڑا۔ ”جس کمرے میں ہم رہتے ہیں، نواب صاحب کی خواب گاہ میں شاید ایسے پچاس کمرے بن سکتے تھے۔ اس کی کھڑکیوں اور دروازوں پر بنگال کی ریشم کے پردے تھے...... اور وہ ایسا کپڑا تھا کہ چاہو تو سارے پردوں کو ایک انگوٹھی میں سے گزار لو۔ فرش پر ایرانی قالین تھے، جن میں پاؤں دھنسے جاتے تھے۔ کمرے میں رکھا ہوا گلدان سونے کا تھا۔ ذرا اندازہ لگاؤ...... تھوکنے کے لئے بھی وہ لوگ سونے کا برتن

استعمال کرتے تھے۔ مسہری اتنی بڑی تھی کہ اس پر نواب صاحب اپنی تینوں بیگمات سمیت سوتے' تب بھی جگہ بچ جاتی۔ اس مسہری کے سرہانے نقش ونگار سے سجا ہوا جو آدھے تھال جیسا بڑا سا تختہ تھا' اس پر ہیرے جڑے ہوئے تھے۔"

گلفی گویا ایک بار پھر کسی خیال میں کھو کر خاموش ہو گیا۔ ایک لمحے کے انتظار کے بعد سلطانہ نے ہولے سے اس کا گھٹنا ہلایا اور بیتابی سے پوچھا۔

"پھر کیا ہوا دادا......؟" بات جس حد تک بھی اس کی سمجھ میں آ رہی تھی' اسے شاید اس میں بھی لطف آ رہا تھا اور وہ سب کچھ سننے کیلئے بے تاب تھا۔ اس کے دادا نے ذرا چونک کر ٹھنڈی سانس لی۔ "ہونا کیا تھا بیٹا...... ہم سارے بھتوؤں کی شاید قسمت ہی خراب ہے' جب بھی ہم کوئی بڑا ہاتھ مارنے کی کوشش کرتے ہیں کوئی نہ کوئی گڑبڑ ہو جاتی ہے۔ کافی دیر تک میں اس لمبے چوڑے کمرے میں گم صم ہی کھڑا رہا۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ خواب گاہ اوپر کی منزل پر تھی۔ نیچے چنبیلی اور گلاب کی کیاریاں تھیں' اس لئے کمرے میں آنے والی ہوا بھی خوشبودار تھی۔ واقعی دولت والوں کا رہن سہن دیکھ کر تو لگتا ہے جیسے وہ زمین پر ہی ایک طرح کی چھوٹی موٹی جنت بنا لیتے ہیں۔ میرا دل چاہ رہا تھا کچھ دیر اس مسہری پر لیٹ کر نیند کے مزے لے لوں۔ بڑی مشکل سے میں نے اپنے آپ کو روکا۔ اس حد تک تو میری قسمت اچھی تھی کہ خواب گاہ میں کوئی نہیں تھا' لیکن کسی وقت بھی کوئی آ سکتا تھا۔"

گلفی سانس لینے کو رکا تو سلطانہ بے تابی سے بولا۔ "تو کیا کوئی آ گیا تھا؟"

"ہاں...... کوئی آ گیا تھا۔" گلفی نے آہ سی بھر کر کہا۔

"کون......؟" سلطانہ نے تجسس سے پوچھا۔

ہوئے تھے۔ میں ہر زاویے سے اپنے آپ کو دیکھ سکتا تھا۔"

سلطانہ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ شاید اس کے لئے کسی بڑی سی چھت میں بہت سے آئینے نصب ہونے کا تصور حیران کن تھا۔ گلفی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "ہیرے کی طرف بڑھتا ہوا میرا ہاتھ رک گیا۔ ہم ڈاکوؤں کے لئے یہ کوئی اچھا شگون نہیں ہوتا کہ واردات کے دوران ہمیں کسی آئینے میں اپنا عکس نظر آ جائے۔ میں نے سوچا مجھے ڈاکے کا ارادہ چھوڑ کر واپس چلے جانا چاہئے...... لیکن مجھے آرام سے جانا نصیب نہیں ہوا۔ عین اسی وقت ایک بڑا سا کتا کمرے میں آ گیا۔ اس کا قد اور وجود کسی گدھے سے کم نہیں تھا۔ اس کا جبڑا آدھا کھلا ہوا تھا اور لمبی سی زبان باہر لٹک رہی تھی۔ وہ اتنا خوفناک تھا کہ اسے دیکھ کر کسی شیر دل انسان کو بھی جھرجھری آ سکتی تھی۔ میرا خیال ہے وہ کسی ریچھ سے آسانی سے مقابلہ کر سکتا تھا اور شاید کسی شیر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بھی دیکھ سکتا تھا۔ بہرحال میں نے اس کی طرف دیکھنے میں زیادہ وقت ضائع نہیں کیا۔ مجھے معلوم تھا' وہ مجھ پر چھلانگ لگانے والا ہے۔ میں نے اس سے پہلے کھڑکی سے باہر چھلانگ لگا دی۔"

"لیکن وہ کمرا تو اوپر کی منزل پر تھا...... آپ کو تو بہت چوٹ لگی ہو گی...... ٹانگ وانگ تو نہیں ٹوٹی؟" سلطانہ نے تشویش سے پوچھا۔

"ہاں بیٹا...... میں تو اس وقت بھول ہی گیا تھا کہ خواب گاہ اوپر کی منزل پر تھی۔" گلفی یوں ذرا کراہ کر بولا' جیسے اسے اس وقت کی چوٹیں یاد آ گئی ہوں۔ "وہ تو میری قسمت اچھی تھی کہ میں گلاب کی کیاری میں جا کر گرا' جس کی زمین خاصی نرم تھی' لیکن تمہیں پتا ہے گلاب کے ساتھ کانٹے بھی ہو [illegible]

کرتے تھے۔ جب معاملہ ٹھنڈا پڑ جاتا تھا تو میں مراد آباد یا بریلی واپس آ جاتا تھا۔ اگر رام پور میں دوسرے شہر کی پولیس مجھے پکڑتی تو ان پر پابندی ہوتی کہ مجھے رام پور کی پولیس کے حوالے کریں اور انہیں معلوم تھا کہ رام پور کی پولیس مجھے چھوڑ دے گی۔ اس لئے وہ میرے پیچھے رام پور آنے کی زحمت ہی نہیں کرتے تھے۔“

”واہ! آپ اکیلے ہی سب کچھ کرتے تھے؟ آپ کے ساتھ دوسرے لوگ نہیں ہوتے تھے؟“ سلطانہ نے پوچھا۔

”نہیں بیٹا...... دوسرے بہت سے بھنتوؤں نے گروہ وغیرہ بنائے ہوئے تھے‘ لیکن میں ہر واردات اکیلا ہی کرتا تھا۔ اکیلے کام کرنے میں مشکل تو ہوتی تھی‘ لیکن گروہ بنانے میں اس سے بھی زیادہ مشکلیں تھیں۔“ گلفی نے اپنے پوتے کو بتایا۔ ”لیکن میں مراد آباد میں بھنتوؤں کی پنچایت کو اپنی وارداتوں کے مال میں سے کچھ حصہ پہنچایا کرتا تھا۔ پنچایت میں پانچ بڑے بزرگ شامل ہوتے ہیں جو ”پنچ“ کہلاتے ہیں۔ ان کا سردار ”مکھیا“ یا ”سرپنچ“ کہلاتا ہے۔ میں پنچایت کو خوش رکھتا تھا۔ خاص طور پر اس لئے کہ میں اکیلا آدمی تھا۔ پنچایت آڑے وقت میں میرے کام آتی تھی اور میری جو بھی مدد کر سکتی تھی‘ وہ کرتی تھی۔ ویسے تو مجھے پنچایت کی کوئی خاص پروا نہیں تھی۔ پھر بھی میں اس کا کچھ نہ کچھ خیال رکھتا تھا۔ ہم جیسے لوگوں کی شادی بیاہ‘ پنچایت ہی کراتی تھی اور وہی ہمارے جھگڑے طے کراتی تھی۔ اگر ہم جیسا کوئی آدمی قدرتی موت مر جاتا تھا یا پولیس کے ہاتھوں مارا جاتا تھا تو پنچایت ہی اس کے اتم سنسکار کا بندوبست کرتی تھی اور اس کی راکھ گنگا میں بہانے کے لئے بھیجتی تھی۔“

”دادا...... آپ یہاں کیسے پہنچ گئے؟“ سلطانہ نے ایک اور اہم سوال کیا۔ یہ سوال وہ کئی دن سے پوچھنا چاہ رہا تھا‘ لیکن ہر بار دوسری باتوں میں الجھ کر یہ بات رہ جاتی تھی۔

”یہ بھی ایک عجیب ہی کہانی ہے بیٹا۔“ گلفی نے ایک بار پھر ٹھنڈی سانس لی۔ ”بات دراصل یہ ہے کہ تیرا باپ میرے گھر میں‘ میری شادی کے بہت سالوں بعد پیدا ہوا تھا۔ چنانچہ جب تک وہ کچھ بڑا ہوا‘ اس وقت تک میں اچھا خاصا بوڑھا ہو چکا تھا۔ ایک صدمے کی بات یہ بھی تھی کہ تیرا باپ کبھی ایک اچھا ڈاکو نہیں بن سکا۔ وہ بالکل ہی نالائق تھا۔ یوں سمجھو اس نے تو بھنتوؤں کا نام ہی ڈبو دیا تھا۔ وہ بس معمولی درجے کا چور اچکا تھا۔ ڈاکو بننے کے اس میں گن بھی نہیں تھے اور اس نے کوشش بھی نہیں کی۔ بڑا ہی ڈھیلا آدمی تھا۔ مجھ پر تو بالکل نہیں گیا تھا۔ یوں

سمجھو اس کے حصے کا کام بھی مجھے کرنا پڑتا تھا۔“

ایک لمحے کے لئے خاموش ہونے کے بعد گلفی نے سلسلۂ کلام جوڑا۔ ”ظاہر ہے اب میں کچھ اور بوڑھا ہو گیا تو میرے لئے ڈاکے ڈالنا اور مشکل ہو گیا‘ لیکن میں کسی نہ کسی طرح اپنا یہ خاندانی کام جاری رکھے ہوئے تھا۔ دھیرے دھیرے میرا دارومدار چوری چکاری پر ہی رہ گیا۔ ایک رات میں ایک ٹھاکر کے گھر میں گھسا۔ میرا ابھی اپنے پیشے سے اس حد تک دل اچاٹ ہو چکا تھا کہ اس رات میں اپنے ساتھ کوئی ہتھیار بھی لے کر نہیں گیا تھا۔ میں نے اپنے اندازے سے وہ جگہ ڈھونڈ لی جہاں ٹھاکر نے اپنے زیورات کی تھیلی چھپائی ہوئی تھی‘ لیکن ابھی میں نے تھیلی کو کھول کر دیکھا ہی تھا کہ قریب ہی کہیں سے ایک فائر کی آواز سنائی دی۔ میں کمرے سے نکل بھاگا اور صحن کی دیوار پر چڑھ کر باہر کود گیا...... لیکن کچھ عمر کا تقاضا تھا اور کچھ گھبراہٹ تھی‘ جس کی وجہ سے میں صحیح طرح چھلانگ نہیں لگا سکا۔ میرے پاؤں میں بری طرح موچ آ گئی۔ زیورات کی تھیلی میرے ہاتھ سے گر گئی۔ بڑی مشکل سے اٹھ کر میں لنگڑاتا ہوا دوڑنے ہی لگا تھا کہ کسی نے میرا راستہ روک لیا۔ اس کے ہاتھوں میں بندوق تھی‘ پھر چاندنی میں میں نے دیکھا‘ وہ خود ٹھاکر ہی تھا۔ اس نے بندوق میرے نرخرے پر رکھ دی اور مجھے دیوار سے لگا دیا۔ وہ بہت غصے میں دکھائی دے رہا تھا۔“

اس مرحلے پر گلفی بیڑی نکال کر سلگانے کے لئے خاموش ہو گیا۔ سلطانہ کا اشتیاق قابل دید تھا۔ وہ دادا کی داستان سننے کے لئے بے چین معلوم ہوتا تھا‘ شاید اسے یوں لگ رہا تھا کہ دادا نے بیڑی سلگانے میں زیادہ دیر لگا دی تھی۔ وہ بول اٹھا۔ ”پھر کیا ہوا دادا......؟“

گلفی بیڑی کا طویل کش لے کر دھوئیں کا مرغولا ہوا میں چھوڑنے کے بعد بولا۔ ”مجھے یقین ہو گیا تھا کہ زندگی کی آخری رات آن پہنچی ہے۔ میں نے تو دل میں آخری اشلوک بھی پڑھ لئے تھے۔ پھر میں نے سوچا‘ چلو گلفی میاں...... ایک بار منت خوشامد کا حربہ بھی آزما کر دیکھ لو۔ میں نے ٹھاکر کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے اور پھر اپنی آنکھوں میں آنسو بھر لانا بھی میرے لئے کچھ زیادہ مشکل کام ثابت نہیں ہوا۔ میں نے روتے روتے اس کے پیروں کو ہاتھ لگا کر کہا۔ ”ٹھاکر...... تم ایک امیر کبیر آدمی ہو‘ تمہارے پاس پتا نہیں کتنے بیگھے زمین ہے‘ میں ایک غریب بھنتو ہوں‘ بھوک سے مجبور ہو کر چوری کرنے نکلا تھا‘ لیکن اس میں بھی کامیاب نہیں ہو سکا۔ اگر تم مجھے معاف کر دو تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ کبھی چوری نہیں کروں گا‘ کسی کے گھر میں نہیں

گھروں گا۔ مجھے ٹھاکر کی آنکھوں میں کچھ نرمی نظر آنے لگی۔"

گلفی نے ایک لمحے کے لئے خاموش ہو کر بیڑی کا ایک اور کش لیا' پھر سلسلۂ کلام جوڑا۔

"مجھے تھوڑی دیر اور اس کی منت خوشامد کرنی پڑی۔ آخر وہ بولا۔ "تم واقعی ایک غریب آدمی ہو۔ میرا دل نہیں چاہتا کہ تمہیں گولی ماروں یا پولیس کے حوالے کروں۔ اس سے اچھا ہے کہ میں تمہیں سدھرنے کا موقع دوں' تم ایسا کرو کل دن چڑھے میرے پاس آنا' اپنی پتنی کو بھی ساتھ لانا' میں تم دونوں کو دو دو روپے دوں گا۔ میں نے اس کی بات سن کر سکون کی سانس لی۔ رام جی نے اس کے دل میں میرے لئے رحم ڈال دیا تھا۔"

وہ خاموش ہوا تو سلطانہ نے تجسس سے پوچھا۔ "تو پھر دوسرے دن آپ اور دادی اس کے پاس گئے؟"

"ہاں بھئی...... کیوں نہ جاتے...... وعدہ تو وعدہ ہوتا ہے۔ ایک بھتو چاہے چور ہو یا ڈاکو' وہ اپنی زبان سے نہیں پھرتا۔ میں دوسرے روز تمہاری دادی کو ساتھ لے کر ٹھاکر کے گھر پہنچ گیا۔ وہاں ایک بیل گاڑی تیار کھڑی تھی۔ بیل گاڑی والے کے پاس بھی بندوق تھی اور ایک دوسرا آدمی اس کے ساتھ تھا۔ اس کے پاس بھی بندوق تھی۔ ٹھاکر نے تمہارے دادا اور دادی' دونوں کو دو دو روپے دیئے اور کہا۔ "میرے یہ آدمی تمہیں میرے کھیتوں میں لے جائیں گے' وہاں ان دنوں سرسوں کی فصل تیار ہو رہی ہے۔ تم دونوں میاں بیوی روزانہ میرے کھیتوں میں کام کیا کرنا۔ میں تمہیں روزانہ دو دو روپے دیا کروں گا۔ آئندہ تم محنت کی کمائی کھانا' چوری چکاری نہ کرنا۔ ہم بہت خوش ہوئے۔ سودا برا نہیں تھا۔ ان دنوں پورا مہینہ کھیتوں میں کام کرنے والے مزدوروں اور مزارعوں کو بھی دو روپے نہیں ملتے تھے۔ ٹھاکر ہمیں ایک دن کی مزدوری دو روپے دے رہا تھا۔ میں تو سچے دل سے توبہ کر کے' چوری چکاری کی زندگی چھوڑ کر شرافت کی زندگی گزارنے کے بارے میں سوچنے لگا۔ ویسے بھی یہ کام میرے لئے زیادہ سے زیادہ مشکل ہوتا جا رہا تھا۔"

"ٹھاکر نے آپ کو صرف دو چار دن اپنے کھیتوں پر کام کرنے دیا ہوگا' پھر بھگا دیا ہوگا؟" کمسن سلطانہ نے خیال ظاہر کیا۔ وہ بھی اپنی بساط کے مطابق یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتا تھا کہ دنیا کے معاملات کی اسے بھی کچھ سمجھ ہے۔

"نہیں...... اس نے ہمیں نہیں بھگایا۔" گلفی نے آہ بھر کر کہا۔ "ہمارے ساتھ تو اس سے

زیادہ بری ہوئی۔ بیل گاڑی میں سوار دونوں بندوقوں والے آدمی ہمیں سیدھے یہاں نجیب آباد کے قلعے میں لے آئے جہاں ہمیں کئی اور بندوق والوں نے گھیر لیا۔ اس وقت تک ہمیں نہیں معلوم تھا کہ یہ قلعہ ایک طرح کی جیل بن چکا ہے' خاص طور پر بھتوؤں کے لئے...... ہمیں ایک کمرے میں لے جایا گیا جہاں ایک بابو نے ہمارے بارے میں ہر بات ایک رجسٹر میں لکھی اور کاغذوں پر ہمارے ہاتھوں کے نشان بھی لے کر محفوظ کر لئے گئے۔ وہاں ایک انگریز بابو بھی موجود تھا۔ کافی دیر میں جا کر ہمیں پتا چلا کہ بیل گاڑی میں ہمارے ساتھ جو دوسرا بندوق والا آیا تھا۔ وہ سرکار کا آدمی تھا۔ چکر اصل میں یہ تھا کہ کسی بھی بھتو اور خاص طور پر کسی چور' اچکے یا ڈکیت بھتو کو پکڑ کر اس قلعے میں لانے کے بدلے انگریز سرکار کی طرف سے دس روپے ملتے تھے۔ ٹھاکر نے ہم دونوں میاں بیوی کو پکڑوا کر بیس روپے کھرے کر لئے تھے۔ ان میں سے دو دو روپے اس نے ہمیں پکڑا دیئے تھے۔ اس دن ہمیں تجربہ ہوا کہ کسی ٹھاکر پر کبھی بھروسا نہیں کرنا چاہئے۔ بس...... اس دن سے ہم یہاں قید ہیں۔ بعد میں تیرے ماں باپ کو بھی انگریز سرکار کے آدمی پکڑ کر یہیں لے آئے تھے۔ پھر کچھ سالوں میں تیرا باپ غائب ہو گیا' ماں تجھے جنم دیتے ہوئے مر گئی۔ دادی کو بھابڑ کا بخار کھا گیا۔ اب بس ہم دونوں یہاں ہیں اور نہ جانے کب تک یہاں رہیں گے۔"

گلفی نے افسردہ سے انداز میں خاموش ہو کر بیڑی کا آخری کش لیا۔ سلطانہ بغور اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد گلفی بولا۔ "یہ جگہ اصل جیل سے بھی' ایک لحاظ سے زیادہ بری ہے۔ اصل جیل میں آدمی سال' دو سال' چار سال سزا کاٹ کر آخر کار باہر آ جاتا ہے۔ یہاں سے تو زیادہ تر لوگوں کی ارتھی ہی باہر جاتی ہے۔ بہت کم لوگوں کو اچھے چال چلن کا سرٹیفکیٹ ملتا ہے اور وہ انگریز سرکار کی نظر میں "نیک معاش" بنتے ہیں' صرف انہیں یہاں سے آزادی نصیب ہوتی ہے۔ ان میں سے بھی بعض کو کسی غلطی کی وجہ سے دوبارہ یہاں آنا پڑ جاتا ہے۔ لگتا ہے ہم دادا پوتے کو تو زندگی بھر یہاں سے "نیک معاش" کا سرٹیفکیٹ نہیں ملے گا۔ ایک آدمی کے بارے میں جب ساری معلومات انگریز سرکار کے پاس درج ہو جاتی ہے تو پھر وہ یہاں سے بھاگ کر بھی زیادہ دن آزاد نہیں رہ سکتا۔ انگریز سرکار نے پولیس' جاسوسوں اور مخبروں کا ایسا جال پھیلایا ہوا ہے کہ بھاگا ہوا آدمی جلد ہی پکڑا جاتا ہے۔"

چند لمحے وہ دونوں ہی خاموش رہے' پھر سلطانہ ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔ "دادا......

یہاں کی سب سے بری بات مجھے یہ لگتی ہے کہ کوئی بھنتو قلعے کے اندر یا باہر کوئی غلط کام کرتا ہے تو اسے میدان میں سب کے سامنے الٹا لٹا کر اس کی دھوتی اوپر کر کے اس کے کولہوں پر بید مارے جاتے ہیں اور ایڈ جوٹنٹ آنند کے آدمی اسے گندی گندی گالیاں دیتے ہیں۔ اس وقت مجھے بہت غصہ آتا ہے۔ میرا دل چاہتا ہے' چاقو سے کسی کا پیٹ پھاڑ دوں۔''

''تجھے غصہ آتا ہے......؟'' گلفی نہ جانے کیوں یہ سن کر بہت خوش ہوتے ہوئے بولا۔ ''یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ اس کا مطلب ہے تو جوان ہو رہا ہے اور شیر دل بھی ہے۔ تیرا باپ تو شیر دل نہیں تھا' لیکن تو شاید شیر دل نکلے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ ایک دن تو اس قلعے کی یہ موٹی موٹی اور اونچی دیواریں توڑ دے اور سارے بھنتو یہاں سے نکل کر بھاگ جائیں۔ میں چاہے اس وقت اس دنیا میں ہوں یا نہ ہوں' لیکن ان بھنتوؤں کی زندگی میں ایک ایسا دن ضرور آئے گا جب یہ اپنے آپ کو بالکل آزاد محسوس کریں۔''

سلطانہ نے پرُخیال انداز میں قلعے کی دیواروں کی طرف دیکھا' جو وہاں سے بہت دور تھیں۔ وہ کچھ بولا نہیں' لیکن اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ بہت کچھ سوچ رہا ہے۔ وہ ابھی محض آٹھ نو سال کا تھا' لیکن دیکھنے میں اپنی عمر سے بڑا لگتا تھا اور باتیں بھی اپنی عمر سے بڑی کرتا تھا۔ اس کی اٹھان اچھی تھی' وہ تیرہ چودہ سال کا لگتا تھا' لیکن تھا بانس کی طرح پتلا اور لمبا...... اس کے چہرے پر سب سے خاص چیز اس کی آنکھیں معلوم ہوتی تھیں۔ پراسرار سی وہ موٹی موٹی آنکھیں کچھ کہتی محسوس ہوتی تھیں' پھر بھی سلطانہ کے دل کا حال کوئی نہیں جان سکتا تھا کہ وہ اس وقت کیا سوچ رہا ہے۔ جب تک وہ اپنی زبان سے کچھ نہ کہتا' اس کے دل کا بھید جاننا مشکل ہوتا تھا۔

وہ قلعے میں پرورش پاتے ہوئے طرح طرح کے واقعات اپنی آنکھوں سے دیکھتا تھا' بہت سی باتیں سنتا تھا اور بہت کچھ اپنے ذہن میں جذب کرتا رہتا تھا۔ انہی دنوں ایک روز اس

پادری نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں مختصری تقریر کی' پھر غمزدہ سے لہجے میں انگریزی میں کافی دیر تک کچھ بولتا رہا۔ باقی سب لوگ ہاتھ باندھے سر جھکائے کھڑے رہے۔ سلطانہ کی سمجھ میں یہ تو آ گیا کہ کوئی عورت مر گئی تھی' لیکن کیا صرف اس وجہ سے اتنے لوگ جمع تھے اور کئی انگریز بھی آئے ہوئے تھے؟ وہاں تو آئے دن کسی نہ کسی کے مرنے کی خبر آتی رہتی تھی' لیکن کوئی توجہ سے سنتا بھی نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد انگریز پادری نے ایک موٹی سی کتاب کھول کر کچھ پڑھنا شروع کر دیا۔

''دادا...... یہ کیا ہو رہا ہے؟'' اس نے موقع مناسب دیکھ کر سرگوشی میں پوچھا۔

''بیٹا ملکہ وکٹوریہ کا انتقال ہو گیا ہے' اس کا سوگ منایا جا رہا ہے۔'' گلفی نے بھی سرگوشی میں جواب دیا۔

''کیا ملکہ وکٹوریہ مراد آباد میں رہتی تھی؟'' سلطانہ نے پوچھا۔ اس کے خیال میں زیادہ تر بڑے لوگ مراد آباد میں رہتے تھے۔ وہ اب تک جن شہروں کی جھلک دیکھ پایا تھا' اس کے خیال میں ان میں سب سے بڑا مراد آباد تھا۔

''ارے نہیں بیٹا...... ملکہ وکٹوریہ تو ولایت میں رہتی تھی۔ اس کے سامنے تو ہمارے آئی جی' ڈی آئی جی بھی تھر تھر کانپتے تھے۔ لاٹ صاحب بھی اس کے سامنے ہاتھ باندھ کر بات کرتے تھے۔'' گلفی نے پوتے کی معلومات میں اضافہ کیا۔ ہندوستان میں متعین انگریز وائسرائے کو وہاں کے زیادہ تر لوگ ''لاٹ صاحب'' کہا کرتے تھے۔

آخر کار وہ تعزیتی جلسہ ختم ہوا اور سب لوگ اپنے اپنے ٹھکانے پر واپس آ گئے۔ کچھ دنوں بعد پتا چلا کہ ملکہ کا تاج اس کے بیٹے کے سر پر رکھ دیا گیا تھا اور وہ ولایت ہندوستان کا بادشاہ بن گیا تھا۔ قلعے میں اپنے ہم عمر لڑکوں میں سلطانہ کی سب سے زیادہ دوستی بھورے سے تھی۔ تین دن پہلے ایک واقعے کی وجہ سے وہ اس سے اور بھی زیادہ متاثر ہو گیا تھا۔ اس وقت بہت سے لوگ پوجا پاٹ کے لئے قلعے کے مندر میں جمع تھے۔ سلطانہ اور بھورے بھی ایک طرف کھڑے تھے۔ ... لیکن ایک عورت کا بچہ مسلسل

طریقے سے بھورے کو سکھائے جا رہا تھا۔ نہ جانے کیوں وہ محسوس کرتا تھا' جیسے بھورے کے ساتھ اس کی دوستی زندگی بھر کے لئے ہے اور وہ ہمیشہ اس کے ساتھ ہی رہے گا۔ ان کے ہم عمر دو تین دوسرے لڑکے بھی اکثر ان کے ساتھ ہی رہنے لگے تھے اور ان کا گویا ایک چھوٹا سا گروہ بن گیا تھا' لیکن سلطانہ کی سب سے زیادہ قربت بھورے کے ساتھ تھی۔ اپنے دادا سے ملی ہوئی تربیت سلطانہ نے کسی اور لڑکے کو منتقل کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ البتہ کچھ چھوٹے موٹے کام انہیں بھی سکھا دیتا تھا۔

سلطانہ نے اپنے ہی ہم عمر ایک اور لڑکے کو بھی اپنے گروہ میں شامل کرنے کی کوشش کی' لیکن وہ ان سب سے بہت مختلف تھا۔ وہ بہت سنجیدہ اور پڑھا کو قسم کا لڑکا تھا۔ اس کا نام نبوا تھا۔ وہ یسوع مسیح کی تعلیمات پر مبنی ان کتابوں سے بہت متاثر ہو چکا تھا جو قلعے میں چپکے چپکے انگریزوں کی طرف سے بانٹی جاتی تھیں۔ وہ اچھا خاصا لکھنا پڑھنا بھی سیکھ چکا تھا۔ وہ اکثر بیٹھا وہی کتابیں پڑھتا رہتا۔

''تم ہمارے ساتھ کھیل کود اور دوسرے کاموں میں حصہ کیوں نہیں لیتے؟'' ایک بار سلطانہ نے سنجیدگی سے اس سے پوچھا۔

''تم لوگ بدمعاش ہو۔'' نبوا نے صاف گوئی سے کہا۔ ''ایک نہ ایک روز ضرور کسی مصیبت میں پھنسو گے۔ میں نہیں چاہتا کہ تم لوگوں کے ساتھ رہ کر میں بھی کسی مصیبت میں پھنسوں۔''

سلطانہ اس کی صاف گوئی پر برا ماننے کے بجائے ہنس دیا۔ وہ اس کے بات کرنے کے انداز سے واقعی محظوظ ہوا تھا۔ وہ اس وقت بھی ایک کتاب ہاتھ میں پکڑے ہوئے تھا۔ سلطانہ نے اس کتاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''تم ہر وقت یہ کتابیں کیوں پڑھتے رہتے ہو؟''

''مجھے پتا چلا ہے کہ جو انگریزوں کے دھرم پر چلنے کی کوشش کرتا ہے انگریز اس سے بڑے خوش ہوتے ہیں' اس لئے میں ان کے دھرم کی سب باتیں سیکھنے کی کوشش کر رہا ہوں' شاید آگے چل کر میں انہی کا دھرم اپنا لوں۔ اس سے مجھے بہت فائدہ ہوگا۔ ہو سکتا ہے وہ مجھے پادری بنا دیں' کوئی اچھی سی نوکری دلا دیں یا پھر ولایت ہی بھیج دیں۔ تمہیں پتا ہے فقیر سنگھ جی بھی کبھی سکھ تھا' لیکن نوجوانی میں وہ عیسائی ہو گیا تھا۔ آج وہ کتنا بڑا آدمی ہے' خود انگریز بھی اسے جھک کر سلام کرتے ہیں۔ نام اس کا اب بھی سکھوں والا ہے' مگر اصل میں وہ عیسائی ہے۔'' نبوا نے خاصے جوش و خروش سے یہ سب کچھ کہا۔

نجیب آباد کے قلعے میں رہنے والوں کیلئے فقیر سنگھ جی بہت بڑا نام تھا۔ وہ ولایت میں رہتا تھا اور سال میں ایک بار قلعے کا دورہ کرنے آتا تھا۔ اس کی آمد سے کئی دن پہلے اس کے استقبال کی تیاریاں شروع ہو جاتی تھیں۔ قلعے کے در و دیوار کو سجایا جاتا تھا۔ جھنڈیاں لگائی جاتی تھیں۔ زمین پر چھڑکاؤ کیا جاتا تھا اور راستوں کے دونوں طرف چونا گرایا جاتا تھا۔ سٹیج تیار کیا جاتا تھا اور میدان کے کچھ حصے میں قالین ڈالے جاتے تھے۔ قلعے میں اعلان ہوتا تھا کہ اس کی آمد کے دن ہر قیدی نہا دھو کر صاف ستھرے کپڑے پہن کر میدان میں پہنچے۔

نجیب آباد کا قلعہ' اس قسم کے دوسرے کئی قلعے اور علاقے انگریز فوج کے جس حصے کے زیر انتظام تھے وہ ''امن فوج'' کہلاتی تھی۔ قلعے میں رہنے والے اسے ''مکتی فوج'' کہتے تھے۔ یہ لوگ وردی بہت کم پہنتے تھے۔ زیادہ تر بنیوں' برہمنوں اور دوسرے ہندوستانیوں جیسے لباس میں ہی رہتے تھے۔ ان میں انگریز بھی شامل تھے اور ہندوستانی بھی...... یہ لوگ صرف پرامن مقاصد کے لئے کام کرتے تھے۔ انہیں کہیں جنگ لڑنے نہیں بھیجا جاتا تھا۔

فقیر سنگھ جی' جس کا ذکر نبوا کر رہا تھا' اسی مکتی فوج کا ایک اعلیٰ عہدے دار تھا۔ اس کی وضع قطع اب بھی سکھوں والی تھی' لیکن وہ عیسائی ہو چکا تھا۔ کسی اجتماع میں تو وہ باقاعدہ پادری کے فرائض بھی انجام دیتا تھا۔ رنگ روپ کے اعتبار سے وہ انگریز ہی لگتا تھا۔ اس کی رنگت سرخ و سپید' بال بھورے اور آنکھیں نیلی تھیں۔ اس کے گلے میں ہر وقت صلیب کی ساخت کا' سونے کا ایک لاکٹ نظر آتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نبوا نے فقیر سنگھ جی کو اپنا آئیڈیل بنا لیا تھا۔ نبوا بھی بغیر باپ کا بچہ تھا۔ اس کا باپ پولیس کے ہاتھوں مارا جا چکا تھا۔ وہ قلعے میں اپنی ماں اور چھوٹی بہن کے ساتھ رہتا تھا۔

''ابے تو فقیر ضرور بن جائے گا' لیکن فقیر سنگھ جی کبھی نہیں بن سکتا۔'' سلطانہ نے اس کی کمر پر ایک دھپ رسید کر کے کہا اور اسے اس کے حال پر چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔

ان لڑکوں کو اب باہر جانے کے لئے پاس بھی ملنے لگے تھے۔ ان کی کم عمری کی وجہ سے آمد و رفت کے سلسلے میں ان پر کچھ زیادہ سختی بھی نہیں تھی اور نہ ہی زیادہ پوچھ گچھ ہوتی تھی۔ گیٹ پر سلطانہ کے دادا گلفی کی ڈیوٹی ہونے کی وجہ سے انہیں اور بھی آسانی رہتی تھی' تاہم انہیں قلعے میں واپس لانا ان کے بڑوں کی ذمے داری تھی۔ قلعے سے باہر بھی سلطانہ کی دوستی بعض لڑکوں سے استوار ہونے لگی تھی۔ ان میں ایک لڑکا گجندر سنگھ بھی تھا' اس کا باپ ایک ''نیک معاش'' تھا۔

قلعے میں سات آٹھ سال اچھے چال چلن کے ساتھ گزارنے کے بعد رہائی پانے والے بعض لوگوں نے آس پاس کے علاقوں میں ہی کہیں اپنی جمع پونجی سے تھوڑی بہت زمین خرید کر اس پر کھیتی باڑی شروع کر دی تھی یا کسی بستی میں کوئی کام کرنے لگے تھے۔ گجندر کے باپ کے پاس دو بیگھہ زمین تھی۔ گجندر' سلطانہ ہی کا ہم عمر تھا۔ اس کے باپ نے اپنی فصل کی نگرانی کے لئے کھیت کے قریب ہی ایک درخت پر مچان لگا رکھی تھی۔ وہ زیادہ تر بندوق لئے اسی مچان پر پایا جاتا تھا۔ گجندر سے ملنے کے لئے سلطانہ کو پہلے دیکھنا پڑتا تھا کہ اس کا باپ مچان پر یا کہیں اور آس پاس موجود تو نہیں' کیونکہ وہ قلعے سے آنے والے لڑکوں کے ساتھ اپنے بیٹے کا ملنا جلنا پسند نہیں کرتا تھا۔

اسے اندیشہ تھا کہ وہ اس کے بیٹے کو بگاڑ نہ دیں اور ان کی کسی حرکت کی وجہ سے اس کا ''نیک معاش'' والا سرٹیفکیٹ منسوخ نہ ہو جائے۔ اس صورت میں اسے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر دوبارہ قلعے میں جانا پڑتا' جس کا تصور بھی اس کیلئے محال تھا۔ اس بے چارے کو معلوم ہی نہیں تھا کہ اس کا بیٹا ان لڑکوں کے ساتھ کئی چھوٹی موٹی وارداتوں میں شریک ہو چکا تھا اور چوری کی کئی چیزیں انہوں نے لا کر اسی کی زمین پر غلے کے کمرے میں زمین کھود کر دبائی تھیں۔ گجندر بھی بہرحال سلطانہ کا اچھا دوست بن چکا تھا اور دوستی میں وہ ہر معاملے میں پوری طرح اس کا ساتھ دینے کے لئے تیار رہتا تھا۔ گجندر کو بھی کئی جانوروں اور پرندوں کی آوازیں نکالنی آتی تھیں۔

سلطانہ کی عمر کا تیرہواں سال شروع ہوئے چھ مہینے بیت گئے تو ایک روز اس کے دادا نے کہا۔ ''بیٹا اب تو بڑا ہو گیا ہے' اب تجھے اپنی زندگی کی پہلی باقاعدہ اور کوئی ڈھنگ کی واردات کرنی چاہئے۔ چھوٹی موٹی چوریاں اور راستے میں لوگوں کو لوٹنا تو صرف ہاتھ صاف کرنے کے لئے ہوتا ہے' تو گلفی کا پوتا ہے' تجھے کوئی ایسی واردات کرنی ہو گی جس سے میرے خاندان کا نام اونچا ہو۔''

''دادا! آپ حکم کریں...... کسی ٹھاکر' برہمن یا بنئے کا گھر لوٹ لوں؟'' سلطانہ نے بے خوفی سے پوچھا۔ اس کم عمری میں ہی اس میں اتنا حوصلہ آ چکا تھا کہ وہ کسی بھی ساہوکار کے گھر میں ڈاکہ ڈال سکتا تھا اور مزاحمت کرنے والے کسی شخص کو ذبح بھی کر سکتا تھا۔

''نا بیٹا...... نا......'' گلفی نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ٹھاکر' برہمن یا بنئے کا گھر لوٹنا تو کوئی بڑی واردات نہیں' یہ کام تو تیری عمر میں' میں نے بھی کر لیا تھا' تجھے تو اس سے آگے بڑھ کر کوئی کام دکھانا ہو گا' آخر تو مجھ سے آگے کی نسل ہے۔''

سلطانہ ایک لمحے کے لئے سوچ میں پڑ گیا' پھر سر کھجاتے ہوئے بولا۔ ''دادا...... اجازت دو تو کسی کانسٹیبل' سب انسپکٹر یا انسپکٹر کو لوٹ لوں اور کہو تو اس کا گلا بھی کاٹ دوں؟''

دادا نے ایک بار پھر نفی میں سر ہلایا۔ اس کی آنکھیں ہوا میں بہت دور جیسے کہیں کچھ دیکھ رہی تھیں۔ وہ خوابناک سے لہجے میں بولا۔ ''نہیں بیٹا...... پہلی اور باقاعدہ واردات تو تجھے اس سے بڑی کرنی ہو گی' تو صرف گلفی کا پوتا ہی نہیں تیرا جنم بھی ایک بہت بڑی میم صاحب کے ہاتھوں میں ہوا ہے' تو کوئی معمولی آدمی نہیں ہے' تو کسی لاٹ صاحب سے کم نہیں......''

''تو پھر مجھے کس کو لوٹنا چاہئے؟'' سلطانہ ذرا پریشان ہو کر بولا۔

گلفی کی پیشانی پر سوچ کی لکیریں ابھر آئیں۔ ایک لمحے خاموش رہنے کے بعد وہ گویا فیصلے پر پہنچتے ہوئے بولا۔ ''تجھے کسی گورے صاحب کو لوٹنا چاہئے۔''

''گورے صاحب کو......؟'' سلطانہ کی آنکھیں پھیل گئیں۔ کسی گورے صاحب کو لوٹنے کا خیال تو اس کے ذہن میں کبھی آیا ہی نہیں تھا۔ گورے تو چھوٹے بڑے تمام ہندوستانیوں کے آقا تھے۔ سلطانہ کے خیال میں کسی گورے کو تو کوئی لوٹ ہی نہیں سکتا تھا۔ اسے یہ خیال بھی آیا کہ لوٹ مار کے دوران کسی کو قتل کرنے کی ضرورت بھی پیش آ جاتی تھی۔ اگر گورے صاحب کو قتل کرنا ضروری ہو گیا تو پھر کیا ہو گا؟ کیا گورے صاحب کو قتل کیا جا سکتا تھا؟ سلطانہ محسوس کر رہا تھا کہ یہ تو ایک ناممکن سا کام تھا۔ دوسری طرف مسئلہ یہ تھا کہ وہ دادا کے سامنے اپنے آپ کو کمزور یا خوفزدہ بھی ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا۔ چنانچہ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد اس نے اپنے لہجے سے بے پروائی کا اظہار کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے...... یہ کون سا مشکل کام ہے۔ گورے صاحب میں اور دوسروں میں خاص فرق تو نہیں...... بس...... گورے صاحب کی چمڑی سفید ہوتی ہے۔''

سلطانہ کو ایک خیال یہ بھی آیا کہ اس کے دادا کی امیدیں چونکہ بیٹے سے پوری نہیں ہو سکی تھیں' اس لئے انہوں نے ساری امیدیں اب پوتے سے ہی وابستہ کر لی تھیں۔ وہ اپنے انہونے خواب بھی اب اسی کے ذریعے پورے ہوتے دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ دادا کی فرمائش پوری کرنے کی ہامی بھر چکا تھا۔ اب اسے یہ کام کرنا ہی تھا۔

چنانچہ اس نے خوف اور اندیشوں کو ذہن سے جھٹکتے ہوئے کہا۔ ''دادا...... آپ مجھے اس گورے صاحب کا نام اور اس کے گھر کا رستہ بتا دیں۔ آپ کا پوتا اسے بتا دے گا کہ ایک بھگوکیا

کچھ کر سکتا ہے۔"

"میں کسی عام گورے صاحب کی بات نہیں کر رہا۔" سلطانہ کے دادا نے گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"تو پھر آپ کسی گورے اے ایس پی کی بات کر رہے ہیں؟" سلطانہ نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

دادا کا سر ایک بار پھر نفی میں ہل گیا تو سلطانہ بولا۔ "آپ کا مطلب ہے ایس پی......؟"

جب اس نے دادا کا سر بدستور نفی میں ہلتے دیکھا تو وہ وقفے وقفے سے بولتا چلا گیا۔ "آپ کیا چاہتے ہیں...... میں ڈی آئی جی کو لوٹ لوں؟ آئی جی کو......؟ کمشنر کو......؟"

دادا کا سر اب بھی نفی میں ہل رہا تھا۔ سلطانہ کے دل کی دھڑکنیں بہت تیز ہو چکی تھیں۔ اس نے ہمت کر کے پوچھا۔ "دادا...... آخر آپ کیا چاہتے ہیں؟ آپ کا مطلب ہے' میں لاٹ صاحب کو لوٹ لوں......؟"

"نہیں بیٹا......" دادا کے لہجے میں معمول سے زیادہ شفقت سمٹ آئی۔ "میں چاہتا ہوں تم اسے لوٹو جو لاٹ صاحب کا بھی لاٹ صاحب ہو۔"

"کیا کوئی لاٹ صاحب سے بھی بڑا ہے؟ کیا واقعی لاٹ صاحب کا بھی کوئی صاحب ہے؟ کون ہے وہ......؟" سلطانہ نے بے تابی سے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر دیئے۔

"اس کا بادشاہ......" دادا نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔" سلطانہ کی آواز میں ہلکی سی لرزش تھی' لیکن وہ بدستور دادا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ رہا تھا۔ "آپ مجھے اس کا نام بتائیں' اس کے گھر کا رستہ بتائیں' پھر میں جا کر اسے بتاؤں گا کہ ایک بھنتو کا بچہ کیا کچھ کر سکتا ہے۔"

"اس کا نام جارج پنجم ہے۔ وہ ولایت' ہندوستان اور نہ جانے کہاں کہاں کا بادشاہ ہے۔ ولایت میں رہتا ہے...... لیکن دو ہفتے بعد دلی آ رہا ہے' شاید وہ ایک بھنتو کے ہاتھوں لٹنے کے لئے ہی آ رہا ہے۔" دادا نے ایک پراسرار سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

سلطانہ کا دل ایک لمحے کے لئے تو جیسے دھڑکنا ہی بھول گیا۔ اس نے تو کبھی کسی عام انگریز کو بھی لوٹنے کے بارے میں نہیں سوچا تھا اور دادا ایک دم ہی ولایت اور ہندوستان کے بادشاہ تک پہنچے تھے۔ سلطانہ کو احساس ہوا کہ دادا نے ابھی سے مراد آباد میں پنچایت سے اس کی

شادی بیاہ کے بارے میں بات کرنا شروع کر دی تھی اور پنچایت والے ایسے کسی لڑکے کے رشتے کی بات آگے بڑھانے سے انکار کر دیتے تھے جس نے باپ یا دادا کی طرف سے کسی واردات کا حکم ملنے پر اس کی تعمیل سے انکار کر دیا ہو۔

چنانچہ سلطانہ نے پوری کوشش کی کہ اس کے چہرے سے حیرت یا خوف کا اظہار نہ ہو۔ وہ اپنا لہجہ بھی ہموار رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ "مجھے یہ بتا دیں' دلی جانے کا طریقہ کیا ہے؟"

"بجنور سے میل ٹرین دلی جاتی ہے' تین گھنٹے کا سفر ہے۔" دادا نے جواب دیا۔

"یہ بہت بڑا کام ہے۔ اس کے لئے مجھے بھورے اور پریتم کو بھی ساتھ لے جانا پڑے گا۔" سلطانہ نے کہا۔

"ٹھیک ہے...... جسے چاہو' ساتھ لے جاؤ' مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" دادا نے کہا اور اٹھ کر بے پروائی سے ایک طرف چل دیئے۔ ان کا انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے انہوں نے سلطانہ کو قلعے کے بازار سے پیسے دو پیسے کا سودا سلف لانے کے لئے کہا ہو۔

سلطانہ نے ان کی اجازت پا کر صرف بھورے اور پریتم کو ہی نہیں بلکہ گجندر سنگھ' نگیشر' سرجو اور صادق کو بھی ساتھ چلنے پر آمادہ کر لیا۔ یہ سب اس کے گہرے دوست تھے اور ایک طرح سے اس کا گروہ انہی پر مشتمل تھا۔ گجندرا اپنے باپ کے ساتھ دو چار بار دلی جا بھی چکا تھا۔ اس لئے کچھ امید رکھی جا سکتی تھی کہ وہ گائیڈ کے فرائض انجام دے سکتا تھا۔

انہوں نے یہ کہہ کر چند دن کے لئے پاس حاصل کر لیا کہ وہ میلہ اور سوانگ دیکھنے بجنور جا رہے تھے۔ سوانگ ایک طرح سے سٹیج ڈرامے یا تھیٹر کی ابتدائی شکل تھی۔ اس میں لوگ مختلف بہروپ دھار کر' ایک سٹیج نما چبوترے پر آ کر اپنے بہروپ کی مناسبت سے کچھ حرکتیں کرتے تھے اور چبوترے کے چاروں طرف بیٹھے ہوئے تماشائی انہیں داد دیتے تھے۔ یہ گویا چھوٹے چھوٹے ڈرامے اور خاکے ہوتے تھے۔ انہی کے درمیان مختلف رقاصائیں بھی اپنے فن کا مظاہرہ کرتی تھیں۔ سوانگ پیش کرنے کے لئے باقاعدہ کمپنیاں بنی ہوئی تھیں جو اپنا "شو" پیش کرنے کے لئے شہر شہر جاتی تھیں۔ ان دنوں بجنور میں واقعی ایک کمپنی اپنا سوانگ لے کر آئی ہوئی تھی' جس کی دھوم مچی ہوئی تھی۔

✦......✦......✦

دوسرے روز وہ لوگ صبح سویرے قلعے سے نکل کھڑے ہوئے۔ انہیں گجندر سنگھ کو اس کے باپ کے کھیت سے ساتھ لینا تھا۔ ان کے درمیان پروگرام پہلے ہی طے ہو چکا تھا۔ کھیت کے قریب پہنچ کر سلطانہ نے شیر کی آواز نکالی اور جلد ہی گجندر ان کے پاس پہنچ گیا۔ یہ اس کے لئے اشارہ تھا۔ سب اکٹھے ہو گئے تو وہ یکے کی تلاش میں آگے چل دیئے۔ انہیں اندیشہ تھا کہ کسی یکے والے کو بجنور چلنے کے لئے آمادہ کرنا بھی ان کے لئے آسان نہیں ہو گا۔ دراصل دوسرے بہت سے لوگوں کی طرح یکے اور بیل گاڑی والے بھی بھنتوؤں سے ڈرتے تھے۔ انہیں اندیشہ رہتا تھا کہ کہیں راستے میں بھنتو انہیں لوٹ نہ لیں۔ ادھر بھنتوؤں کی پیشانی پر قدرت نے جیسے کوئی نادیدہ مہر لگا رکھی تھی۔ اکثر لوگ انہیں دیکھ کر ہی پہچان لیتے تھے کہ وہ بھنتو ہیں۔ اس کی ایک وجہ شاید ان کی سانولی رنگت اور ذرا خاص قسم کے نین نقش تھے۔ تاہم سلطانہ کا رنگ سانولا نہیں، گندمی تھا۔

سلطانہ کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ اسے جارج پنجم کو کس طرح لوٹنا ہے یا اس سے کیا چیز حاصل کرنی ہے۔ وہ بس دادا کا حکم سن کر تن بہ تقدیر ہو کر چل پڑا تھا۔ اسے امید تھی کہ دلی پہنچ کر صورتحال کو دیکھ کر خود بخود اس کے ذہن میں کچھ آ جائے گا۔ وہ خوفزدہ نہیں تھا۔ اس کے اپنے دل میں بھی یہ شوق ابھر آیا تھا کہ وہ کوئی ایسا کام کر کے دکھائے جس سے سارے بھنتو قبیلے میں اس کی دھوم مچ جائے۔

جس سڑک کے کنارے وہ چلے جا رہے تھے، اس پر اول تو کوئی یکہ آتا جاتا ہی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ایک دو آئے بھی تو وہ ان کے ہاتھ ہلانے کے باوجود گزرتے چلے گئے۔ سلطانہ کو اندازہ تھا کہ یکے بان انہیں مشکوک سمجھ رہے ہوں گے۔ اسے پہلے بھی اس بات کا تجربہ تھا کہ یکے بان بھنتوؤں کو بٹھانے سے گریز کرتے تھے۔ وہ جب کبھی اپنے دادا کے ساتھ یکے میں کہیں گیا تو انہوں نے اپنے آپ کو "ہبورا" قبیلے کے افراد ظاہر کیا تھا۔ ہبورا قبیلے کے لوگ بھی کافی حد

تک انہی سے ملتے جلتے نظر آتے تھے، لیکن وہ زیادہ تر شریف اور امن پسند لوگ ہوتے تھے۔

سلطانہ کو یاد تھا کہ ایک بار تو اس کے دادا نے اپنے آپ کو بنیا ظاہر کیا تھا۔ تب ایک یکے میں ان کے بیٹھنے کی نوبت آئی تھی۔ دادا نے یکے والے کو بتایا تھا کہ وہ مراد آباد سے آ رہے ہیں تاہم یکے والا راستے میں گردن ترچھی کر کے بار بار شک زدہ سی نظروں سے ان کی طرف دیکھتا رہا۔ آخرکار وہ دادا سے پوچھے بغیر نہ رہ سکا کہ مراد آباد میں ان کی دکان کہاں تھی؟ دادا نے ایک بازار کا نام لے دیا۔ تب یکے والے نے دوسرا سوال کر دیا کہ وہ گڑ کس بھاؤ فروخت کرتے تھے؟ اس پر گویا دادا کی قوت برداشت جواب دے گئی۔ انہوں نے چاقو نکال کر اس کی نوک یکے والے کی گردن پر رکھ دی اور بالکل بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ابے سیدھی طرح یکہ چلا اور اس فکر میں دبلا مت ہو کہ ہم کون ہیں؟ اب اگر تو نے گردن گھما گھما کر ہماری طرف دیکھا تو تیرا سر یکے سے نیچے لڑھک رہا ہو گا۔ میرا چاقو یہ نہیں دیکھتا کہ کون بنیا ہے اور کون برہمن؟"

اس کے بعد یکے والا سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور اس نے کن انکھیوں سے بھی ان کی طرف دیکھنے کی کوشش نہیں کی، لیکن سلطانہ نے اسے زیر لب یہ کہتے سن لیا تھا۔

"مجھے تو پہلے ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ لوگ بنئے نہیں ہو سکتے۔"

جب ایک بوڑھے اور ایک کمسن بھنتو کو یکہ روکنے میں دشواری پیش آتی تھی تو اس وقت سات نوعمر بھنتو لڑکوں کے گروہ کو سڑک پر جاتے دیکھ کر بھلا کون سا یکے والا رکنے کی ہمت کر سکتا تھا؟ کئی بار انہوں نے کوئی یکہ قریب آتے دیکھ کر دونوں ہاتھ اونچے کر کے یکے والے کو یہ بتانے کی بھی کوشش کی کہ وہ بالکل غیر مسلح ہیں۔ اس کے باوجود ہر یکے والے نے ان کے قریب پہنچ کر گھوڑے کو چابک رسید کر کے اس کی رفتار تیز کر دی اور نکلتا چلا گیا۔ چنانچہ یونہی چلتے چلتے ان کا دس میل کا فاصلہ پیدل ہی طے ہو گیا اور وہ بجنور پہنچ گئے جہاں سے انہوں نے دلی کے لئے ٹرین پکڑ لی۔

سلطانہ نے اس سے پہلے مراد آباد کے بارونق بازار اور وہ گلیاں دیکھی تھیں جن میں اکثر چہل پہل رہتی تھی۔ وہ اسے ہی بہت بڑا شہر سمجھتا تھا، لیکن دلی پہنچ کر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اسے احساس ہوا کہ مراد آباد تو اس کے سامنے کچھ نہیں تھا۔ اسے لگا کہ دلی کا تو شاید ریلوے سٹیشن ہی پورے مراد آباد سے بڑا تھا اور وہاں موجود لوگوں کی تعداد شاید بجنور کی آبادی سے زیادہ تھی۔

وہ لوگ جب ریلوے سٹیشن کی حدود سے باہر نکلے تو سلطانہ نے گجندر سنگھ سے پوچھا۔

"یہاں ہر چیز اتنی صاف ستھری کیوں ہے؟"

یہ سوال کرنے کی ضرورت اسے اس لئے پیش آئی تھی کہ جب وہ مراد آباد جاتے تھے تو گھوڑا گاڑیوں کے دوڑنے کی وجہ سے ہر طرف دھول اڑتی دکھائی دیتی تھی اور چند گز سے آگے کی چیزوں کو دیکھنا مشکل ہوتا تھا' جبکہ دلی میں لال قلعے کی دیواریں اور جامع مسجد کے گنبد دور سے نظر آ رہے تھے حتیٰ کہ وہاں تو آسمان بھی کچھ زیادہ ہی صاف دکھائی دے رہا تھا۔

گجندر سنگھ انہیں ریلوے سٹیشن کے پیچھے لے گیا' جہاں سڑک کی طرف زمین کی ایک لمبی سی پٹی خالی پڑی ہوئی تھی۔ طے یہ پایا کہ اگر وہ لوگ کسی واردات کے بعد ایک دوسرے سے بچھڑ گئے یا واردات کے بعد انہیں مصلحتاً الگ ہونا پڑا تو دوبارہ وہ یہاں یکجا ہوں گے۔ اس کے بعد وہ چاندنی چوک پہنچے جسے بادشاہ کے اعزاز میں تقریب کے لئے سجایا گیا تھا۔ گجندر سنگھ نے بتایا کہ وہ پچھلی مرتبہ جب وہاں آیا تھا تو سڑک کے بیچ میں ایک نالا بہہ رہا تھا' لیکن اب انگریزوں کی انتظامیہ نے نہ صرف اسے ڈھک دیا تھا' بلکہ اس کے اوپر پتھر کی سلوں سے ایک شاندار سڑک بھی بنا دی تھی' جو اتنی صاف ستھری تھی کہ سلطانہ اور اسکے ساتھی شاید اس پر سونے میں بھی راحت محسوس کرتے۔

وہاں گو بہت سی بیل گاڑیاں' یکے اور مختلف چیزوں سے لدے ہوئے ٹھیلے رواں دواں تھے' لیکن کہیں گندگی' دھول مٹی یا کچرے کا نام ونشان تک نہیں تھا۔ سلطانہ نے رام پور میں صرف نوابوں کے پاس کار دیکھی تھی' لیکن لگتا تھا کہ یہاں تو ہر انگریز...... حتیٰ کہ بعض بنیوں کے پاس بھی کاریں تھیں۔ سلطانہ کو دریائے جمنا دیکھنے کا بھی بہت شوق تھا' لیکن گجندر سنگھ نے بتایا کہ جمنا' لال قلعے کے دوسری طرف بہتا ہے۔ وہاں جانے کے لئے کافی فاصلہ طے کرنا پڑتا۔ سردست انہوں نے یہ ارادہ ملتوی کر دیا۔ وہ پہلے کچھ اور جگہوں پر گھومنا پھرنا چاہتے تھے۔

قلعے کی تمام دیواروں پر چراغ رکھے گئے تھے اور جارج پنجم کو سلامی دینے کے لئے توپیں لال قلعے سے باہر لائی جا رہی تھیں۔ بادشاہ کو اتوار کے دن میدان میں دربار عام بھی منعقد کرنا تھا' جس کی تیاریاں زور وشور سے جاری تھیں۔ سلطانہ اور اس کے ساتھیوں نے قلعے کے سامنے گھوم پھر کر صورت حال کا جائزہ لیا۔ وہ اس چکر میں بھی تھے کہ شاید قلعے کے اندر گھسنے کا موقع مل جائے۔ سامنے کی طرف قلعے کے دو بڑے دروازے تھے' لیکن دونوں پر ہی سخت پہرہ تھا۔ ان

دروازوں پر کھڑے ہوئے محافظ نجیب آباد کے قلعے پر ڈیوٹی دینے والے محافظوں سے زیادہ لمبے تڑنگے اور بارعب تھے۔ ان کے پاس بندوقیں بھی تھیں۔ وہیں سلطانہ نے بعض انگریزوں کو بھی بادشاہ کے استقبال کے سلسلے میں ایسے چھوٹے موٹے اور معمولی کام کرتے دیکھا جو عام طور پر بھنتوؤں سے لئے جاتے تھے۔

وہ لوگ گھومتے پھرتے سلیم گڑھ قلعے کی طرف بھی چلے گئے۔ پھر ریلوے لائنیں عبور کرنے کا ارادہ کرنے لگے۔ اس دوران شاید مشق کے طور پر بہت سے فوجیوں کی پریڈ بھی شروع ہو گئی۔ قلعے کے گرد کھدی ہوئی خندق کے پار سے کچھ فوجی پریڈ کرتے ہوئے انہیں اپنی طرف بھی آتے دکھائی دیئے۔ پریتم ڈر گیا اور جلدی سے بولا۔ "یار...... یہ ہمیں پکڑنے تو نہیں آ رہے؟"

"ابے پاگل ہو گیا ہے کیا؟" سلطانہ نے اسے ڈانٹ پلائی۔ "انہیں کیا اتنی دور سے پتا چل جائے گا کہ ہم بھنتو ہیں اور کسی دوسرے شہر سے آئے ہیں؟ اس وقت تو ہم بھی دلی والے ہیں۔"

قلعے کی دیوار کے قریب سے ایک ریلوے لائن گزر رہی تھی۔ اس پر ایک ٹرین کھڑی تھی' جس کے انجن سے دھوئیں کے سیاہ بادل فضا میں بلند ہو رہے تھے۔ بھورے ذرا حیرت سے بولا۔

"یہ ریل یہاں کیوں رکی ہوئی ہے؟ اسے تو قلعے کے قریب سے گزر کر ریلوے سٹیشن پر چلے جانا چاہئے۔"

پھر انہیں احساس ہوا کہ وہ کوئی عام ٹرین نہیں تھی۔ اس میں مسافروں کا ہجوم نظر نہیں آ رہا تھا اور نہ ہی گٹھریاں' پوٹلیاں اور ڈبے اس کی کھڑکیوں سے باہر لٹکے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ اس کی بوگیاں عام ٹرین کی بوگیوں سے بڑی' اونچی اور خوبصورت تھیں۔ ساری کی ساری بوگیوں میں فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ جیسی کھڑکیاں تھیں جن کے شیشے بند تھے۔ یہ شیشے گہرے رنگ کے تھے' اس لئے اندر کا منظر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

"یہ کہیں لاٹ صاحب کی ریل تو نہیں......؟" سلطانہ نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا۔

"سب لاعلمی کے اظہار میں سر ہلا کر رہ گئے۔ سلطانہ نے ایک بار آدھی رات کے وقت مراد آباد سے "لاٹ صاحب" یعنی وائسرائے کی ٹرین گزرتے دیکھی تھی۔ پٹڑیوں کے دونوں طرف ریلوے کا عملہ اور محافظ وغیرہ مشعلیں لئے کھڑے تھے۔ ٹرین وہاں رکی نہیں تھی۔ وہ اتنی

تیز رفتاری سے وہاں سے گزرتی چلی گئی تھی کہ ریلوے لائن کے دونوں طرف کھڑے لوگوں کی مشعلوں میں سے آدھی بجھ گئی تھیں۔ بہر حال وہ ٹرین بھی کافی حد تک ایسی ہی تھی۔

ابھی وہ سب لڑکے ٹرین کی طرف دیکھ ہی رہے تھے کہ نفیریاں اور ڈھول تاشے بجنے لگے۔ چند لمحے بعد ایک بوگی کا دروازہ آہستگی سے کھلا اور گورے صاحبوں اور میموں کی ایک قطار باہر آنے لگی۔ دو سردار جی، جن کے سروں پر سنہری پگڑیاں تھیں، دونوں طرف سے ایک گورے صاحب اور اس کے چند ساتھیوں پر بڑی بڑی چھتریاں تانے ہوئے تھے۔ وہ لوگ ایک نئے پلیٹ فارم پر اتر رہے تھے، جو شاید ان کے لئے خاص طور پر قلعے کے قریب تیار کیا گیا تھا۔ ایک دراز قد گورا صاحب چند دوسرے گوروں اور میموں کے وسط میں تھا۔ وہی سب کی توجہ کا مرکز معلوم ہوتا تھا اور سب اس کے سامنے مؤدب بھی تھے۔ اس دوران مسلح فوجیوں کی ایک قطار ان لوگوں کے سامنے ڈھال کی طرح آن کھڑی ہوئی تھی، لیکن سلطانہ اور اس کے ساتھی ذرا بلندی پر ہونے کی وجہ سے کافی حد تک اب بھی یہ سارا نظارہ دیکھ رہے تھے۔

ان لوگوں کا چھوٹا سا قافلہ دھیرے دھیرے چلتا ہوا اس چھوٹے سے پل کے قریب پہنچ گیا تھا، جو قلعے کے گرد کھدی ہوئی خندق سے اندر ایک وسیع میدان نظر آ رہا تھا، جس میں ایک بہت بڑا شامیانہ لگا ہوا تھا۔ گوروں کا چھوٹا سا قافلہ اسی طرف جا رہا تھا۔ اچانک سلطانہ کے ذہن میں گویا بجلی سی کوندی۔ اسے حیرت ہوئی کہ اتنی سی بات ان سب کی سمجھ میں کیوں نہیں آئی تھی۔ کم از کم اسے اب احساس ہو گیا تھا کہ گوروں کے چھوٹے سے قافلے میں جو شخص مرکزی حیثیت کا حامل نظر آ رہا تھا، وہ کون تھا۔

اس نے سرگوشی میں بھورے سے کہا۔ ''ابے...... یہ ان لوگوں کا بادشاہ ہے۔''

''کیا یہ رامپور کا نواب ہے؟'' بھورے نے سادگی سے پوچھا۔

''ارے...... رامپور کے نواب بے چارے اس کے سامنے کیا چیز ہیں...... وہ تو اس کے سامنے ایسے ہی ہیں جیسے نواب صاحب کے سامنے ہم بھنتو۔'' سلطانہ بولا۔

''کیا کہہ رہے ہو یار......؟'' بھورے حیرت سے بولا۔ ''تو پھر یہ کون ہے؟''

اب دوسرے لڑکے بھی ان کی طرف متوجہ ہو چکے تھے اور ساری گفتگو سن رہے تھے۔ سلطانہ نیچی آواز میں بولا۔ ''ابے گدھے...... یہی تو جارج پنجم ہے۔ کتنا عجیب اتفاق ہے کہ ادھر ہم یہاں پہنچے ہیں اور ادھر اس کی ریل یہاں پہنچی ہے۔''

حالانکہ سلطانہ نے زندگی میں کبھی جارج پنجم کو نہیں دیکھا تھا او نہ ہی کبھی اس کی تصویر دیکھی تھی، لیکن اس وقت گویا کسی غیبی قوت نے اس کے کان میں سرگوشی کی تھی کہ وہ شخص جارج پنجم تھا۔ اسے کچھ الگ تھلگ سا دکھائی دیا تھا، حالانکہ اسے زیادہ تر انگریز ایک جیسے ہی لگتے تھے۔ خاص طور پر دور سے...... لیکن اس وقت جس طرح مسلح فوجیوں کی قطار وہاں پہنچی تھی، جس طرح نفیریاں اور ڈھول تاشے بجنے شروع ہوئے تھے، اس سے بھی جارج پنجم کو پہچاننے میں سلطانہ کو مدد ملی تھی۔

مسلح فوجیوں کے گھیرے میں چھوٹا سا جلوس قلعے کی طرف رواں تھا۔ نفیریوں اور ڈھول تاشوں کا شور کم ہو گیا تھا، لیکن اس کی جگہ نعروں اور تالیوں کے شور نے لے لی تھی۔ سب لوگوں کی توجہ جارج پنجم کے جلوس کی طرف ہی تھی۔ سلطانہ کو احساس تھا کہ اس کے ساتھیوں کو اب بھی اندازہ نہیں تھا کہ جارج پنجم کون تھا۔ اچانک ایک اور خیال بجلی کے کوندے کی طرح اس کے ذہن میں لپکا۔ ٹرین اپنی جگہ کھڑی تھی اور اس کے دروازے کھلے تھے۔ اسے خیال آیا تھا کہ دادا نے جو انتہائی کٹھن کام اس کے سپرد کیا تھا، کیا یہ اس کیلئے ایک اچھا موقع نہیں تھا؟

''بھورے...... جلدی کرو...... ہمیں ریل کے اندر جانا ہے۔'' اچانک اس نے کہا۔ پھر اس نے دوسروں کو سمجھایا کہ انہیں کیا کرنا تھا۔

بھورے بے چوں چرا اس کے حکم کی تعمیل میں اس کے ساتھ چل پڑا۔ وہ گھوم کر مختصر سی ٹرین کے دوسری طرف چلے گئے اور وہاں سے اس کے نیچے رینگ گئے۔ انہیں کئی لوگوں کی ٹانگیں نظر آ رہی تھیں جو ٹرین سے بھاری بھاری صندوق اور بکس وغیرہ اتار رہے تھے۔

''یہ لوگ بادشاہ کا خزانہ قلعے میں لے جا رہے ہیں۔'' سلطانہ نے سرگوشی میں بھورے سے کہا۔

''ہمیں جلدی کچھ کرنا ہو گا ورنہ ہمارے ہاتھ کچھ نہیں لگے گا۔''

سلطانہ نے ایک پرندے کی آواز نکال کر ساتھیوں کو سگنل دیا۔ ان میں سے کسی نے پریتم کی کمر پر دھپ رسید کی۔ پریتم نے رونا شروع کر دیا۔ نکیشر نے صادق کو پکڑ کے اس کا سر اپنے گھٹنوں کے درمیان دبا لیا اور چیخنے لگا کہ وہ اسے جان سے مار دے گا۔ گجندر سنگھ اور سرجو کچھ ایسی اداکاری کرنے لگے جیسے انہیں چھڑانے کی کوشش کر رہے ہوں۔ بھورے بھی جا کر ان میں شامل ہو گیا۔ ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ کچھ پتا نہیں چل رہا تھا کہ کون کس کے ساتھ گتھم گتھا تھا۔

پلیٹ فارم پر موجود سب لوگ ان کی طرف متوجہ ہو گئے اور انہیں چھڑانے کی کوشش کرنے لگے‘ لیکن ان کے جوش وخروش سے کچھ ایسا لگ رہا تھا‘ جیسے انہیں ایک دوسرے سے الگ کرانے کے لئے پوری فوج کی ضرورت پڑے گی۔ سلطانہ نے ٹرین کے نیچے دبکے دبکے اندازہ لگایا کہ کوئی گورا صاحب بھی اس طرف آ رہا تھا۔ اس نے سر ذرا سا نکال کر دیکھا اور ایک مناسب لمحہ میسر آتے ہی وہ کسی چھلاوے کی طرح ٹرین میں داخل ہو چکا تھا۔

باہر موجود لوگ آخر کار لڑکوں کو ایک دوسرے سے الگ کرنے میں کامیاب ہو گئے اور انہوں نے ان سب کو ٹرین کے ساتھ لگا کر کھڑا کر دیا‘ لیکن انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ سلطانہ ٹرین کے اندر پہنچ چکا تھا۔ یعنی ان کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ محافظ ان کے پیچھے بھاگے۔ ان میں سے بعض کے پاس تیر کمانیں اور بعض کے پاس بندوقیں تھیں۔ تاہم وہ لڑکوں کی کم عمری دیکھ کر فائر کرنے کے سلسلے میں ہچکچاہٹ کا شکار تھے۔

ادھر سلطانہ ٹرین میں داخل ہو کر حیران رہ گیا۔ ٹرین کیا تھی‘ ایک پورا محل تھا۔ سلطانہ کا خیال تھا کہ شاید رامپور کے نواب بھی اسے دیکھ کر حیران رہ جاتے۔ اس میں لکڑی کی بنچوں جیسی سیٹیں یا سامان رکھنے کے لئے ریک نہیں تھے۔ کھڑکیوں کے بند شیشوں پر اندر کی طرف خوبصورت اور نفیس پردے لٹکے ہوئے تھے۔ ان کھڑکیوں کے پاس موٹے موٹے گدوں والے مخملیں صوفے لگے ہوئے تھے۔ بے اختیار سلطانہ کا دل چاہا کہ وہ ان میں سے کسی بڑے سے صوفے پر لیٹ کر دیکھے۔ چند لمحوں کی ہچکچاہٹ کے بعد اس نے اپنی اس خواہش پر عمل کر ہی ڈالا۔

اسے یوں لگا جیسے وہ نرم روئی کے ڈھیر میں دھنس گیا تھا۔ اس کی پگڑی اس کے سر سے پھسل گئی۔ اس نے جلدی سے اسے سنبھالا۔ ٹرین کی چھت میں برقی قمقمے اور دیواروں پر پنکھے نصب تھے‘ جو اس وقت بھی چل رہے تھے۔ ٹرین کے اندر کی فضا خنک اور خوابناک تھی‘ جس قسم کے برقی قمقمے اور پنکھے ٹرین میں لگے ہوئے تھے‘ سلطانہ نے سنا تھا کہ اس طرح کی چیزیں اس زمانے میں صرف رامپور کے نواب کے محل میں پائی جاتی تھیں۔ البتہ کچھ سالوں بعد وہ رفتہ رفتہ رئیسوں‘ ساہوکاروں اور کچھ دولت مند بنیوں کے گھروں میں بھی دکھائی دینے لگی تھیں۔

سلطانہ اچانک ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اتنی آرام دہ چیز پر وہ زندگی میں پہلی بار لیٹا تھا۔ اسے اندیشہ محسوس ہوا تھا کہ وہ کہیں صوفے پر سو ہی نہ جائے۔ چند لمحوں کے لئے تو وہ بھول ہی گیا تھا

کہ وہ کہاں لیٹا ہوا تھا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اس ٹرین میں کرسیاں اور میزیں بھی لگی ہوئی تھیں۔ میزوں پر کاغذات بکھرے ہوئے تھے۔ وہ کچھ آگے بڑھا تو اسے ایک میز درازوں والی بھی نظر آئی۔ اس نے درازیں کھولنے کی کوشش کی‘ لیکن وہ مقفل تھیں۔ اسے معلوم تھا کہ زیادہ تر بنئے اپنی قیمتی چیزیں‘ رسوئی یا باورچی خانہ کا فرش کھود کر‘ اس میں دبا دیتے تھے لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بادشاہ اپنے خزانے کہاں رکھتے تھے؟

اس نے اِدھر اُدھر کسی خزانے کی تلاش شروع کر دی۔ صوفوں کے پیچھے اور نیچے جھانک کر دیکھا۔ پردے ہٹا کر دیکھا۔ کہیں کوئی سامان یا ایسی چیز نہیں تھی‘ جسے وہ ساتھ لے جا سکتا۔ پھر اسے سامنے ایک دروازہ نظر آیا۔ وہ دوڑتا ہوا اس میں سے گزر گیا۔ اس کے چلنے یا دوڑنے سے کوئی آواز پیدا نہیں ہو رہی تھی‘ کیونکہ فرش پر دبیز قالین موجود تھا‘ جو کسی گدے سے کم نہیں تھا۔ اس دروازے کے دوسری طرف بھی ایسا ہی ایک لمبا کمرا تھا‘ جیسے کمرے سے سلطانہ گزر کر آیا تھا۔ وہاں بھی اسی طرح قمقمے‘ پنکھے‘ صوفے‘ پردے‘ قالین اور میز کرسیاں تھیں۔ اسے اپنی دلچسپی کی کوئی چیز دکھائی نہ دی۔

وہ جوں جوں آگے بڑھتا گیا‘ اسے احساس ہوا کہ ٹرین ایسے ہی کمروں پر مشتمل ایک زنجیر سی تھی۔ وہ رفتہ رفتہ اس دروازے سے دور جا رہا تھا‘ جس سے اندر آیا تھا‘ لیکن اسے امید تھی کہ دوسرے سرے پر بھی کوئی دروازہ ہو گا۔ اب وہ جس کمرے میں پہنچا‘ اس میں شاندار بیڈ لگا ہوا تھا‘ جس کے سرہانے بڑا سا آئینہ نصب تھا۔ اس کے قریب درازوں والی الماری کھڑی تھی۔ سلطانہ نے درازیں کھول کر دیکھیں‘ وہ سب کی سب خالی تھیں۔ اس نے یہی سوچا کہ بادشاہ کے ملازم اس کا خزانہ کسی محفوظ مقام پر لے جا چکے تھے۔

اچانک وہ ٹھٹک کر رہ گیا۔ اس نے باہر گجندر سنگھ کے رونے کی آواز سنی تھی۔ آواز اتنی اونچی ضرور تھی کہ بند شیشوں کے پار اس کے کانوں تک پہنچ گئی تھی۔ اس نے کھڑکی کا پردہ ذرا سا ہٹایا اور ایک معمولی سی جھری بنا کر اس سے باہر جھانکا۔ اس نے دیکھا کہ محافظ گجندر سنگھ کو پکڑ لائے تھے اور اسے تھپڑ مار رہے تھے۔ وہ بری طرح رو رہا تھا۔ آخر وہ بارہ تیرا سال کا لڑکا ہی تو تھا۔ سلطانہ کا دل بیٹھنے لگا۔ اگر انہوں نے گجندر کو پکڑ لیا تھا تو اس کا مطلب تھا‘ شاید دوسرے پانچ لڑکوں کو بھی پکڑ لیا ہو۔ ان کی دھوتیوں کی ڈب میں چاقو بھی موجود تھے۔

ویسے تو وہ دھوتی کی ڈب میں چاقو اس طرح چھپاتے تھے کہ تلاشی لینے والوں کو ملتا نہیں

تھا' لیکن کچھ بعید نہیں تھا کہ اس قسم کے محافظوں کو مل بھی جاتا۔ بھورے کے بارے میں سلطانہ کو ویسے بھی اندیشہ تھا کہ اگر وہ ان محافظوں کے ہتھے چڑھ گیا تو ان کی مار پیٹ زیادہ دیر تک نہیں سہہ سکے گا اور زبان کھول دے گا' انہیں یہ بھی بتا دے گا کہ سلطانہ ٹرین میں گھسا ہوا تھا۔ چنانچہ اسے جو کچھ بھی کرنا تھا' جلد از جلد کر لینا چاہئے تھا۔

اس دوران قلعے کی طرف سے سنائی دینے والا' نعروں اور تالیوں کا شور کچھ اور بلند ہو گیا تھا۔ سلطانہ نے فیصلہ کیا کہ اسے اپنے ساتھیوں کا معاملہ تقدیر پر ہی چھوڑنا پڑے گا۔ فی الحال اسے اس کام کی فکر کرنی تھی جس کیلئے وہ آیا ہوا تھا۔ وہ اس کی اب تک کی زندگی کا سب سے اہم کام تھا۔ اسے بادشاہ کی کوئی نہ کوئی چیز تو ساتھ لے کر جانی تھی' جو وہ دادا کو دکھا سکتا اور ثابت کر سکتا کہ اگر وہ جارج پنجم کو لوٹنے کے ارادے سے نکلا تھا تو کم از کم خالی ہاتھ تو واپس نہیں آیا۔ اگر لوٹ کر نہیں' تو کم از کم چرا کر تو کچھ نہ کچھ لے آیا۔ آدھی دنیا کے بادشاہ کی تو کوئی چیز چرانے کا بھی بھلا کون تصور کر سکتا تھا۔

سلطانہ نے وحشت زدہ نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بادشاہ کی کیا چیز ساتھ لے کر جائے۔ اچانک اس کی نظر اس پنکھے پر پڑی جو بیڈ کے سرہانے' دیوار پر لگا ہوا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ پنکھا ہی اتار کر لے جائے گا۔ پنکھا ویسے بھی اس زمانے میں کوئی معمولی چیز نہیں تھی۔ اس کی حیثیت ایک چھوٹے موٹے عجوبے کی سی تھی۔ اس نے پنکھا اتارنے کے لئے بیڈ پر چڑھنے کا ارادہ کیا' جس پر خوبصورت چادر بچھی ہوئی تھی اور پائنتی کی طرف اس سے بھی زیادہ خوبصورت کمبل تہہ کیا ہوا رکھا تھا۔ کمبل کسی ایرانی بلی کی کھال جیسا دکھائی دے رہا تھا۔ سلطانہ کے پیروں میں موٹے چمڑے کی بھدی سی چپلیں تھیں' لیکن چپلوں کی موجودگی کے باوجود اس کے پاؤں کیچڑ اور دھول میں لتھڑے ہوئے تھے۔ وہ سوچ میں پڑ گیا کہ اس کے بیڈ پر چڑھنے سے تو کمبل اور چادر وغیرہ پر اس کے پیروں کے نشان پڑ جائیں گے۔

پھر اس کا دھیان کمبل پر رکھے ہوئے' گتے کے ایک ڈبے پر گیا۔ اس نے ڈبے کو اب تک گویا دیکھتے ہوئے بھی نہیں دیکھا تھا۔ اس نے لپک کر اسے کھولا اور اندر جھانکا۔ ڈبے کے اندر مخمل بچھی ہوئی تھی اور اس پر ایک خوبصورت تاج رکھا تھا جس میں نہ جانے کتنے ہیرے جڑے ہوئے تھے۔ ان کی جھلملاہٹ سے ڈبے کے اندر روشنی سی ہو رہی تھی۔ سلطانہ نے اب تک کئی

تاج دیکھے تھے۔ دراصل اس نے اپنے دادا کے ساتھ دور دور سے کئی نوابوں کو دیکھا تھا' جن کے سروں پر تاج ہوتے تھے۔ اس نے رامپور کے نواب اور مراد آباد کے ٹھاکروں کو تاج پہنے دیکھا تھا۔ اس کے دادا نے اسے بتایا تھا کہ ان میں جو چیزیں جگمگاتی دکھائی دیتی تھیں وہ ہیرے ہوتے تھے۔

اس میں شک نہیں تھا کہ سلطان نے جتنے تاج دیکھے تھے' وہ سب اپنی اپنی جگہ خوبصورت تھے' لیکن اس وقت وہ جو تاج دیکھ رہا تھا۔ اس کی بات ہی کچھ اور تھی۔ اس میں تو ہیروں کے علاوہ زمرد' یاقوت' نیلم اور نہ جانے کون کون سے قیمتی پتھر جڑے ہوئے تھے۔

اس میں سات محرابیں سی بنی ہوئی تھیں اور ان سب میں رنگا رنگ ہیرے جواہر جڑے ہوئے تھے۔ سلطانہ نے ایسے رنگ بھی اس سے پہلے نہیں دیکھے تھے۔

گجندر سنگھ کی چیخیں اب سنائی نہیں دے رہی تھیں اور قلعے کی طرف سے سنائی دینے والا شور بھی معدوم ہونے لگا تھا۔ اس لئے سلطانہ کی مکمل توجہ تاج کی طرف مرتکز ہو کر رہ گئی تھی۔ پھر اس نے تاج کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر اس ڈبے سے نکال لیا۔ اس وقت اس کے ہاتھوں میں ہلکی سی لرزش تھی۔ اس نے تاج کو ذرا اوپر کر کے اپنی آنکھوں کے قریب لا کر دیکھا تو اس کی آنکھیں چندھیا گئیں...... اور پھر نہ جانے کیوں اس کی آنکھوں میں آنسو بھی آ گئے۔

شاید یہ خوشی کے آنسو تھے۔ ایک منٹ پہلے تک اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا چیز چرائے؟ اسے اس مقصد کے لئے کوئی معقول چیز نہیں مل رہی تھی اور اب ایک ایسی چیز اس کے سامنے آ گئی تھی جس کا اس نے تو کیا' اس کے دادا نے بھی کبھی تصور نہیں کیا تھا۔ اس کے دادا اپنے وقت کے اتنے بڑے ڈاکو تھے' لیکن انہوں نے زندگی میں کبھی ایک ایسے بادشاہ کا تاج چرانے کے بارے میں سوچا بھی نہیں ہوگا' جس کی حکمرانی آدھی دنیا پر تھی۔ سلطانہ کو یہ اندازہ بھی ہو رہا تھا کہ اگر وہ چاہے تو یہ تاج چرانے کے بعد اسے زندگی بھر شاید کوئی چیز چرانے یا لوٹنے کی ضرورت نہ رہے۔ وہ اگر سال چھ مہینے بعد تاج سے ایک ہیرا اکھاڑ کر بیچ دیا کرے تو اس کی زندگی عیش و آرام سے گزر جائے گی اور شاید اس کے مرنے کے بعد بھی کچھ ہیرے بچ جائیں گے۔ ان کے علاوہ تاج کی تیاری میں جتنا سونا لگا ہوا تھا' وہ اپنی جگہ نہ جانے کتنی قیمت کا تھا۔

تاج کو ہاتھوں میں لینے کے بعد ابھی سلطانہ کے دل کی دھڑکنیں بھی قابو میں نہیں آئی تھیں کہ اسے احساس ہوا' پیچھے اسی دروازے سے محافظ اندر آ رہے تھے' جس سے وہ اندر آیا تھا۔

وہ دروازہ خاصا پیچھے رہ گیا تھا' لیکن سلطانہ کو معلوم تھا کہ محافظوں کو اس حصے تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی' جہاں وہ کھڑا تھا۔ اس نے جلدی سے تاج کو اپنی دھوتی میں چھپانے کی کوشش کی' لیکن وہ اچھا خاصا بڑا تھا اور اس کی ساخت ایسی نہیں تھی کہ اسے دھوتی میں چھپایا جا سکتا۔

اب اسے اپنے سامنے ایک ہی راستہ نظر آ رہا تھا کہ وہ اس مختصر ٹرین کے دوسرے سرے کی طرف بھاگنا شروع کر دے۔ اسے امید تھی کہ ٹرین کے پچھلی طرف بھی کوئی نہ کوئی دروازہ ہو گا۔ اس وقت اسے زیادہ سے زیادہ خوش گمانی کی ضرورت تھی۔ اس نے یہ بھی فرض کر لیا تھا کہ پچھلی طرف کے دروازے پر کوئی محافظ نہیں ہو گا...... اور اگر ہوا بھی تو وہ اپنے چاقو سے اس کا کام تمام کر دے گا۔

وہ اس امید پر ٹرین کے پچھلے سرے کی طرف بھاگا کہ وہ زیادہ دور نہیں ہو گا' لیکن درمیانی دروازے سے گزر کر وہ ایک اور کمپارٹمنٹ میں پہنچ گیا۔ وہ بھی ایک چھوٹے سے کمرے کی طرح تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر بادشاہ نے ٹرین میں کتنے کمرے بنوا رکھے تھے؟ اس نے اگلی دیوار میں دروازہ تلاش کرنا چاہا لیکن وہاں کوئی دروازہ نہیں تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ ٹرین کے آخر تک تو پہنچ گیا تھا' لیکن اس ٹرین میں دروازہ ہی ایک تھا...... اور وہ وہی تھا جس سے وہ خود اندر آیا تھا۔ ٹرین سے باہر جانے کا واحد راستہ بھی وہی تھا...... اور وہاں محافظ موجود تھے۔ جو شاید اسے ہی تلاش کر رہے تھے۔

اس کا مطلب تھا کہ وہ بالکل اسی طرح پھنس چکا تھا' جس طرح چوہے دان میں چوہا پھنستا ہے۔ چند لمحے پہلے بادشاہ کا تاج اس کے ہاتھوں میں آیا تھا تو اس نے اپنے آپ پر بڑا فخر محسوس کیا تھا کہ محض تیرہ سال کی عمر میں وہ ایک ایسی چیز چرانے میں کامیاب ہو گیا تھا' جو اس کے دادا نے شاید خواب میں بھی نہیں دیکھی تھی' لیکن اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ محض ایک کم عمر اور بے وقوف لڑکا تھا' جسے اس قسم کے کاموں کا کوئی سلیقہ نہیں تھا۔ وہ سوچے سمجھے بغیر' کوئی منصوبہ بنائے بغیر' بس منہ اٹھا کر نکل کھڑا ہوا تھا۔ وہ صحیح معنوں میں یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ اسے کرنا کیا تھا۔

اب وہ فیصلہ کرنے سے بھی قاصر تھا کہ جس مصیبت میں پھنس چکا تھا' اس سے نکلنے کی کوشش کس طرح کرے۔ اس نے اس کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر لیں جو بلی کو سامنے دیکھ کر شاید اس امید پر آنکھیں بند کر لیتا ہے کہ وہ موت کا دھوکا دینے میں کامیاب ہو گیا ہے تاہم

سلطانہ نے اتنا ضرور کیا کہ وہ دل ہی دل میں دعائیں مانگنے لگا۔ ایک عجیب بات یہ تھی کہ اب وہ زیادہ مصیبت میں ہوتا تھا تو ہندوؤں' مسلمانوں اور عیسائیوں' تینوں ہی کے انداز میں دعائیں مانگنے لگتا تھا۔ نسل در نسل اثرات کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو سمجھتا تو ہندو ہی تھا' لیکن وہ کوئی بہت زیادہ راسخ العقیدہ ہندو نہیں تھا...... اور نہ ہی کبھی آگے چل کر بن سکا۔ اس پر تینوں ہی مذاہب کے اثرات تھے اور اسے تینوں ہی کی بہت سی باتیں اچھی لگتی تھیں۔ اس کا دادا بھی چونکہ کٹر ہندو نہیں تھا' اس لئے اس نے بھی کبھی خاص طور پر اس پر زور نہیں دیا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہئے۔ اس زمانے میں چونکہ تعصب بھی کوئی خاص نہیں تھا' اس لئے اسے کسی بھی مذہب کے لوگوں میں گھلنے ملنے میں کبھی کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ اس کا دادا خود اسے کئی مزاروں پر اور دو چار گرجا گھروں میں بھی لے جا چکا تھا۔

اس وقت چند لمحوں میں بہت سے دعائیں مانگنے کے بعد سلطانہ کے دل کو کچھ سکون ملا۔ اس نے آنکھیں کھول لیں۔ اسے قریب ہی ایک سفید سٹول سا نظر آیا۔ وہ اس پر بیٹھ گیا۔ تاج اس نے اپنی گود میں رکھ لیا۔ اپنی دانست میں وہ اب صرف موت کا منتظر تھا۔ اس کا خیال تھا کہ گورے محافظ آ کر اسے گولی مار دیں گے۔ تاہم اس تصور سے اب اسے کوئی خاص خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ سب سے پہلے والے کمپارٹمنٹ کی طرف سے اب صوفے وغیرہ اِدھر اُدھر کھسکائے جانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ سلطانہ کے خیال میں وہ لوگ اسے ہی تلاش کر رہے تھے اور دیکھ رہے تھے کہ وہ کہیں کسی صوفے کے پیچھے تو نہیں چھپا ہوا؟

اس دوران قلعے کی طرف سے توپیں چلنے کی آوازیں سنائی دینے لگی تھیں۔ یقیناً بادشاہ سلامت کو توپوں کی سلامی دی جا رہی تھی۔ سلطانہ کو یہ خیال بھی آیا کہ شاید محافظ اسے پکڑ کر لے جائیں اور کسی توپ کے دہانے پر باندھ کر گولے سے اڑا دیں۔ یہ بھی بعید نہیں تھا کہ وہ اسے ہی توپ میں ڈال کر گولے کی جگہ چلا دیں اور جمنا کے پار جا گرے۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ یہ کمرہ ان کمروں سے کافی مختلف تھا جن سے وہ گزر کر آ رہا تھا۔ پنکھا تو یہاں بھی لگا ہوا تھا' لیکن فرش پر قالین کے بجائے پلاسٹک کی خوبصورت' موٹی چادر بچھی ہوئی تھی۔ پلاسٹک کی اس قسم کی موٹی چادر سلطانہ نے ایڈجوٹنٹ آنند کے کوارٹر میں بچھی ہوئی دیکھی تھی۔

اس کمرے کی کھڑکیوں پر پردے نہیں تھے۔ اس کے باوجود شیشوں کے پار دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ کیونکہ ان پر سفید پینٹ تھا' جس کی وجہ سے باہر سے اندر یا اندر سے باہر کچھ نہیں دیکھا جا سکتا

تھا۔ اس کمرے میں پھولوں جیسی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ ایک دیوار کے ساتھ ٹب بنا ہوا تھا' جس میں اس وقت پانی بھی بھرا ہوا تھا۔ سلطانہ سمجھا' شاید وہ بادشاہ کے گھوڑے کے لئے پانی کا حوض تھا اور سنگ مرمر کے سے جس سٹول پر وہ خود بیٹھا ہوا تھا' شاید بادشاہ اسی پر بیٹھ کر اپنے گھوڑے کو پانی پیتے ہوئے دیکھا تھا۔

ایک طرف واش بیسن بھی لگا ہوا تھا' جس میں پانی کی ٹونٹی بھی موجود تھی۔ قریب ہی دیوار میں نصب ایک ہینگر پر تولیہ بھی لٹکا ہوا تھا۔ سلطانہ کی تو یہ سمجھ میں آ گیا کہ بادشاہ ہی وہاں منہ دھوتا ہو گا' لیکن پھر وہ سوچ میں پڑ گیا کہ اپنے گھوڑے کو پانی پیتے دیکھنے کے دوران بادشاہ کو منہ دھونے کی کیا ضرورت تھی؟ اسی لمحے اسے یہ احساس بھی ہوا کہ وہ کمرہ ایک گھوڑے کے لئے چھوٹا تھا۔

محافظ اب شاید برابر والے کمرے میں پہنچ گئے تھے۔ پٹ کھٹکائے جانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ موت اب کچھ اور قریب آ چکی تھی۔ سلطانہ اچھل کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس کے اس طرح اچانک ایک جھٹکے سے اٹھنے کے باوجود سٹول الٹ کر نہیں گرا تھا' بلکہ اسی طرح مضبوطی سے اپنی جگہ جما ہوا تھا۔ سلطانہ نے اب اسے ذرا غور سے دیکھا تو احساس ہوا کہ اس کی بناوٹ بھی کچھ عجیب سی تھی۔ اسے یاد آیا کہ ایسا سٹول اس نے ایڈجوٹنٹ آنند کے گھر میں دیکھا تھا...... لیکن وہ لوگ اسے کموڈ کہتے تھے اور رفع حاجت کے لئے استعمال کرتے تھے۔ اچانک سلطانہ کی سمجھ میں آیا کہ یہ بھی کموڈ ہی تھا' جس پر وہ اب تک بیٹھا ہوا تھا۔ یہ جارج پنجم کا کموڈ تھا۔

اب اس کی یہ بھی سمجھ میں آ گیا کہ وہ جارج پنجم کی ریل گاڑی کے غسل خانے میں تھا۔ وہ ایک بار پھر بادشاہ سلامت کی قسمت پر رشک کئے بغیر نہ رہ سکا' جو ریل گاڑی میں بھی اپنا الگ' شاندار غسل خانہ ساتھ لے کر چلتے تھے۔ اور ایک وہ بھی تھا' جس کی قسمت میں اس غسل خانے میں موت لکھی تھی۔ اس بار موت کا خیال آیا تو اچانک ہی زندگی کی خواہش بھی عود کر آئی۔ اسے خیال آیا کہ زندگی کیلئے تو آخری لمحے تک جدوجہد کرتے رہنا چاہئے تھا۔

ایک نئے جوش و خروش کے ساتھ اس نے کموڈ ایک طرف کھسکا دیا۔ اس کے نیچے تقریباً اس کے پیندے جتنا ہی ایک سوراخ موجود تھا...... اور اگر کسی طرح ٹرین سے باہر جانا ممکن تھا تو اس کے لئے یہی اس کی جائے فرار تھی۔ ایک آدمی کے باہر جانے کے لئے سوراخ کافی چھوٹا

تھا' لیکن سلطانہ صرف تیرہ برس کا تھا...... دبلا پتلا...... اور پھر اس کے دادا نے اسے نہایت تنگ جگہوں سے گزر جانے کی جو تربیت دی تھی' وہ آخر کس دن کام آنی تھی؟

اس نے اپنی دھوتی کے کنارے ٹانگوں کے گرد لپیٹے' کرتے کے دامن' دھوتی کے اندر سمیٹے اور گہری سانس لے کر اپنی زندگی کی سب سے کٹھن آزمائش کے لئے تیار ہو گیا۔ تاج کو سنبھالنے کے لئے اب ایک ہی طریقہ بہتر تھا۔ اس نے اسے سر پر رکھ لیا۔ وہ اس کے سر پر ڈھیلا تھا' لیکن اس نے ایک چھوٹا کپڑا تلاش کر کے اسے تاج کے اندر ٹھونس لیا اور تاج کسی حد تک مضبوطی سے اس کے سر پر ٹک گیا۔ یہ بھی ایک ستم ظریفی تھی کہ وہ جارج پنجم کا تاج پہن کر اس کے کموڈ کے سوراخ میں گھس رہا تھا۔

اس نے اپنے بازوؤں کو جسم کے ساتھ چپکایا' اپنے وجود کو سانپ کی طرح سکیڑا اور دل ہی دل میں دعائیں کرتے ہوئے سوراخ میں اتر گیا۔ دھیرے دھیرے وہ اس سوراخ سے گزر گیا اور عین اسی وقت جب اس کا سر بادشاہ کے تاج سمیت نیچے جا رہا تھا' اس نے زوردار آواز کے ساتھ باتھ روم کا دروازہ کھلتے محسوس کیا۔ پھر کسی کے چیخنے کی آواز آئی اور ایک گولی چلی' مگر اس وقت تک وہ ٹرین کے نیچے پٹریوں کے درمیان پتھروں پر گر چکا تھا۔

اسے جسم پر ذرا رگڑ لگنے اور چند خراشیں آنے کے سوا کوئی گزند نہیں پہنچی تھی اور وہ تاج بھی اپنے ساتھ لانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس نے فوراً کوئل کی آواز نکالی اور ٹرین کے نیچے سے نکل کر اس سے دور جانے کے لئے دوڑ پڑا۔ کوئل کی آواز اس کے ساتھیوں کے لئے اشارہ تھی کہ وہ زندہ سلامت اور محفوظ ہے۔ اس کے ساتھیوں نے بھی اپنے آپ کو محافظوں کی گرفت سے چھڑا لیا اور مختلف سمتوں میں بھاگ کھڑے ہوئے۔ وہ الگ الگ اس لئے بھاگے کہ محافظ بھی ان کا پیچھا کرنے کے لئے ٹولیوں میں تقسیم ہو جائیں۔

سلطانہ نے دوڑتے ہوئے سو قدم کا فاصلہ طے کیا ہو گا کہ فائر کی آواز گونجی اور گولی سنسناتی ہوئی اس کے سر کے پاس سے گزری۔ دوڑتے دوڑتے اس نے گردن گھما کر دیکھا۔ تین آدمی اس کے تعاقب میں آ رہے تھے۔ ان میں ایک گورا تھا اور دو ہندوستانی۔ سلطانہ نالیاں' جوہڑ' جھاڑیاں اور گڑھے پھلانگتا' دوڑا جا رہا تھا۔ وہ جان بوجھ کر رکاوٹوں والی جگہوں سے گزر رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ شاید اس طرح اس کا تعاقب کرنے والے جلدی تھک کر اس کا پیچھا چھوڑ دیں گے' لیکن ایسا نہیں ہوا۔ انہوں نے تعاقب جاری رکھا۔

سلطانہ کے جسم پر اب بہت سی خراشیں آ چکی تھیں اور ہوا ٹھنڈی ہونے کے باوجود اس میں آگ سی لگا رہی تھی' مگر وہ اپنے سر پر بہت سے سونے اور سیکڑوں ہیروں کا وزن اٹھائے دوڑا چلا جا رہا تھا۔ اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ جارج پنجم کا تاج کتنا بھاری تھا۔ دوڑنے کے دوران دھیرے دھیرے وہ اس کی پیشانی پر نیچے کی طرف کھسکتا بھی آ رہا تھا۔ حتیٰ کہ اسنے سلطانہ کی آنکھوں کو ڈھانپ ہی لیا۔ اس نے اسے ذرا اوپر کھسکایا اور بدستور دوڑتا رہا۔ پکڑے جانے اور مارے جانے دونوں ہی کا خوف اس کے لئے بھیانک تھا۔

اسے یقین تھا کہ پکڑے جانے کی صورت میں بھی اس کے ساتھ جو سلوک ہوگا وہ ناقابل بیان اذیت لئے ہوئے ہوگا۔ اس کیلئے تو اوندھے لیٹ کر کولہوں پر بید کھانے کا تصور ہی ناقابل برداشت تھا' جبکہ اسے اندیشہ تھا کہ اس کے علاوہ بھی اس کے ساتھ نہ جانے کیا کچھ ہو۔ چنانچہ وہ اندھا دھند دوڑا جا رہا تھا۔ توپوں کی گرج اب بھی اس کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ وہ جمنا کے کنارے پہنچ چکا تھا۔ اب اس کے سامنے دریا تھا اور پیچھے وہ لوگ' جو اس کے خون کے پیاسے تھے۔

دادا نے اسے دوسرے بہت سے کام تو سکھا دیئے تھے' لیکن تیراکی ابھی تک نہیں سکھائی تھی۔ دریا ذرا گہرائی میں تھا اور اس کا کنارا ڈھلوان تھا۔ سلطانہ ذرا سنبھل کر اترتا چلا گیا۔ جب اس نے پانی کی سطح کے قریب پہنچ کر گردن گھما کر اوپر دیکھا تو اسے تینوں آدمی' اوپر کنارے پر کھڑے نظر آئے۔ وہ اپنی بندوقیں سیدھی کر رہے تھے۔ بارہ بور کی بندوقوں کے لئے یہ فاصلہ کچھ بھی نہیں تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ پیچھے تو یقینی طور پر موت کھڑی تھی۔ چنانچہ اس نے اپنا منہ دریا کی طرف کر لیا اور دل ہی دل میں کہا۔ ''جمنا ماتا...... تجھے معلوم ہے میں تیرنا نہیں جانتا...... میں اپنی جان تیرے حوالے کر رہا ہوں...... چاہے ڈبو دے...... چاہے بچا لے......''

دوسرے ہی لمحے اس نے آنکھیں بند کر کے دریا میں چھلانگ لگا دی۔ اس نے تیرنے کے انداز میں ہاتھ پاؤں مارنے کی کوشش کی اور کچھ آگے تک چلا گیا لیکن پھر ڈبکیاں کھانے لگا۔ اس نے مدد کے لئے بھی پکارا' لیکن وہاں بھلا کون اس کی مدد کرنے والا تھا۔ حتیٰ کہ اس نے ایک بار تو کنارے پر کھڑے ''صاحبوں'' سے بھی التجا کی کہ وہ اسے گولی مار دیں' لیکن شاید ان تک اس کی آواز پہنچی ہی نہیں یا پھر اس کے منہ سے صحیح طور پر الفاظ ہی نہیں نکل رہے تھے۔ ایک بار تو اسے بھی لگا کہ وہ بس' بے معنی سے انداز میں چیخ و پکار کر رہا تھا۔

اپنے ڈوبنے ابھرنے کے دوران اس نے کئی بار فائروں کے دھماکے سنے اور اسے لگا کہ اس کے آس پاس پانی میں زوردار چھپاکے بھی سنائی دیئے تھے' تاہم یہ محسوس نہیں ہوا کہ کوئی گولی اسے لگی تھی۔ پھر اس کے ہاتھ پاؤں جواب دے گئے۔ اسے احساس ہوا کہ پانی اس کے سر سے اونچا ہو رہا تھا اور اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ دھیرے دھیرے اس کے حواس مکمل طور پر جواب دے گئے اور اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔

اس کا ذہن جب تاریکیوں میں ڈوب رہا تھا تو اسے امید نہیں تھی کہ وہ دوبارہ بیدار ہوگا' مگر نہ جانے کب اس کی آنکھ کھل گئی۔ چند لمحوں بعد اس کے حواس ذرا بہتر طور پر کام کرنے لگے تو اس نے دیکھا' وہ دریا کے کنارے پڑا تھا' لیکن یہ دریا کا دوسرا کنارا تھا۔ سورج ڈوب رہا تھا۔ وہ لڑکھڑاتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی دھوتی اس کے جسم سے چپکی ہوئی تھی۔ کُرتا کئی جگہ سے پھٹ چکا تھا۔ گھٹنے چھلے ہوئے تھے' تاہم اسے اپنا سر ہلکا محسوس ہو رہا تھا' جس پر اسے حیرت ہوئی۔ غیر ارادی طور پر اس نے سر پر ہاتھ پھیر کر دیکھا اور گہری سانس لے کر رہ گیا۔

تاج اس کے سر پر نہیں تھا...... اس کا مطلب تھا کہ جمنا میا نے اس کی جان تو بخش دی تھی' لیکن شاید نذرانے کے طور پر جارج پنجم کا تاج لے لیا تھا۔ سلطانہ کو تاج کے جانے کا کوئی خاص افسوس نہیں ہوا۔ نئی زندگی ملنے کی خوشی اس نقصان سے بڑھ کر تھی۔ تاج نہ سہی' اب وہ زندگی میں اور نہ جانے کیا کچھ لوٹ سکتا تھا۔ بڑے ہو کر بہت کچھ کر سکتا تھا۔ اس نے جمنا میا کا شکریہ ادا کیا اور اس کے کنارے کنارے چل پڑا۔

چکر کاٹ کر وہ کسی نہ کسی طرح ریلوے سٹیشن پہنچ گیا اور وہیں سے اس خالی زمین پر پہنچ گیا جہاں سب ساتھیوں نے اکٹھے ہونے کا پروگرام بنایا تھا۔ یہ دیکھ کر اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی کہ بھورے' پریتم اور گجندر وہاں موجود تھے۔ حالت تو ان کی بھی کچھ اچھی نہیں تھی' لیکن سب ایک دوسرے کو دیکھ کر اپنی تکلیفیں بھول گئے۔ نگیشر' سرجو اور صادق' بازار سے دال روٹی لینے گئے ہوئے تھے۔ پیسے ان کے پاس نہیں تھے' لیکن ان لوگوں کے لئے یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں تھا۔ سرجو اور صادق نے ایک مال گاڑی کی آڑ میں کسی کو چاقو دکھا کر اس سے کچھ رقم لوٹ لی تھی اور نگیشر نے کسی دکاندار کے پیسے چرا لئے تھے۔

''ہم تو سمجھے تھے' تمہیں گوروں نے پکڑ لیا ہے۔'' پریتم نے سلطانہ سے کہا۔

''تم نے ریل گاڑی میں گھس کر غلطی کی تھی۔'' بھورے نے سلطانہ کو ڈانٹنے کے انداز میں کہا۔

"تمہیں میری غلطیاں یاد دلانے کی پڑی ہوئی ہے......" سلطانہ غصے سے بولا۔

"دیکھ نہیں رہے ہو' میں کس حال میں ہوں؟ تمہیں کیا پتا میں کتنی تکلیف اٹھا کر آ رہا ہوں۔ تین آدمی بندوقیں لئے میرا پیچھا کر رہے تھے' جن میں سے ایک گورا صاحب تھا۔ میں تو جمنا میا میں ڈوب کر یوں سمجھو' مر ہی گیا تھا۔ پتا نہیں کیسے زندہ واپس آ گیا ہوں۔ میں تو اس بھرو سے پر ریل گاڑی میں گھس گیا تھا کہ تم پہرے داروں کو چکر دے کر ریل گاڑی سے دور لے جاؤ گے۔"

"ہم کیا کرتے......ہم وقتی طور پر ان کے قابو میں آ گئے تھے......" بھورے اب تحمل سے بولا۔ "پھر بھی ہم انتظار کر رہے تھے کہ تم کوئل کی آواز نکال کر ہمیں اشارہ دو گے' لیکن تم تو جیسے ریل گاڑی میں جا کر سو ہی گئے تھے۔ تم شاید اپنے آپ کو جارج پنجم کا مہمان سمجھ رہے تھے۔"

"اور تم جارج پنجم کی کوئی چیز چرا کر بھی نہیں لائے ہو۔" گجندر نے اس کا سرتاپا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"تم تو کسی عام چیز کی بات کر رہے ہو...... میں تو جارج پنجم کا تاج پرسر رکھ کر ریل گاڑی سے باہر نکلا تھا۔" سلطانہ نے غصے سے کہا۔

اس کے ساتھیوں نے ہنسنا شروع کر دیا۔ سلطانہ کا غصہ اتنا بڑھا کہ اس نے بھورے کے منہ پر تھپڑ رسید کر دیا اور پریتم کو مارنے کے لئے لپکا۔ پریتم دوڑ پڑا۔ سلطانہ اس کے پیچھے دوڑا۔ پریتم پیپل کے ایک درخت پر چڑھ گیا۔ سلطانہ بھی اس کے پیچھے درخت پر چڑھا' مگر وہ دوسری طرف کود گیا۔ وہ اس دوران بھی مسلسل ہنسے جا رہا تھا۔ سلطانہ کا غصے سے برا حال تھا' لیکن وہ پریتم کا پیچھا چھوڑ کر واپس آ گیا۔ اس دوران نکیشر' سرجو اور صادق بھی لوٹ آئے۔ وہ بھی سلطانہ کو زندہ سلامت دیکھ کر خوش ہوئے' لیکن تاج والی بات سن کر وہ بھی ہنسنے لگے۔

سب نے سلطانہ کا خوب مذاق اڑایا' لیکن اب وہ کچھ نہیں بول رہا تھا۔ روٹھے روٹھے سے انداز میں ایک طرف بیٹھا تھا۔ بڑی مشکل سے اس کے ساتھیوں نے اسے دال روٹی کھانے پر آمادہ کیا۔ کھانے کے بعد وہ درختوں کے نیچے لیٹ گئے' لیکن نیند کسی کو نہیں آ رہی تھی۔ رات اچھی خاصی سرد تھی اور ان کے پاس ایک چادر تک نہیں تھی۔ بہر حال کسی نہ کسی طرح رات کٹ ہی گئی۔

✦

رات سوتے جاگتے ہی گزری تھی۔ سپیدۂ سحر نمودار ہوا تو کہر بھی پڑنے لگی' جس کی وجہ سے ماحول ایک بار پھر دھندلا گیا۔ دن چڑھے کہر ختم ہوئی تو سب لڑکے اٹھ کر ریلوے سٹیشن پہنچ گئے۔ وہاں ایک نلکے پر انہوں نے ہاتھ منہ دھویا اور اپنے حلئے کچھ ٹھیک کئے۔ اس روز جمعرات تھی اور بادشاہ کا دربار عام اتوار کو لگنا تھا۔ سلطانہ سمیت سب لڑکوں نے فیصلہ کیا تھا کہ اب وہ دربار دیکھ کر ہی جائیں گے۔ کھانے پینے اور دیگر اخراجات کے لئے انہیں رقم کی ضرورت تھی' جس کا بندوبست کرنا ان کے لئے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ انہوں نے پلیٹ فارم پر گھومتے پھرتے اس طرح مسافروں کی جیبیں کاٹ لیں کہ کسی کو ان پر شک نہیں گزرا۔

تین دن انہوں نے دلی میں گھومتے پھرتے گزار دیئے۔ انہوں نے خوب سیر کی' لیکن زیادہ تر وہ ریلوے سٹیشن کے آس پاس ہی رہتے۔ اس دوران انہوں نے معمولی معاوضے پر کچھ کاریں اور بگھیاں دھوئیں' ان کی صفائی کی۔ اس قسم کے کام انہوں نے صرف اس لئے کئے کہ کوئی انہیں محض آوارہ گرد نہ سمجھے۔ گو کہ وہ پورا دلی نہیں دیکھ سکے' لیکن شہر کے جتنے حصے میں وہ گھوم پھر سکے' اس میں بھی انہیں بہت لطف آیا۔ انہوں نے زندگی میں کبھی کہیں اتنے گورے' اتنے راجا اور ساہوکار' اتنے ہاتھی گھوڑے اور اتنی موٹر کاریں نہیں دیکھی تھیں اور انہیں حیرت اس بات پر تھی کہ ان سب چیزوں کے باوجود شہر میں کہیں دھول مٹی یا گندگی نہیں تھی۔

ان تین دنوں کے دوران بھی سلطانہ کے ساتھی اس کی کہانی کا مذاق اڑاتے رہے' جو اس نے بادشاہ کا تاج چرانے کے بارے میں سنائی تھی۔ آخر کار سلطانہ نے شری مہاراجہ کی قسم کھا کر انہیں یقین دلانے کی کوشش کی کہ اس نے بادشاہ کا تاج اپنے سر پر رکھا تھا۔ بھورے نے جب اسے زیادہ سنجیدہ ہوتے دیکھا تو اپنی دانست میں بزرگانہ بردباری سے بولا۔ "بھئی اس میں ضد بحث کی کیا بات ہے...... اتوار کو بادشاہ کا دربار لگے گا تو ہم دیکھ لیں گے کہ اس کے سر پر تاج ہے یا نہیں...... اگر تاج بادشاہ کے سر پر ہوا تو اس کا مطلب صاف ظاہر ہو گا اور اگر نہ ہوا تو اس کا

مطلب بھی صاف ظاہر ہوگا۔"

سب بھورے کی اس تجویز پر متفق ہو گئے اور انہوں نے سلطانہ کا پیچھا چھوڑ دیا۔

بادشاہ کے دربار کے لئے قلعے کے قریب' کھلے میدان میں خیموں کا گویا ایک شہر آباد کیا گیا تھا۔ ان میں جارج پنجم' رامپور کے نواب اور دربنگا کے راجہ کے خیمے بھی شامل تھے جو اتنے خوبصورت اور شاہانہ تھے کہ کسی محل کا چھوٹا موٹا نمونہ معلوم ہوتے تھے۔ ان کے قریب' ان کے ملازمین کے لئے خیمے لگائے گئے تھے۔ لڑکے ان خیموں کے قریب نہیں گئے۔ انہیں معلوم تھا کہ اگر کوئی بھگولڑکا ان کے آس پاس منڈلاتا پایا گیا تو اسے گرفتار کر لیا جائے گا۔ سلطانہ کو تو ویسے ہی خطرہ تھا کہ کہیں اسے اس لڑکے کی حیثیت سے پہچان نہ لیا جائے جو بادشاہ کا تاج چرا کر اس کی ریل گاڑی سے نکل بھاگا تھا۔ اگر وہ پکڑا جاتا تو اسے اپنے زندہ بچنے کی امید کم تھی۔

تاہم وہ سب اس میدان کے آس پاس گھومتے رہے' جس میں دربار منعقد ہونا تھا۔ وہ میدان کم از کم آدھا میل طویل اور کم و بیش اتنا ہی چوڑا تھا۔ اس کی حدود کے اردگرد زمین بتدریج بلند ہو رہی تھی۔ درحقیقت یہ ایک مسطح پہاڑی تھی جس کے اردگرد زمین آدھے چاند کی شکل میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس میدان میں ہزاروں افراد آرام سے بیٹھ کر مرکزی حصے کی طرف دیکھ سکتے تھے' جہاں ایک عظیم الشان پنڈال لگایا گیا تھا۔ اس کے اندر ایک آراستہ و پیراستہ سٹیج تھا جس پر شاہانہ انداز کی نشستیں موجود تھیں۔ درحقیقت اس پورے حصے کی آرائش ہی شاہانہ تھی۔ اس میدان میں داخلے کے راستے پر ایک عظیم الشان محراب بنائی گئی تھی اور بادشاہ کی آمد کے راستے کو نہایت خوبصورتی سے سجایا گیا تھا۔

لڑکوں نے بلندی پر اپنے لئے ایک جگہ پہلے ہی منتخب کر لی تھی' جہاں وہ آسانی سے پورے میدان اور شاہی پنڈال کا نظارہ کر سکتے تھے۔ اتوار کو صبح جلد ہی جا کر انہوں نے اپنی وہ جگہ سنبھال لی۔ میدان اور خیموں کے شہر کے درمیان سے گزرنے والے راستے پر دونوں طرف مستعد اور مسلح فوجی تعینات تھے۔ انہیں بادشاہ کی آمد کے لئے بہت انتظار کرنا پڑا۔ سورج تقریباً سر پر آ چکا تھا' جب بادشاہ کا جلوس آتا دکھائی دیا۔ بلندی کی طرف سے توپیں چلنے کی گھن گرج سنائی دی' پھر شہنائیاں بجنے لگیں۔ گھوڑوں اور بگھیوں کا ایک جلوس' داخلے کے راستے پر بنی شاندار محراب کی طرف آ رہا تھا۔ بادشاہ کی بگھی دور سے ہی پہچانی جا رہی تھی۔ وہ کھلی چھت کی بگھی تھی' لیکن سب سے زیادہ شاندار تھی۔

"ضرور وہی بادشاہ کی بگھی ہے۔" بھورے بول اٹھا۔

"تمہیں کیسے پتا ہے؟ تم نے کیا اس سے پہلے بادشاہ کی بگھی دیکھی ہے؟" سلطانہ نے ناگواری سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"ارے بھئی' اسے دیکھنے سے ہی پتا چل رہا ہے کہ وہ بادشاہ کی بگھی ہے۔ وہ سب سے بڑی ہے۔ اس میں سب سے زیادہ گھوڑے جتے ہوئے ہیں اور گورے صاحب لوگ تک سب سے زیادہ اسی کے سامنے جھک رہے ہیں۔" بھورے نے کہا۔

اس کی بات معقول تھی۔ اس دوران انہوں نے بگھی میں بیٹھے بادشاہ کو بھی دیکھ لیا۔ ملکہ اس کے ساتھ تھی۔ بادشاہ نیلے لبادے میں تھا جبکہ ملکہ سفید گاؤن میں تھی۔ بادشاہ کے سینے پر بہت سے تمغے اور ستارے لگے ہوئے تھے۔ سلطانہ کو سب سے زیادہ حیرت یہ دیکھ کر ہوئی کہ اس کے سر پر تاج بھی موجود تھا۔ وہی تاج جو تین دن پہلے سلطانہ اپنے سر پر رکھ کر بھاگا تھا۔ وہ اسے اچھی طرح پہچان سکتا تھا۔ اس میں وہی مختلف رنگوں کے ہیرے جواہر لگے ہوئے تھے' جنہیں سلطانہ نے اچھی طرح دیکھا تھا۔ ان کی ترتیب وہی تھی۔ پورے تاج کی بناوٹ وہی تھی' جو ابھی تک سلطانہ کی آنکھوں میں بسی ہوئی تھی۔ دھوپ میں تاج کے ہیروں کو دیکھ کر ان لوگوں کی آنکھیں یقیناً چندھیا رہی ہوں گی' جو بگھی کے قریب تھے۔

"وہ دیکھو...... جارج پنجم نے تمہارا تاج چرا لیا ہے۔" بھورے نے سلطانہ پر طنز کیا۔

"نہیں...... میرا خیال ہے جمنا ماتا نے اسے ڈبونے کے بجائے کنارے کی طرف اچھال دیا ہوگا۔" نکلیشر بھی طنز کرنے سے باز نہ رہا۔

سلطانہ چپ تھا اور ایک ٹک تاج کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ اس کے خیال میں بہرحال یہ کوئی انہونی بات نہیں تھی کہ تاج بادشاہ کے سر پر موجود تھا۔ عین ممکن تھا کہ جب وہ دریا میں ڈبکیاں کھاتے ہوئے بے ہوش ہو گیا ہو تو تاج اس کے سر سے اتر گیا ہو' لیکن اس کا تعاقب کرنے والوں نے اسے ڈوبنے نہ دیا ہو اور پانی سے نکال کر لے گئے ہوں۔ شاید اسی جدوجہد میں انہوں نے سلطانہ کی طرف توجہ نہیں دی تھی اور وہ کسی طرح زندہ سلامت دوسرے کنارے پر پہنچ گیا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے تھا کہ بادشاہ کے آدمیوں نے اپنی بدنامی کے ڈر سے تاج کے چوری ہونے کا ذکر بادشاہ یا کسی اور کے سامنے کیا ہی نہ ہو۔ اس صورت میں ان کے خلاف کارروائی بھی ہو سکتی تھی۔

سلطانہ کی نظر تاج سے ہوتی ہوئی بادشاہ کے چہرے پر آن رکی۔ وہ گویا اس کے چہرے پر حقیقت تلاش کر رہا تھا' مگر بادشاہ کے چہرے سے کچھ بھی پڑھنا ممکن نہیں تھا۔ وہ بس مسکرا رہا تھا۔ شاید اپنے شاندار استقبال پر خوش ہو رہا تھا۔ سلطانہ کو بادشاہ بہت ہی گورا لگ رہا تھا۔ اس نے آج تک جتنے بھی انگریز دیکھے تھے' وہ ان سب سے زیادہ گورا تھا۔ تاج کے نیچے سے اس کے جو تھوڑے بہت بال نظر آ رہے تھے' وہ سرخ رنگ کے تھے۔ اس کے سر پر رکھا ہوا تاج گویا سلطانہ کا منہ چڑا رہا تھا۔ سلطانہ سوچ رہا تھا کہ بادشاہ کی قسمت یقیناً بہت اچھی ہوتی ہے۔ ظاہر ہے' اسی لئے وہ بادشاہ ہوتے ہیں۔ ان کی چیزیں تو شاید دریا بھی واپس کر دیتے ہیں۔ اب سلطانہ کو یقین ہو گیا تھا کہ جب وہ دریا میں ڈبکیاں کھا رہا تھا اور اسے گردوپیش کا ہوش نہیں رہا تھا تو تاج اس کے سر سے اتر گیا تھا اور اس کا تعاقب کرنے والوں نے تاج کو ڈوبنے نہیں دیا تھا۔ وہ اس سے پہلے ہی تاج تک پہنچ گئے تھے۔

لڑکے گو کہ بادشاہ کی سواری سے کافی دور تھے' لیکن ان کی نظریں بہت تیز تھیں۔ وہ سارا نظارہ نہایت آسانی سے اور صاف طور پر دیکھ رہے تھے۔ بادشاہ کے راستے میں دونوں طرف گھڑ سوار بھی کھڑے تھے۔ ان میں سے کچھ کے ہاتھوں میں تیر کمانیں' کچھ کے ہاتھوں میں جھنڈے تھے۔ چاروں طرف تالیوں' شہنائیوں اور نعروں کا شور برپا تھا۔ سٹیج پر بہت سے نواب اور راجہ' بادشاہ کے استقبال کے لئے کھڑے تھے۔

جب بادشاہ اسٹیج پر پہنچا تو سب نواب اور راجا اس کے سامنے کورنش بجالائے۔ پھر انہوں نے اطاعت گزاری کے اظہار کے لئے باری باری آگے بڑھ کر اپنی اپنی تلواریں بادشاہ کے قدموں میں رکھ دیں۔ بادشاہ کا اشارہ پا کر ایک فوجی ہر راجا اور نواب کی تلوار اٹھا کر اسے واپس دیتا رہا۔ ان نوابوں اور راجاؤں کے درمیان سلطان نے رام پور کے نواب کو بھی دیکھا' جنہیں وہ اپنے دادا کے ساتھ رام پور جانے کے دوران کئی بار دیکھ چکا تھا۔ اس کے دادا' نواب صاحب کے سامنے دور ہی سے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو جاتے تھے اور نواب صاحب کے رعب سے ان کے ہاتھوں میں ہلکی سی کپکپاہٹ آ جاتی تھی' لیکن سلطانہ دیکھ رہا تھا کہ یہاں نواب صاحب خود جارج پنجم کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔

سلطانہ کا دل چاہا کہ وہ بھی بادشاہ کے سامنے سٹیج پر چلا جائے اور ہاتھ باندھ کر اس بات پر اس سے معافی مانگ لے کہ اس نے اس کا تاج چرانے کی کوشش کی تھی۔ اس نے دل ہی دل

میں تو ایسا کر لیا تاہم عملی طور پر ایسا کرنے سے اپنے آپ کو باز رکھا۔ بادشاہ اور ملکہ تخت پر بیٹھ چکے تھے۔ گورے صاحب جنہوں نے لمبے لمبے کوٹ پہنے ہوئے تھے' باری باری تقریریں کرنے لگے۔

وہ لوگ زیادہ دیر تک تقریریں نہیں سن سکے۔ ویسے بھی ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ چنانچہ وہ واپس سٹیشن چلے گئے۔ بھورے کافی خوش نظر آ رہا تھا' جبکہ سلطانہ کچھ بجھا بجھا سا تھا۔ اس سہ پہر انہوں نے ایک میل ٹرین پکڑی اور بجنور واپس روانہ ہو گئے۔ سلطانہ کو اندازہ تھا کہ اس کے دادا کتنی بے چینی سے اس کا انتظار کر رہے ہوں گے اور اسے خالی ہاتھ دیکھ کر وہ کتنے مایوس ہوں گے۔ ان کا قیام بھی دلی میں ذرا طویل رہا تھا۔ ان کے پاس اتنے دنوں کے لئے پاس نہیں تھے۔ چنانچہ انہیں قلعے کے قوانین کی اس خلاف ورزی پر سزا بھی مل سکتی تھی۔

ٹرین میں وہ ستو کھاتے جا رہے تھے' جو انہوں نے دلی سے لئے تھے۔ ٹرین میں بہت کم لوگ تھے۔ دلی کی طرف آنے والی ٹرینوں میں کافی رش تھا' کیونکہ ہر طرف سے لوگ بادشاہ کا دربار دیکھنے آ رہے تھے۔ واپس جانے والے بہت کم تھے۔ ٹرین کبھی کھیتوں کے قریب سے اور کبھی ویرانوں کے درمیان سے گزر رہی تھی۔ وہ لوگ بیزاری نظروں سے کھڑکیوں سے باہر دیکھ رہے تھے۔ ان کے کمپارٹمنٹ میں ایک بنیا اپنی بیوی اور بیٹیوں کے ساتھ موجود تھا۔ سلطانہ نے اس کی بیٹیوں کو شمار کیا وہ چھ تھیں۔

ٹرین کو دلی سے روانہ ہوئے ایک گھنٹہ گزر گیا تو بنیا لمبی سیٹ پر لیٹ کر جلد ہی خراٹے لینے لگا۔ سلطانہ کو اس کے گلے میں سونے کی ایک اچھی خاصی موٹی چین دکھائی دی۔ اس کی بیوی جس کے بالوں میں منگل سوتر لپٹا ہوا تھا' سونے کے کئی زیور پہنے ہوئے تھی۔ لڑکیوں نے بھی چھوٹے موٹے کئی زیور پہنے ہوئے تھے۔ حتیٰ کہ سب سے چھوٹی لڑکی جو ایک ڈیڑھ سال کی تھی' اس کی کلائی میں بھی سونے کی چوڑیاں نظر آ رہی تھیں۔

بھورے اور نکیشر بار بار سلطانہ کی طرف دیکھ رہے تھے اور آنکھوں ہی آنکھوں میں بنئے' اس کی بیوی اور بیٹیوں کی طرف اشارہ کر رہے تھے۔ تاہم سلطانہ کچھ سست سے انداز میں بیٹھا ہوا تھا۔ پھر بنئے کی بیوی نے ایک پوٹلی کھولی اور گھی سے چپڑی ہوئی روٹیاں نکال کر دال اور بھاجی کے ساتھ کھانے لگی۔ بیٹیاں بھی اس کے ساتھ کھانے میں شریک تھیں اور ان کے منہ سے چپ چپ کی آوازیں نکل رہی تھیں۔

کھانے کی خوشبوؤں سے ان کے دل للچا رہے تھے۔انہوں نے اس روز صرف ستو کھائے تھے۔سلطانہ سوچ رہا تھا کہ کاش وہ لوگ ان کے سامنے کھانا شروع نہ کرتے۔بنیا بھی اٹھ بیٹھا تھا اور اپنے کنبے کے ساتھ کھانے میں شریک ہو گیا تھا۔

اسے چپڑ چپڑ کر کے کھاتے دیکھ کر نہ جانے کیوں سلطانہ کو غصہ آ گیا۔اسے یوں لگا جیسے بنیا اور اس کے گھر والے گھی میں تر بہ تر جو روٹیاں اور بگھارے ہوئے سالن کھا رہے تھے' ان پر اس کا اور اس کے دوستوں کا بھی حق تھا' جو ستو کھا کر گزارا کر رہے تھے۔پھر اس کی سوچوں کے دائرے کچھ اور دور تک پھیلتے چلے گئے۔اسے یوں لگا جیسے اس بنئے ہی کی طرح دنیا کے زیادہ تر لوگ انہی کے منہ سے نوالے چھین چھین کر کھا رہے تھے۔

صرف یہی نہیں' بلکہ بنئے نے دو چار مرتبہ ان کی طرف دیکھا بھی تھا تو سلطانہ نے اس کی آنکھوں میں خاصی حقارت محسوس کی تھی۔اسے یقیناً بہت اچھی طرح اندازہ تھا کہ وہ نہایت غریب گھروں کے آوارہ گرد قسم کے لڑکے تھے۔

سلطانہ کے دل میں اٹھتا ہوا نفرت کا ابال لمحہ بہ لمحہ بڑھتا گیا۔آخر وہ اس فیصلے پر پہنچ گیا کہ بنئے کو سزا دینا ضروری تھا۔اچانک وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور آگے بڑھ کر بنئے کی بنچ نما سیٹ پر پاؤں رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ذرا آگے کو جھکتے ہوئے اس نے تحکمانہ انداز میں ہاتھ ہلا کر بنئے سے کہا۔''اپنی پتنی اور بیٹیوں سے کہو کہ سارے زیور اتار کر مجھے دے دیں۔''

بنئے کیلئے اس کا یہ حکم یقیناً حیرت کا باعث تھا۔اس نے صرف ایک لمحے کیلئے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔وہ خوفزدہ ہرگز نہیں تھا۔اس کی نظر سلطانہ کے چہرے سے ہٹ کر اس کے پاؤں پر آ رکی جو اس نے بنئے کی سیٹ پر ٹکایا ہوا تھا۔وہ حقارت سے ناک سکیڑ کر بولا۔''ابے پاؤں تو نیچے کر...... اگر میرے شریر (جسم) سے چھو گیا تو میرا دھرم بھرشٹ ہو جائے گا۔مجھے اگلے سٹیشن پر اتر کر اشنان (غسل) کرنا پڑے گا۔''

''تیرے اشنان کی ایسی کی تیسی......'' سلطانہ نے شدید غصے اور نفرت سے کہا۔ساتھ ہی اس کا ہاتھ تیزی سے گھوما۔ایک زوردار تھپڑ بنئے کے منہ پر پڑا۔وہ سیٹ سے گرتے گرتے بچا۔سلطانہ ابھی بمشکل تیرہ سال کا تھا' لیکن پر مشقت زندگی اور دادا کی تربیت نے اس کے جسم کو گویا لوہا بنا دیا تھا۔کچھ چیزیں خداداد بھی ہوتی ہیں۔سلطانہ کے چھریرے جسم میں بے پناہ لوچ اور لچک کے باوجود فولاد کی سی مضبوطی بھی تھی۔اس کے ہاتھ نے شاید ہتھوڑے کا سا کام کیا تھا۔

ایک لمحے کے لئے تو وہ جیسے حواس ہی کھو بیٹھا تھا۔

ذرا سنبھل کر اس نے دوبارہ سلطانہ کی طرف دیکھا تو اسے اس کے ہاتھ میں چاقو نظر آیا' جس کا جھلملاتا پھل نہایت خوفناک لگ رہا تھا۔اب اس کے سامنے اکیلا سلطان ہی نہیں' اس کے سب ساتھی بھی کھڑے تھے۔انہوں نے بنئے اور اس کے کنبے کو گھیرے میں لے لیا تھا اور ان سب ہی کے ہاتھوں میں چاقو تھے۔اب تو بنئے' اس کی بیوی اور بیٹیوں کے اوسان خطا ہو گئے۔ان کے دہشت زدہ چہرے دیکھ کر سلطانہ کے دل کو کچھ تسکین ملی اور جارج پنجم کا تاج ہاتھ سے جانے کا صدمہ بھی ذرا کم ہو گیا۔

انہوں نے بنئے کی بیوی اور بیٹیوں کے تمام تر زیورات اتروا لئے۔سونے کی کوئی چیز انہوں نے ان کے جسم پر نہیں چھوڑی۔حتیٰ کہ ایک سال کی بچی کی ننھی ننھی چوڑیاں بھی اتروا لیں۔اس نے رونا شروع کر دیا۔سلطانہ اسے بھی ایک تھپڑ رسید کرنے لگا تھا' مگر پھر رک گیا تھا۔اسے خیال آ گیا تھا کہ وہ تو بہت ہی چھوٹی تھی۔کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ زیادہ زور سے تھپڑ لگنے پر وہ دماغ کی کوئی رگ وغیرہ پھٹنے کے باعث مر ہی جاتی۔

اگلے سٹیشن پر وہ لوگ ٹرین کے رکنے سے پہلے ہی چھلانگیں لگا کر اتر گئے اور بجنور جانے کے بجائے وہیں سے کسی طرح براہ راست نجیب آباد آ گئے۔انہیں خطرہ تھا کہ بجنور میں انہیں پولیس پکڑ لے گی...... بلکہ عین ممکن ہے کہ وہ ان کی منتظر ہو۔نجیب آباد کے قلعے میں بھی ان کا کوئی اچھا استقبال نہیں ہوا' کیونکہ انہوں نے اس سے کہیں زیادہ وقت قلعے سے باہر گزارا تھا' جتنے کی انہیں اجازت تھی۔گو کہ سلطانہ کے دادا اس وقت بھی قلعے کے گیٹ پر اپنی ڈیوٹی پر موجود تھے۔جب وہ وہاں پہنچے لیکن دادا انہیں ایڈجونٹ آنند کے آدمیوں کے عتاب سے نہیں بچا سکے۔

انہوں نے پہلے تو سلطانہ اور اس کے ساتھیوں کی تھپڑوں سے تواضع کی پھر سلطانہ کو تین دن اور تین رات کے لئے...... جبکہ اس کے ساتھیوں کو دو دن اور دو رات کے لئے اس چھوٹی سی جیل میں بند کر دیا گیا جو قلعے کے اندر ہی موجود تھی۔یہ گویا بڑی جیل کے اندر ایک چھوٹی جیل تھی۔سلطانہ کے ساتھیوں کو اس لئے ذرا کم سزا ہوئی تھی کہ وہ عمر میں سلطانہ سے بھی چھوٹے تھے۔سلطانہ کو صرف 72 گھنٹے قید کی سزا ہی نہیں ہوئی بلکہ جیل میں اس کی پیٹھ پر پانچ بید بھی لگائے گئے۔

سلطانہ کو یہ تو غنیمت لگا کہ بید رسید کرنے کیلئے اسے قلعے کے میدان میں لوگوں کے مجمع کے درمیان اوندھا نہیں لٹایا گیا' بلکہ جیل میں ہی ایک ٹکٹکی پر باندھ کر بید رسید کئے گئے اور اس دوران اس کی دھوتی اوپر نہیں کھسکائی گئی۔ اس کے باوجود سلطانہ نے بہت ذلت محسوس کی۔

رات کو وہ جیل کی تنگ سی کوٹھری میں فرش پر بچھی کھردری چٹائی پر چت نہیں لیٹ سکا۔ کولہوں میں بڑی تکلیف اور جلن تھی۔ وہ اوندھا لیٹ کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے دھندلائی ہوئی تھیں' لیکن سینے میں جیسے آگ سی بھڑک رہی تھی۔ لہو گویا نفرت کا لاوا بن کر اس کی رگوں میں دوڑ رہا تھا۔ شدید غصے سے دانت بھینچے وہ یہی سوچے جارہا تھا کہ آخر ان لوگوں کے مقدر میں اتنی ذلت کیوں لکھی ہوئی تھی؟ انہیں اپنی چھوٹی چھوٹی خواہشیں پوری کرنے کے لئے دوسروں سے مال وزر کیوں چھیننا پڑتا تھا؟

سچی بات یہ تھی کہ سلطانہ روں سے چھیننا اچھا نہیں لگتا تھا' لیکن شاید اپنے حالات کی وجہ سے ایک عجیب سی نفرت اس کے دل و دماغ پر غالب آجاتی تھی۔ اسے وہ سارے لوگ برے لگنے لگتے تھے' جو اسے اپنے سے کہیں زیادہ خوشحال دکھائی دیتے تھے' جو حقارت سے اس جیسے لوگوں کی طرف دیکھتے تھے' جو ذرا اکڑ کر ادھر اُدھر گھومتے پھرتے دکھائی دیتے تھے اور جن کے پاس کسی نہ کسی قسم کے اختیارات تھے۔ اسے ایسا لگتا تھا کہ جیسے ان سب چیزوں میں اس کا بھی حصہ تھا' جو دوسروں نے اس سے چھین لیا تھا۔ اسے یہ بھی لگتا تھا کہ اسے ملنے والی سزائیں اور لوگوں کا حقارت بھرا سلوک اس کا مقدر ہرگز نہیں تھا' بلکہ یہ سب کچھ لوگوں نے ہی زبردستی اس پر تھوپ دیا تھا۔

تین دن' تین راتوں تک وہ جیل کی تنگ و تاریک کوٹھری میں پڑا جلتا کڑھتا رہا اور اس کی نس نس میں گویا نفرت کا زہر گھلتا رہا۔ غنیمت تھا کہ قلعے میں آنے سے پہلے وہ اپنے لوٹے ہوئے زیور باہر ہی ایک محفوظ سی جگہ دیکھ کر زمین میں دبا آئے تھے۔ اگر وہ زیورات ان کے پاس سے برآمد ہوجاتے تو یقیناً انہیں فوری طور پر پولیس کے حوالے کردیا جاتا اور وہاں ان کے ساتھ اس سے بھی برا سلوک ہوتا۔ قلعے میں بید مارے جانے کی سزا صرف سلطانہ ہی کو ملی تھی' کیونکہ اس کی حیثیت کم عمر لڑکوں کے اس گروہ میں سردار کی سی تھی۔

گجندر سنگھ کو تو سرے سے کوئی سزا ہی نہیں ملی تھی' کیونکہ وہ باہر ہی سیدھا اپنے باپ کی زمین پر چلا گیا تھا' جسے معلوم ہی نہیں تھا کہ وہ سلطانہ کے ساتھ تھا۔ گجندر نے اپنی غیر حاضری

کے بارے میں کوئی کہانی گھڑ کر باپ کو سنا دی تھی۔ اسی نے بعد میں لوٹ کا مال زمین سے نکال کر سلطانہ کے دادا کے ہاتھ سب کو ان کا حصہ پہنچا دیا تھا اور اپنا حصہ رکھ لیا تھا۔ انہوں نے آتے وقت ہی لوٹ کے مال کے حصے بخرے کر لئے تھے اور طے کر لیا تھا کہ کون سی چیز کون لے گا۔

سلطانہ کے حصے میں بنئے کی بیوی کا منگل سوتر آیا تھا' جس میں کافی سونا لگا ہوا تھا۔ اس کے دادا گیٹ پر اپنی ڈیوٹی ختم کرنے کے بعد روزانہ رات کو اس سے ملنے آتے تھے۔ وہ اسے خوب تسلیاں دیتے تھے اور اس کا حوصلہ بڑھاتے تھے۔ تیسری رات وہ آئے تو منگل سوتر ان کے پاس موجود تھا۔ جیل کا گارڈ جب دادا پوتے کو کوٹھری میں چھوڑ کر چلا گیا تو گلفی اپنی جیب سے منگل سوتر نکالتے ہوئے بولا۔ ''میں نے تو تجھے بادشاہ کو لوٹنے یا اس کی کوئی چیز چرانے کے لئے بھیجا تھا۔ یہ منگل سوتر کہاں سے آگیا؟''

''بس...... دادا...... میں بادشاہ تک نہیں پہنچ سکا اور نہ ہی اس کی کوئی چیز چرا سکا۔'' سلطانہ نے دادا سے نظر چراتے ہوئے ذرا شرمندگی سے کہا۔ ''یہ تو بس راستے میں ایک داؤ لگ گیا۔ اس کی نشانی ہے۔ خالی ہاتھ گھر واپس آنے سے تو پھر بھی اچھا ہے نا......''

''لیکن میں نے تو سنا ہے تو نے بادشاہ کا تاج چرا لیا تھا۔ وہ کہاں گیا؟'' دادا نے نرمی سے پوچھا۔

سلطانہ نے بری طرح چونک کر دادا کی طرف دیکھا۔ دادا بظاہر سنجیدہ نظر آرہے تھے' لیکن سلطانہ کو کچھ شبہ سا ہوا کہ ان کی گھنی مونچھوں کے نیچے' ان کے سوکھے سے ہونٹوں پر بہت ہلکی سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

''آپ کو یہ بات کس نے بتائی؟'' سلطانہ نے جاننا چاہا۔

''وہ...... بھورے کچھ ذکر کر رہا تھا۔'' دادا کے انداز میں بے پروائی تھی۔

''وہ یونہی بکواس کر رہا ہوگا...... میں نے چرس پی کر شاید اس کے سامنے کچھ الٹی سیدھی ہانک دی تھی۔'' سلطانہ بولا۔ وہ اب اس قصے سے جان ہی چھڑانا چاہتا تھا۔ اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ اس کے لئے کسی کو بھی اس بات کا یقین دلانا تقریباً ناممکن ہوگا۔ اس لئے اب یہ تذکرہ ہی فضول تھا۔

''چرس تو میں نے ابھی تک تجھے دی ہی نہیں...... اور مجھے پتا ہے تو نے ابھی چرس پینا شروع بھی نہیں کی۔'' گلفی نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔

"وہ...... دلی میں ہم نے تھوڑی سی خرید لی تھی۔ کچھ میں نے بھی پی لی...... پہلی بار پی تھی...... دماغ کو چڑھ گئی۔ پتا نہیں' میں بھورے سے کیا کیا الٹی سیدھی باتیں کرتا رہا۔" سلطانہ نے ایک بار پھر دادا سے نظر چرالی۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ دادا اس کے جھوٹ کو سمجھ رہے ہیں۔ انہیں یقین آ گیا ہے کہ اس نے تاج چرایا ضرور تھا' مگر وہ اسے گنوا بیٹھا۔ وہ دوسروں کی طرح اس کی کہانی کو جھوٹ نہیں سمجھ رہے تھے۔ تاہم اسے کچھ شرمندہ اور اس موضوع سے گریزاں دیکھ کر انہوں نے بات بدل دی اور اسے تسلی دینے لگے کہ صبح اسے اس مختصر سزائے قید سے نجات مل جائے گی۔ وہ اسے مختصر سزا قرار دے رہے تھے' جبکہ سلطانہ کو تین دن اور تین راتیں' تین سالوں کے برابر محسوس ہوئی تھیں۔

دوسرے روز وہ رہا ہوا تو اس کی تکلیف میں کچھ کمی تھی' لیکن اس کے سینے میں نظام' سماج اور بہت سے افراد کے بارے میں نفرت کی آگ بدستور بھڑک رہی تھی' جس کی وجہ سے وہ غصے میں تھا۔ جونہی بھورے سے اس کا سامنا ہوا' اس نے اس کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ رسید کیا۔ وہ ہکا بکا رہ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا' سلطانہ نے اسے دبوچا اور نیچے گرا لیا۔ وہ بھورے کے سینے پر چڑھ بیٹھا اور اس کا گریبان دونوں ہاتھوں میں جکڑ کر اسے جھنجھوڑتے ہوئے بولا۔ "اگر آئندہ تم نے تاج والی کہانی کسی اور کو سنائی تو میں تمہاری گردن توڑ دوں گا۔"

بھورے اس کا غصہ دیکھ کر خوفزدہ ہونے کے ساتھ ساتھ حیرت زدہ بھی رہ گیا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اس کے سینے میں کیسی آگ بھڑک رہی تھی۔ بہرحال اس نے فوراً ہاتھ جوڑ کر معافی مانگ لی اور وعدہ کیا کہ وہ آئندہ بادشاہ کے تاج والی کہانی زبان پر نہیں لائے گا۔ ان میں سے کسی کو بھی نہیں معلوم تھا کہ جس وقت وہ یہ باتیں کر رہے تھے۔ اس وقت دلی میں پولیس کے کچھ انگریز افسر اپنے دفتر میں بیٹھے سرگوشیوں میں ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے کہ خدا نے ان کی عزت رکھ لی کہ بادشاہ کا تاج جو چوری ہو گیا تھا' بروقت مل گیا' ورنہ ان کا نہ جانے کیا حشر ہوتا۔



اسی طرح ایک سال اور بیت گیا۔ اس ایک سال کے دوران سلطانہ جسمانی طور پر کچھ اور مضبوط ہو گیا۔ جرائم کے میدان میں اس کا تجربہ کچھ اور بڑھ گیا۔ ہر تھوڑے عرصے بعد کوئی نہ کوئی ایسا واقعہ بھی رونما ہو جاتا تھا' جو اس کے سینے میں بھڑکتی ہوئی آگ کو ہوا دے دیتا تھا۔ اگر وہ آگ ذرا مدھم پڑنے بھی لگتی تو سماج ہی اسے دوبارہ بھڑکانے کا سبب بن جاتا تھا۔ تاہم وہ اس

آگ کو سینے میں چھپائے پھرتا رہتا تھا۔ کسی سے اس بارے میں کچھ نہیں کہتا تھا۔

وہ چودہ سال کا ہوا تو اس کے دادا کو اس کی شادی کی فکر ستانے لگی۔ انہیں قلعے سے نجات پانے کی کوئی فکر نہیں تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ انہیں اب قلعہ ہی اپنا گھر محسوس ہونے لگا تھا اور وہ وہیں رہ کر تمام معمولات زندگی انجام دینے کے عادی ہو گئے تھے۔ وہ سلطانہ کے رشتے کی بات کرنے مراد آباد' اپنے قبیلے کی پنچایت میں چلے گئے۔ انہوں نے بریندر جی کی بیٹی پتلی کا رشتہ سلطانہ کے لئے مانگ لیا۔ یہ لوگ بھی قلعے میں ہی رہتے تھے۔ پتلی کی ایک بڑی بہن بھی تھی جس کا نام لکشمی تھا' لیکن اس کے لئے ابھی تک کوئی رشتہ نہیں آیا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ انگریزوں کی تبلیغ سے بہت متاثر ہو گئی تھی اور ہر وقت ان کی دی ہوئی کتابیں پڑھتی رہتی تھی' جن میں عیسائیت کا پرچار ہوتا تھا۔

اس کے بارے میں مشہور ہو چکا تھا کہ وہ تقریباً عیسائی ہو چکی ہے۔ اس کے گھر والے اس سلسلے میں اس سے کوئی سختی نہیں کرتے تھے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ لکشمی کے رجحانات کی وجہ سے قلعے کا انگریز عملہ اس پر مہربان رہتا تھا۔ جب قلعے میں باہر سے کوئی انگریز افسر یا کوئی اور سفید فام شخصیت آتی تھی تو لکشمی کو خاص طور پر اس سے ملوایا جاتا تھا۔ لکشمی کی اپنی گویا ایک الگ ہی شخصیت بن گئی تھی۔ اس کا خود اپنے خاندان سے بھی تعلق کچھ کم ہو گیا تھا۔

پتلی اسی لکشمی کی چھوٹی بہن تھی۔ بریندر جی بھنتوؤں کی ایک قدرے اعلیٰ نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ لوگ "ڈھولیا بھنتو" کہلاتے تھے۔ ان کی رنگت عام بھنتوؤں کے مقابلے میں کافی صاف ہوتی تھی...... اور پتلی تو اچھی خاصی گوری تھی۔ سلطانہ کے دادا کی نظر انتخاب خاص طور پر اسی لئے پتلی پر پڑی تھی۔ انہوں نے تو سلطانہ سے کہہ بھی دیا تھا۔ "تیرا بیاہ پتلی سے ہو گیا تو تیرے بچے گورے ہوں گے۔ لوگ انہیں بھنتو کے بجائے برہمن یا بنیا سمجھا کریں گے۔"

سلطانہ یہ بات سن کر ذرا شرمیلے سے انداز میں مسکرا کر رہ گیا تھا۔

گلفی نے جب پنچایت میں بریندر جی سے سلطانہ کے لئے پتلی کا رشتہ مانگا تو انہوں نے کوئی پس و پیش نہیں کی' لیکن فوراً ہی یہ ضرور جتا دیا کہ وہ اعلیٰ نسل کے بھنتو تھے اور ان کی بیٹی گوری تھی' اس لئے "موچھ" کی رقم بہت زیادہ ہوگی۔ "موچھ" وہ رقم تھی جو رشتہ طے ہونے پر لڑکے کا باپ لڑکی کے باپ کو ادا کرتا تھا۔ بریندر جی نے پانچ سو روپے کا مطالبہ کیا جو بلاشبہ ایک ہوشربا رقم تھی' تاہم گلفی کی پیشانی پر بل نہ آیا۔

دراصل گلفی نے وہ منگل سوتر سنبھال کر رکھا ہوا تھا' جو ایک سال پہلے سلطانہ نے ٹرین میں بنئے کی بیوی سے چھینا تھا۔ اس منگل سوتر کی بناوٹ میں کافی سونا استعمال کیا گیا تھا۔ گلفی نے موچھ کی رقم کے طور پر وہ منگل سوتر نکال کر بریندر جی کے سامنے رکھ دیا۔ اس منگل سوتر کو دیکھ کر بریندر جی کی آنکھیں خوشی سے پھیل گئیں۔ اس میں استعمال کیا گیا سونا پانچ سو روپے سے زیادہ مالیت کا تھا۔ چنانچہ ہنسی خوشی رشتہ طے پا گیا۔

اب مسئلہ شادی کا تھا۔ گلفی کو معلوم تھا کہ ایڈ جونٹ آنند کی اجازت کے بغیر شادی نہیں ہو سکتی...... اور آنند سے اجازت ملنے کی کوئی امید نہیں تھی' کیونکہ لڑکا اور لڑکی دونوں کم عمر تھے۔ ملک میں انگریز کا قانون چلتا تھا اور اس کے مطابق سلطانہ اور تپلی کی شادی کی عمر نہیں تھی۔ ادھر بریندر جلد از جلد لڑکی کو رخصت کر دینا چاہتے تھے۔ انہیں فی الحال اپنی بڑی بیٹی لکشمی کی شادی کی تو کوئی امید نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ سوچ رہے تھے کہ جس بیٹی کا رشتہ آ گیا تھا' کم از کم اس کا بوجھ ان کے سر سے اتر جائے۔

چنانچہ قلعے میں ہی بریندر جی کے کمرے میں خفیہ طور پر شادی کر دی گئی۔ اس موقع پر ایک دعوت کا اہتمام کیا گیا' جس میں ایڈ جونٹ آنند اور قلعے کے عملے میں شامل دو تین انگریزوں نے بھی شرکت کی' لیکن انہیں یہی بتایا گیا کہ ابھی سلطانہ اور تپلی کی صرف منگنی ہوئی تھی' جب وہ قانونی طور پر شادی کی عمر کو پہنچیں گے تو شادی بھی کر دی جائے گی۔ آنند اور انگریز خوشی خوشی کھانا وغیرہ کھا کر چلے گئے۔

اس تقریب کو ابھی دو دن ہی گزرے تھے کہ دلی سے سب انسپکٹر تیرتھ سنگھ تین کانسٹیبلوں کے ساتھ قلعے میں آیا اور ایڈ جونٹ آنند سے ملا۔ پولیس کا یہ سب انسپکٹر قلعے والوں کے لئے اجنبی نہیں تھا۔ وہ کبھی کبھار کسی معاملے کی تفتیش یا کسی کیس کی تحقیقات کے سلسلے میں قلعے میں آتا رہتا تھا۔ اس روز پوجا پاٹ کے بعد آنند نے اعلان کر دیا کہ دس سے پندرہ سال تک کی عمر کے سب لڑکے قلعے کے گیٹ کے قریب پہنچ جائیں۔ تیرتھ سنگھ وہاں ان سے ایک ڈکیتی کے سلسلے میں پوچھ گچھ کرے گا۔

سلطانہ اور اس کے ساتھیوں کو کوئی تشویش نہ ہوئی۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ تیرتھ سنگھ جس ڈکیتی کی تفتیش کرنے آیا ہے۔ وہ ایک سال پرانی ہے۔ وہ تو ٹرین میں بنئے اور اس کی بیوی' بیٹیوں کو لوٹنے کے واقعے کو بھول چکے تھے۔ انہیں گمان تک نہیں تھا کہ اتنے دنوں بعد بھی کسی

واردات کی تفتیش ہو سکتی ہے۔ وہ یہی سمجھ رہے تھے کہ شاید پولیس اس معاملے میں ٹامک ٹوئیاں مار کر بیٹھ گئی ہے اور اب بات ختم ہو چکی ہے۔ چنانچہ وہ سب بے خوف و خطر قلعے کے گیٹ کے قریب' آنند کے دفتر کے سامنے پہنچ گئے۔ دس سے پندرہ سال کی عمر کے تقریباً پچاس لڑکے تنے میں موجود تھے۔ ان میں سے بعض کے والدین یا سرپرست بھی ان کے ساتھ تھے۔

سب انسپکٹر تیرتھ سنگھ آنند کے دفتر کے سامنے کرسی میز لگائے بیٹھا تھا۔ کانسٹیبلوں نے تمام لڑکوں کو ایک قطار میں کھڑا کر دیا اور حکم دیا کہ جب انہیں اشارہ ملے تو وہ باری باری اور دھیرے دھیرے چلتے ہوئے تیرتھ سنگھ کے سامنے سے گزریں۔ یہ ایک قسم کی شناختی پریڈ تھی۔

پریڈ شروع ہونے سے پہلے تیرتھ سنگھ تقریر کرنے کے سے انداز میں بولا۔ ''دلی سے بجنور آنے والی ایک ریل گاڑی میں ایک سال پہلے ڈکیتی ہوئی تھی' لیکن اس کی تفتیش نہ جانے کون کون سے پولیس افسران کے پاس رہی جو اِدھر اُدھر جھک مارتے رہے۔ آخر کار یہ تفتیش دو روز پہلے میرے سپرد ہوئی۔ میں نے فریادی کو بلایا اور اس سے لڑکوں کا حلیہ پوچھا۔ ابھی اس نے صرف اتنا ہی کہا تھا کہ وہ بہت غریب سے گھروں کے لڑکے معلوم ہوتے تھے' مگر بہت تیز اور نڈر تھے۔ میں نے اس کی بات کاٹ کر پوچھا کہ کیا وہ بھنتو معلوم ہوتے تھے؟ اس نے ذرا شک والے لہجے میں کہا کہ ہاں' بھنتو بھی ہو سکتے تھے۔ بس میں فوراً سمجھ گیا کہ مجھے تفتیش کے لئے کہاں جانا چاہئے۔ میں ان گدھے پولیس افسروں کی طرح نہیں ہوں جو ایک سال تک نہ جانے کہاں کہاں جھک مارتے رہے۔ میں تو دو باتیں سنتے ہی سمجھ گیا کہ جن لڑکوں کی مجھے تلاش ہے' وہ مجھے یہاں ملیں گے۔''

اس نے مونچھوں کو بل دیتے ہوئے فاتحانہ انداز میں لڑکوں کی طرف دیکھا' پھر انہیں آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ اس وقت بھی اصل مجرموں کے سوا باقی سب لڑکوں کے چہروں پر خوف تھا۔ ان کے ساتھ آنے والے ان کے والدین اور سرپرستوں کے چہروں پر بھی تشویش تھی۔ بعض کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور بعض کے ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔ گلفی بھی وہیں موجود تھا' لیکن اس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ وہ اس سارے معاملے سے لاتعلق نظر آ رہا تھا۔

لڑکے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے' تیرتھ سنگھ کی طرف منہ کئے دھیرے دھیرے اس کی میز کے سامنے سے گزرنے لگے۔ صرف سلطانہ اور بھورے کو دیکھ کر تیرتھ سنگھ نے نہایت آہستگی سے معنی خیز انداز میں سر ہلایا' لیکن کچھ بولا نہیں۔ اس نے سب لڑکوں کو اپنے سامنے سے گزر

جانے دیا۔ اس کے بعد بھی وہ چند لمحے پُرخیال انداز میں خاموش بیٹھا رہا اور اپنی چھڑی کو دھیرے دھیرے ہاتھوں میں گھماتا رہا۔ اس کے سامنے موجود سب لوگ گویا اپنی سانسیں روکے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ آخر وہ کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے بولا۔ ''مجھے تو اندازہ ہو ہی گیا ہے کہ وہ لڑکے کون تھے؟ لیکن پھر بھی میں ایک کام کرتا ہوں جس سے بات بالکل پکی ہو جائے......''

اس نے ایک کانسٹیبل کو اشارہ کیا۔ وہ آنند کے دفتر میں چلا گیا اور چند لمحے بعد وہاں سے ایک آدمی کو ساتھ لیے آیا جسے دیکھ کر سلطانہ اور اس کے ساتھیوں کی سانسیں سینے میں اٹکنے لگیں۔ وہ وہی بنیا تھا' جسے انہوں نے پچھلے سال ٹرین میں لوٹا تھا۔ وہ آ کر تیرتھ سنگھ کے ساتھ کھڑا ہو گیا اور ایک بار پھر لڑکوں کی شناختی پریڈ شروع ہو گئی۔ ''یہی تھا...... یہی تھا وہ مردود...... جوان سب کا سردار معلوم ہو رہا تھا...... ایک نمبر کا بدمعاش اور ڈاکو ہے یہ......''

اس نے صرف چیخنے اور دو تین موٹی موٹی گالیاں دینے پر ہی اکتفا نہیں کیا' بلکہ آگے بڑھ کر سلطانہ کے منہ پر تھپڑ بھی رسید کرنے کی کوشش کی' لیکن شاید اپنی تھل تھل کرتی توند کی وجہ سے لڑکھڑا گیا۔ ویسے بھی سلطانہ پھرتی سے ایک قدم پیچھے ہٹ گیا تھا۔ وہ اس کے تھپڑ سے بچ گیا۔ وہ کسی قسم کی گھبراہٹ کا مظاہرہ کیے بغیر ہاتھ اٹھائے ہوئے مدبرانہ انداز میں بولا۔ ''شانتی مہاراج شانتی...... سنا ہے زیادہ غصہ کرنے سے دماغ کی رگ پھٹ جاتی ہے...... ناک سے خون آنے لگتا ہے اور آدمی پٹ سے گر کر مر جاتا ہے......''

بنئے نے ایک بار پھر سلطانہ پر جھپٹنے کی کوشش کی' لیکن کانسٹیبل نے اسے روک دیا۔ تیرتھ سنگھ خاموشی سے بیٹھا گویا کوئی دلچسپ تماشا دیکھ رہا تھا۔ سلطانہ اپنے لہجے میں دکھ اور تاسف سموتے ہوئے بولا۔

''ہمارا غریب ہونا ہی ہمارا سب سے بڑا دوش ہے...... جس کا دل چاہتا ہے' اٹھ کر ہمیں چور ڈاکو کہہ دیتا ہے۔ برہمن' بنئے اور ٹھاکر...... دکاندار' سنار یا ساہوکار بن کر جس طرح چاہیں لوگوں کو لوٹتے رہیں' مگر سماج میں پھر بھی ان کی عزت ہوتی ہے۔ ہم محنت مشقت کر کے...... دوسروں کے جوتے کھا کے بھی دو وقت کی روٹی کمائیں تب بھی چور کے چور ہی رہتے ہیں۔ یہ جو اتنے لڑکے یہاں دوشی بنے کھڑے ہیں' ان میں سے زیادہ تر چھوٹی چھوٹی عمروں سے محنت مشقت کر رہے ہیں اور بغیر کسی پاپ کے' اس قلعے میں قیدیوں کی زندگی گزار رہے ہیں۔ ہمارا

سب سے بڑا دوش' ہمارا بھکھو ہونا ہے۔ ہماری تو شکلوں سے پتا چلتا ہے کہ ہم بھوک اور فاقوں کے مارے ہوئے ہیں۔ اصل چور اور ڈاکو تو یہ لوگ ہیں......'' اس نے ڈرامائی انداز میں بنئے کی طرف اشارہ کیا۔ ان کے موٹے موٹے پیٹ ہی بتا دیتے ہیں کہ یہ پورے سماج کو لوٹ کر کھا رہے ہیں' مگر انہیں کوئی کچھ نہیں کہتا۔ الٹا ان جیسوں کے اشاروں پر پولیس ہم جیسے غریبوں کو پکڑنے آ جاتی ہے......''

سلطانہ نے موٹے پیٹوں کا ذکر کیا تو تیرتھ سنگھ بھی ذرا سنبھل کر بیٹھ گیا' کیونکہ اس کی توند بھی خاصی نمایاں تھی۔ سلطانہ کی اس جذباتی تقریر کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ تاہم اتنا ضرور ہوا کہ اس کے دادا کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی' جیسے اسے اس لمحے اپنے پوتے پر فخر محسوس ہوا ہو۔ اس کے علاوہ دوسرے لڑکوں اور اس کی سرپرستوں کے چہروں پر ذرا رونق آ گئی جیسے سلطانہ کے اس طرح جرأت مندی سے بولنے پر انہیں کچھ سہارا ملا ہو۔

''چپ رہ بے...... زیادہ سیاسی لیڈر بننے کی کوشش نہ کر......'' تیرتھ سنگھ نے چھڑی میز پر مارتے ہوئے سلطانہ کی طرف دیکھ کر آنکھیں نکالیں۔ پھر اس نے شناختی پریڈ جاری رکھنے کا اشارہ کیا۔

سلطانہ کے علاوہ بنیا صرف بھورے کو پہچان پایا۔ باقی لڑکوں کے بارے میں وہ شک اور بے یقینی کا شکار رہا۔ گجندر سنگھ تو وہاں موجود ہی نہیں تھا' اس لئے وہ تفتیش سے مکمل طور پر ہی بچا رہا۔ تیرتھ سنگھ نے صرف سلطانہ اور بھورے کو روک لیا' باقی سب کو جانے دیا۔ بھورے کی جان بھی اس لئے چھوٹ گئی کہ تیرتھ سنگھ اس کیس کی جو فائل لے کر آیا تھا' اس میں اس کی انگلیوں کے نشانات موجود نہیں تھے۔ آخری بار جب قلعے میں انگلیوں کے نشانات لئے گئے تھے تو بھورے کم عمری کی وجہ سے نشانات دینے سے بچ گیا تھا' جبکہ سلطانہ کی انگلیوں کے نشانات پولیس ریکارڈ میں موجود تھے اور اس وقت جیسے ہی پولیس کے ایک آدمی نے جائے واردات سے محفوظ کیے گئے چند انگلیوں کے نشانات کا موازنہ سلطانہ کی انگلیوں کے نشانات سے کیا تو تصدیق ہو گئی کہ وہ اس واردات میں شریک تھا۔ ویسے بھی بنئے نے اسے پہچان لیا تھا۔

گلفی نے تیرتھ سنگھ کی منت سماجت کرنے کے علاوہ مصنوعی طور پر کچھ رونا دھونا مچا کر بھی اپنے پوتے کی جان چھڑانے کی کوشش کی' لیکن اسے کامیابی نہیں ہوئی۔ تیرتھ سنگھ نے اس کی ایک نہیں سنی۔ وہ سلطانہ کو مراد آباد لے گیا جہاں اسے جیل میں بند کر دیا گیا۔ دوسرے روز اسے

انگریز مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا گیا' جس نے مختصری سماعت کے بعد اسے سات سال قید کی سزا سنادی۔ سلطانہ کا دل ڈوب گیا۔ سات سال بہت طویل عرصہ تھا۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ چند زیور لوٹنے کے جرم میں اسے اتنی لمبی سزا ہو جائے گی۔

گلفی' مجسٹریٹ کا فیصلہ سننے کے بعد دھاڑیں مار مار کر رونے لگا اور سر پیٹ پیٹ کر عدالت میں دہائیاں دینے لگا۔ پولیس والے اسے گھسیٹتے ہوئے باہر لے گئے۔ سلطانہ کو مراد آباد جیل میں بند کر دیا گیا جو نجیب آباد کے قلعے کی جیل سے کہیں زیادہ بری جگہ تھی۔ وہاں اس کے کپڑے اتروا کر اسے جیل کے کپڑے دیے گئے۔ یہ بوری جیسے کپڑے کا کرتا پاجامہ تھا جسے پہننے کے بعد جسم میں سوئیاں چبھتی محسوس ہوتی تھیں۔ زرد رنگ کے اس کپڑے پر چوکور سیاہ خانے بنے ہوئے تھے اور سینے پر ایک طرف نمبر درج تھا۔ سلطانہ یہ دیکھ کر قدرے حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا کہ اس کا نمبر سات تھا۔ اسے یاد آیا کہ جس ڈکیتی کے سلسلے میں اسے سزا ہوئی تھی' اسے بھی سزا بھی سات سال کی ہوئی تھی۔ یہ ایک عجیب اتفاق تھا کہ جیل میں اس کا نمبر بھی سات تھا۔

عجیب بات یہ تھی کی تیرتھ سنگھ یا مراد آباد کے کسی پولیس والے نے اس سے ڈکیتی کے مال کے بارے میں کوئی خاص پوچھ گچھ نہیں کی تھی۔ تیرتھ سنگھ نے اس سے صرف یہ پوچھا تھا کہ زیور کہاں ہیں؟ سلطانہ نے یہی جواب دیا تھا۔ ''جب میں نے بنئے کو لوٹا ہی نہیں...... مجھے اس ڈکیتی کے بارے میں کچھ پتا ہی نہیں...... تو میں زیوروں کے بارے میں کیا بتا سکتا ہوں؟''

وہ مجسٹریٹ کے سامنے بھی آخری لمحے تک ڈکیتی سے منکر رہا تھا۔ تیرتھ سنگھ اور دوسرے پولیس والوں کو یقیناً اندازہ ہو گیا تھا کہ اب تک مال ٹھکانے لگ چکا ہوگا' اس لئے انہوں نے اس کی برآمدگی پر زیادہ زور نہیں دیا تھا' مگر جیل پہنچ کر سلطانہ قید کی سختیوں کے ساتھ ساتھ ایک نئی مصیبت میں پھنس گیا۔ وہاں جیل کا عملہ جن پولیس والوں پر مشتمل تھا' انہوں نے اس سے پوچھ گچھ شروع کر دی کہ ڈکیتی میں اس کے ساتھ جو دوسرے لڑکے شریک تھے' وہ کون تھے اور اب کہاں ہیں؟ اس کے علاوہ وہ۔ لوٹ کے مال کے بارے میں بھی زور دے کر پوچھ رہے تھے۔

انہوں نے سلطانہ کو بہت ڈرایا دھمکایا اور جب وہ کسی صورت مان کر نہیں دیا تو ایک روز صبح ہی صبح کئی پولیس والے اسے اس کی تنگ و تاریک' سیلن زدہ کوٹھری سے نکال کر جیل کے صحن میں لے گئے اور اسے زبردستی اوندھا لٹا دیا۔ دو پولیس والوں نے اس کے بازو اور دو پولیس والوں نے اسکی ٹانگیں چوڑی کر کے مضبوطی سے پکڑ لیں۔ اس کا لباس کھسکا دیا گیا اور ایک موٹے بید

سے اس کے کولہوں پر ضربیں لگائی جانے لگیں۔ سلطانہ نے ضبط کرنے کی بہت کوشش کی' لیکن ہر ضرب پر بے اختیار اس کے حلق سے اذیت بھری چیخ نکل جاتی۔ اس کے ساتھ ہی ایک پولیس والا اپنا سوال دہراتا۔ ''اب بھی بتا دے لوٹ کا مال کہاں ہے ورنہ کولہوں کی چمڑی اتر جائے گی...... کبھی سیدھے بیٹھنا یا چت لیٹنا نصیب نہیں ہوگا...... اوندھا لیٹے لیٹے ہی زندگی گزر جائے گی......''

''میرے پاس کوئی لوٹ کا مال نہیں ہے......'' سلطانہ گلا پھاڑ کر چیخا۔

صحن کے چاروں طرف جیل کی بہت سی کوٹھریاں تھیں۔ ان سب میں بھی قیدی موجود تھے اور وہ دروازوں کی سلاخیں تھامے کھڑے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے بعض کا رویہ سلطانہ کے لئے ہمدردانہ تھا اور وہ سپاہیوں سے التجائیں کر رہے تھے۔

''ابے جانے دو یار...... بچہ ہے...... اتنا مت مارو......'' ایک نے کہا۔

دوسرا بولا۔ ''اوئے...... اسے تو عدالت سزا سنا چکی ہے۔ اب تم مال کے لئے اس کی جان کیوں لے رہے ہو؟''

کسی اور طرف سے آواز آئی۔ ''کسی روز انگریز جیلر معائنے پر آ گیا اور لونڈے نے یہ سب کچھ بتا دیا تو تم سب معطل ہو جاؤ گے۔''

ایک دو قیدی ایسے جرأت مند بھی تھے جو ان پولیس والوں کو موٹی موٹی گالیاں دے رہے تھے' مگر کچھ قیدی ایسے بھی تھے جن کے لئے یہ ایک دلچسپ تماشا تھا۔ ان میں سے کوئی ہنس رہا تھا' کوئی آوازے کس رہا تھا اور کوئی پولیس والوں کو شرمناک قسم کے مشورے دے رہا تھا' تاہم پولیس والے ان ساری باتوں سے بے نیاز اپنے کام میں مصروف تھے۔ وہ نہایت سنجیدگی سے گویا اپنی ڈیوٹی سرانجام دے رہے تھے اور انہیں گرد و پیش سے کوئی غرض نہیں تھی۔ ان کے انداز سے کچھ ایسا لگ رہا تھا' جیسے ان کے آس پاس کوئی موجود ہی نہیں ہے۔

سات آٹھ ڈنڈے رسید کرنے کے بعد انہوں نے تشدد کا یہ سلسلہ بند کر دیا اور سلطانہ کو لے جا کر دوبارہ کوٹھری میں بند کر دیا۔ سلطانہ کیلئے واقعی سیدھی طرح بیٹھنا یا چت لیٹنا تقریباً ناممکن ہو گیا۔ اوپر سے بوری نما کپڑوں سے سوئیاں سی چبھنے کی تکلیف بھی کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ آخر تنگ آ کر اس نے قمیص تو اتار ہی دی' لیکن جلد ہی سردی لگنے لگی اور اسے قمیص دوبارہ پہننی پڑی۔ دیر تک وہ گھاس پھونس سے بنی چٹائی پر اوندھا لیٹا سسکتا رہا اور دادا کو یاد کر کے روتا رہا۔

رات کو سردی بڑھی تو اس نے قریب پڑا میلا اور پھٹا پرانا سا کمبل اوپر لے لیا۔ تھوڑی دیر بعد اسے پتا چلا کہ اس میں جوئیں اور کھٹمل تھے۔

اس کی ساری رات کچھ اونگھتے اور کچھ جاگتے گزری۔ کبھی وہ کمبل اوڑھ لیتا' کبھی اتار دیتا۔ وہ سمجھا تھا کہ جیل کے پولیس والے اس کی طرف سے مایوس ہو گئے ہیں اور اس کی سزا ختم ہو گئی ہے' لیکن دوسرے روز روکھی روٹی اور پانی جیسی لسی کا ناشتہ کرنے کے بعد اسے پتا چلا کہ یہ اس کی خوش فہمی تھی۔ جیل کے پولیس والے ایک بار پھر اسے صحن میں لے گئے۔ اس بار اسے چت لٹا دیا گیا۔ حالانکہ چت لیٹنا بجائے خود اس کے لئے سزا سے کم نہیں تھا۔ اس بار ڈنڈے اس کے پیروں کے تلووں پر مارے جا رہے تھے۔ ان ضربوں کی اذیت بھی کچھ کم نہیں تھی۔ ہر ضرب کی دھمک گویا اس کے دماغ تک پہنچ رہی تھی اور وہ ذبح ہوتے ہوئے بکرے کی طرح چیخ رہا تھا۔



جیل کے سفاک سپاہی سلطانہ کی چیخوں سے بے نیاز' اس کے پیروں کے تلووں پر ڈنڈے برساتے رہے۔ اس روز بھی وہ اس سے اس کے ساتھیوں اور لوٹ کے مال کے بارے میں پوچھتے رہے۔ سلطانہ اس روز کا تشدد بھی سہہ گیا۔ اس نے اپنے ساتھیوں اور لوٹ مار کے بارے میں زبان نہیں کھولی۔ ساتھیوں کے بارے میں زبان کھولنا تو اسے ویسے ہی مردانگی کے اصول کے خلاف محسوس ہو رہا تھا اور لوٹ کے مال کے بارے میں کچھ کہنا بیکار تھا۔ منگل سوتر کے سوا ان کے زیورات میں سے اب تک کچھ بھی نہیں بچا تھا اور منگل سوتر اس کی بیوی کی "موچھ" کی رقم کی جگہ دیا جا چکا تھا۔

ابھی تو اس کی بیوی کی رخصتی کی نوبت بھی نہیں آئی تھی۔ وہ اپنے ماں باپ کے گھر میں ہی تھی۔ اگر سلطانہ منگل سوتر کے بارے میں بتا دیتا تو یقیناً پولیس اسے لڑکی والوں کے گھر سے برآمد کر لیتی' صرف یہی نہیں بلکہ وہ شاید تپلی کے گھر والوں کو بھی تفتیش میں گھسیٹ لیتی اور انہیں نہ جانے کن پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ یہ سلطانہ کو گوارا نہیں تھا۔ ویسے بھی منگل سوتر اگر لڑکی والوں سے لے لیا جاتا تو اس کا مطلب یہی ہوتا کہ "موچھ" کی رقم واپس ہو گئی ہے۔ اس کے بعد قبیلے کے رسوم و رواج کے مطابق لڑکی والوں کو یہ حق حاصل ہو جاتا کہ وہ لڑکی کی شادی کہیں اور کر دیں۔ سلطانہ کو یہ بھی گوارا نہیں تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی جان پر سارا ظلم برداشت کر لیا۔

جب اس کے پیروں کے تلووں پر پندرہ بیس ضربیں لگائی جا چکیں تو اردگرد کی کوٹھریوں

میں تماشا دیکھتے ہوئے قیدیوں میں سے ایک چیخ اٹھا۔ "ابے کمینو...... بس کرو...... کیا بچے کو جان سے مارو گے؟ اگر اسے کچھ پتا ہوتا تو اب تک ضرور بتا دیتا۔ لگتا ہے بے چارہ بے گناہ ہی پکڑا گیا ہے۔"

وہ قیدی گزشتہ روز بھی سلطانہ کی ہمدردی میں آواز بلند کر چکا تھا' لیکن اس وقت سپاہیوں نے اس کی بات ان سنی کر دی تھی' لیکن آج ان میں سے ایک نے پلٹ کر خونخوار نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور اپنے ساتھی سے مخاطب ہوا۔ "اس کتے کو بڑی تکلیف ہو رہی ہے' اس کا دل اس لونڈے کی ہمدردی میں پھٹا جا رہا ہے۔ ایسا کر اسے نکال لا...... لونڈے کی جگہ آج اسے لٹاتے ہیں' بہت زمانہ ہو گیا ہے اس کی خاطر تواضع نہیں ہوئی...... بہت مستی چڑھ رہی ہے اسے......"

وہ قیدی خاصا عمر رسیدہ تھا اور بھنتو ہی معلوم ہوتا تھا۔ وہ خاصا نحیف تھا' لیکن سپاہیوں کی بات سن کر بھی وہ خوفزدہ نہیں ہوا اور اپنی کوٹھری کے دروازے کی سلاخیں پکڑ کر انہیں جھنجوڑنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ "ہاں...... ہاں...... مارو مجھے...... میں جب یہاں آیا تھا تو میرے ساتھ تم لوگوں نے کیا کچھ نہیں کیا تھا...... وہ تم نہیں تھے' مگر تم جیسے ہی تمہارے بھائی بند تھے...... تمہاری ہی طرح خبیث اور ظالم تھے...... تم جیسے لوگ ہی معصوموں اور بے گناہوں کو ڈاکو بنا دیتے ہیں...... جو لوگ چھوٹے موٹے جرم کر کے یہاں آتے ہیں' وہ بھی تم جیسے لوگوں کی وجہ سے ہی زیادہ بڑے مجرم بن کر یہاں سے نکلتے ہیں۔ مارو...... مجھے بھی مارو...... مجھے معلوم ہے تمہیں میرے بڑھاپے پر بھی ترس نہیں آئے گا...... میں چاہتا ہوں تمہارے ہاتھوں مارا جاؤں تا کہ کسی طرح تو صاحب لوگوں کو تمہارے ظلم کا پتا چلے...... دیکھ لینا' کسی روز تمہارا حشر بہت برا ہو گا...... صاحب لوگوں کے ہاتھوں نہ سہی' کسی اور کے ہاتھ سہی...... کتے کی موت مرو گے تم لوگ...... لکھ لو میری بات......"

سپاہی جو اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنانے کے لئے تیار نظر آ رہے تھے' اس کی مجنونانہ سی تقریر سن کر رک گئے۔ وہ چند لمحے غصے سے اسے گھورتے رہے' پھر انہوں نے غالباً دل ہی دل میں اسے اس کے حال پر چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ انہوں نے سلطانہ پر بھی تشدد بند کر دیا۔ اس کی چیخیں تھم چکی تھیں' لیکن وہ اب بھی کراہ رہا تھا۔ سپاہیوں نے اس کے بازو پکڑ کر بے دردی سے ایک جھٹکے سے اسے اٹھایا اور فوراً ہی چھوڑ دیا۔ وہ لڑکھڑایا اور گر پڑا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو اسے

انداز ہ ہوا کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اس کے پیروں میں اتنی تکلیف تھی کہ وہ اس کا وزن برداشت نہیں کر رہے تھے۔ اذیت کی لہریں اس کے دماغ تک جا رہی تھیں اور معدے میں گرہیں سی پڑ رہی تھیں۔

وہ دو چار قیدی جو کل کی صورتحال پر بھی سنگدلی سے ہنس رہے تھے اور آوازے کس رہے تھے' وہ آج بھی یہی کر رہے تھے۔ سپاہیوں نے ایک بار پھر جھک کر سلطانہ کے دونوں بازو پکڑے اور جھٹکے سے اسے کھڑا کیا۔ اس بار انہوں نے اس کے بازو نہیں چھوڑے' لیکن سلطانہ ان کے سہارے کے باوجود پاؤں زمین پر ٹکا نہیں پا رہا تھا۔ وہ اسے تقریباً گھسیٹتے ہوئے واپس اس کی کوٹھری کی طرف لے چلے۔ اس کا گھسٹنے کا انداز کچھ ایسا ہی تھا' جیسے اس کے دونوں پاؤں ٹوٹ چکے ہوں۔ اسی عالم میں چلتے چلتے اس نے عجیب سی نظروں سے سپاہیوں کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں سرخ انگارہ ہو رہی تھیں اور جب وہ بولا تو اس کی آواز بھی کچھ ایسی عجیب اور بھاری بھاری سی محسوس ہوئی' جیسے اس کے وجود میں کوئی روح حلول کر گئی ہو۔ اس نے پلکیں جھپکائے بغیر ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم لوگوں نے اچھا نہیں کیا۔''

اس کی آنکھوں میں' اور اس کے لہجے میں نہ جانے کیا بات تھی کہ سپاہی ایک لمحے کیلئے ٹھٹک کر رہ گئے' لیکن سلطانہ نے فوراً ہی سر جھکا لیا اور تھکے تھکے سے انداز میں آنکھیں بند کر لیں۔ اس وقت تک وہ اپنی کوٹھری کے دروازے پر پہنچ چکا تھا۔ سپاہیوں کو سلطانہ کے یکسر بدلے ہوئے انداز سے جو جھٹکا سا لگا تھا' وہ اس سے سنبھل چکے تھے۔ ایک سپاہی' جس نے سلطانہ کا ایک بازو پکڑا ہوا تھا' اسے تقریباً جھنجھوڑتے ہوئے غضبناک سے لہجے میں بولا۔ ''تو کیا ہمیں دھمکی دینے کی کوشش کر رہا ہے......؟''

اس نے سلطانہ کو دو تین موٹی موٹی گالیاں دیں' پھر دروازہ کھول کر اسے اندر دھکا دے دیا۔ سلطانہ فرش پر جا گرا۔ دوسرا سپاہی دوازہ بند کرتے ہوئے بولا۔ ''کل تیری رہی سہی اکڑ بھی نکال دیں گے۔ اس کے بعد تو بولنا بھول جائے گا......بس ہائے ہائے کیا کرے گا۔''

سلطانہ نے کوئی جواب دیا اور نہ ہی ان کی طرف دیکھا۔ وہ جہاں جا کر گرا تھا' وہیں آنکھیں بند کئے اوندھا پڑا رہا۔ سپاہی دروازہ مقفل کر کے جا چکے تو وہ دھیرے دھیرے رونے اور سسکنے لگا۔ دن بھر وہ اسی طرح پڑا سسکتا رہا۔ دوپہر کو جیل کا گارڈ اس کیلئے وہی دال روٹی لے کر آیا' جسے کھانا مشکل ہوتا تھا۔ سلطانہ نے اس کی طرف بھی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا۔ ایسا لگتا تھا

جیسے وہ وہیں پڑے پڑے مر جانا چاہتا تھا۔

قدرت کا اصول ہے' جہاں کانٹے ہوتے ہیں' وہاں کوئی نہ کوئی پھول بھی کھل جاتا ہے۔ جیل کے چند سپاہی اور ان کا انچارج اے ایس آئی جتنے سفاک' لالچی اور حرام خور تھے' اتنا ہی ایک ادھیڑ عمر گارڈ رحم دل اور انسان دوست تھا۔ وہ ان گارڈز میں سے ایک تھا جو قیدیوں کے لئے کھانا لانے پر مامور تھا۔ وہ سلطانہ کے ساتھ شفقت اور ہمدردی سے پیش آیا اور اس کی ہر ممکن مدد کرنے لگا۔ سلطانہ کے کولہوں کا گوشت ادھڑ سا گیا تھا۔ گارڈ نے اسے ایک مرہم لا کر دیا۔ پیروں پر مالش کرنے کے لئے اس نے اسے ایک شیشی میں کوئی خاص تیل بھی دیا۔

سلطانہ کی خوش قسمتی تھی کہ تیسرے روز جیل کے سپاہی اس پر تشدد کرنے کے لئے اسے لینے نہیں آئے۔ اس کے بعد انہوں نے اس کا پیچھا چھوڑ ہی دیا۔ شاید وہ اس کی طرف سے مایوس ہو گئے تھے اور انہیں یقین ہو گیا تھا کہ سلطانہ سے انہیں کوئی زیور یا روپیہ پیسہ ہاتھ نہیں آئے گا۔ گارڈ کی مدد سے جلد ہی اس کی حالت بھی بہتر ہو گئی اور جیل میں اس سے مشقت لی جانے لگی۔ وہاں کسی کو اس سے ملاقات کے لئے بھی آنے کی اجازت نہیں تھی۔ چنانچہ گلفی بھی اس سے ملنے نہ آ سکا۔ وہ اکثر راتوں کو اپنے دادا کو یاد کر کے رویا کرتا۔ دنیا میں صحیح معنوں میں دادا کے سوا اس کا کوئی تھا بھی نہیں۔ وہی اس کے دوست' بزرگ' سرپرست' استاذ' سبھی کچھ تھے۔

جیل میں رات' خاص طور پر کاٹے نہیں کٹتی تھی۔ راتوں کو سلطانہ اندھیرے میں نظر نہ آنے والی چھت پر نظریں گاڑے یہی سوچتا رہتا کہ جیل میں اس کے سات سال کیسے گزریں گے......اور جب وہ جیل سے نکلے گا تو کتنا بڑا ہو چکا ہوگا؟ کیا تپلی اور اس کے والدین اس وقت تک اس کا انتظار کر لیں گے؟ اسے ان سوالوں کا کوئی جواب نہ ملتا تو وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا لیتا' مگر نیند پھر بھی مشکل سے ہی آتی۔

خلاف توقع اسے ایک سال بعد ہی کم از کم اس جیل سے نکلنا نصیب ہو گیا' لیکن اس کیلئے اس کے دادا کو اپنی جان کی بھینٹ دینا پڑی۔ کم از کم سلطانہ کو تو یہی محسوس ہوا کہ دادا نے اس کیلئے اپنی جان کا نذرانہ دیا تھا۔

ایک روز چند سپاہی مراد آباد جیل میں آئے۔ سلطانہ نے اس سے پہلے انہیں نہیں دیکھا تھا۔ انہوں نے جیل میں کچھ کاغذی کارروائی کی' پھر سلطانہ کو اپنے ساتھ لے گئے۔ سلطانہ کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور پیروں میں بیڑیاں تھیں۔ جیل سے باہر آنے کے بعد صرف ایک مسلح

سپاہی اس کے ساتھ رہ گیا‘ جو اسے ریلوے سٹیشن لے آیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ نجیب آباد جانے والی ٹرین میں سوار ہو گئے۔ سلطانہ کی ہتھکڑیاں اور بیڑیاں چونکہ ٹرین میں بھی کھولی نہیں گئی تھیں‘ اس لئے اسے یہ اندازہ تو ہو گیا تھا کہ اسے آزادی نہیں ملی ہے‘ بلکہ شاید اسے کسی اور جیل میں منتقل کیا جا رہا ہے۔

نجیب آباد میں مسلح سپاہی اس کی زنجیر تھامے اسے قلعے میں لے گیا‘ جہاں سب سے پہلے گیٹ پر اس کی ملاقات ایڈ جوئنٹ آنند سے ہوئی۔ آنند نے مشفقانہ سے انداز میں سلطانہ کا سر تھپتھپایا اور بولا۔ ”تمہارے دادا مندر کے علاوہ چرچ میں بھی آ کر دعا کرتے تھے کہ تمہیں مراد آباد جیل سے چھٹکارا مل جائے۔ وہ یہی دعا مزاروں پر بھی مانگنے جاتے تھے۔ آخر ان کی دعا قبول ہو گئی۔ تم مراد آباد جیل سے باہر آ گئے۔“

اس کی بات کا مطلب سلطانہ کی سمجھ میں نہ آیا‘ لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ پوچھتا‘ آنند اپنے دفتر میں چلا گیا۔ جو مسلح سپاہی سلطانہ کے ساتھ تھا‘ اس نے اسے اپنے گھر کی طرف چلنے کی ہدایت کی۔ سلطانہ جب میدان کے قریب پہنچا تو اس نے اپنے جاننے والے تمام لوگوں کو وہاں موجود پایا۔ ایسا لگتا تھا جیسے انہیں اس کی آمد کی اطلاع تھی اور وہ سب اس کے استقبال کیلئے جمع ہوئے تھے۔ اس کے دوست لڑکے سب سے آگے تھے۔ بھورے پہلے سے کافی لمبا ہو گیا تھا اور نکیشر کی مونچھیں نکل آئی تھیں۔ بریندر جی بھی وہاں موجود تھے‘ جبکہ لکشمی اور پتلی ہجوم سے ذرا ہٹ کر کھڑی ہوئی تھیں۔

سلطانہ نے محسوس کیا کہ وہ واقعی گھر پہنچ گیا تھا اور شاید اس کے استقبال کے لئے آنے والوں میں اب جلیبیاں تقسیم ہونے والی تھیں‘ لیکن پھر اس نے محسوس کیا کہ وہ لوگ اس طرح خوش نظر نہیں آ رہے تھے‘ جس طرح وہ لوگ ہوتے تھے‘ جن کا کوئی پیارا مدت کی جدائی کے بعد گھر واپس آتا تھا۔ مردوں کے چہروں پر افسردگی تھی اور اس کے ساتھی لڑکے اس سے نظریں نہیں ملا رہے تھے۔ پتلی کی آنکھیں سوجی سوجی سی لگ رہی تھیں‘ جیسے وہ دیر تک روتی رہی ہو۔ سلطانہ کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ اس کا کس قسم کا استقبال ہو رہا تھا۔ جلیبیوں کا بھی کہیں دور دور تک نام ونشان نہیں تھا۔ اس کی سمجھ میں یہ بھی نہیں آ رہا تھا کہ قلعے کے اندر پہنچ جانے کے بعد بھی اس کی ہتھکڑیاں اور بیڑیاں کیوں نہیں کھولی گئی تھیں۔

چند لمحے بعد بریندر جی اسے ایک طرف لے گئے اور غمزدہ سے لہجے میں بولے۔ ”بیٹا!

تمہارے لئے یہ خبر بے شک بڑا دکھ پہنچانے والی ہو گی‘ لیکن بہرحال تمہیں بتانا بھی ضروری ہے۔ بات یہ ہے بیٹا...... کہ تمہارے دادا کا دیانت ہو گیا ہے۔“

”کیا......؟“ سلطانہ بے اختیار پھٹی پھٹی سی آواز میں چلا اٹھا۔ ”دادا مر گئے......؟ مگر کیسے......؟ وہ تو بالکل ٹھیک ٹھاک تھے......اتنی اچھی صحت تھی ان کی......“

”پتا نہیں سانپ نے کاٹ لیا تھا...... بنگارس نسل کا سانپ تھا...... بہت ہی زہریلا ہوتا ہے۔ ہاتھی کو بھی کاٹ لے تو وہ بھی وہیں تڑپ کر مر جاتا ہے۔ تمہارا دادا تو پھر بھی بہت دیر تک زندہ رہے اور ان کی جان بچانے کی بڑی کوششیں کی گئیں۔ اس سانپ کو بھی ڈھونڈ کر مار دیا گیا جس نے انہیں ڈسا تھا۔ انگریزوں نے بھی اسے تلاش کرنے میں ہمارا ساتھ دیا۔ لاٹھیاں اور بندوقیں لے کر ہمارے ساتھ رہے۔“ بریندر جی یہ سب کچھ بتا کر افسردہ سے انداز میں خاموش ہو گئے۔

سلطانہ کو یوں لگا جیسے دادا اپنی زندگی کے باقی سال اسے دے گئے تھے۔ وہ شاید اس لئے مر گئے تھے کہ سلطانہ لمبی عمر پا سکے۔ اس دوران بھورے بھی ان کے قریب آ گیا اور سلطانہ کو بتانے لگا کہ اس کے دادا کی جان بچانے کے لئے کیا کیا جتن کئے گئے۔ وہ بولا۔ ”سب سے پہلے ایک بھگت کو بلایا گیا تھا‘ جس نے شری مہاراج کے نام پر ایک کالی بکری کی بھینٹ دی‘ پھر ایک سنیاسی آیا جس نے ان کے زخم سے زہر چوسا اور ایک گھنٹے تک ان کے پاس بیٹھا منتر پڑھتا رہا‘ قلعے کے دواخانے میں کام کرنے والے کمپاؤنڈر نے بھی ان کے زخم پر اپنا پاؤڈر چھڑک دیا تھا‘ جو وہ ہر زخمی ہونے والے کو دیا کرتا تھا۔ نجیب آباد سے ایک حکیم اور بجنور سے ایک وید کو بھی بلایا گیا تھا۔ مراد آباد سے ایک انگریز ڈاکٹر کو بلانے کے لئے مجھے بھیجا گیا تھا‘ لیکن جب میں اس کے پاس پہنچا تو اس نے بتایا کہ وہ تو خود بیمار ہے۔ اگر وہ آ بھی جاتا تو شاید کوئی فرق نہ پڑتا۔ جب کسی کی زندگی پوری ہو گئی ہو تو اسے کون بچا سکتا ہے؟“

سلطانہ غمزدہ انداز میں سر ہلا کر رہ گیا۔ آنسو اس کے رخساروں پر بہہ رہے تھے۔ وہ اپنی جیل کے زمانے کی تکلیفیں بھول گیا تھا۔ اس وقت ہتھکڑیاں اور بیڑیوں کی موجودگی کا احساس بھی نہیں رہا تھا۔ دادا کی موت کا صدمہ ہر تکلیف پر بھاری تھا۔ ان کی ارتھی تیار تھی‘ لیکن اسے جلانے کیلئے ہردوار لے جایا جا رہا تھا۔ جہاں اس کی راکھ گنگا میں بہائی جانی تھی۔ قلعے کے بہت سے لوگ ارتھی کے ساتھ جانا چاہتے تھے‘ لیکن اس مقصد کے لئے صرف دس لوگوں کو پاس ملے

تھے۔

''مجھے بھی ہردوار جانے کے لئے پاس دے دو۔'' سلطانہ نے ایڈ جوٹنٹ آنند کی منت کی۔ ''میں اپنے ہاتھوں سے دادا کی راکھ گنگا میں بہانا چاہتا ہوں۔''

''ہردوار آنے جانے میں تو کئی دن لگیں گے۔ تمہیں اتنے دنوں کے لئے پاس نہیں مل سکتا۔'' ایڈ جوٹنٹ آنند نے جواب دیا۔ ''پولیس کی طرف سے میرے پاس تمہارے بارے میں لمبا چوڑا حکم نامہ آیا ہے۔ اس کے مطابق تو تمہیں قلعے سے باہر جانے کی بھی اجازت نہیں ہے۔ تم نے دادا کی ارتھی اٹھنے سے پہلے ان کی شکل دیکھ لی' یہی کافی ہے۔''

''تم پولیس کو میری طرف سے یقین دلا دو...... میں کہیں نہیں بھاگوں گا۔'' سلطانہ نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

''تم مجھ سے جس کتاب پر چاہو' ہاتھ رکھوا کر سوگند لے لو' میں کہیں نہیں بھاگوں گا' چاہے میری ہتھکڑیاں اور بیڑیاں کھول بھی دی جائیں۔ رامائن...... گیتا...... انگریزوں کی بائبل...... میں ان سب کتابوں پر ہاتھ رکھ کر قسم کھانے کیلئے تیار ہوں۔''

ایڈ جوٹنٹ آنند نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ضد کرنے کی ضرورت نہیں' تمہاری جگہ بھورے جا رہا ہے۔''

ابھی دادا کی پوری طرح ارتھی نہیں بنائی گئی تھی۔ بس ان کے مردہ جسم کو ایک پرانی چارپائی پر رکھ کر چاروں طرف کچھ لکڑیاں رسی سے باندھ دی گئی تھیں۔ چار آدمیوں نے وہ چارپائی اٹھائی اور پیدل ہی ریلوے سٹیشن کی طرف چل پڑے۔ مزید چھ آدمی ان کے ہمراہ تھے' لیکن رخصت کرنے والوں کا ایک بڑا ہجوم تھا اور وہ سب اشکبار تھے۔ وہ بلاشبہ ایک غمناک منظر تھا۔ جب ارتھی قلعے کے گیٹ سے باہر چلی گئی تو لوگ دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ گلفی میں کوئی ایسی بات ضرور تھی کہ وہ قلعے میں اس قدر مقبول تھا اور لوگ اسے اتنا پسند کرتے تھے۔ سلطانہ کا تو گویا دل شدت غم سے پھٹا جا رہا تھا۔

ارتھی جا چکی تو قلعے کے مردوں نے گلفی کے سوگ میں اپنے سر اور بھنوؤں کے بال منڈوا دیئے۔ اس کی موت کی خبر مراد آباد پہنچی تو پنچایت کے سارے پنچوں نے بھی اپنے سر اور بھنویں منڈوا دیں۔ ایک پنچ اداس لہجے میں بولا۔ ''یہ گلفی کی دوسری موت ہے...... اس کی پہلی موت اس وقت ہوئی تھی جب وہ قلعے میں قید ہوا تھا۔''

گلفی کی راکھ گنگا میں بہانے والے جب ہردوار سے واپس آئے تو بھورے نے سلطان کو بتایا۔ ''بھئی گلفی دادا کا شریر (جسم) تو کسی طرح بھی راکھ نہیں بن سکا۔ ہم نے ارتھی کی لکڑیوں پر بے حساب گھی انڈیلا اور آگ کے شعلے آسمان سے باتیں کرتے رہے' لیکن گلفی دادا کا بدن پوری طرح نہیں جل سکا۔ جب ہم کوششیں کر کے تھک گئے تو آخرکار ہم نے ان کی راکھ کے بجائے ان کا ادھ جلا وجود ہی گنگا میں بہا دیا۔ بڑی ضدی آتما (روح) تھی ان کی...... اپنے شریر کو چھوڑ ہی نہیں رہی تھی۔ مجھے تو شک ہے کہ ان کی آتما ابھی تک ان کے شریر میں ہی بند ہے۔ ہمیں تو پنڈت یہی بتاتے ہیں کہ جب تک آدمی کا شریر راکھ نہ ہو جائے' اس کی آتما اس کے اندر ہی رہتی ہے۔ چاہے وہ ہل جل نہ رہا ہو...... مگر اس کی آتما اس کے اندر ہی رہتی ہے۔''

''مجھے تو اس کے بارے میں کچھ پکا پتا نہیں...... ہوسکتا ہے پنڈت ٹھیک ہی کہتے ہوں۔'' سلطانہ نے افسردگی سے کہا۔

گلفی کے مرنے کے بعد قلعے میں مہینوں اس کے تذکرے رہے۔ جہاں بھی چار مرد جمع ہوتے' باتوں کے دوران گلفی کا ذکر ضرور آتا۔ اس کی بہادری اور بے خوفی کے قصے سنائے جاتے۔ ڈاکہ زنی میں اس کی مہارت پر رشک کا اظہار کیا جاتا' اس کے بعض یادگار ڈاکوں کے قصے سنائے جاتے' کچھ لوگ دوسروں کو بتاتے کہ گلفی نے بہت سے لوگوں کو کیا کچھ سکھایا تھا۔ گلفی کی زندگی میں شاید اس کا اتنا احترام اور اہمیت نہیں تھی' جتنی اس کے مرنے کے بعد محسوس ہو رہی تھی۔ لوگ اس کا تذکرہ اسی طرح کرتے تھے' جیسے کوئی بہت بڑا ڈاکو نہیں بلکہ نہایت معزز' بہت زیادہ باصلاحیت اور نہایت اعلیٰ صفات کا حامل شخص دنیا سے رخصت ہو گیا تھا۔

سلطانہ کو مراد آباد جیل واپس نہیں بھیجا گیا تھا۔ اس کا تبادلہ قلعے کی جیل میں کر دیا گیا تھا۔ یہاں اسے روزانہ دن میں نجیب آباد میں کھڈیوں پر کپڑا بننے کا کام کرنا تھا۔ وہ روزانہ ہتھکڑیوں اور بیڑیوں سمیت' مسلح محافظ کی نگرانی میں قلعے سے روانہ ہوتا اور اسے اس مقام پر لے جایا جاتا جہاں کھڈیاں لگی ہوئی تھیں۔ اسے چند دن کھڈیوں پر کام کرنا سکھایا گیا۔ پھر وہ خود ہی کام کرنے لگا۔ کام کے دوران بھی اس کی ہتھکڑیاں اور بیڑیاں کھولی نہیں جاتی تھیں' بلکہ اس کی ایک زنجیر ایک کھمبے کے ساتھ باندھ دی جاتی تھی۔

کھڈیوں پر اس جیسے دوسرے قیدی بھی کام کرتے تھے۔ ہر چھ قیدیوں کی نگرانی پر ایک مسلح نگران تعینات ہوتا تھا۔ بعض اوقات سلطانہ کے گروپ کا نگراں بھی بھخو ہوتا تھا' لیکن وہ بھی

ان کے ساتھ کوئی نرمی یا رعایت نہیں کرتا تھا۔ وہ ان کی طرف کچھ اسی طرح دیکھتا تھا‘ جیسے وہ انسان نہیں بلکہ کیڑے مکوڑے ہوں۔ سلطانہ کیلئے جو معمول مقرر کر دیا گیا تھا‘ اسے اب اسی کے مطابق اپنی سزا کا وقت پورا کرنا تھا۔ اسے کہیں جانے کے لئے پاس بھی نہیں مل سکتا تھا۔

اسے جب کھڈیوں پر کام کرتے ہوئے تین مہینے گزر گئے تو ایک روز بریندر جی جیل کی کوٹھری میں اس سے ملنے آئے اور بولے۔ ”بیٹا! پتلی تمہاری امانت ہے‘ اس کا کیا کرنا ہے؟“

”میرے حالات آپ دیکھ ہی رہے ہیں۔“ سلطانہ بجھے بجھے سے لہجے میں بولا۔ ”میں اسے اپنی پابند بنا کر نہیں رکھ سکتا‘ آپ کو اگر کوئی ایسا آدمی مل جائے جس کے حالات مجھ سے بہتر ہوں اور جو کم از کم پاس لے کر قلعے سے باہر جا سکتا ہو‘ آپ اس سے پتلی کی شادی کر دیں اور میرا منگل سوتر واپس کر دیں۔ میں یہ بات پنچایت کے سامنے بھی کہنے کو تیار ہوں۔“

سلطانہ میں اب بڑی عمر کے مردوں جیسی بردباری آ گئی تھی اور وہ بڑے ٹھہرے انداز میں‘ سمجھداری سے بات کرتا تھا۔ بریندر جی نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولے۔ ”بیٹا! پنچایت سے زیادہ مجھے گلفی کی فکر ہے۔ گلفی سے کیا ہوا وعدہ میری نظر میں جتنا اہم ہے‘ اتنی پنچایت کی کہی ہوئی بات اہم نہیں ہے۔ خاص طور پر گلفی کے مرنے کے بعد تو اس کے ادھورے چھوڑے ہوئے کاموں کو پورا کرنا ہمارے لئے اور بھی زیادہ ضروری ہو گیا ہے۔“

وہ ایک لمحے کے لئے خاموش ہوئے‘ پھر پگڑی اتار کر سر کھجاتے ہوئے بولے۔ ”میں تمہارے پاس اس لئے نہیں آیا تھا کہ تم سے پتلی کو آزاد کرانے کی بات کروں۔ اگر مجھے پتلی کا بیاہ کہیں اور کرنا ہوتا تو میں تم سے بات کئے بغیر بھی کر دیتا اور تمہارا منگل سوتر واپس بھجوا دیتا۔ تمہارے حالات ایسے نہیں تھے کہ تم اس سلسلے میں کچھ کر سکتے۔“

”ہاں...... یہ بات تو ٹھیک ہے۔“ سلطانہ نے تسلیم کیا۔

”تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ جب سے تم جیل گئے ہو‘ پتلی کے لئے کئی رشتے آ چکے ہیں‘ جن میں سے دو تین ایسے تھے جو ”موچھ“ کے طور پر اس سے زیادہ رقم دینے کو تیار تھے‘ جتنے کا تمہارا منگل سوتر ہے۔“ بریندر جی بولے۔

”ہاں...... یہ بات مجھے معلوم ہے۔“ سلطانہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ جب مراد آباد جیل سے قلعے میں آیا تھا تو یہ بات اسے اس کے دوستوں نے بتائی تھی۔ وہ بھی اس بات پر حیران تھے کہ بریندر جی نے ان میں سے کوئی رشتہ کیوں قبول نہیں کر لیا تھا۔

”اس سے کیا ظاہر ہوتا ہے؟“ بریندر جی نے دھیرے سے اسے ڈانٹنے کے انداز میں پوچھا۔

”یہی کہ آپ میرا اور پتلی کا رشتہ توڑنا نہیں چاہتے۔“ سلطانہ نے جواب دیا۔ ”مجھے اس بات کا اندازہ ہو چکا ہے اور مجھے بہت خوشی ہے کہ آپ کو دادا سے کئے ہوئے وعدے کا اتنا خیال ہے۔ میں خود اپنی طرف سے آپ کو موقع دے رہا تھا کہ اپنے آپ کو آزاد سمجھتے ہوئے کوئی بھی فیصلہ کر سکیں‘ خود کو پابند یا مجبور نہ محسوس کریں۔ کہیں پتلی یہ خیال نہ کرے کہ بڑوں کے طے ہوئے رشتے کی وجہ سے اس کی زندگی خراب ہو رہی ہے۔“

”ارے نہیں بابا......“ بریندر جی نے ایک جھٹکے سے پگڑی دوبارہ سر پر رکھتے ہوئے کہا۔ ”وہ تو اس رشتے پر ہم سے بھی زیادہ پکی ہے۔ وہ کہتی ہے اگر مجھے ساری عمر بھی سلطانہ کا انتظار کرنا پڑا تو کر لوں گی۔“

سلطانہ کو یہ بات سن کر حیرت بھی ہوئی اور ایک عجیب سی مسرت بھی...... اس کے دل میں ایک انوکھی خوشی کی لہر ابھری۔ ایسی خوشی اس نے اس سے پہلے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ گویا اس دنیا میں کوئی ایسا بھی تھا جو عمر بھر اس کا انتظار کر سکتا تھا؟ زندگی بھر اس کی راہ تک سکتا تھا؟ اس کی تو پتلی سے کبھی اس طرح کی کوئی بات بھی نہیں ہوئی تھی۔ وہ بچپن سے ساتھ کھیلے کودے ضرور تھے‘ لیکن ان کے درمیان کوئی وعدہ نہیں ہوا تھا‘ انہوں نے ایک دوسرے کو کوئی وچن نہیں دیا تھا...... تو پھر پتلی نے اتنی بڑی بات کیسے کہہ دی تھی؟ کیا بڑوں نے انہیں جس بندھن میں باندھا تھا‘ وہ پیار کے رشتے میں بدل گیا تھا؟ اس کے بعد تو ان کے درمیان کبھی ملاقات بھی نہیں ہوئی تھی‘ کوئی بات بھی نہیں ہوئی تھی‘ اس کے باوجود دل کا ناتا اتنی مضبوطی سے جڑ گیا تھا۔

”اگر وہ ایسا کہتی ہے تو پھر میں بھی ساری زندگی اس کا انتظار کر سکتا ہوں۔ سارا جیون اس کی راہ دیکھتے بتا سکتا ہوں۔“ بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔ اپنے الفاظ پر اسے خود بھی حیرت ہوئی۔ اس نے ایسا کہنے کا کوئی ارادہ نہیں کیا تھا‘ مگر الفاظ خود بخود اس کی زبان پر آ گئے تھے۔

”بالکل ٹھیک...... یہ ہوئی نہ مردوں والی بات......“ بریندر جی نے طمانیت سے سر ہلایا۔ پھر ان کا لہجہ کچھ رازدارانہ سا ہو گیا۔ ”میں نے ایڈجونٹ آنند سے بات کی تھی۔ اسے اس بات کا تو پہلے ہی پتا چل چکا ہے کہ تمہاری اور پتلی کی شادی ہو چکی ہے‘ لیکن اس کا کہنا ہے کہ تم دونوں کی تو اب بھی شادی بیاہ کی عمر نہیں ہے‘ مگر وہ یہ بات مان گیا ہے کہ دو سال بعد پتلی کو جیل میں

تمہاری پتنی کی حیثیت سے تمہارے ساتھ رہنے کی اجازت دے دے گا۔ مجھے اس پر تمہاری رائے لینی تھی‘ تمہاری مرضی معلوم کرنی تھی۔ تمہیں تو اس پر کوئی اعتراض نہیں نا......؟‘‘

’’آپ کیسی بات کر رہے ہیں چاچا...... میں تو اس دنیا میں بالکل اکیلا رہ گیا ہوں۔ میری زندگی میں کوئی آ جائے گا تو جیل کے دن رات میرے لئے کچھ آسان ہو جائیں گے...... لیکن اس خیال سے مجھے اچھا نہیں لگے گا کہ میری پتنی بابل کے گھر سے وداع ہو کر آئے گی بھی تو کہاں......؟ جیل میں......! لڑکیاں وداع ہو کر پیا کے گھر جاتی ہیں۔ اسے جیل کی کوٹھری میں رہنا پڑے گا۔ بس‘ یہ تھوڑا سا دکھ دل میں رہے گا۔‘‘

’’ارے چھوڑ بیٹا...... ایسے دکھ دل سے لگانے کی ضرورت نہیں۔‘‘ بریندر جی نے اس کا کندھا تھپکا۔ ’’کہنے کو ہم ڈھولیا ہیں لیکن یہ بھی بھنتو قبیلے ہی کی شاخ ہے اور بھنتوؤں کے لئے جیل‘ ہتھکڑی‘ بیڑی کوئی نئی انوکھی یا بری چیز نہیں۔ ہتھکڑی‘ بیڑی ہمارے مردوں کا زیور اور جیل ان کا گھر ہے۔ تِلی تو یوں سمجھو اپنے گھر ہی آئے گی اور وہ یہاں بھی خوش رہے گی۔ تم اس مسئلے پر سوچ کر اپنا دل میلا نہ کرو۔‘‘

یوں سلطان کی زندگی میں گویا ایک نیا دروازہ کھل گیا۔ انتظار کا دروازہ...... اسے یوں لگا جیسے تپتے صحرا جیسی اس کی زندگی میں ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آنے لگے ہوں۔ اب تک اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ کسی چاہنے والے کے تصور میں دن رات گزارنے والوں کے لئے زندگی کے دکھ کچھ ہلکے ہو جاتے ہیں۔ کانٹوں کی چبھن کچھ کم ہو جاتی تھی۔ وہ اب بالکل چپ چپ رہنے لگا۔ اس کے اندر اب ایک الگ ہی دنیا آباد تھی اور وہ بس اسی میں مگن رہتا تھا۔ ظاہری طور پر وہ جیسے ایک مشین سی بن گیا تھا۔ کھڈی پر بیٹھ کر وہ گویا اسی کا ایک حصہ بن جاتا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں مشینی سے انداز میں حرکت کرتے رہتے اور کھڈی کی کھٹ کھٹ کے ساتھ اس کے دل کی دھک دھک ہم آہنگ ہو کر لمحوں کا سفر اس طرح طے کرتی رہتی کہ اسے وقت گزرنے کا احساس بھی نہ ہوتا۔

ہتھکڑیاں اور بیڑیاں اب اسے تکلیف نہیں دیتی تھیں۔ وہ گویا اس کے جسم کا حصہ بن گئی تھیں۔ وہ اب کسی سے الجھتا بھی نہیں تھا‘ کسی سے کوئی شکایت نہیں کرتا تھا۔ اس کے اندر غصہ اور غیظ و غضب ختم تو نہیں ہوا تھا‘ لیکن وقتی طور پر جیسے خوشی و سرشاری کی چادر اوڑھ کر کہیں سو گیا تھا۔ اس کے نگراں کو بھی نہیں معلوم تھا کہ ایک چاقو اس کے پاس اب بھی موجود تھا۔ کبھی کبھار وہ رات

کو جیل کی کوٹھری میں اکیلا بیٹھا اس چاقو سے کھیلتا رہتا۔ کبھی اسے ہوا میں گھماتا‘ کبھی اس کی دھار پر ہاتھ پھیر کر دیکھتا اور اس سے نادیدہ لوگوں کے جسموں کی چیر پھاڑ کرتا‘ حتیٰ کہ کبھی کبھی وہ اس چاقو کو اپنے چہرے کے قریب لا کر سرگوشیوں میں اس سے باتیں بھی کرتا۔

یوں دو سال گزر گئے۔

ان دو سالوں میں بہت سی تبدیلیاں آ گئی تھیں۔ بھورے کی شادی ہو گئی تھی۔ اس نے کافی لمبا قد نکال لیا تھا اور مضبوط جسم کا جوان دکھائی دینے لگا تھا۔ اس کی شادی جس سے ہوئی تھی‘ اسے قلعے میں سب سے خوبصورت بھنتو لڑکی سمجھا جاتا تھا۔ ایک گڑبڑ یہ ہوئی کہ اس کی شادی کے کچھ ہی دونوں بعد اس کی ماں مر گئی‘ جس کی وجہ سے اس کے چھوٹے بھائی پریتم کی شادی کھٹائی میں پڑ گئی۔ لڑکیوں کے والدین موچھ کی رقم بھی زیادہ مانگنے لگے تھے‘ جس کی وجہ سے پریتم کے لئے شادی کرنا اور بھی دشوار ہو گیا۔

تاہم کچھ عرصے بعد اسے بھی ایک بھینگی لڑکی میسر آ ہی گئی۔ بھینگی ہونے کی وجہ سے اس کی موچھ کی رقم کم تھی‘ لیکن یہ ’’رعایتی سودا‘‘ بھی بے چارے پریتم کو راس نہ آیا۔ شادی کے کچھ ہی دنوں بعد اس کی بیوی چیچک کا شکار ہو کر مر گئی۔ وہ نوعمری میں ہی رنڈوا ہو گیا۔ نکیشر کی بھی شادی ہو گئی تھی۔ اسے قلعے سے باہر رہنے والے ایک ’’نیک معاش‘‘ نے اپنی بیٹی دے دی تھی۔ انگریز حکومت قلعے سے باہر رہنے والے ایسے ’’نیک معاش‘‘ لوگوں کی ہمت افزائی کرتی تھی جو اپنی بیٹیوں کے رشتے قلعے میں قید نوجوانوں سے کر دیتے تھے۔ ایسی لڑکیوں کی موچھ کی رقم خود انگریز سرکار دیتی تھی۔ یوں نکیشر کی شادی ہو گئی ورنہ موچھ کی رقم اس کے پاس بھی نہیں تھی۔

گجندر کا باپ اس کیلئے کوئی لڑکی نہ ڈھونڈ سکا‘ کیونکہ اس کی دو بیگھہ زمین سے صرف اتنی آمدنی ہوتی تھی کہ دونوں باپ بیٹے اپنا پیٹ ہی مشکل سے پالتے تھے۔ سرجو اور صادق ابھی کچھ اور کم عمر تھے‘ لیکن مونچھیں بہرحال ان کی بھی نکل آئی تھیں۔ وہ سب شاید زندگی بھر کیلئے اس بات پر سلطان کے احسان مند ہو چکے تھے کہ اس نے پولیس کا سارا ظلم اپنی جان پر سہہ لیا تھا‘ لیکن ڈکیتی کے سلسلے میں ان کا نام نہیں لیا تھا۔ اسے شاید لمبی سزا بھی اسی لئے ہوئی تھی‘ لیکن اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اب وہ سب لڑکے سلطانہ کے انتہائی وفادار اور جاں نثار دوست بن چکے تھے۔ اب وہ اس کی خاطر جان بھی قربان کر سکتے تھے۔ بھورے گو کہ قد کاٹھ میں سلطانہ سے بھی نکلتا ہوا تھا اور نہایت مضبوط و طاقتور دکھائی دیتا تھا‘ لیکن سلطانہ کے سامنے چھوٹے بھائیوں کی طرح سر جھکا کر

کھڑا ہوتا تھا اور سعادت مندی سے اس کا ہر حکم ماننے کے لئے تیار رہتا تھا۔

تلی اب آ کر جیل میں سلطانہ کے ساتھ رہنے لگی تھی۔ صبح کا اجالا نمودار ہونے پر دونوں الگ الگ سمتوں میں اپنے اپنے کام پر روانہ ہو جاتے۔ تلی کو گنے کے کھیتوں میں کام کے لئے جانا پڑتا تھا۔ سلطانہ کو بدستور کھڈیوں پر کام کرنے جانا پڑتا تھا۔ دھوپ' سردی' گرمی اور دوسرے ہر طرح کے موسموں میں کھیتوں میں کام کرنے کے باوجود تلی اب بھی قلعے کی سب سے گوری لڑکی تھی۔ اس نے بڑے صبر' قناعت اور سادگی سے جیل کی تنگ و تاریک کوٹھری کو ہی اپنا گھر سمجھ لیا تھا اور سہانے مستقبل کے خواب دیکھنے شروع کر دیئے تھے۔

جلد ہی اس نے سلطانہ سے کہنا شروع کر دیا تھا۔ ''ہمارے کئی بیٹے ہوں گے' ہم خوب محنت کریں گے۔ تم کھڈیوں پر اور بھی زیادہ محنت سے کام کرو۔ میں کھیتوں میں پہلے سے زیادہ مشقت کیا کروں گی۔ تاکہ سرکار ہمیں جلدی ''نیک معاش'' سرٹیفکیٹ دے دے۔ پھر ہمیں قلعے سے باہر کہیں نہ کہیں تھوڑی بہت زمین مل جائے گی۔ ہم اس پر اپنا گھر بنائیں گے اور خوب محنت کر کے کپاس اور گنے کی فصلیں اگائیں گے۔ دو چار سال میں ہم خوش حال ہو جائیں گے۔''

سلطانہ ایک اچھی' خوبصورت اور محبت کرنے والی بیوی پا کر بہت خوش تھا' لیکن وہ اس کے خوابوں میں شریک نہ ہوتا۔ نہ جانے کیوں اس کا دل کہتا تھا کہ ان خوابوں کو تعبیریں ملنے کی کوئی امید نہیں تھی۔ اسے قلعے سے چھٹکارا پانے کا ہی کوئی امکان نظر نہیں آتا تھا۔ بہت سے لوگوں کو قلعے میں سات آٹھ سال گزارنے کے بعد ''نیک معاش'' کا سرٹیفکیٹ مل جاتا تھا' لیکن گلفی کے زمانے سے ہی سلطانہ دیکھ رہا تھا کہ ان کے ساتھ کوئی نہ کوئی ایسی بات ہو جاتی تھی' جس کی وجہ سے قلعے میں ان کے رہنے کی مدت نئے سرے سے شمار ہونے لگتی تھی۔ اب اسے پتا چلا تھا کہ اسے سات سال کی جو سزائے قید ہوئی تھی' اس کی وہ مدت اس کے قلعے میں رہنے کے سات سال شروع ہوں گے اور اگر اس دوران وہ کوئی جرم کر بیٹھا تو قلعے میں رہنے کا عرصہ ایک بار پھر نئے سرے سے شروع ہو جائے گا۔

یہ حساب کتاب سلطانہ کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ اس کے لئے یہ کسی گورکھ دھندے سے کم نہیں تھا۔ اس لئے اس نے اس کے بارے میں سوچنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ وہ قلعے میں پیدا ہوا تھا اور اسے یوں لگتا تھا کہ وہ قلعے میں ہی مر جائے گا۔ کبھی کبھی اس کے دل میں ایک انجانے سے درد کی لہر اٹھتی تھی۔ ایک ایسا درد جس کی نوعیت کو سمجھنے سے وہ قاصر تھا۔ وہ ایک ان پڑھ' سادہ لوح اور

کرخت سا آدمی تھا۔ انسانی جذبات اور محسوسات کی باریکیوں کو سمجھنا' انہیں کوئی معانی پہنانا اور صحیح تناظر میں دیکھنا' اس کے بس کی بات نہیں تھی' لیکن جب بھی اس کے دل میں اس انجانے درد کی لہر اٹھتی تو وہ یہ ضرور سوچتا کہ کیا اسے تقدیر کے اس فیصلے کو قبول کر لینا چاہئے؟ کیا اسے اس بات پر صبر کر لینا چاہئے کہ اس کی ساری زندگی قلعے میں ہی گزرے گی؟

اس سوال کا جواب اسے ایک عجیب سی بے چینی اور اضطراب کی صورت میں ملتا۔ جب سے وہ جوان اور ذرا باشعور ہوا تھا' تب سے یہ سوال اسے بہت ہی اذیت دینے لگا تھا۔ وہ اس پہلو پر سوچتا تو اس کی رگ و پے میں چنگاریاں سی دوڑنے لگتیں۔ اسے یوں لگتا جیسے اس کے وجود میں ایک نہایت طاقتور اور سرکش روح قید تھی' جسے زنجیریں پہنا دی گئی تھیں۔ اس کے اندر کوئی پُرشور دریا ٹھاٹھیں مار رہا تھا' مگر اس کے چاروں طرف مضبوط بند باندھ دیئے گئے تھے۔

اسی لئے وہ تلی کے خیالوں' خوابوں اور تصورات میں شریک نہیں ہوتا تھا۔ اسے خود اپنے آپ سے خوف آتا تھا۔ اندیشہ محسوس ہوتا تھا کہ کہیں اس کے دل میں بھی ان خوابوں کی تعبیریں حاصل کرنے کی آرزو نہ جاگ اٹھے۔ اسے کچھ یوں لگتا تھا کہ ان تعبیروں کو پانے کے راستے پر قدم رکھتے ہی اس کے اندر موجود کچھ بند ٹوٹ جائیں گے' کوئی سرکش دریا' کوئی باغی روح آزاد ہو جائے گی...... اور پھر شاید کوئی بڑی تباہی آئے گی' شاید خوابوں کی تعبیریں کچھ اور دور چلی جائیں گی۔ اس کے ہاتھ نہیں آئیں گی۔ شاید بہت سے خواب بھی ادھورے رہ جائیں گے۔

چنانچہ وہ تلی کو بس ''ہوں ہاں'' میں ہی جواب دیتا اور اس کی سرگوشیاں سنتے سنتے سو جاتا۔

تلی کو جب جیل میں سلطانہ کے پاس آئے تین سال گزر گئے اور اس کے ہاں اولاد ہونے کے کوئی آثار دکھائی نہ دیئے تو وہ پریشان ہونے لگی۔ وہ تو کئی بیٹوں کے خواب دیکھتی تھی' لیکن اس کے ہاں ابھی تک پہلے بچے ہی کی کوئی امید نظر نہیں آ رہی تھی۔ کوئی وجہ بھی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ اسی دوران انہیں پتا چلا کہ بھورے کی بیوی امید سے تھی۔ یہ سن کر تلی کا اضطراب اور بڑھ گیا۔ سلطانہ کو اس معاملے میں کوئی بے چینی نہیں تھی' لیکن وہ تلی کو اداس اور پریشان دیکھتا تھا تو اس کے دل کو بھی کچھ ہونے لگتا تھا۔

ایک روز وہ جیل کی کوٹھری میں پہنچا تو اسے تلی بڑی خوش دکھائی دی۔ وہ تقریباً روز ہی سلطانہ سے پہلے اپنے کام پر سے واپس آ جاتی تھی' لیکن کافی دنوں سے وہ اس وقت تھکی تھکی اور کچھ پژمردہ سی دکھائی دیتی تھی۔ آج خلاف توقع سلطانہ نے اسے خوش اور تازہ دم پایا۔

"کافی دنوں بعد تمہارے چہرے پر کچھ خوشی نظر آ رہی ہے۔" سلطانہ نے زمین پر بچھے گھاس پھونس کے گدے پر اس کے برابر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "کیا کوئی اچھی خبر سننے کو ملی ہے؟"

"ہاں...... یہی سمجھ لو۔" پتلی بولی۔ "اولاد کے لئے میں نے مندروں میں تو کافی پوجا پاٹ کر لی۔ میں پادری صاحب سے دعا کرانے گرجا گھر میں بھی گئی تھی' مگر ابھی تک کوئی امید نظر نہیں آ رہی۔ اب مجھے ایک پیر صاحب کا پتا چلا ہے' وہ رہتے تو پتا نہیں کہاں ہیں مگر بھادوں کے مہینے میں مراد آباد آتے ہیں' وہاں وہ خاص طور پر بے اولاد عورتوں کے لئے آتے ہیں۔ میں نے سنا ہے ان کے پاس جانے والی ہر عورت مراد پاتی ہے۔"

"لیکن ...... پیر صاحب کے پاس تو مسلمان عورتیں ہی جاتی ہوں گی؟" سلطانہ نے گدے پر لیٹتے ہوئے کہا۔ اسے جب جیل کی کوٹھری میں داخل کیا جاتا تھا تو اس کی ہتھکڑیاں اور بیڑیاں کھول دی جاتی تھیں۔ پتلی نے اس کی ٹانگیں دبانا شروع کر دیں۔ یہ اس کا معمول تھا۔ جب سلطانہ کھڈیوں پر واپس آتا تھا تو پتلی کچھ دیر تک اس کی ٹانگیں دباتی تھی اور سر میں مالش کرتی تھی' حالانکہ اس وقت وہ خود بھی تھکی ہوتی تھی۔

"پیر صاحب کسی کو بھی اپنے پاس آنے سے منع نہیں کرتے۔" پتلی نے بتایا۔ "ہندو' مسلمان' سکھ' عیسائی سبھی بے اولاد عورتیں ان کے پاس جاتی ہیں۔ وہ ہر عورت کو بس ایک سیب کھانے کے لئے دیتے ہیں اور اس کی مراد پوری ہو جاتی ہے۔ سنا ہے وہ سیب کھانے والی ہر عورت ماں ضرور بنتی ہے۔ ہزاروں عورتیں ان کے پاس جاتی ہیں۔"

سلطانہ کو اس بات پر کوئی خاص یقین نہیں آیا کہ پیر صاحب کا دیا ہوا سیب کھانے سے کوئی بے اولاد عورت ماں بن سکتی تھی' لیکن اس نے پتلی سے بحث نہیں کی اور نہ ہی اسے پیر صاحب کے پاس جانے سے منع کیا۔ وہ اس کا دل توڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کی کوشش یہی تھی کہ پتلی اپنا ہر جتن کر لے۔

بھادوں کا مہینہ آیا تو پتلی پاس لے کر بھورے کی بیوی کے ساتھ مراد آباد چلی گئی اور پیر صاحب کی خدمت میں حاضری دے آئی۔ اس نے پیر صاحب کا دیا ہوا سیب وہیں کھا لیا تھا۔ اسے واپس آئے چوتھا مہینہ تھا جب انہیں پتا چلا کہ بھورے کی بیوی کا بچہ اس کی کوکھ میں ہی مر گیا تھا۔ پتلی اور سلطانہ دونوں کو ہی یہ سن کر بہت افسوس ہوا' مگر اسی مہینے کے اختتام تک پتلی کا تاسف خوشی میں بدل گیا۔ اس نے سلطانہ کو بتایا کہ وہ امید سے تھی۔ اس کی خوشی کی کوئی حد نہیں

تھی' لیکن سلطانہ یہ خبر سن کر کچھ پریشان سا ہو گیا۔

پتلی اس کے چہرے پر وحشت کے آثار دیکھ کر برا ماننے کے سے انداز میں بولی۔ "لگتا ہے تمہیں اس بات کی خوشی نہیں ہوئی؟"

"خوشی......؟" سلطانہ الجھن آمیز سے لہجے میں بولا۔ "خوشی تو شاید ہوئی ہے......لیکن اس سے زیادہ پریشانی ہو رہی ہے۔ مجھے لگتا ہے پیر صاحب نے کچھ اچھا نہیں کیا۔ انہوں نے بھورے کی بیوی سے بچہ چھین کر ہماری جھولی میں ڈال دیا ہے۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔"

"کیسی پاگلوں جیسی باتیں کر رہے ہو......؟" پتلی نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"پیر فقیر...... سادھو سنت اور دوسرے نیک لوگ اس طرح کے کام نہیں کرتے' یہ تو بس اتفاق ہے۔"

پتلی نے اسے کافی سمجھایا۔ وہ چپ تو ہو گیا لیکن اس کا دل مطمئن نہیں ہوا۔ اس کے ضمیر میں ایک خلش سی تھی۔ چند دن بعد قلعے سے باہر کھڈیوں کی طرف جاتے ہوئے اس کی ملاقات بھورے سے ہوئی تو اس کے ذرا بدلے بدلے سے تاثرات دیکھ کر اسے یوں لگا جیسے یہ بات بھورے کے ذہن میں آئی تھی یا شاید کسی اور نے اس کے ذہن میں ڈالی تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ ان کی بچپن کی دوستی پر بدگمانی کے سائے لہرا رہے تھے۔

اس نے چلتے چلتے اپنا بازو' ہتھکڑی اور زنجیر سمیت بھورے کے کندھے پر رکھ کر اسے اپنے قریب کرتے ہوئے کہا۔ "بھورے...... میرے یار...... دل چھوٹا نہ کر...... میرے گھر میں جو بیٹا ہو گا نا......بس یوں سمجھ لے وہ تیرا ہی بیٹا ہو گا۔ اگر تو کہے گا تو وہ میں تجھے دے دوں گا۔"

بھورے کے چہرے پر جو دھواں سا پھیلا ہوا تھا' وہ چھٹتا دکھائی دیا۔ اس نے بھی ایک بازو سے سلطانہ کو بھینچ لیا۔ "ارے سلطانہ بھائی...... اس کی ضرورت نہیں...... دو بھائیوں کے بیچ میں اولاد' کیا تیری کیا میری...... میں تمہارے بچے کو پتلی بھابی سے جدا تو نہیں کر سکتا۔ وہ تو دکھ سے مر جائے گی۔ اسے بچے کا بڑا ارمان ہے۔ تمہارا بچہ تمہارے گھر میں رہے یا میرے گھر میں...... ایک ہی بات ہے۔ آگے چل کر بھگوان مجھے اور بچہ دے دے گا' وہ بھی تمہارا ہی ہو گا۔"

یوں کم از کم اس وقت ایسا لگا کہ ان کے درمیان بدگمانی کی جو نادیدہ سی خلیج آ گئی تھی' وہ اب ختم ہو گئی تھی۔

موسم بہار آیا تو ایک روز قلعے والوں کیلئے اعلان ہوا کہ وہ گرجا گھر کے سامنے والے میدان میں پہنچیں' وہاں کوئی خصوصی دعا ہو گی۔ سلطانہ کو بھی ہتھکڑیوں' بیڑیوں سمیت وہاں جانا پڑا۔ اس کے سب دوست بھی اس کے ساتھ ہو لئے۔

میدان میں جب سب لوگ جمع ہو گئے تو پادری کے ساتھ ایڈ جونٹ آنند وہاں آیا۔

ایڈ جونٹ آنند ایک ہندو گھرانے میں پیدا ہوا تھا اور اس کا نام اب بھی ہندوانہ تھا' لیکن درحقیقت وہ عیسائی ہو چکا تھا۔ وہ چند سال ولایت بھی رہ کر آیا تھا۔ وہ اہم عہدے پر تو فائز تھا ہی...... لیکن وہ اپنی ڈیوٹی کے علاوہ بھی انگریزوں کے لئے خدمات انجام دیتا تھا۔ وہ قلعے میں رہنے والوں اور انگریز انتظامیہ کے درمیان چوبیس گھنٹے ہی ایک پل کے طور پر کام کرتا تھا۔ ایک طرف وہ انتظامیہ کا حصہ تھا' دوسری طرف وہ بوقت ضرورت انگریزوں نے قلعے کا نظام چلانے اور اس پر موثر کنٹرول رکھنے کے لئے گویا قلعے والوں میں سے ہی ایک آدمی چن رکھا تھا۔

اس وقت دعا شروع ہونے سے پہلے آنند نے مختصری تقریر میں اس کا پس منظر بیان کیا' جس سے سلطانہ کو پتا چلا کہ پنجاب کے ایک شہر میں ڈائر نامی ایک انگریز جرنیل نے کسی جلسے پر فائرنگ کرا دی تھی جس کی وجہ سے بیس ہزار سے زیادہ آدمی مر گئے تھے۔ ان میں ہندو' مسلمان اور سکھ' سبھی شامل تھے۔ دعا دراصل ان سب مرنے والوں کے لئے کی جا رہی تھی۔ انگریز پادری نے دعا کرائی۔

دعا کے بعد سب لوگ واپس روانہ ہوئے تو سلطانہ اور چند دوسرے قیدیوں کی نگرانی پر تعینات رہنے والا مسلح نگراں ان کے پیچھے تھا' جبکہ سلطانہ کے دوست اس کے دائیں بائیں چل رہے تھے۔

"بھورے...... یار...... ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔" سلطانہ الجھن آمیز لہجے میں بولا۔

"وہاں پنجاب میں انگریز جرنیل نے بیس پچیس ہزار آدمی مار دیئے۔ یہاں انگریز پادری ان کی بخشش کی دعا کرا رہا ہے' عجیب لوگ ہیں یہ بھی......"

"میرے خیال میں تو انگریز پادری دراصل دل ہی دل میں اپنے جرنیل کے لئے دعا مانگ رہا ہو گا کہ کہیں اب ہندو' سکھ یا مسلمان اسے نہ مار دیں۔" بھورے ایک لمحے سوچنے کے بعد گہری سنجیدگی سے بولا۔

"ہاں یار...... تم ٹھیک کہہ رہے ہو' یہ انگریز اتنے رحم دل تو نہیں ہیں کہ اپنے جرنیل کے

ہاتھوں مرنے والے ہندوستانیوں کے لئے دعا کرائیں۔" سلطانہ نے اس سے اتفاق کیا۔ "ان کی رحم دلی تو ہم لوگ دیکھ ہی رہے ہیں۔ کس طرح انہوں نے ان بھنتوؤں کو بھی قلعے میں قید کر رکھا ہے' جن بے چاروں کو معلوم ہی نہیں کہ ان کا قصور کیا ہے۔ یہیں پیدا ہونے والے معصوم بچے بھی اپنے ماں باپ کے ساتھ قیدیوں کی زندگی گزار رہے ہیں۔ مجھے ہی دیکھ لو...... ریل گاڑی میں صرف بنئے کے کنبے سے زیور چھیننے کی سزا کاٹتے ساتواں سال چل رہا ہے۔ سات سال سے یہ ہتھکڑیاں' بیڑیاں لگی ہوئی ہیں۔" اس نے ہاتھ اونچے کر کے اپنی زنجیریں دکھائیں۔ "اور ادھر مراد آباد والی جیل میں تو شاید سپاہی ڈنڈوں سے مار مار کر مجھے ہمیشہ کیلئے معذور ہی کر دیتے۔ وہ کسی وجہ سے رک گئے تھے' ورنہ ان کا تو روز میرے بدن کے کسی نہ کسی حصے کو ڈنڈوں سے کوٹنے کا ارادہ تھا۔ اگر وہ اپنے دل کے ارمان نکال لیتے اور اس کے بعد بھی مجھے زندہ جیل سے نکلنا نصیب ہوتا تو شاید میں بھی ان معذوروں کی طرح کسی سڑک کے کنارے پڑا بھیک مانگتا دکھائی دیتا' جن کے بدن کا کوئی حصہ صحیح سلامت اور کام کرنے کے قابل نہیں ہوتا...... جو اس گٹھری سی بنے' پڑے رہتے ہیں۔"

شاید مراد آباد جیل میں گزارے ہوئے دنوں کو یاد کر کے سلطانہ کے چہرے پر ایک عجیب سا کھنچاؤ آ گیا اور اس کی آنکھیں سلگنے لگیں۔



بندوق بردار نگران گو کہ اس وقت سلطانہ کی زنجیر تھامے اس کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا' لیکن شاید اس نے بھی سلطانہ کے لہجے کی تلخی کو محسوس کر لیا تھا۔ وہ اونچی آواز میں بولا۔ ''تیری قسمت اچھی ہے سلطانہ...... تو بہت اچھی حالت میں مراد آباد جیل سے نکل آیا۔ اگر تجھے سات سال وہاں گزارنے پڑ جاتے تو باہر آنے کے بعد تو زندگی میں شاید کچھ بھی کرنے کے قابل نہ رہتا۔ تیرے بارے میں تو پتا نہیں کیوں جیل والوں کو حکم ملا ہوا تھا کہ اس لڑکے پر سختی رکھنا ہے۔ پھر پتا نہیں کیا ہوا کہ ایک سال بعد یہ سختی' نرمی میں تبدیل ہو گئی۔''

وہ نگران جو سلطانہ اور دوسرے پانچ قیدیوں پر نظر رکھنے کیلئے تعینات تھا' مراد آباد جیل سے ہی آیا تھا۔ اس لئے وہاں کے حالات سے کافی حد تک واقف تھا۔ تاہم سلطانہ کا وہاں اس سے شاذ و نادر ہی سامنا ہوا تھا اور وہ سلطانہ پر تشدد کرنے والے سپاہیوں میں بھی کبھی شامل نہیں رہا تھا۔ اس نے قلعے میں بھی سلطانہ کی نگرانی کے دوران کبھی اس پر کوئی سختی کرنے' اس سے الجھنے یا اکڑ دکھانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ بس خاموشی سے اپنی ڈیوٹی انجام دیتا تھا۔ وہ اپنے کام سے کام رکھنے والا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اتنے طویل عرصے سے سلطانہ سمیت چھ قیدیوں کی نگرانی کا فریضہ وہی انجام دے رہا تھا۔ سلطانہ نے بھی کبھی اس سے الجھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

سلطانہ نے گردن گھما کر سرخ سرخ آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں اکثر سرخ ہی رہتی تھیں۔ اب وہ ایک دراز قد اور کڑیل جوان تھا۔ اسے گو کہ اچھا ماحول' اچھی خوراک اور زندگی کی دوسری نعمتیں میسر نہیں تھیں' روکھی سوکھی کھا کر اور سات سال سے ہاتھ پیروں میں زنجیریں پہن کر دن گزار رہا تھا۔ اس کے باوجود اس نے بڑا اچھا قد کاٹھ نکالا تھا اور اسے دیکھ کر اس کے جسم و جان کی غیر معمولی مضبوطی کا احساس ہوتا تھا۔

''وہ جتنی چاہے سختیاں کر لیتے...... سلطانہ سب سہہ جاتا۔'' سلطانہ بولا۔ ''مجھے تو سختیاں

اچھی لگنے لگی ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے یہ سختیاں مجھے سخت جان بنا رہی ہیں۔ شاید میں اندر سے پتھر کا ہو رہا ہوں۔''

''میرا خیال ہے اب تمہاری سختیوں کا زمانہ ختم ہو رہا ہے...... ہاں' اگر تم نے کوئی اور واردات کر ڈالی تو بات اور ہے۔'' گارڈ بولا۔

''میری سختیوں کا زمانہ ختم ہو رہا ہے......؟'' سلطانہ نے حیرت سے دہرایا اور چلتے چلتے رک گیا۔ ''کیا مطلب ہے تمہارا......؟''

''کیا تمہیں آنند نے کچھ نہیں بتایا؟'' گارڈ نے بھی رکتے ہوئے پوچھا۔ سلطانہ نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''شاید وہ عین وقت پر یہ بات بتا کر تمہیں حیران کرنا چاہتا ہو...... لیکن اب بات شروع ہو گئی ہے تو میں بہرحال تمہیں بتا دیتا ہوں۔'' گارڈ گہری سانس لے کر بولا۔ ''تمہاری رہائی کے آرڈر آ گئے ہیں۔ میرا خیال ہے ہفتے' دس دن بعد تمہیں رہا کر دیا جائے گا۔ تمہیں پانچ چھ مہینے کی جو سزا باقی تھی' وہ معاف ہو گئی ہے۔''

''کیا واقعی......؟'' حیرت اور بے یقینی سے سلطانہ کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ''تم سچ کہہ رہے ہو؟''

وہ گویا اپنی موجودہ زندگی کا عادی ہو گیا تھا اور شاید رہائی کا خیال ہی اس کے ذہن سے محو ہو گیا تھا۔

''ہاں...... میں کل ڈیوٹی ختم ہونے کے بعد آنند صاحب کے دفتر میں بیٹھا تھا تو میں نے انہیں کسی سے بات کرتے سنا تھا۔ وہ ایک کاغذ کسی کو دکھاتے ہوئے کہہ رہے تھے' آئی جی صاحب جیل خانہ جات کی چٹھی آئی ہے۔ انہوں نے کچھ قیدیوں کے نام بھیجے ہیں' جنہیں ہفتے دس دن بعد آزاد کیا جا رہا ہے۔ ان میں تمہارا نام بھی تھا۔'' گارڈ نے بتایا۔

''تم مذاق تو نہیں کر رہے نا......؟'' سلطانہ کو اب بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔

''بے وقوف انسان...... اس قسم کی باتوں میں بھی بھلا کسی سے مذاق کیا جاتا ہے؟'' گارڈ گویا ذرا بُرا مناتے ہوئے بولا۔ ''بس' میں کان اور آنکھیں کھلی رکھتا ہوں' اس لئے میں نے یہ بات سن لی...... لیکن تم اتنے حیران کیوں ہو رہے ہو؟ آخر ایک نہ ایک دن تو تمہیں رہا ہونا ہی تھا۔''

اب سلطانہ اسے کیا بتاتا کہ رہائی کا خیال اس کے دماغ کے کسی تاریک گوشے میں چلا گیا تھا۔ اسے تو کچھ یوں لگنے لگا تھا کہ زندگی بس اسی طرح جیل سے کھڈیوں تک اور کھڈیوں سے واپس جیل آنے جانے میں ہی تمام ہو جائے گی۔

گارڈ ایک لمحے کے توقف کے بعد بولا۔ ''تمہاری باقی سزا شاید اس لئے معاف ہو گئی ہے کہ تم نے یہاں خاموشی سے' سر جھکا کر محنت سے کام کرتے ہوئے کئی سال گزار دیئے اور کوئی گڑبڑ نہیں کی۔''

سلطانہ گویا خیالوں کی دنیا میں کہیں دور نکل گیا تھا۔ وہ چونکا اور ایک دم آگے بڑھ کر زنجیروں سمیت گارڈ سے لپٹ گیا۔ وہ بے چارہ اس اچانک افتاد سے بری طرح گھبرا گیا۔ فوری طور پر شاید اسے یہی گماں گزرا کہ سلطانہ نے شاید اس پر حملہ کر دیا ہے اور اسے قابو میں کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ اپنے آپ کو اور اپنی بندوق کو سلطانہ کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔ سلطانہ کی دیکھا دیکھی بھورے اور پریتم بھی اس سے لپٹ گئے تھے۔

سلطانہ نے بھی اس کی گھبراہٹ کو محسوس کر لیا اور اسے اپنے بازوؤں کے شکنجے سے آزاد کرتے ہوئے بولا۔ ''پریشان کیوں ہو رہے ہو دلیر سنگھ؟ نام دلیر ہے تو ذرا دلیر ہی بن کر رہا کرو نا...... ہم تو ذرا خوشی ظاہر کر رہے تھے۔ تم نے اتنی بڑی خوشخبری سنائی ہے...... دل چاہ رہا ہے تمہارا منہ چوم لوں...... یا تمہارا منہ جلیبیوں سے بھر دوں۔''

بھورے اور پریتم نے بھی دلیر سنگھ نامی اس گارڈ کو چھوڑ دیا۔ وہ دو قدم پیچھے ہٹ کر ذرا کھسیانے سے انداز میں اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ سلطانہ کا خوشی کا اظہار صرف یہیں تک محدود نہیں رہا۔ اس نے دھیرے دھیرے ناچنا بھی شروع کر دیا۔ اس کا انداز کسی حد تک خمار زدہ لوگوں جیسا تھا۔ اپنے ہاتھ پیروں میں جھولتی زنجیروں کے ساتھ رقص کرتے ہوئے وہ کچھ عجیب بھی لگ رہا تھا۔ اس کے انداز میں دیوانگی کی جھلک بھی تھی۔ اس کے دوست بھی اس کے ساتھ رقص کرنے لگے۔ وہ سب کے سب رقص کرتے ہوئے ایک دائرے میں گھوم رہے تھے۔ ان کے رقص نے ایک عجیب سماں باندھ دیا۔ انہیں اس طرح کرتے دیکھ کر لوگ ان کے گرد جمع ہونے لگے۔ جب انہیں سلطانہ کی متوقع رہائی کے بارے میں معلوم ہوا تو انہوں نے بھی تالیاں بجا بجا کر رقص کرنے والی ٹولی کا ساتھ دینا شروع کر دیا۔ کافی دیر بعد بڑی مشکل سے گارڈ اپنی زیر نگرانی قیدیوں کو وہاں سے لے جانے میں کامیاب ہوا۔

گارڈ کی سنائی ہوئی خبر سچ ثابت ہوئی۔ ٹھیک آٹھ دن بعد سلطانہ کو رہا کر دیا گیا۔ قلعے میں رہنے والے اسے گلفی کا وارث سمجھتے تھے' اس لئے اس کی بھی قلعے میں تقریباً اتنی ہی اہمیت تھی۔ اس کی رہائی پر پورے قلعے میں خوشیاں منائی گئیں۔ جگہ جگہ چراغ روشن کئے گئے اور لوگوں کی ایک بڑی تعداد اسے جیل سے لینے گئی۔ اسے کندھوں پر اٹھا کر جیل سے اس کمرے تک لایا گیا' جس میں وہ کبھی اپنے دادا کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ وہی کمرہ اب اسے الاٹ کر دیا گیا تھا۔ جیل سے اس کی رہائی اور اس کمرے تک اس کی آمد کا منظر بالکل ایسا ہی تھا' جیسے وہ کوئی مجرم نہیں' بلکہ سیاسی لیڈر ہو۔ اپنی سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے ملنے والی سزا کاٹ کر جیل سے رہا ہو کر واپس آ رہا ہو اور اس کے پارٹی ورکر اسے لینے آئے ہوں۔

اس کی بیوی تپلی اس چھوٹے سے کمرے میں موجود تھی' جو اب ان دونوں کا گھر تھا۔ اس کمرے کو تپلی نے غریبانہ سے انداز میں سجایا بھی تھا اور اس کام میں پڑوسیوں نے اس کی مدد کی تھی' لیکن جس وقت سلطانہ جیل سے گھر پہنچا' اس وقت تپلی چارپائی پر پڑی درد سے کراہ رہی تھی۔ پاس پڑوس کی دو تین عورتیں اس کے پاس موجود تھیں۔ سلطانہ کے گھر میں کسی بھی وقت ولادت متوقع تھی۔

رات گئے جب اس کی رہائی کا ہنگامہ ذرا ٹھنڈا پڑا تو دوسرا ہنگامہ شروع ہو گیا۔ وہ اس وقت اپنے کمرے سے کچھ دور چھوٹے میدان میں' پرانے برگد کے نیچے لکڑی کے ایک نیم شکستہ تخت پر بیٹھا' آس پاس اس کے دوستوں کے علاوہ بھی کئی افراد موجود تھے۔ چوپال کا سا منظر تھا۔ اس کے دادا گلفی بھی کبھی اسی طرح محفل جمایا کرتے تھے۔ اسی دوران ایک عورت اس کے کمرے سے نکل کر تیز تیز قدموں سے ان لوگوں کی طرف آئی۔

وہ سلطانہ سے ذرا دور ہی رک کر کپکپاتی آواز میں بولی۔ ''ارے سلطانہ...... بہت بدھائی ہو تمہیں...... تمہارے گھر میں بیٹے نے جنم لیا ہے۔''

سلطانہ کے حلق سے ایک بلند' مگر بے معنی سی آواز نکلی۔ یوں لگا جیسے اس نے الفاظ کے بغیر ہی کوئی نعرہ لگانے کی کوشش کی ہو' پھر وہ تخت سے اتر آیا اور ہاتھ جوڑ کر یوں سر جھکا کر کھڑا ہو گیا' جیسے کسی نادیدہ ہستی کے سامنے عبادت کر رہا ہو۔ شاید وہ اس وقت تصور ہی تصور میں دیوی دیوتاؤں کے سامنے تشکر کا اظہار کر رہا تھا۔ چند لمحوں بعد جب اس نے سر اونچا کیا تو اس کے آس پاس موجود لوگ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ سلطانہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ کر اس کے

رخساروں پر آ گئے تھے۔ جب وہ چھوٹا تھا تب بھی لوگوں نے اسے کسی تکلیف یا مصیبت کے وقت میں روتے نہیں دیکھا تھا' تاہم جب وہ بولا تو انہیں اندازہ ہوا کہ سلطانہ کے آنسو دراصل خوشی کے آنسو تھے۔

''مجھے یقین نہیں آ رہا کہ شری مہاراج یکدم کسی کی زندگی کا پانسا یوں بھی پلٹ سکتے ہیں......'' وہ لرزاں سی آواز میں بولا۔ ''مجھے تو یوں لگنے لگا تھا کہ جیون بس اب جیلوں میں ہی گزر جائے گا...... پہلے مراد آباد جیل...... پھر قلعے کی جیل...... اور یہ قلعہ بھی کسی جیل سے کم نہیں......لیکن جیسا وقت میں نے گزارا ہے' اس کے بعد یہ قلعہ بھی کافی اچھا لگنے لگا ہے۔ یہاں کچھ نہ کچھ آزادیاں تو ہمیں ملی ہوئی ہیں......اور پھر چاروں طرف اپنے ہی لوگ موجود ہیں...... میں تو اب اپنے آپ کو آزاد ہی محسوس کر رہا ہوں......اور پھر دیکھو......بھگوان نے دہری خوشی دے دی......دو بڑی خوشیاں ایک ساتھ مل گئیں۔ اتنی خوشی تو مجھ سے برداشت بھی نہیں ہو رہی۔ بھگوان نے مجھے بیٹا بھی دے دیا۔ ایک وقت تھا کہ پتلی مایوس ہی ہو گئی تھی۔ وہ سمجھ رہی تھی ہمارے ہاں اولاد نہیں ہو گی۔ مجھے بہرحال یہ سبق ملا ہے کہ انسان کو کبھی مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ حالات کسی وقت بھی پلٹا کھا سکتے ہیں اور وہ کچھ ہو سکتا ہے' جو انسان کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا۔''

''بے شک...... بے شک......'' کوئی بلند آواز میں بولا۔ کچھ اور لوگوں نے بھی مختلف الفاظ میں اس کی بات کی تائید کی۔ اس کے دوست تو کچھ ایسی عقیدت سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے جیسے وہ دنیا کا سب سے بڑا سیانا اور دانشور ہو۔ انہوں نے اس سے پہلے واقعی سلطانہ کو اتنی سنجیدگی اور سمجھداری سے بات کرتے نہیں سنا تھا۔

سلطانہ اپنی سزائے قید کے دوران جو مشقت کرتا رہا تھا' اس کا اسے معمولی سا معاوضہ بھی ملتا رہا تھا۔ جس میں سے کچھ تو شادی کے بعد خرچ ہوتا رہا اور کچھ پس انداز ہو گیا تھا۔ وہ رقم اس کے کمرے میں موجود تھی۔ اس نے عورت کے ذریعے وہ رقم منگوائی اور ساری کی ساری بھورے کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ ''تم ابھی حلوائی کے گھر جاؤ۔ شاید وہ سو رہا ہو گا۔ اسے اٹھاؤ اور اس سے اس ساری رقم کی جلیبیاں تیار کراؤ۔ جتنی بھی جلیبیاں ان پیسوں میں آ جائیں' وہ سب کی سب قلعے میں تقسیم کرا دو۔ کوشش کرنا کہ قلعے میں موجود ہر انسان کا کم از کم منہ میٹھا ضرور ہو جائے۔''

''یہ کام ہو جائے گا......تم فکر مت کرو......'' بھورے نے رقم لیتے ہوئے کہا۔ اسے حیرت اس بات پر تھی کہ سلطانہ کو آنے والے کل کی کوئی فکر نہیں تھی کہ وہ گزر اوقات کیسے کرے گا۔ تاہم اس نے اس سلسلے میں زبان بند رکھی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اس میں سلطانہ کو کچھ سمجھانے کی جرأت نہیں تھی۔ دوسرے اسے امید تھی کہ سلطانہ اپنا برا بھلا شاید خود بہتر سمجھتا ہو گا۔ آخر اب تو وہ صاحب اولاد بھی ہو گیا تھا۔

''سلطانہ! تم اپنے بیٹے کا نام کیا رکھو گے؟'' محفل میں سے کسی اور نے پوچھا۔

اس سے پہلے کہ سلطانہ کوئی جواب دیتا' ایک اور شخص بول اٹھا۔ ''ارے بھئی......ایسی جلدی کا ہے کی ہے؟ ابھی تو بیچارے سلطانہ نے اپنے بیٹے کی شکل بھی نہیں دیکھی اور تم نے نام کے بارے میں پوچھنا بھی شروع کر دیا۔''

''کوئی بات نہیں......اسے پوچھنے دو......'' سلطانہ نے نرمی سے اس شخص سے کہا۔ ''میں نے تو نام پہلے سوچا ہوا ہے۔ میری تو جب شادی ہوئی' میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر میرے ہاں بیٹا ہوا تو اس کا کیا نام رکھوں گا......''

''چلو......یہ تو اچھا ہے کہ تم نے نام پہلے ہی سوچا ہوا ہے۔ اب دماغ نہیں کھپانا پڑے گا......'' وہ آدمی گہری سانس لے کر بولا۔ ''کیا نام سوچا ہے تم نے؟''

''راجکمار......'' سلطانہ نے خوابناک سے لہجے میں جواب دیا۔ ''میں سلطان ہوں......میرا بیٹا راجکمار ہو گا......باپ بادشاہ ہے تو بیٹے کو شہزادہ ہونا چاہیے نا......''

''واہ......واہ......نام تو تم نے واقعی غضب کا سوچا ہے۔'' ایک آدمی نے کچھ اس انداز سے کہا جیسے مشاعرے میں کسی شاعر کو داد دے رہا ہو۔

''بس......تو پھر فیصلہ ہو گیا......تمہارے بیٹے کا نام راجکمار ہی ہو گا۔''

''یہ نام جب میرے دماغ میں آیا' اس وقت میں جیل میں تھا......'' سلطانہ کھوئے کھوئے سے لہجے میں بولا۔

''مجھے یہ خیال بھی آیا کہ نام میرا سلطان ہے اور میں جیل میں پڑا ہوں۔ بیٹے کا نام راجکمار رکھنے کی سوچ رہا ہوں......لیکن شاید وہ بھی جیل میں ہی پیدا ہو......اور وہ عورت جو اسے جنم دے گی وہ بھی میرے ساتھ جیل میں ہی ہے...... یہ بھی کیسا قسمت کا کھیل ہے۔ نام کے بادشاہ......اور پڑے ہیں جیل کی کوٹھری میں...... میں اس بارے میں بہت دیر تک سوچتا رہا۔ پھر

مجھے دادا کی باتیں یاد آئیں۔ راجاؤں اور راجکماروں پر بھی ہر طرح کا وقت آسکتا ہے۔ تاریخ میں ایسے بھی بادشاہ گزرے ہیں جنہیں قید خانوں میں رہنا پڑا۔ کسی کی آنکھیں نکال لی گئیں' کسی کے بدن کو گرم سلاخوں سے داغا گیا۔ کسی کے ساتھ' کسی وقت بھی' کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ جب یہ باتیں میرے دماغ میں آئیں تو جیسے سارا دُکھ دور ہو گیا۔ میں بالکل ہلکا پھلکا ہو گیا۔''

سب لوگ اس طرح توجہ اور انہماک سے اس کی باتیں سن رہے تھے' جیسے اس سے پہلے انہوں نے اس طرح کی کوئی بات سنی ہی نہ ہو۔

اس وقت صبح کا اجالا نمودار ہو رہا تھا۔ جب سلطانہ کو کمرے میں بلایا گیا کہ وہ آ کر اپنے بچے کو دیکھ لے۔ وہ جب کمرے میں پہنچا تو اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ اسے کچھ یوں لگ رہا تھا' جیسے اس کے سامنے قدرت کا کوئی بہت بڑا بھید کھلنے جا رہا ہو۔ جب اس کی پہلی نظر اپنے بیٹے پر پڑی تو اس کا دل گویا دھڑکنا ہی بھول گیا۔ اس کے نین نقش تو باپ پر ہی تھے' لیکن وہ بہت گورا تھا۔ شاید اس لئے وہ سلطانہ سے کہیں زیادہ خوبصورت لگ رہا تھا۔ تلی کے چہرے پر ایک عجیب سی ملاحت تھی۔ ماں بن کر کم از کم اس وقت تو وہ جیسے کسی اور ہی دنیا کی مخلوق بن گئی تھی۔ ماں بیٹا دونوں صاف ستھرے کپڑوں میں لپیٹے ہوئے تھے۔ سلطانہ نے ایسے صاف ستھرے کپڑے پہلی بار اپنے گھر میں دیکھے تھے۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ کب اور کہاں سے آئے تھے۔ بچہ دھیرے دھیرے کسمسا رہا تھا اور کبھی ہاتھ پاؤں چلانے لگتا تھا۔ سلطانہ گھٹنوں کے بل زمین پر' چارپائی کے قریب بیٹھ گیا۔

''تلی...... تم ٹھیک تو ہو نا'' تلی نے سرگوشی کے سے انداز میں جواب دیا۔ اس کی رنگت میں زردی تھی' مگر آنکھوں میں ایک عجیب سا خمار اترا ہوا تھا' جیسے وہ بہت مطمئن' بہت آسودہ اور بہت سکھی ہو۔ شاید یہ سب ممتا کی سرشاری تھی۔

ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ پہلے ہی کی طرح سرگوشی کے انداز میں بولی۔

''سلطانہ...... میں نے تمہیں راجکمار دے دیا ہے۔ اب میں مر بھی جاؤں تو مجھے کوئی غم نہیں......'' اس تک اطلاع پہنچ چکی تھی کہ سلطان نے بچے کا نام راجکمار رکھ دیا ہے۔

''یہ کیسی باتیں شروع کر دیں تم نے......'' سلطانہ نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''مجھے تو ایسا لگ رہا ہے کہ ہمارے لئے جیون ہی اب شروع ہوا ہے۔ اس سے پہلے تو ہم ایسے ہی...... بس...... بے کار کی زندگی گزار رہے تھے۔''

تلی بہت دھیرے سے کراہی' پھر اس نے آہستگی سے آنکھیں بند کر لیں۔ سلطانہ نے گھبرا کر جلدی سے اس کا ہاتھ ہلایا۔

''تلی تم ٹھیک تو ہو نا......؟''

''ہاں...... ہاں...... میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' تلی نے ایک عجیب' من موہنے انداز سے مسکراتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔ تب سلطانہ نے جھجکتے ہوئے اپنے بیٹے کو آہستگی سے چوما۔ پھر وہ اس کیلئے بہت سی دعائیں کرنے لگا' لیکن یہ دعائیں وہ دل ہی دل میں کر رہا تھا۔



سلطانہ کا بیٹا اس وقت دو ماہ کا ہو چکا تھا' جب ایک روز بھورے اس کے پاس آیا۔ وہ معمول سے کچھ زیادہ سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔

''تمہارے خیال میں ایڈجوٹنٹ آنند کیسا آدمی ہے؟'' اس نے آتے ہی بلاتمہید سلطانہ سے پوچھا۔

سلطانہ ایک لمحے کے لئے سوچ میں پڑ گیا۔ پھر سر کو ہلکا سا جھٹکا دے کر بولا۔ ''میرے خیال میں تو ٹھیک ہی ہے۔ میرے ساتھ تو اس نے کبھی کوئی سختی نہیں کی...... اور دادا کے ساتھ تو بہت اچھی طرح پیش آتا تھا۔''

''لیکن میرے خیال میں وہ کوئی اچھا آدمی نہیں ہے......'' بھورے ذرا غصیلے سے لہجے میں بولا۔ ''دل میں وہ بھنتوؤں کو بالکل پسند نہیں کرتا' لیکن صرف اس لئے ان کے ساتھ ذرا نرمی سے پیش آتا ہے کہ شاید وہ اس کے سلوک سے متاثر ہو کر عیسائی ہو جائیں۔ وہ خود ہندو سے عیسائی ہو چکا ہے اور اب کوشش کرتا رہتا ہے کہ غریب اور چھوٹی ذاتوں کے لوگ عیسائی ہو جائیں۔ تمہیں پتا ہی ہے کئی بھنتو' عیسائی ہو بھی چکے ہیں۔ تمہاری اپنی سالی عیسائی ہو چکی ہے۔ اس کے ماں باپ تک نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی......''

''ارے یار!...... اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ہم لوگوں کو ویسے ہی اس ملک میں کون پوچھتا ہے۔ عیسائی بننے سے اگر کچھ بیچارے لوگوں کو عزت مل جاتی ہے' تو مل جانے دو۔ انگریز بھی انہیں سر پر بٹھانے لگتے ہیں......'' سلطانہ مذہب کے معاملے میں کچھ زیادہ کٹر نہیں تھا اور نہ ہی ان باتوں کو اہمیت دیتا تھا۔

ایک لمحے کے توقف کے بعد اس نے ذرا غور سے بھورے کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''تم کیا

آنند کے بارے میں صرف اسی وجہ سے پوچھ رہے تھے؟''

''نہیں......'' بھورے نے گہری سانس لی۔ ''میں تو کوئی اور بات کرنے آیا تھا۔ یہ بات تو ویسے ہی بیچ میں آ گئی۔ میں تو اپنے باپو کے بارے میں بات کرنے آیا تھا۔ تمہیں پتا ہے میرے باپو مراد آباد جیل میں ہیں۔''

''ہاں...... یہ تو مجھے پتا ہے' لیکن جب میں خود مراد آباد جیل میں تھا تو مجھے ان کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو سکا اور نہ ہی کسی نے کچھ بتایا۔ میرا کبھی ان سے سامنا نہیں ہوا...... یا ہو سکتا ہے کہ سامنا ہوا بھی ہو' لیکن مجھے پتا ہی نہ چل سکا ہو کہ وہ تمہارے باپو ہیں۔'' سلطانہ بولا۔ اسے حیرت تھی کہ بھورے آج اپنے باپو کا ذکر کیوں کر رہا تھا۔ بھورے سے اس کی دوستی تقریباً دس سال سے تھی۔ ان دس سالوں کے دوران اس نے کبھی اپنے باپو کے بارے میں بات نہیں کی تھی۔ وہ بہت ہی عجیب قسم کا کم گو نوجوان تھا۔

جب اس کی ماں مری اور اس کی ارتھی ہر دوار لے جائی جا رہی تھی۔ وہ تب بھی نہ تو رویا تھا اور نہ ہی اس نے کسی سے کوئی بات کی تھی۔ بس وہ چپ چاپ ہوا میں گھورتا رہا تھا۔ اس کا چہرہ پتھرایا ہوا سا لگ رہا تھا اور اسے دیکھ کر خوف آ رہا تھا۔ نہ جانے کیوں اس کی' اس طرح کی خاموشی کسی رونے دھونے اور بین کرنے سے زیادہ دل دہلا رہی تھی۔

''جب ماتا زندہ تھیں تو وہ اور بھی خود بڑی مشکل سے صرف ایک بار ان سے مل سکے تھے۔ اس کیلئے بھی ہمیں پتا نہیں کہاں کہاں درخواستیں دینی پڑی تھیں اور کس کس کی بنتی اور خوشامد کرنی پڑی تھی۔ دو دن تک تو ہم بھوکے پیاسے مراد آباد جیل کے گیٹ پر بیٹھے رہے تھے......'' بھورے زہریلے لہجے میں بولا۔ ''تم اس لحاظ سے پھر بھی خوش نصیب ہو کہ تم پر جلدی مقدمہ چلا...... جلدی سزا ہوئی...... لیکن چلو...... وہ وقت بھی گزر ہی گیا۔ آج تم کم سے کم وہ زندگی گزارنے کیلئے تو آزاد ہو جو جیل جانے سے پہلے گزار رہے تھے' لیکن میرے باپو کی زندگی تو جیل میں ہی ختم ہو رہی ہے۔'' اندرونی غصے کے باعث بھورے کی آواز حلق میں اٹک گئی۔

''کیا مطلب......؟'' سلطانہ نے ذرا حیرت سے پوچھا۔

''دس سال سے وہ جیل میں پڑے ہیں اور ابھی تک اس کا مقدمہ چل رہا ہے۔ کوئی فیصلہ ہی نہیں ہو رہا۔ ہم تو یہ گلہ بھی نہیں کر سکتے کہ انگریز انصاف نہیں کر رہا' کیونکہ جیل اور عدالت کے لوگ...... جج' وکیل...... سب ہندوستانی ہیں۔ بات اصل میں صرف یہ ہے کہ غریب کی کوئی نہیں

سنتا۔'' بھورے کے لہجے میں تلخی بڑھتی جا رہی تھی۔

''وہ سب تو ٹھیک ہے...... لیکن تم آنند کے بارے میں کیوں پوچھ رہے تھے؟'' سلطانہ نے قدرے الجھن سے کہا۔

''وہ کل میرے باپو کے مقدمے کے سلسلے میں گواہی دینے کیلئے مراد آباد جا رہا ہے۔ اس کی گواہی بہت اہم ہے۔ اسی پر سارے مقدمے اور فیصلے کا دارومدار ہے......'' بھورے بتانے لگا۔ ''میں جب سات سال کا تھا تو باپو کا قلعے کے گیٹ کے پاس ایک کانسٹیبل سے کسی بات پر جھگڑا ہو گیا تھا۔ بات اتنی بڑھی کہ باپو نے کانسٹیبل کو چاقو گھونپ دیا۔ ان کا دھیان اس طرف نہیں گیا تھا کہ ایڈ جوٹنٹ آنند اس وقت وہاں قریب ہی کھڑا تھا اور سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ کانسٹیبل کمزور سا آدمی تھا۔ وہ پٹ سے وہیں گرا اور مر گیا۔ آنند ان دنوں نیا نیا ولایت سے آیا تھا۔ باپو شاید اسے بھی چاقو گھونپ دیتے اور موقع کا گواہ نہ رہتا' لیکن وہ جلدی سے اپنے دفتر میں چلا گیا اور اس نے دروازہ بند کر لیا۔ باپو پکڑے گئے......'' وہ ایک گہری سانس لے کر خاموش ہو گیا۔

سلطانہ توجہ سے اس کی بات سن رہا تھا۔ دس سال کی دوستی میں پہلی بار اسے بھورے کے باپ کے بارے میں جاننے کا موقع ملا تھا۔ ذرا دیر کی خاموشی کے بعد بھورے گویا اپنے بیان کی تصحیح کرتے ہوئے بولا۔ ''ویسے باپو کو جیل میں پورے دس سال نہیں ہوئے۔ بیچ میں ایک بار وہ جیل سے بھاگنے میں بھی کامیاب ہو گئے تھے۔ کافی عرصہ وہ مراد آباد اور بریلی کے درمیان لوٹ مار کرتے رہے' لیکن دوبارہ پکڑے گئے۔ ان کا کیس بڑا مشکل قسم کا ہے۔ اس میں بڑے چکر ہیں...... لیکن بہر حال...... رات مجھے مراد آباد سے پنچایت نے خبر بھجوائی ہے کہ کل آنند گواہی کیلئے مراد آباد پہنچے گا۔ باپو کی زندگی اس کی گواہی کے ساتھ لٹکی ہوئی ہے۔''

''تمہارے باپو کے ہاتھوں کانسٹیبل کے قتل کا واقعہ کس وقت پیش آیا تھا'' سلطانہ نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔

''میں نے سنا ہے' شام کا وقت تھا۔ اندھیرا پھیل رہا تھا'' بھورے نے جواب دیا۔

''کیا اسے دس سال پہلے کی بات ٹھیک طریقے سے یاد ہوگی؟ کیا پتا وہ اندھیرے کی وجہ سے کچھ دیکھ ہی نہ پایا ہو؟'' سلطانہ نے گویا ''ڈوبتے کو تنکے کا سہارا'' والے محاورے پر عمل کرتے ہوئے بھورے کو امید دلانے کی کوشش کی۔

''اس نے سب کچھ ٹھیک طرح دیکھا تھا اور اسے سب کچھ اچھی طرح یاد ہے۔'' بھورے

تیزی سے بولا۔"اور وہ اپنے کسی آدمی سے کہہ بھی چکا ہے کہ وہ عدالت کے سامنے سب کچھ سچ سچ بیان کرے گا۔ ظاہر ہے اس کے بعد باپو جی پھانسی چڑھ جائیں گے...... لیکن یہ کہاں کا انصاف ہے؟ وہ آٹھ دس سال جیل کاٹ چکے ہیں۔ انہوں نے اگر غصے میں سپاہی کا خون کر دیا تھا تو کیا اس کی اتنی سزا کافی نہیں؟ مراد آباد جیل میں تو تم خود بھی رہ کر آئے ہو۔ تم تو اندازہ لگا سکتے ہو کہ ان کے آٹھ دس سال وہاں کیسے گزرے ہوں گے۔"

اس نے ایک گہری سانس لے کر گویا اپنے اندر بھڑکتی آگ کی تپش کچھ کم کرنے کی کوشش کی' پھر بولا۔"دوسری طرف تم جنرل ڈائر کو دیکھو۔ اس نے پنجاب میں بیس ہزار...... یا شاید اس سے بھی زیادہ آدمی مار دیئے۔ اسے تو ایک دن کی بھی سزا نہیں ہوئی۔ صرف اس لئے کہ وہ انگریز ہے اور انگریز ہمارے آقا ہیں؟ ہمارے مائی باپ ہیں؟"

سلطانہ چند لمحوں کے لئے سوچ میں ڈوب گیا' پھر دھیمے لہجے میں بولا۔"میرا خیال اب بھی یہی ہے کہ آنند ایک اچھا آدمی ہے۔ وہ رحمدل بھی ہے۔ ہم چل کر اس سے بات کرتے ہیں۔ ضرورت پڑی تو اس کی منت سماجت بھی کر لیں گے۔ ہو سکتا ہے وہ ہماری بات مان لے اور گواہی دینے نہ جائے۔"

"یہ بات کرنے کیلئے تو میں تمہارے پاس آیا تھا۔" بھورے کا اندرونی تناؤ اور غصہ گویا یکا یک کچھ کم ہو گیا۔

سلطانہ اس معاملے میں ٹانگ اڑانا تو نہیں چاہتا تھا' لیکن معاملہ بھورے کی دوستی کا تھا۔ بھورے اس کا سب سے گہرا دوست ہی نہیں تھا' کبھی کبھی تو وہ سلطانہ کو اپنا چھوٹا بھائی لگتا تھا۔ پھر اس کے ذہن میں ابھی تک وہ بات بھی تھی کہ تپلی جس پیر صاحب کے پاس بچے کیلئے گئی تھی تو بھورے کا بچہ اس کی بیوی کی کوکھ میں مر گیا تھا اور کچھ دن بعد تپلی امید سے ہو گئی تھی۔ سلطانہ کے دماغ کے کسی گوشے میں اب بھی یہ خیال بیٹھا ہوا تھا کہ پیر صاحب نے بھورے سے بچہ لے کر اسے دے دیا تھا۔ اس نے یہی سوچا کہ اس وقت اگر بھورے کو اس کی مدد کی ضرورت تھی تو وہ پیچھے نہیں ہٹ سکتا تھا۔

اس وقت شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ گھروں میں اور بعض راستوں پر مشعلیں' چراغ' لالٹین اور پیٹرومیکس لیمپ روشن ہونے لگے تھے۔ سلطانہ نے بہتر سمجھا کہ گھر میں تپلی کو بتا دے وہ آنند سے ملنے جا رہا ہے۔ بھورے باہر ہی کھڑا رہا۔ سلطانہ نے اپنے کمرے میں جا کر تپلی

اپنے ارادے سے آگاہ کیا تو وہ بولی۔"میں نے روٹی اور پیاز کا سالن بنا لیا تھا۔ اگر کھانا کھا کر ہی جاتے تو اچھا تھا۔ صاحب سے ملنے جا رہے ہو' پتا نہیں کتنی دیر لگ جائے۔"

"نہیں...... میں کھانا کھانے کیلئے نہیں رک سکتا۔ معاملہ بہت سنگین ہے اور بھورے بہت پریشان ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ اسے انتظار کرنا پڑے۔ میں فوراً ہی اس کے ساتھ جا رہا ہوں۔" سلطانہ نے کہا۔

راجکمار اس وقت کپڑے کے ایک جھولے میں تھا۔ تپلی نے لمبا سا ایک کپڑا چارپائی کی پٹی کے ساتھ باندھ کر یہ جھولا بنایا ہوا تھا۔ تپلی نے سلطانہ کو روکنے پر اصرار نہیں کیا اور وہ بھورے کے ساتھ آنند سے ملنے کے لئے روانہ ہو گیا۔ انہیں معلوم تھا کہ آنند اس وقت دفتر میں نہیں' بلکہ گھر پر ہو گا۔ اس لئے وہ اُدھر ہی جا رہے تھے۔ آسمان پر اس وقت آدھا چاند نمودار ہو رہا تھا' لیکن اس کی چاندنی دھندلی اور نہ ہونے کے برابر تھی۔ آنند اور دوسرے افسروں کے کوارٹر اور چھوٹے چھوٹے بنگلے قلعے کی پچھلی دیوار کے ساتھ ساتھ تھے۔ ان کے آس پاس بھی قلعے کے قیدیوں کے کچے پکے کمروں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ وہاں ایک کنواں بھی تھا' جس سے قلعے کے عملے کے گھروں میں پانی سپلائی ہوتا تھا۔

اس طرف جاتے وقت راستے میں سلطانہ نے بھورے کی طرف دیکھا تو اسے اس کی پیشانی پر شکنیں اور چہرے پر غصے کے آثار دکھائی دیئے۔ وہ سلطانہ کو باتوں باتوں میں بتا چکا تھا کہ اس نے اپنے باپو کی فکر میں' دن بھر میں کچھ بھی نہیں کھایا تھا۔ شاید اس لئے بھی اسے زیادہ غصہ آ رہا تھا۔ وہ راستے میں جو باتیں کرتا جا رہا تھا' ان سے بھی اس کے غصے کا اظہار ہو رہا تھا۔

"تمہیں پتا ہے......" اس نے سلطانہ کا بازو پکڑ کر تقریباً جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔"گاندھی جی نے کہا کہ حکومت چور ہے۔ اس نے ہندوستان کا سب کچھ چرا لیا ہے۔ اب بتاؤ...... یہ کوئی انصاف ہے کہ حکومت سب کچھ چرا لے تو اسے کوئی پوچھنے والا نہیں...... ہم ذرا سی بھی چوری ڈکیتی کر لیں تو اتنی لمبی لمبی سزائیں ملتی ہیں۔ جنرل ڈائر نے بیس ہزار آدمیوں کو مار دیا۔ اس کیلئے کوئی سزا نہیں۔ میرے باپو نے ایک آدمی کو مارا تو انہوں نے آٹھ دس سال قید بھی کاٹی اور اب وہ پھانسی بھی چڑھیں گے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے؟ ہمیں ایسی حکومت کا تختہ الٹ دینا چاہئے...... اس کا بیڑا غرق کر دینا چاہئے......"

وہ بار بار یہی باتیں دہرائے جا رہا تھا۔ آج اس کی کم گوئی نہ جانے کہاں چلی گئی تھی۔

سلطانہ ایک لمحے خاموش رہا۔ اسے بھورے کی باتوں سے ذرا الجھن اور اکتاہٹ محسوس ہونے لگی تھی۔ گو کہ اس کے اپنے خیالات بھی اس سے زیادہ مختلف نہیں تھے‘ لیکن وہ ان باتوں کی تکرار کے بجائے‘ مسائل کا کوئی حل اور عملی طور پر کوئی راستہ تلاش کرنے میں زیادہ دماغ کھپاتا تھا۔ اس وقت بھی وہ اسی مرحلے کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ آنند سے ان کی بات کرنے کا انداز متاثر کن ہوتا کہ وہ گواہی کیلئے مراد آباد جانے کا ارادہ ترک کر دے‘ لیکن اسے خود بھی احساس تھا کہ بات کرنے کا ڈھنگ نہ تو اسے کچھ زیادہ آتا تھا اور نہ ہی بھورے کو۔ ویسے بھی آنند خواہ ان کے ساتھ کچھ نرمی سے پیش آتا تھا‘ لیکن ان کیلئے وہ بہرحال ایک بڑا آدمی تھا۔ وہ لوگ اسے بڑے انگریز افسروں سے بھی زیادہ اہمیت دیتے تھے‘ کیونکہ بڑے سے بڑے مسئلے کے حل کے سلسلے میں بھی انگریزوں سے ان کے رابطے کا ذریعہ وہی تھا۔ ان کی کوئی بھی بات انگریزوں تک پہنچانے کے سلسلے میں ہمیشہ وہی ان کے کام آتا تھا۔ ایک طرح سے قلعے کا حاکم وہی تھا۔ سلطانہ اور بھورے کے ذہنوں پر تو اس سے مرعوبیت کے نقوش کچھ زیادہ ہی گہرے تھے۔ انہوں نے ہوش سنبھالنے کے بعد آنند کو ہی قلعے کا نظم و نسق چلاتے دیکھا تھا اور اس کے ہر حکم کی تعمیل کی تھی۔

آنند اپنے گھر پر نہیں تھا۔ انہیں پتا چلا کہ وہ آس پاس ہی کہیں موجود تھا۔ وہ اسے تلاش کرتے ہوئے آگے بڑھے تو وہ انہیں کنویں پر نظر آ گیا۔ یہ دیکھ کر وہ حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکے کہ آنند خود کنویں سے پانی بھر رہا تھا۔ اس کے گھر پر دو تین آدمی ملازموں کی طرح کام کرتے تھے۔ ویسے بھی وہ اگر قلعے میں راہ چلتے آدمی کو بھی کوئی کام کرنے کیلئے کہہ دیتا تو وہ انکار نہیں کر سکتا تھا‘ مگر نہ جانے کیوں اس وقت وہ خود لکڑی کی چرخی گھما کر کنویں سے پانی کا ڈول نکال رہا تھا۔ اسے دیکھ کر بھورے کے تاثرات کچھ اور تبدیل ہو گئے۔ وہ پہلے سے زیادہ غصے میں نظر آنے لگا۔

”تم جا کر اس سے بات کرو...... اسے سمجھاؤ کہ کل مراد آباد نہ جائے۔“ اس نے سلطانہ کو کہنی مار کر نیچی آواز میں کہا اور خود درختوں کے جھنڈ کی طرف چلا گیا۔ کنویں کے تین طرف درختوں کے جھنڈ پھیلے ہوئے تھے۔ وہ ایک بالکل الگ تھلگ سی جگہ تھی اور ایک چھوٹے سے جنگل کا منظر پیش کرتی تھی۔ بھورے اتنی تیزی سے درختوں کے جھنڈ میں غائب ہو گیا کہ سلطانہ اسے روکنے کی کوشش بھی نہ کر سکا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے اپنے آپ کو وہاں تنہا پایا۔

اسی اثنا میں آنند نے پانی کا بھرا ہوا ڈول کنویں سے نکال لیا اور اسے قریب رکھی بالٹی میں ڈالنے کیلئے مڑا۔ اسی وقت اس کی نظر سلطانہ پر پڑ گئی۔ گو کہ وہاں روشنی کچھ زیادہ نہیں تھی‘ لیکن اتنی ضرور تھی کہ اس نے سلطانہ کو پہچان لیا۔ وہ پانی کا ڈول بالٹی میں انڈیلتے ہوئے سرسری انداز میں بولا۔ ”ارے...... سلطانہ...... تم اس وقت یہاں کیا کر رہے ہو؟“

سلطانہ کیلئے اب اس سے بات کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تھا۔ وہ کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے آگے بڑھا اور ہچکچاتے ہوئے بولا۔

”وہ...... صاحب جی...... بس میں آپ سے ایک ضروری بات کرنے آیا تھا۔“

آنند نہ صرف عیسائی ہو چکا تھا‘ بلکہ اس کی وضع قطع بھی انگریزوں والی ہوتی تھی۔ وہ انگریزی بھی نہایت روانی سے‘ انگریزوں والے ہی لہجے میں بولتا۔ اس کے علاوہ وہ سرخ و سپید بھی تھا۔ جو لوگ اسے نہیں جانتے تھے اور جنہیں پہلی بار اس سے ملنے کا اتفاق ہوتا تھا‘ عموماً دھوکا کھا جاتے تھے اور اسے انگریز سمجھ لیتے تھے‘ لیکن اس وقت وہ سفید کرتے اور دھوتی میں تھا۔ دھوتی خالص ہندوانہ انداز میں بندھی ہوئی تھی۔ پیروں میں عام سی چپل تھی۔ اس وقت وہ کوئی خوشحال بنیا دکھائی دے رہا تھا۔

سلطانہ کی بات سن کر وہ ڈول کنویں کی منڈیر پر رکھ کر‘ دو سیڑھیاں اتر کر اینٹوں کے اس چبوترے سے اتر آیا جو کنویں کے گرد بنا ہوا تھا۔ وہ خود سلطانہ کے قریب آتے ہوئے قدرے ہمدردانہ لہجے میں بولا۔ ”ہاں...... ہاں...... کہو‘ کیا بات ہے؟ لگتا ہے کوئی پریشانی ہے جو تمہیں اس وقت میرے پاس آنا پڑا؟“

”ہاں...... پریشانی تو بہت بڑی ہے صاحب جی!“ سلطانہ ہاتھ باندھ کر بولا۔ ”ایک لڑکے کے باپ کی زندگی آپ کے ہاتھ میں ہے۔ آپ چاہیں تو اسے پھانسی کے تختے پر چڑھوا سکتے ہیں اور چاہیں تو بچا سکتے ہیں۔“

آنند کے تاثرات ذرا بدل گئے اور پیشانی پر شکنیں ابھر آئیں۔ ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا۔ ”شاید تم بھورے کے باپ کی بات کر رہے ہو؟“

”آپ ٹھیک سمجھے صاحب جی!“ سلطانہ خود اعتمادی سے بولا۔ ”ہم چاہتے ہیں‘ آپ کل اس کے بارے میں گواہی دینے مراد آباد نہ جائیں۔ آپ نہیں جائیں گے تو آپ کا کچھ نہیں بگڑے گا اور ایک آدمی کی جان بچ جائے گی۔ آپ چلے جائیں گے تو ایک آدمی اپنی زندگی سے

چلا جائے گا۔ اس سے آپ کو کیا مل جائے گا؟ آپ کو تو کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں صاحب جی!؟"

آنند کے چہرے پر ناگواری کے آثار نمایاں ہو گئے۔ وہ بدلے ہوئے لہجے میں بولا۔ "تم مجھے سبق پڑھانے کی کوشش مت کرو کہ مجھے کیا کرنا چاہئے اور کیا نہیں...... یہ فیصلہ میں خود اچھی طرح کر سکتا ہوں۔ انسانیت اور ہمدردی اپنی جگہ ہے لیکن ضمیر اور قانون کے تقاضے پورے کرنا اس سے زیادہ ضروری ہے۔ میں نے جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا' میں اس کی گواہی دینے ضرور جاؤں گا۔ اس سے مجھے کوئی نہیں روک سکتا۔ اس طرح کے کام سے مجھے تم تو کیا' اگر میری بیوی' میرا بھائی...... حتیٰ کہ میرا باپ بھی روکنے کی کوشش کرتا تو میں نہ رُکتا۔ اب تم اس سلسلے میں مجھے کچھ اور سمجھانے کی کوشش نہ کرنا ورنہ مجھے غصہ آ جائے گا۔"

آنند کا لہجہ بتا رہا تھا کہ اس کا فیصلہ پتھر پر لکیر ہے اور کوئی طاقت اسے یہ فیصلہ بدلنے پر مجبور نہیں کر سکتی۔ وہ تو اپنی بات کر رہا تھا کہ کہیں اسے غصہ نہ آ جائے' اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہاں آس پاس ہی کوئی موجود تھا' جو اس سے کہیں زیادہ غصے میں تھا اور اس کی بات سن کر تو اس کا غصہ پاگل پن کی حدود میں داخل ہو چکا تھا۔ اچانک درختوں کے جھنڈ کی طرف سے ایک سایہ سا بجلی کی سی تیزی سے حرکت میں آیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ کنوئیں کے قریب اس حصے میں آ گیا جہاں کھمبوں پر لگے ہوئے مٹی کے تیل کے لیمپوں کی وجہ سے کچھ روشنی تھی۔

وہ بھورے تھا' جس کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بڑا سا چاقو تھا جس کا پھل زرد روشنی میں جھلملا رہا تھا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ' چاقو آنند کے پیٹ میں گھونپ دیا۔ وہ ایک لفظ بھی نہیں بولا اور نہ ہی اس کے حلق سے کسی قسم کی کوئی آواز نکلی۔ آنند کے حلق سے البتہ ایک کربناک چیخ برآمد ہوئی' لیکن بھورے نے اسے بلند نہیں ہونے دیا۔ اس نے آنند کے منہ پر سختی سے ایک ہاتھ رکھتے ہوئے چاقو اس کے پیٹ سے نکالا اور کھچ سے دوبارہ اس کے پہلو میں گھونپ دیا۔

اس نے آنند کے جسم کے مختلف حصوں پر تین چار وار کئے۔ پھر اسے چھوڑ دیا۔ وہ دھم سے زمین پر گرا۔ اس کے جسم سے بھل بھل خون بہہ رہا تھا اور اس کی سفید قمیص تیزی سے خون میں بھیگتی جا رہی تھی۔ اس کے حلق سے ہلکی سی خرخراہٹ کی آوازیں نکل رہی تھیں اور آنکھیں دو چار مرتبہ جھپکنے کے بعد بند ہو چکی تھیں۔ یہ سب کچھ چند سیکنڈ کے اندر اندر ہو گیا تھا۔ سلطانہ دم

بخود کھڑا یہ منظر دیکھ رہا تھا' تاہم اس کا ذہن ساکت نہیں تھا۔ وہ بجلی کی رفتار سے کام کر رہا تھا۔ سلطانہ کو بہت اچھی طرح اندازہ تھا کہ اس کی موجودگی میں بھورے کے ہاتھوں آنند کا قتل کتنا بڑا واقعہ تھا۔

اسے احساس تھا کہ جان صرف آنند کی نہیں گئی تھی' بلکہ اسے اپنے آپ کو اور بھورے کو بھی مردوں سے بدتر سمجھنا چاہئے تھا۔ کوئی نہایت المناک انجام ان کا منتظر تھا۔ جرم گو کہ صرف بھورے کا تھا' لیکن سلطانہ کو معلوم تھا کہ وہ خود بھی اس میں بری طرح ملوث ہونے سے نہیں بچ سکے گا' خواہ وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر سب کو اپنی بے گناہی کا یقین دلانے کی کوشش کرتا رہے' بلکہ مسئلہ شاید صرف اس کی اپنی جان کا نہیں تھا' اسے یقین تھا کہ اس کے سارے دوست اس کی لپیٹ میں آ ئیں گے۔ ان میں سے نہ جانے کسے پھانسی نصیب ہو گی اور نہایت دردناک زندگی نہ جانے کس کس کا مقدر ہو گی۔

بھورے خون آلود چاقو ہاتھ میں لئے اب ساکت کھڑا سلطانہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کا انداز کچھ ایسا تھا جیسے اسے آنند کے قتل کا حکم سلطانہ نے دیا تھا اور اب وہ خاموشی کی زبان میں اس سے پوچھ رہا تھا کہ اس اسے اگلا قدم کیا اٹھانا ہے اور اس کیلئے مزید کیا حکم ہے؟ سلطانہ کا ذہن اس وقت اچانک جس رفتار سے کام کرنے لگا تھا' اس میں وہ ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں کئی کئی فیصلے کر رہا تھا۔ وہ اس نتیجے پر پہنچ گیا تھا کہ اس کی اور اس کے دوستوں کی زندگی پلک جھپکتے میں پلٹا کھا گئی ہے' بہت بڑی مصیبت اس کے اور اس کے دوستوں کے سر پہ پڑ چکی ہے' اب کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر کے یہ انتظار کرنا فضول ہے کہ بلی آئے اور انہیں کھا جائے۔ بہتر یہی تھا کہ جو مصیبت انہیں دبوچنے والی تھی' اسے جل دے کر بھاگنے کی کوشش کی جائے اور فرار کی راہ میں جو بھی بڑی سے بڑی مصیبت آئے' اس کا مقابلہ کر لیا جائے تو بہتر ہے۔ اس راستے پر جو رکاوٹ سامنے آئے' اسے ہٹانے کے لئے جدوجہد کرنا' بے بسی کی موت مرنے یا بے دست و پا ہو کر پنجرے میں بند پرندے کی طرح اذیتیں برداشت کرنے سے بہتر تھا۔

"ابے گدھے...... کھڑا میرا منہ کیا تک رہا ہے...... لاش کو ایک طرف ہٹا......" سلطانہ نے گھٹی گھٹی سی آواز میں تیزی سے کہا۔

اس نے خود جھک کر آنند کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔ آنند کے ہاتھوں میں ابھی زندگی کی حرارت باقی تھی' لیکن اس کے سینے کا زیروبم تھم چکا تھا۔

سلطانہ کو یقین ہو گیا کہ وہ مر چکا تھا۔ اس نے لاش کو درختوں کی طرف کھینچنا شروع کیا۔ آنند ایک قد آور اور جسیم آدمی تھا۔ مردہ حالت میں اسے کھینچنا آسان نہیں تھا۔ اس لمحے بھورے بھی چونک کر گویا کسی خواب سے چونکا۔ اس نے خاصے اطمینان سے چاقو آنند ہی کے کپڑوں سے صاف کیا اور اسے ڈب میں رکھ لیا۔ اس کی آستین بھی خون میں لتھڑی ہوئی تھی، تاہم اس نے اس کی پروا نہیں کی۔

اس نے لاش کے پاؤں پکڑ لئے اور اسے اٹھا کر ڈنڈا ڈولی کر کے وہ دونوں کنویں کے پچھلی طرف لے چلے، جدھر درختوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ اس طرف اندھیرا تھا۔ سلطانہ کو امید تھی کہ اگر انہوں نے لاش درختوں کے جھنڈ میں، اندھیرے میں ڈال دی تو شاید وہ صبح تک دریافت نہیں کی جا سکے گی اور اس دوران وہ دونوں قلعے سے نکل جائیں گے۔ ابھی وہ لاش کو اٹھائے، کنویں کے چبوترے کے ساتھ کچھ ہی دور پہنچے تھے کہ بھورے کے ہاتھوں سے لاش کی ٹانگیں چھوٹتے چھوٹتے رہ گئیں۔ وہ آنکھیں پھاڑے سلطانہ کے عقب میں دیکھ رہا تھا۔

تب سلطانہ نے بھی گردن گھما کر پیچھے دیکھا۔ اس کا ردعمل بھی بھورے سے زیادہ مختلف نہیں تھا۔ اس کے پیچھے دو قدم کے فاصلے پر ملگجے اندھیرے میں ایک لڑکی کھڑی تھی۔ اس کی آنکھیں حیرت اور دہشت سے پھیلی ہوئی تھیں اور اس نے اپنا ایک ہاتھ سختی سے اپنے منہ پر رکھا ہوا تھا۔ شاید اس نے اس طرح منہ پر ہاتھ رکھ کر اپنی چیخ ضبط کی تھی۔ اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ کچھ دیر سے وہاں موجود تھی۔ گو کہ اس کا سر اس کی ساڑھی کے پلو میں اور آدھا چہرہ اس کے اپنے ہاتھ کے پیچھے چھپا ہوا تھا، لیکن سلطانہ نے اسے پہچان لیا۔

اس کا نام رادھا تھا۔ اٹھارہ بیس سال کی وہ لڑکی خاصی خوبصورت اور گدرائے ہوئے جسم کی مالک تھی۔ وہ شوخ و شنگ یا ہر ایک سے خواہ مخواہ بے تکلف ہونے والی لڑکی نہیں تھی، لیکن اس کی صورت اور سراپا ہی کچھ ایسا تھا کہ بڑی عمر کے مردوں کی بھی اس پر نظر پڑتی تھی تو ایک لمحے کیلئے ان کی آنکھوں میں بھی عجیب سی چمک آ جاتی تھی۔ اکثر مرد کوشش کرتے تھے کہ کسی نہ کسی بہانے اس سے بات کریں، لیکن وہ ان سب سے کترا کر، سر جھکائے، سنجیدگی سے اپنے راستے پر آگے بڑھ جانے کی کوشش کرتی تھی۔ وہ کسی کی ضروری بات کا ہی جواب دیتی تھی۔ اس کی چال بھی کچھ ایسی تھی کہ اس کے گزر جانے کے بعد بھی لوگ کچھ دیر تک اس کی طرف دیکھتے رہتے تھے اور کوئی کوئی تو ٹھنڈی سانس بھی لیتا تھا۔

ایک لمحے کیلئے بجلی کے کوندے کی طرح یہ خیال بھی سلطانہ کے ذہن میں لپکا کہ وہ کہیں آنند سے ملنے کیلئے تو کنویں پر نہیں آئی تھی؟ شاید وہ اسے اور بھورے کو آتے دیکھ کر وہیں رک گئی تھی...... اور پھر جو کچھ ہوا تھا، وہ سب اس کی آنکھوں کے سامنے ہوا تھا؟ لیکن اب ان کے پاس ایسی باتوں پر غور کرنے کا وقت نہیں تھا۔ ان کے جرم کا چشم دید گواہ ان کے سامنے کھڑا تھا اور اس کا ارادہ نہ جانے کیا تھا۔ سلطانہ اور بھورے دونوں نے ہی بے اختیار لاش کے ہاتھ پاؤں چھوڑ دیئے۔ آنند کی خون میں بھیگی ہوئی لاش دھپ سے زمین پر گر پڑی۔

وہ دونوں بالکل غیر ارادی طور پر رادھا کی طرف لپکے۔ کم از کم سلطانہ کا ارادہ تو یہی تھا کہ وہ رادھا سے زبان بند رکھنے کی درخواست کرے گا۔ اسے پیار سے سمجھائے گا کہ وہ کم از کم کچھ دیر کیلئے اپنی زبان بند رکھے...... لیکن ان دونوں کو ہی اندازہ نہیں تھا کہ ان کا یوں ایک ساتھ رادھا کی طرف لپکنا اسے پہلے سے بھی زیادہ خوفزدہ کر دے گا۔

رادھا کی آنکھیں خوف سے کچھ اور پھیل گئیں۔ اس نے منہ پر ہاتھ رکھ کر جس چیخ کو روکا ہوا تھا، اسے اس نے منہ سے ہاتھ ہٹا کر آزاد کر دیا۔ اس کی بلند آہنگ خوفزدہ چیخ نے اچانک پرسکون فضا کی خاموشی کو درہم برہم کر دیا۔



سلطانہ اور بھورے دونوں کو ہی رادھا کی چیخ نے خوفزدہ کر دیا۔ اب ان کے سامنے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا کہ وہ رادھا کو دبوچ لیں اور اسے مزید چیخیں مارنے سے باز رکھیں۔ سلطانہ نے چیتے کی طرح چھلانگ لگائی اور رادھا کو بانہوں میں جکڑ لیا۔ بھورے نے بھی تقریباً اس کے ساتھ ہی زقند لگائی تھی۔ اس نے عقلمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے فوراً ہی اس کے منہ پر سختی سے ہاتھ رکھ دیا۔ وہ ان دونوں کے درمیان یوں دب کر رہ گئی' جیسے کسی ہرنی کو دو شیروں نے بیک وقت دبوچ لیا ہو۔

"رادھا...... تمہیں کرشن جی کا واسطہ...... چیخو مت' ہم تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔" سلطانہ نے رادھا کے کان کے قریب سرگوشی کی۔ اس کی سرگوشی سانپ کی پھنکار جیسی تھی۔ شاید وہ اس کی کچھ اور منت کرتا' لیکن عین اسی وقت کچھ دور سے ایک بھاری اور گونج دار سی آواز سنائی دی۔ بولنے والا کا انداز للکارنے جیسا تھا۔ "کون ہے بھئی......؟ کیا ہو رہا ہے......؟"

سلطانہ نے آواز پہچان لی۔ وہ رات کو گشت کرنے والے ایک سپاہی کی آواز تھی۔ اس نے شاید ابھی گشت شروع ہی کیا تھا۔ اس کی آواز سے ظاہر تھا کہ نسوانی چیخ نے اسے تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ شاید وہ توقع کر رہا تھا کہ اسے دوسری چیخ بھی سنائی دے گی' اس لئے وہ ایک بار للکارنے کے سے انداز میں اونچی آواز میں بول کر بالکل خاموش ہو گیا تھا۔

ادھر سلطانہ اور بھورے کی گرفت میں رادھا بھی بولنے سے قاصر تھی۔ اسے شاید سانس لینے میں بھی دشواری پیش آ رہی تھی۔ خطرے کے احساس سے سلطانہ اور بھورے نے بھی سانس تقریباً روک لی تھی۔ فضا پر کچھ ایسا سکوت چھا گیا تھا' جیسا کسی طوفان کی آمد سے پہلے محسوس ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسی خاموشی تھی جس کی تہہ میں نہ جانے کتنا شور دبا ہوا تھا۔

سلطانہ' بھورے اور رادھا اپنی جگہ ساکت تھے اور شاید تینوں ہی ایک دوسرے کے دل کی دھڑکنیں سن رہے تھے۔ سلطانہ کو نہ جانے کیوں احساس تھا کہ سپاہی کہیں قریب ہی موجود تھا اور اچانک چھا جانے والی خاموشی کی وجہ سے وہ پہلے سے زیادہ چوکنا ہو گیا تھا۔ اب شاید وہ اس درندے کی طرح گھات لگا کر آگے بڑھ رہا تھا' جو اپنے شکار کو دیکھ چکا ہوتا ہے' لیکن شکار کو پتا نہیں ہوتا کہ درندہ کہاں ہے؟ اس احساس نے سلطانہ کی تشویش بڑھا دی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ رادھا کو چھوڑ کر نکل بھاگنے کی کوشش کرنا فوری طور پر ضروری تھا۔

اس نے ایک بار پھر رادھا کے کان میں سرگوشی کی۔ "دیکھو...... ہم تمہیں چھوڑ رہے ہیں' لیکن اگر تم نے ذرا سی بھی آواز نکالی تو تمہاری گردن کاٹ دیں گے۔"

اب اس کا لہجہ بالکل بدلا ہوا تھا اور ضرورت پڑنے پر اس کا ارادہ اس دھمکی پر عمل کرنے کا بھی تھا۔ اس نے بھورے کو اشارہ کیا۔ بھورے نے اپنی دھوتی کی ڈب سے چاقو نکال کر اسے کھولا۔ اس دوران اس کا دوسرا ہاتھ بدستور سختی سے رادھا کے منہ پر جما رہا۔ ایک ہی ہاتھ سے اس نے نہ صرف چاقو کھولا' بلکہ اس کی نوک رادھا کے بلاؤز سے ذرا نیچے اس کی پسلیوں میں چبھو کر اس کی ہلاکت خیزی کا احساس دلانے کی بھی کوشش کی۔

اس دوران سلطانہ بھی چاقو نکال چکا تھا۔ اس نے اپنا چاقو رادھا کی آنکھوں کے سامنے لہرایا' پھر انہوں نے نہایت آہستگی سے رادھا کو چھوڑ دیا۔ اس کے ہونٹ تھرتھرا رہے تھے' تاہم اس کے منہ سے کوئی آواز نہیں نکلی۔ وہ واقعی چاروں طرف سے درندوں میں گھری ہوئی ہرنی کی طرح خوفزدہ دکھائی دے رہی تھی۔ سلطانہ اور بھورے الٹے قدموں آہستگی سے درختوں کے جھنڈ کی طرف بڑھے' لیکن عین اسی وقت فضا کا سکوت ایک بار پھر درہم برہم ہو گیا۔

اس بار سکوت فائر کی آواز سے ٹوٹا تھا۔ گولی سلطانہ کے سر سے بمشکل دو انچ اوپر سے گزر گئی۔ وہ فوراً گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ گولی چلنے کا مطلب یہی تھا کہ انہیں دیکھ لیا گیا تھا یا پھر سپاہی کو کم از کم یہ اندازہ ضرور ہو گیا تھا کہ گڑبڑ کہاں ہے۔ گولی چلنے سے بھی زیادہ خطرے والی بات یہ ہوئی کہ اس کی وجہ سے رادھا مزید دہشت زدہ ہو گئی۔ اس کے حلق سے بے اختیار ایک بار پھر چیخ نکلی۔ یہ چیخ خود اس کے اپنے لئے مہلک ثابت ہوئی۔ وہ اس کی زندگی کی آخری آواز تھی۔

اس کی یہ چیخ بلند ہوتے ہی دوسرا فائر ہوا اور گولی اس کی گردن سے یوں پار ہو گئی کہ حلقوم سے گھسی اور گدی کی طرف سے نکل گئی۔ وہ چاروں خانے چت زمین پر گری اور وہیں ساکت ہو

گئی۔ لہو اس کے نرخرے سے یوں بہہ رہا تھا، جیسے کسی نے نل ادھ کھلا چھوڑ دیا ہو۔ شباب اور دلکشی کی وہ علامت ایک لمحے میں موت کی بدصورتی کو گلے لگا کر ساکت ہو گئی۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ فائر کرنے والے کو کوئی غلط فہمی ہوئی تھی یا اس کا نشانہ خطا ہو گیا تھا۔ بے قصور رادھا کے یوں اچانک مر جانے سے سلطانہ اور بھورے دونوں ہی کو مزید ایک زوردار دھچکا لگا، لیکن انہوں نے اس کیفیت میں ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا۔ وہ کنویں کے چبوترے کی آڑ لئے، سر نیچے کر کے دوسری طرف بھاگے۔ سلطانہ کا خیال تھا کہ وہ چبوترے کے دوسرے کونے پر پہنچ کر ایک لمحے کے لئے صورتحال کا جائزہ لیں گے، پھر تیزی سے درختوں کے جھنڈ کی طرف بھاگ لیں گے۔ اس وقت انہیں وہی قدرے محفوظ پناہ گاہ دکھائی دے رہی تھی۔ یہ بات طے تھی کہ فائر کرنے والا خواہ سپاہی تھا یا کوئی اور...... وہ کہیں قریب ہی تھا، لیکن سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کہاں تھا۔

چبوترے کے کونے پر پہنچ کر وہ رکے۔ سلطانہ آگے تھا اور بھورے اس کے پیچھے۔ دونوں خاصا جھکے ہوئے تھے، تا کہ ان کے سر چبوترے کے اوپر سے کسی کو نظر نہ آ جائیں۔ ابھی سلطانہ نے چبوترے کی آڑ سے سر نکال کر دیکھنے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ نہایت ڈرامائی انداز میں اس طرف سے اچانک کوئی نکل کر اس کے سامنے آ گیا۔ وہ باوردی سپاہی تھا اور اس کے ہاتھوں میں توڑے دار بندوق نہیں، بلکہ رائفل تھی۔ گشت پر مامور سپاہیوں کو رائفلیں کسی خاص موقع پر ہی دی جاتی تھیں، جب کسی گڑبڑ کا ذرا سا بھی اندیشہ ہوتا تھا۔

''آج کون سی گڑبڑ کا اندیشہ تھا؟'' سلطانہ سوچے بغیر نہ رہ سکا۔ کیا آنند کو کسی غیبی طاقت نے بتا دیا تھا کہ آج کتنی بڑی گڑبڑ ہونے والی ہے؟'' جو کچھ بھی ہو رہا تھا، بہت عجیب ہو رہا تھا۔ چند منٹ پہلے تک ان میں سے کوئی بھی بات ان کے وہم و گمان تک میں نہیں تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دکھائی نہ دینے والا کوئی ہاتھ اچانک حرکت میں آ گیا تھا اور وہ ہر چیز کو بہت تیزی سے اُلٹ پلٹ کر رہا تھا۔ سپاہی کی رائفل کا رخ ان کی طرف تھا۔

''خبردار!'' وہ صرف اتنا ہی کہہ پایا۔ دوسرا کوئی لفظ اس کے منہ سے نکلنے سے پہلے ہی سلطانہ اور بھورے اس پر چھلانگ لگا چکے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آج سلطانہ اور بھورے دونوں کا ذہن ایک ہی انداز میں سوچ رہا تھا۔ دونوں کی حرکات و سکنات میں مکمل ہم آہنگی تھی۔ شاید کوئی غیبی طاقت دونوں کو بیک وقت اپنے اشاروں پر چلا رہی تھی۔ جونہی رائفل بردار سپاہی ان کے سامنے آیا، دونوں کو بیک وقت احساس ہوا تھا کہ وہ ایک فیصلہ کن لمحہ تھا، زندگی اور موت

کی بازی تھی۔ اگر وہ دونوں فوراً ہی ہاتھ اٹھا لیتے تو شاید سپاہی فائر نہ کرتا، لیکن اگر وہ ذرا بھی اِدھر اُدھر بھاگنے کی کوشش کرتے تو ان کی موت یقینی تھی۔

دونوں نے یقیناً یہی نتیجہ اخذ کرتے ہوئے سپاہی پر بیک وقت چھلانگ لگائی تھی...... اور یہ چھلانگ محض اسے قابو میں کرنے کے لئے نہیں تھی۔ وہ ایک جسیم اور مضبوط آدمی تھا، آسانی سے ان کے قابو میں آنے والا نہیں لگتا تھا۔ اس میں اور گدرائے ہوئے جسم والی رادھا میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ چنانچہ سلطانہ اور بھورے میں سے کسی نے بھی اس سے گتھم گتھا ہونے کی کوشش ہی نہیں کی۔ وہ جس لمحے اس کی رسائی میں آیا، اسی لمحے دونوں طرف سے اس کے پہلوؤں میں دو چاقو پیوست ہو چکے تھے۔

وہ ذبح ہوتے بیل کی طرح ڈکرایا اور لڑکھڑا کر اوندھے منہ گرا، لیکن گرنے سے پہلے اس کی رائفل کا ٹریگر ایک بار پھر دب گیا۔ گو کہ سلطانہ اور بھورے میں سے کوئی بھی اس کی گولی کی زد میں نہیں آیا، لیکن فائر کے دھماکے نے ان کے خوف اور اندیشوں میں اضافہ کر دیا۔ قلعے کی فضا زیادہ تر پرسکون ہی رہتی تھی۔ اس رات اچانک اور پے در پے تین فائروں کے دھماکے قلعے کے بیشتر مکینوں کو ہڑبڑا دینے کے لئے کافی تھے۔ سلطانہ کو شک ہوا تھا کہ شاید اس نے پہلے فائر کے بعد ہی کچھ دور سے لوگوں کی آوازیں سنی تھیں۔ تین فائروں کے بعد تو اچھا خاصا بھونچال آ سکتا تھا۔

سپاہی کی رائفل گر چکی تھی۔ سلطانہ نے جھپٹ کر وہ اٹھا لی اور اس کے کندھے سے گولیوں کی بیلٹ بھی اتار لی۔ جتنی تیزی سے واقعات پیش آ رہے تھے، اس سے کہیں زیادہ تیزی سے اس کا ذہن کام کر رہا تھا۔ اسے یقین ہو چکا تھا کہ وہ اور بھورے اب ''مارو یا مر جاؤ'' والی منزل پر پہنچ چکے تھے۔ ان کے لئے اب واپسی کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ اب وہ جو کچھ بھی کر گزرتے، اس سے ان کے لئے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا تھا۔

سپاہی ابھی مرا نہیں تھا، لیکن شاید آخری سانسیں لے رہا تھا۔ وہ دونوں اسے اس کے حال پر چھوڑ کر درختوں کی طرف لپکے، لیکن اسی لمحے سلطانہ کو اپنے پیچھے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ وہ رائفل سمیت پیچھے کی طرف گھوما۔ ایک ہیولا ان کی طرف دوڑا آ رہا تھا۔ عین ممکن تھا کہ سلطانہ سے اضطراری انداز میں ٹریگر دب جاتا۔ اس نے بروقت اپنے آپ کو روک لیا، کیونکہ ہیولا عین اسی لمحے پکار اٹھا تھا۔ ''بھیا!......''

سلطانہ نے پہچان لیا۔ وہ پریتم تھا۔ سلطانہ کے خیال میں یہ اچھا ہی ہوا تھا کہ ان کا ایک اور ساتھی آن پہنچا تھا۔ بھورے کے لئے بھی شاید یہ بات اطمینان کا باعث تھی' کیونکہ پریتم اس کا بھائی تھا۔ اسے پیچھے چھوڑ کر قلعے سے بھاگنا شاید اس کے لئے زیادہ تکلیف دہ ہوتا۔ سلطانہ اور بھورے کو اس کے لئے رُکنا پڑا۔

پریتم قریب آ کر پھولی پھولی سانسوں کے درمیان بولا۔ ''میں پہلے ہی سوچ رہا تھا کہ پیچھے پیچھے آؤں...... میں آدھے راستے میں تھا' جب مجھے گولی چلنے کی آواز آئی...... میرے دل نے کہا کہ تم لوگوں کے ساتھ ہی کوئی گڑبڑ ہوئی ہے۔''

''پریتم! باتوں میں وقت ضائع نہ کرو۔'' سلطانہ تیزی سے بولا۔ ''ہم اس وقت جنگ کی حالت میں ہیں اور یہ جنگ اچانک ہمارے سر پر آن پڑی ہے۔ اب ہمارے بچاؤ کی تھوڑی بہت امید اسی صورت میں ہے کہ ہم اس جنگ کو جنگ کے انداز میں ہی لڑیں۔ میں بہت اہم ذمے داری تمہیں سونپ رہا ہوں۔ تم جتنی بھی جلدی ہو سکے' سب دوستوں اور میری بیوی پتلی کو لے کر قلعے کے مین گیٹ پر پہنچو۔ ہم دونوں بھی کچھ دیر میں وہیں پہنچیں گے۔ ہمیں کسی بھی طرح قلعے سے نکلنا ہے۔ راستے میں جو بھی دوسرے لوگ ملیں' کسی کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔ تم بھی اپنے آپ کو حیران' پریشان اور ڈرے ظاہر کرنا...... جیسے تمہاری بھی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا ہو رہا ہے۔ سمجھ گئے نا......؟''

پریتم کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں' لیکن اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ اس نے سب کچھ توجہ سے سنا تھا۔ وہ جانے کیلئے مڑنے لگا تو سلطانہ نے اس کی کلائی پکڑ کر اسے روکا اور کہا۔ ''جب تم سب اکٹھے ہو جاؤ تو پتلی سے کہنا وہ اکیلی راجکمار کو گود میں لے کر قلعے کے گیٹ پر پہنچے۔ باقی سب لوگ اسلحہ خانے کی طرف سے ہوتے ہوئے گیٹ کی طرف جائیں۔ گیٹ پر پہنچنے سے پہلے ہمیں اسلحہ خانے کو لوٹنا ہے۔ ہم میں سے ہر ایک کو کوشش کرنی ہے کہ زیادہ سے زیادہ اسلحہ اٹھا کر یا کسی سے چھین کر قلعے کے گیٹ پر پہنچے اور سب اپنے چہروں پر اپنی پگڑیوں کے ڈھاٹے باندھ لیں۔''

اس وقت اس کا انداز واقعی میدان جنگ میں موجود کسی تجربہ کار اور بہادر جرنیل جیسا تھا' جو اپنے ماتحتوں کو ہدایات دے رہا تھا۔ آج سے پہلے اسے خود بھی اپنی صلاحیتوں کا اندازہ نہیں تھا۔ اب وہ خود کو ذرا بھی خوفزدہ یا پریشان محسوس نہیں کر رہا تھا۔ خود بخود اس میں نہ جانے

کہاں سے اتنی خوداعتمادی آ گئی تھی۔ شاید اس کا وہی معاملہ ہوا تھا کہ...... مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں...... جب جان کی پروا نہیں رہی تھی تو بڑے سے بڑا خطرہ بھی اس کے لئے گویا خطرہ نہیں رہا تھا۔ وہ پریتم کا بازو چھوڑتے ہوئے بولا۔ ''جلدی سے جاؤ...... شاباش...... آج تمہاری بہادری کا امتحان ہے۔''

پریتم تیزی سے گھوما اور ہوا ہو گیا۔ سلطانہ کی ہدایات نے اس پر جادو کا سا اثر کیا تھا اور اسے گویا پر لگ گئے تھے۔ سلطانہ اور بھورے جلدی سے درختوں کے جھنڈ میں گھس گئے۔ اب چاروں طرف سے کافی شور سنائی دینے لگا تھا۔ آس پاس کے کمروں اور کوارٹروں سے لوگ نکل آئے تھے اور حیران پریشان اِدھر اُدھر پھر رہے تھے۔ ایک دوسرے سے صورت حال معلوم کرنے کی کوشش کر رہے تھے' لیکن کسی کو کچھ معلوم ہوتا تو بتاتا۔

سلطانہ اور بھورے درختوں کے جھنڈ میں چھپ کر صورتحال کا جائزہ لینے لگے۔ مشعلیں اور پٹرومیکس لیمپ اِدھر سے اُدھر حرکت کرتے دکھائی دے رہے تھے۔ کچھ لوگ کنوئیں کی طرف بھی آتے نظر آ رہے تھے۔ شاید انہیں فائروں کی آوازوں سے اندازہ ہو گیا تھا کہ کنوئیں کی طرف کوئی گڑبڑ ہے۔ سلطانہ اور بھورے نے اپنی پگڑیوں کو ڈھاٹے بنا کر چہرے چھپا لئے تھے۔ اچانک انہیں ایک طرف سے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ قلعے میں پتھر کی سلوں سے کئی جگہوں پر سڑکیں بھی بنی ہوئی تھیں لیکن بیشتر زمین کچی تھی۔

وہ دو گھڑسوار سپاہی تھے اور پکی سڑک سے آ رہے تھے' لیکن کنوئیں کی طرف آنے کے لئے انہیں پکی سڑک چھوڑنی پڑی اور ٹاپوں کی آواز بہت مدھم ہو گئی۔ پولیس والوں کے کندھوں پر رائفلیں لٹکی ہوئی تھیں اور ایک ایک ہاتھ میں مشعل تھی۔ دوسرے ہاتھ سے انہوں نے اپنے اپنے گھوڑے کی باگ پکڑی ہوئی تھی۔ وہ تیزی سے کنوئیں کی طرف آ رہے تھے اور اتفاق سے اسی طرف سے آ رہے تھے' جدھر سلطانہ اور بھورے درختوں کے پیچھے چھپے ہوئے تھے۔ سلطانہ نے بھورے کی طرف دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں گویا ان کے درمیان تبادلہ خیال ہو گیا۔ دونوں گھڑسواروں کو ان درختوں کے قریب سے گزرنا تھا' جن کے عقب میں سلطانہ اور بھورے چھپے ہوئے تھے۔ جونہی وہ ذرا قریب پہنچے' سلطانہ نے پے در پے دو فائر کئے۔ دونوں سپاہی گھوڑوں سے نیچے آ گرے اور ان کے گھوڑے ذرا سے بدکے اور ہنہنائے' لیکن پھر رک گئے۔ سلطانہ نے کوشش کی تھی کہ دونوں سپاہیوں کی پیشانی یا چہرے پر گولی لگے تا کہ ان کی وردی زیادہ

خون آلود نہ ہو۔ تیزی سے کام کرتے ہوئے اس کے ذہن نے فوری طور پر ایک منصوبہ بنالیا تھا۔

”بھورے گھوڑوں کو قابو کرلو...... انہیں اور دونوں لاشوں کو درختوں کے پیچھے گھسیٹ کر لانا ہے۔“ سلطانہ نے تیزی سے سرگوشی میں کہا۔

دونوں تیزی سے حرکت میں آئے۔ کچھ دشواری تو پیش آئی' لیکن وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔ دونوں لاشیں اور گھوڑے درختوں کے جھنڈ میں ایسی جگہ آ گئے جہاں کم از کم اس وقت رات کے اندھیرے میں کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ چند لمحوں کے اندر اندر سلطانہ اور بھورے اپنے کپڑے اتار کر پولیس کی وردیاں پہن چکے تھے۔ انہوں نے سروں پر پولیس کی ٹوپیاں بھی پہن لیں' لیکن اپنے چہروں پر ڈھاٹے بدستور بندھے رہنے دیئے۔ جب تک کوئی ان ڈھاٹوں کی وجہ سے ان کے بارے میں مشکوک ہوتا' تب تک وہ اپنا کام کر کے آگے نکل سکتے تھے۔

اب ان کے پاس مزید دو رائفلیں اور گولیوں کی پیٹیاں بھی آ گئی تھیں' جو انہوں نے اپنے کندھوں پر لٹکالیں۔ ہتھیار ان کے پاس آئے تو انہوں نے اپنے آپ کو مزید طاقتور محسوس کیا۔ انہیں لگا کہ اب وہ خطرات کا کچھ اور بے خوفی سے مقابلہ کر سکتے تھے۔ اس وقت تک کچھ لوگ کنویں کے قریب پہنچ چکے تھے۔ وہ اسی طرف آس پاس کمروں اور کوارٹروں میں رہنے والے لوگ تھے' لیکن وہ ابھی کوئی لاش دریافت نہیں کر سکے تھے۔

”غلطی ہو گئی......“ سلطانہ گھوڑے پر سوار ہوتے ہوئے نیچی آواز میں بھورے سے مخاطب ہوا۔ ”ہمیں آنند کی لاش کو کنویں میں پھینک دینا چاہئے تھا۔ اس طرح کافی دیر تک کسی کو اس کی لاش کا پتا نہ چلتا۔“ پھر اس نے بے پروائی سے کندھے اُچکا کر خود کلامی کے سے انداز میں کہا۔ ”خیر...... جو ہو گیا سو ہو گیا۔“

وہ دونوں گھوڑوں پر سوار ہوئے اور درختوں کے جھنڈ سے نکل آئے۔ کچھ لوگوں نے دور سے انہیں دیکھا تو شاید یہی سمجھا کہ پولیس والے بھی گڑبڑ کا پتا چلانے...... یا پھر شاید اس پر قابو پانے کے لئے نکلے ہوئے تھے۔ ایک نے دور سے آواز دے کر پوچھ بھی لیا۔ ”سنتری جی...... ہوا کیا ہے؟“

”یہی کھوج لگانے کے لئے تو ہم نکلے ہیں۔“ سلطانہ نے گھوم کر ان لوگوں کی طرف دیکھے

بغیر اپنی آواز بھاری بنانے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا اور گھوڑے کو تیزی سے دوسری طرف بڑھا لے گیا۔ بھورے اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ آنند کی لاش دریافت ہوتے ہی اس کی موت کی خبر جنگل کی آگ کی طرح قلعے میں پھیل جائے گی اور پھر افراتفری بڑھے گی' لیکن انہیں یہ امید تھی کہ افراتفری ان کے حق میں مفید ثابت ہو سکتی تھی۔

انہیں راستے میں چند خالی جھونپڑیاں نظر آئیں' شاید ان کے مکین صورت حال جاننے کے لئے یا پھر کسی اور وجہ سے باہر نکلے ہوئے تھے۔ سلطانہ اور بھورے نے اپنی مشعلیں جھونپڑیوں پر پھینک دیں۔ انہیں معلوم تھا چند ہی لمحوں میں جھونپڑیوں میں خوفناک آگ بھڑک اٹھے گی اور بہت سے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لے گی۔ اب ان کی کوشش یہ تھی کہ لوگوں کی توجہ مختلف سمتوں میں بٹی رہے اور اصل بات کسی کی بھی سمجھ میں نہ آئے۔

اب ان کا رخ اسلحہ خانے کی طرف تھا۔ وہ جگہ کم از کم باہر سے ان کی اچھی طرح دیکھی بھالی تھی۔ انہیں معلوم تھا وہاں بندوقوں اور رائفلوں کے علاوہ دستی بم بھی ہوتے تھے۔ وہ ایک بڑا سا مستطیل کمرہ تھا' جس کے گرد نیچی سی چار دیواری تھی۔ اس چار دیواری کے اندر تقریباً ہر وقت ایک بندوق بردار سپاہی کمرے کے چاروں طرف گشت کرتا رہتا تھا۔ قلعے میں مختلف ڈیوٹیوں پر مامور جن پولیس اہلکاروں کو کوئی ہتھیار دیا جاتا تھا' وہ یہیں سے جاری ہوتا تھا۔ دن میں اندر ایک کلرک بھی بیٹھتا تھا' جو تمام ہتھیاروں کے بارے میں رجسٹر میں اندراجات کرتا تھا۔

راستے میں سلطانہ اور بھورے کو جہاں جہاں بھی موقع ملا' انہوں نے کھمبوں پر لگے ہوئے مٹی کے تیل کے لیمپ توڑ دیئے اور کہیں کہیں لگی ہوئی مشعلوں کو مختلف چیزوں میں آگ لگانے کے لئے استعمال کر ڈالا' تاکہ قلعے میں اگر روشنیاں نظر بھی آئیں تو درحقیقت وہ آگ کے شعلے ہوں۔ اس طرح قلعے میں بہت بڑی گڑبڑ کا تاثر پیدا ہوتا اور لوگ زیادہ خوفزدہ ہوتے۔ راستے میں انہیں کئی جگہ بہت سے لوگ اِدھر اُدھر آتے جاتے دکھائی دیئے۔ انہوں نے سرسری انداز میں ان کی وردی' ٹوپی اور بندوقیں دیکھیں۔ کسی نے بھی ان کے چہروں پر لپٹے ہوئے کپڑے کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ بعض لوگوں نے ان سے بہ آواز بلند وہی سوال کیا' جو کنویں پر کسی نے کیا تھا۔ سلطانہ وہی جواب دے کر تیزی سے گھوڑا آگے بڑھا لے گیا' جو پہلے دے چکا تھا۔ اسے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ قلعے میں اچھی خاصی افراتفری پھیل چکی تھی۔

وہ جب اسلحہ خانے پر پہنچے تو انہوں نے رات کو پہرہ دینے والے سپاہی کو نیچی سی چار دیوار

سے باہر ہی لکڑی کے چھوٹے سے گیٹ کے پاس کھڑے دیکھا۔ عام طور پر بندوق اس کے کندھے پر لٹکی رہتی تھی' لیکن اس وقت وہ بھی چوکنا معلوم ہوتا تھا' بندوق ہاتھ میں لئے کھڑا تھا۔ سلطانہ اور بھورے کے چہرے پر ڈھاٹے کی وجہ سے اس نے آنکھیں سکیڑ کر ذرا شک زدہ سی نظروں سے ان کی طرف دیکھا' لیکن پوچھے بغیر بھی نہ رہ سکا۔ ''کیا گڑبڑ ہوئی ہے...... کہاں ہوئی ہے؟''

''یہی کھوج لگانے کے لئے ہم نکلے تھے۔'' سلطانہ نے آواز بدلتے ہوئے جواب دیا۔ چہرے پر ڈھاٹا ہونے کی وجہ سے اسے آواز بدلنے میں آسانی ہو رہی تھی۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''ایسا لگتا ہے قلعے میں کچھ قیدیوں نے بغاوت کر دی ہے یا پھر کچھ لوگوں کو چھڑانے کے لئے کسی طرح کچھ آدمی اندر گھس آئے ہیں۔''

''اگر تمہیں کوئی آدمی گڑبڑ والا یا فسادی لگے تو اسے فوراً گولی مار دینا۔'' اسلحہ خانے پر پہرہ دینے والے سپاہی نے مشورہ دینے کے انداز میں کہا اور دوسری طرف دیکھنے لگا' جہاں کافی دور ایک جگہ آگ سی بھڑکتی دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے گڑبڑ کرنے والے اور فسادی کو گولی مارنے کا مشورہ دیا تھا' لیکن اس کے منہ پھیرتے ہی سلطانہ نے اسی کو گولی مار دی۔ گولی اس کی گدی میں گھسی اور چہرے سے باہر نکل گئی۔ وہ اوندھے منہ گرا اور پھڑک کر وہیں ساکت ہو گیا۔ غنیمت تھا کہ اسلحہ خانہ ایک الگ تھلگ سی جگہ پر تھا۔ فوری طور پر کوئی ان کی طرف متوجہ نہیں ہوا۔

سلطانہ اور بھورے' گھوڑے سے اُتر کر اندر پہنچے۔ اسلحہ خانے کے چوبی دروازے پر بڑا سا تالا لگا ہوا تھا۔ بھورے نے اس پر کئی فائر کئے' تالا تو نہیں ٹوٹا لیکن چوبی دروازے کا ایک حصہ ضرور ٹوٹ گیا' جس میں تالا اور کنڈی لگی ہوئی تھی۔ سلطانہ نے انہیں اکھاڑ کر ایک طرف پھینکا اور لات مار کر دروازہ کھول دیا۔ وہ اندر پہنچے تو انہیں چاروں طرف شیلفوں میں بہت سی بندوقیں' رائفلیں' تلواریں حتیٰ کہ تیر کمان بھی رکھے نظر آئے۔ ایک طرف لکڑی کے خانوں میں اناسوں کی طرح دستی بم سجے ہوئے تھے۔ اس وقت یہ سب چیزیں سلطانہ اور بھورے کو بہت اچھی لگ رہی تھیں۔ انہیں کچھ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کسی بہت بڑے خزانے تک پہنچ گئے ہوں۔

اسی لمحے باہر سے اُلو کی آواز سنائی دی۔ اس وقت ان کے حساب سے یہ ایک اور نیک شگون تھا۔ دراصل یہ ایک اشارہ تھا اور اس کا مطلب تھا کہ ان کے ساتھی بھی وہاں پہنچ چکے تھے۔ باہر دو گھوڑے کھڑے دیکھ کر اور سپاہی کی لاش پڑے دیکھ کر وہ یقیناً سمجھ گئے تھے کہ سلطانہ

اور بھورے اسلحہ خانے کے اندر پہنچ چکے ہیں' لیکن وہ احتیاطاً سگنل دے رہے تھے۔ جواباً سلطانہ نے بھی اُلو کی آواز نکالی اور دوسرے ہی لمحے صادق' سرجو' پریتم اور نکیشر بھی اندر آن گھسے۔

''تپلی کہاں ہے؟'' سلطانہ نے بے تابی سے پریتم سے پوچھا۔

''بھابی کو ہم نے بڑے گیٹ کی طرف روانہ کر دیا ہے۔ راجکماران کی گود میں ہے۔ وہ اپنے آپ کو بہت پریشان اور گھبرائی ہوئی ظاہر کر کے سب کو یہ بتائیں گی کہ وہ اپنے پتی کو ڈھونڈتی پھر رہی ہیں' جس کا کوئی پتا نہیں چل رہا۔'' پریتم نے خاصے پرسکون انداز میں جواب دیا۔

اس کا جواب سن کر سلطانہ کو اطمینان ہو گیا اور اس نے چاروں طرف اشارہ کرتے ہوئے شاہانہ انداز میں کہا۔ ''جو کچھ اٹھا سکتے ہو' جلدی جلدی اٹھا لو۔'' پھر اس نے ایک سرسری سی نظر میں سب کے قد کاٹھ کا جائزہ لیتے ہوئے صادق کو مخاطب کیا۔ ''باہر جو سپاہی مرا پڑا ہے' تم اس کی وردی پہن لو' پھر اسلحہ اٹھانا۔ ہم میں سے کم سے کم تین تو پولیس والے نظر آئیں گے۔''

انہوں نے مشینی انداز میں کام کیا۔ ذرا سی دیر بعد ہی وہ اسلحہ خانے سے نکلے تو ان میں ایک ''پولیس والے'' کا اضافہ ہو چکا تھا اور وہ سب کے سب ہتھیاروں سے لدے پھندے تھے۔ نکیشر نے ایک بیگ میں بہت سے دستی بم بھی بھر لئے تھے اور اسے گلے میں لٹکا لیا تھا۔ اسلحہ خانے کے عقب میں کئی گھوڑے بھی بندھے ہوئے تھے۔ انہوں نے چار گھوڑے بھی کھول لئے' اب وہ اپنے آپ کو کسی فوجی دستے سے زیادہ طاقتور محسوس کر رہے تھے۔

وہ آندھی اور طوفان کی طرح بڑے گیٹ کی طرف روانہ ہو گئے۔ سلطانہ کو اندیشہ تھا کہ شاید قلعے میں گڑبڑ کی خبر پھیلنے کے بعد وہاں رہنے والے چند فوجی اور پولیس والے بڑے گیٹ پر ہی تعینات کئے جا چکے ہوں یا پھر وہ گیٹ کی حفاظت کے خیال سے خود ہی وہاں جا کھڑے ہوئے ہوں۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو ہدایت کر دی تھی کہ اگر انہیں گیٹ پر باوردی اہلکار نظر آئیں تو وہ دور سے ہی ان پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دیں' کیونکہ اس صورتحال میں کامیاب وہی رہے گا' جو دوسرے کو کچھ سمجھنے اور سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر اچانک یلغار کر دے گا' جو ذرا بھی دریغ کرے یا ہچکچاہٹ میں مبتلا ہو گا' وہ مارا جائے گا۔

سلطانہ کا اندیشہ درست نکلا۔ تیزی سے گھوڑے دوڑاتے ہوئے انہیں چند سیکنڈ بعد ہی دور سے قلعے کا دیوہیکل گیٹ نظر آیا تو انہوں نے یہ بھی دیکھا کہ تین فوجی اور چھ سات پولیس والے

ہاتھوں میں بندوقیں لئے یوں گیٹ کے سامنے مستعد کھڑے تھے' جیسے تاثر دے رہے ہوں کہ ان کی لاشوں پر سے ہی گزر کر کوئی باہر جا سکتا ہے۔ انہیں غالباً اندازہ ہو گیا تھا کہ قلعے میں گڑبڑ خواہ کہیں بھی ہے اور اس کی نوعیت کچھ بھی ہے' اس کے اثرات گیٹ تک ضرور پہنچیں گے۔ سلطانہ کو حیرت اس بات پر تھی کہ ابھی تک اس کا سامنا کسی انگریز سے نہیں ہوا۔ قلعے میں جو دو چار انگریز موجود رہتے تھے' شاید اس وقت وہ اپنے گھروں میں دبکے ہوئے تھے۔

سلطانہ کے ساتھیوں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا اور دور سے ہی فوجیوں اور پولیس والوں پر گولیوں کی بارش کر دی۔ وہ شاید ابھی ان کے بارے میں الجھن میں ہی تھے' کیونکہ ان میں سے تین پولیس کی وردی میں تھے اور ڈھاٹے سب کے چہروں پر تھے۔ گیٹ کے سامنے کھڑے اہلکاروں کو سنبھلنے کا موقع نہیں مل سکا۔ انہوں نے فائرنگ کرتے ہوئے اِدھر اُدھر بھاگ کر پوزیشن لینے کی کوشش کی' لیکن اسی دوران گولیاں ان سب کا لہو چاٹ گئیں۔ انہوں نے بے وقوفی یہ کی تھی کہ ان میں سے کوئی بھی کسی چیز کی آڑ یا پوزیشن لے کر کھڑا نہیں ہوا تھا۔ شاید ابھی انہیں اس کا موقع ہی نہیں ملا تھا اور وہ چند لمحے پہلے ہی وہاں پہنچے تھے یا پھر شاید ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ کچھ گھڑ سوار اسلحے سے لدے پھندے آندھی طوفان کی طرح ان کے سامنے نمودار ہوں گے اور اپنی راہ میں آنے والوں پر گولیوں کی بارش کرنے میں ایک لمحے کے لئے بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کریں گے۔

جب وہ گیٹ کے ذرا قریب پہنچے تو نگیشر نے ایک دستی بم بھی گیٹ پر پھینک مارا۔ وہ ٹھوس لکڑی کا بہت موٹا گیٹ تھا' جس میں لوہے اور پیتل کی پتیاں اور بہت بڑی بڑی کیلیں بھی جڑی ہوئی تھیں' اس کی آہنی کنڈیاں اور بولٹ موٹے موٹے تھے اور اس پر لٹکا ہوا تالا کسی چھوٹے موٹے صندوق جتنا تھا۔ یہ گیٹ زیادہ تر بند ہی رہتا تھا' خاص خاص موقعوں پر ہی کھولا جاتا تھا۔ اس میں سے ہاتھی بھی گزر سکتے تھے۔ روزمرہ کی آمدورفت کے لئے اس میں ایک چھوٹا بغلی گیٹ بنا ہوا تھا' جو دن میں کھلتا بند ہوتا رہتا تھا۔

نگیشر کے پھینکے ہوئے ہینڈ گرنیڈ سے بڑے گیٹ کا کچھ نہیں بگڑا۔ نہ جانے وہ کیسی لکڑی کا بنا ہوا تھا اور اس کی ساخت میں کیا کاریگری تھی' اسے معمولی سی گزند پہنچی' تاہم دستی بم کا دھاکہ زوردار تھا۔ لکڑی کی کچھ کھپچیاں اور بہت سا دھواں فضا میں پھیل گیا' جس سے فضا میں اچھی خاصی دہشت کا تاثر پھیلا۔ آٹھ دس لاشیں بھی اِدھر اُدھر بکھر چکی تھیں۔ مجموعی طور پر وہ ایک

دہشت انگیز منظر تھا۔ آج سے پہلے شاید کسی نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اس پُرسکون اور پُرامن قلعے میں کبھی ایسا طوفان بھی برپا ہو گا۔ آج شام تک خود سلطانہ اور اس کے ساتھیوں کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ کچھ دیر بعد وہ ایک طوفان کی طرح اٹھیں گے اور سب کچھ کر رہے ہوں گے۔ ایسا لگتا تھا کہ ان کے جسموں میں کوئی اور ہی روح' کوئی اور ہی طاقت حلول کر گئی تھی۔

قلعے میں قیدی کی حیثیت سے زندگی گزارنے والے اور چند دوسرے لوگ بھی وہاں موجود تھے لیکن وہ فائرنگ شروع ہوتے ہی سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ گئے تھے اور جس کے جدھر سینگ سمائے تھے' چلا گیا تھا۔ اب وہاں کوئی نظر نہیں آ رہا تھا' لیکن سلطانہ کے لئے تشویش کی بات یہ تھی کہ وہاں تلی نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس کے گھر کا فاصلہ وہاں سے خاصا تھا اور اس کے پاس اب اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ تلی کو دیکھنے اور ڈھونڈنے وہاں جا سکتا۔

''تلی کہاں ہے؟'' سلطانہ نے پریتم سے پوچھا' جو اس کے قریب ہی گھوڑے پر موجود تھا۔

پریتم کو جواب دینے کی ضرورت نہیں پڑی۔ عین اسی لمحے کسی بچے کے رونے کی آواز فضا میں ابھری۔ بچوں کے رونے کی آوازیں عام طور پر ملتی جلتی سی ہی لگتی ہیں' لیکن سلطانہ اپنے راجکمار کی آواز ہزاروں میں پہچان سکتا تھا۔ اسے راجکمار کے ہنسنے رونے کی آوازیں اور اس کی ہر معصوم ادا دنیا کے سارے بچوں سے الگ اور مختلف لگتی تھی۔ اسے حیرت اس بات پر ہوئی کہ راجکمار کے رونے کی آواز اس کمرے سے آئی تھی جو گیٹ کے قریب ہی تھا اور جسے آنند دفتر کے طور پر استعمال کرتا تھا۔ پھر اس کا دل اندیشوں سے دھڑک اٹھا۔ ''کہیں آنند کے آدمیوں نے تلی کو پکڑ کر تو نہیں بٹھا لیا تھا؟ کہیں ان تک اطلاع تو نہیں پہنچ گئی تھی کہ اس سارے ہنگامے کی وجہ دراصل بھورے اور سلطانہ ہیں۔''

دوسرے ہی لمحے اس کے اندیشے دور ہو گئے۔ تلی' راجکمار کو سینے سے لگائے آنند کے کمرے سے نکل آئی اور دوڑتی ہوئی سیدھی سلطانہ کے گھوڑے کے پاس آئی۔ اس وقت سلطانہ جس حلیے میں تھا' اسے کوئی پہچان نہیں سکتا تھا' مگر تلی نے پہچان لیا تھا۔ سلطانہ نے اس کا ہاتھ تھام کر کھینچا اور اسے اپنے پیچھے گھوڑے پر بٹھایا۔ راجکمار ان دونوں کے بیچ میں پھنس گیا۔ وہ اب کچھ اور زور سے رو رہا تھا' شاید وہ اس سارے ہنگامے' فائرنگ اور دستی بم کے دھاکوں اور شور شرابے پر احتجاج کر رہا تھا۔

"تم آنند کے کمرے میں کیوں چلی گئی تھیں؟" سلطانہ نے پوچھا۔

"وہ خالی پڑا تھا...... اس وقت وہاں کوئی نہیں تھا...... اور سب سے محفوظ جگہ بھی وہی لگ رہی تھی۔" تتلی نے اطمینان سے بتایا۔ وہ ذرا بھی خوفزدہ نہیں لگ رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا' جیسے اسے اس سارے ہنگامے کی توقع تھی یا پھر اس قسم کے حالات کا سامنا کرنا اس کے معمول میں شامل تھا۔

نکیشر کو اندازہ ہو گیا تھا کہ بڑے گیٹ کو تباہ کرنے کے لئے شاید اس کے سارے دستی بم بھی ناکافی ثابت ہوں' چنانچہ اس نے اب تاک کر چھوٹے' بغلی گیٹ پر اس جگہ بم پھینکا جہاں بولٹ اور تالا لگا ہوا تھا۔ ایک زوردار دھماکے سے اس جگہ شگاف ہو گیا۔ بولٹ اور تالا غائب ہو گیا۔ گیٹ خود بخود ہی تھوڑا سا کھل گیا۔ صادق گھوڑا دوڑا کر چھوٹے گیٹ کے قریب گیا اور پھر اس نے گھوڑے کو گھماتے ہوئے لات مار کر گیٹ کھول دیا۔ گھڑ سوار اس گیٹ سے بھی آسانی سے گزر سکتے تھے۔

وہ سب کے سب ایک قطار کی صورت میں گھوڑے دوڑاتے اس گیٹ سے نکلتے چلے گئے۔ ان کے عقب میں صرف دھول اُڑتی رہ گئی جو ان کے فرار کی کہانی سنا رہی تھی۔ آج گویا ایک نئی تاریخ رقم ہو رہی تھی۔ بھنتو قبیلے کے لوگ تعداد میں بہت زیادہ تھے اور سب کے سب چور' ڈاکو نہیں تھے' لیکن ان پر چونکہ یہ ٹھپا لگ گیا تھا' اس لئے وہ سب کے سب لعن طعن' حقارت اور سزائیں برداشت کرتے تھے' مگر ان میں سے کسی نے آج تک انگریزوں' مقامی حاکموں' پولیس اور معززین کے سامنے کوئی ردعمل ظاہر کرنے کی جرأت نہیں کی تھی۔ آج یکدم ہی حالات نے کچھ ایسا پلٹا کھایا تھا کہ نوعمر لڑکوں کا یہ ٹولا حد سے زیادہ سرکشی' سفاکی' بغاوت اور خونریزی کا مظاہرہ کرتے ہوئے تمام نادیدہ زنجیریں توڑ کر قلعے سے نکل بھاگا تھا۔ نجیب آباد کے اس مشہور قلعے کی تاریخ نے آج اچانک ایک نیا موڑ لیا تھا۔

سلطانہ اور اس کے ساتھی یہی محسوس کر رہے تھے کہ وہ کسی پنجرے سے نکل آئے ہیں...... لیکن چند لمحے بعد ہی انہیں اندازہ ہوا کہ ابھی ان کی آزادی کا عمل مکمل نہیں ہوا تھا۔ انہیں اپنے عقب میں گھوڑوں کی ٹاپوں اور پھر ان کے ہنہنانے کی آوازیں سنائی دیں۔ سلطانہ نے مڑ کر دیکھا۔ چاند کی ابتدائی تاریخوں کی انتہائی مدھم سی چاندنی میں اس نے کچھ ہیولے تیزی سے حرکت کرتے دیکھے تو اسے اندازہ ہوا کہ قلعے سے چند گھڑ سوار نکلے تھے۔ وہ یقیناً پولیس اور فوج

کے اہلکار تھے' جو ان کے تعاقب میں روانہ ہوئے تھے۔ انہیں اب کم از کم یہ اندازہ تو ہو گیا تھا کہ کچھ افراد قلعے میں خونریزی کے بعد فرار ہو رہے تھے۔

سلطانہ کو یہ دیکھ کر زیادہ تشویش ہوئی کہ گھوڑوں کے آگے ایک کار بھی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ قلعے میں کار صرف ایک انگریز افسر ہی کے پاس تھی' اس کا صحیح عہدہ وغیرہ تو ان میں سے کسی کو بھی معلوم نہیں تھا' لیکن انہیں یہ ضرور معلوم تھا کہ اس کے سامنے آنند بھی مؤدب رہا کرتا تھا۔ جان نامی وہ انگریز زیادہ تر پس منظر میں ہی رہتا تھا اور اپنے چھوٹے سے بنگلے سے کم ہی باہر نکلتا تھا' لیکن اکثر اہم معاملات میں آنند بھی اسی سے مشورے کیا کرتا تھا اور ہدایات لیا کرتا تھا۔ جان ایک بہت ہی کم گو اور کم آمیز آفیسر تھا۔ قلعے میں رہنے والوں کو وہ کبھی کبھار ہی نظر آتا تھا اور کسی مقامی آدمی سے شاذ و نادر ہی بات کرتا تھا۔

کچھ ہی دیر پہلے سلطانہ اس بات پر دل ہی دل میں کچھ حیران ہوا تھا کہ قلعے میں اتنی افراتفری کے دوران اسے کوئی انگریز دکھائی نہیں دیا تھا۔ وہ یہی سمجھا تھا کہ انگریز اپنے آرام دہ گھروں میں دبکے بیٹھے ہوں گے' لیکن اب اگر انگریز باہر آتا دکھائی بھی دیا تھا تو وہ مقامی اہلکاروں کی قیادت کرتا ہوا آ رہا تھا۔ اس سے پہلے کوئی انگریز شاید اس لئے نہیں نکلا تھا کہ وہ لوگ آنند پر تکیہ کرتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ وہ قلعے کا نظام ایک طویل عرصے سے بہت اچھی طرح چلا رہا تھا اور اگر کبھی کوئی چھوٹی موٹی گڑبڑ ہوتی بھی تھی تو اس پر آسانی سے قابو پا لیتا تھا...... لیکن اب شاید گورے صاحب تک یہ اطلاع پہنچ گئی تھی کہ آنند مر چکا تھا۔

سلطانہ کے لئے ایک تشویش کی بات یہ بھی تھی کہ کار' گھوڑوں سے زیادہ تیز رفتاری سے بھی دوڑ سکتی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ گورا صاحب' گھڑ سواروں سے پہلے ان لوگوں کے قریب پہنچ سکتا تھا اور کار میں اس کے ساتھ نہ جانے مزید کتنے افراد تھے۔ تاہم کچھ فاصلہ اور طے کرنے کے بعد سلطانہ کو اندازہ ہوا کہ کار میں اگر گورا صاحب ہی تھا تو وہ گھڑ سواروں کی صرف قیادت ہی کر رہا تھا' لیکن ان سے پہلے سلطانہ اور اس کے ساتھیوں تک پہنچنے کی کوشش نہیں کر رہا تھا۔ وہ سب یکساں رفتار سے ہی ان کے پیچھے آ رہے تھے۔ پھر انہوں نے فائرنگ بھی شروع کر دی۔

فائرنگ توڑے دار بندوقوں سے نہیں بلکہ رائفلوں سے ہی ہو رہی تھی' لیکن روشنی بہت کم اور سب لوگوں کے بیک وقت بہت تیزی سے حرکت میں ہونے کی وجہ سے وہ گولیوں سے محفوظ رہے۔ انہیں احساس ہوا کہ کچھ گولیاں ان کے آس پاس سے گزری تھیں۔ وہ بدستور تیزی سے

گھوڑے دوڑاتے رہے۔ سلطانہ نے ابھی انہیں جوابی فائرنگ کرنے سے منع کیا تھا۔ ہمالیہ کے پہاڑی سلسلے کے دامن میں پھیلا ہوا سیکڑوں میل کے طول و عرض پر مشتمل یہ علاقہ ''ترائی'' کہلاتا تھا۔ وہ سب لڑکے کم عمر ہونے اور محدود سے انداز میں زندگی گزارنے کے باوجود اس سارے علاقے سے اچھی طرح واقف تھے۔ یہاں کے کھیت کھلیان' میدان' سبزہ زار' جنگل' پہاڑیاں زیادہ تر ان کی دیکھی بھالی تھیں۔

اگر کوئی حصہ ان کے لئے اجنبی ہوتا' تب بھی وہ اس کے بارے میں اندازے لگا کر کسی نہ کسی طرح نکل سکتے تھے۔ بالکل ہی انجان لوگوں کی طرح تو شاید وہ کہیں بھی ٹامک ٹوئیاں نہ مارتے۔ اسی لئے اس وقت سلطانہ کی پہلی کوشش یہی تھی کہ انہیں اپنے تعاقب میں آنے والوں کے ساتھ اندھا دھند مقابلے میں گولیاں اور گرنیڈ ضائع نہ کرنے پڑیں۔ یہ چیزیں اس وقت ان کے لئے بہت اہم تھیں۔ وہ پہلے یہ کوشش کرنا چاہتا تھا کہ اپنے ساتھیوں سمیت کسی طرح انہیں جل دے کر نکل جائے۔

وہ اس وقت جن چوڑی چوڑی بل کھاتی پگڈنڈیوں پر حتی الامکان تیز رفتاری سے گھوڑے دوڑاتے جا رہے تھے' ان کے دونوں طرف دور تک چھوٹے چھوٹے کھیتوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا' جن پر کہیں کہیں اکا دکا جھونپڑیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔ وہ بیساکھ کا مہینہ تھا۔ سرسوں کی فصل کٹ چکی تھی اور گندم کی فصل تیار کھڑی تھی۔ گندم کے لمبے لمبے' خوشہ دار پودے دھندلی چاندنی اور خنک ہوا میں دھیرے دھیرے لہلہا رہے تھے۔ عام حالات میں کوئی ان مناظر کو دیکھتا تو شاید اسے بے پناہ سکون اور ٹھہراؤ کا احساس ہوتا' لیکن اس وقت انہی پرسکون اور جان فزاء نظاروں کے درمیان موت اور زندگی کی کشمکش جاری تھی۔ کچھ لوگ زندگی کی طلب میں ہوا کے دوش پر اُڑنے کی کوشش کر رہے تھے اور کچھ لوگ موت کے سفیر بن کر ان پر جھپٹنے کے لئے ان کا پیچھا کر رہے تھے۔

سلطانہ کو یہ دیکھ کر قدرے حیرت ہوئی کہ ان کے درمیان فاصلہ دھیرے دھیرے کم ہو رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ تعاقب کرنے والے ان کے مقابلے میں زیادہ تیز رفتاری سے آ رہے تھے۔ وہ لوگ وقفے وقفے سے فائرنگ بھی کر رہے تھے۔ اچانک سلطان کو اپنے عقب سے اور کان کے بالکل قریب سے تلی کی دلدوز چیخ سنائی دی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے سلطانہ کو پہلوؤں سے' مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا۔ راجکمار ان دونوں کے بیچ میں دبا ہوا تھا اور مسلسل رو رہا

تھا۔

تلی کے دونوں ہاتھوں کی گرفت ایک لمحے کے لئے سخت ہو گئی' لیکن دوسرے ہی لمحے بالکل ڈھیلی ہو گئی اور سلطانہ کو یوں لگا کہ وہ گھوڑے سے گرنے لگی تھی۔ سلطانہ کے گلے میں دونوں کندھوں کی طرف سے ایک دوسرے کو کراس کرتی ہوئی گولیوں کی کئی پیٹیاں اور دو رائفلیں تھیں۔ ایک رائفل اس کے ہاتھ میں تھی' دوسرے ہاتھ سے اس نے گھوڑے کی لگام پکڑی ہوئی تھی۔ گھوڑا خاصا طویل فاصلہ طے کرنے کے بعد بھی اسی برق رفتاری سے دوڑ رہا تھا' اس کے انداز سے ابھی تھکن ظاہر ہونا شروع نہیں ہوئی تھی' لیکن تلی کے انداز سے سلطانہ کو پتا چل گیا کہ اسے گولی لگ چکی تھی۔

راجکمار چونکہ پہلے ہی کی طرح مسلسل روئے جا رہا تھا' اس لئے سلطانہ کو اندازہ ہوا کہ اسے گزند نہیں پہنچی تھی اور سلطانہ خود بھی محفوظ تھا' ورنہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ ایک ہی گولی ان تینوں کے جسموں سے پار نکل جاتی' شاید فاصلہ کچھ زیادہ ہونے کی وجہ سے گولی کی طاقت کم ہو گئی تھی اور وہ صرف تلی ہی کے جسم میں پیوست ہو کر رک گئی یا پھر زاویہ ہی کچھ ایسا بنا تھا کہ صرف تلی اس کی زد میں آئی تھی۔

بات کچھ بھی تھی' تلی بہرحال گھوڑے سے گرنے لگی تھی اور اس کے ساتھ ہی یقیناً راجکمار بھی گر جاتا۔ اس ننھے سے بچے کے لئے تو اس رفتار سے دوڑتے ہوئے گھوڑے سے گرنا ہی جان لیوا ثابت ہوتا۔ سلطانہ نے فوراً لگام دانتوں میں دبا لی اور تیزی سے ایک بازو پیچھے لے جا کر تلی کو سنبھالا اور اسے گرنے سے بچایا' لیکن اس کا اپنا دل ڈوب چکا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ تلی کو گولی کہاں لگی تھی اور اب وہ زندہ بھی بچے گی یا نہیں۔ اس کے ساتھیوں کو بھی معلوم ہو چکا تھا کہ تلی کو گولی لگ گئی ہے اور ان کے اپنے آس پاس سے بھی گولیاں گزر رہی تھیں۔

بھورے نے سلطانہ کے برابر گھوڑا دوڑاتے ہوئے اونچی آواز میں کہا۔ ''اس طرح کب تک بھاگتے رہیں گے؟ ایک ایک کر کے سب مارے جائیں گے۔''

بھورے ذرا موٹے دماغ کا تھا۔ عقل کی بات کم ہی کرتا تھا' لیکن کم از کم اس کی بات سلطانہ کو ٹھیک لگی اور وہ ایک لمحے میں فیصلے پر پہنچ گیا۔ اب وہ جس علاقے سے گزر رہے تھے' اردگرد میدانی سی زمین پر کہیں کہیں اِکا دُکا درخت نظر آ رہے تھے۔ سلطانہ نے اپنی آواز اتنی اونچی رکھنے کی کوشش کی کہ صرف اس کے اپنے ساتھی سن سکیں۔

"رُکو...... گھوڑوں سے اُتر کر درختوں کی آڑ لو اور لیٹ کر فائر کرو......! اب مقابلہ کرنا ہے۔" اس نے کہا اور سب سے پہلے خود گھوڑا روک کر اس طرح اترا کہ دوسرے ہی لمحے وہ پتلی اور راجکمار کو بھی اپنے بازوؤں میں لے کر گھوڑے سے اتر چکا تھا۔ وہ انہیں بازوؤں پر اٹھائے اٹھائے دوڑ کر ایک درخت کی آڑ میں پہنچا۔ اس نے ان دونوں کو آہستگی سے زمین پر لٹا دیا اور خود بھی سینے کے بل لیٹ گیا۔

اس کے ساتھیوں نے اس کی تقلید کی تھی۔ تعاقب کرنے والوں کے لئے ان کا یہ اقدام قطعی غیر متوقع تھا۔ وہ اپنی جھونک میں کافی آگے تک چلے آئے اور انہیں نشانہ بنانا زیادہ مشکل نہ رہا۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتے یا کہیں پوزیشن لینے کی کوشش کرتے' ان میں سے بیشتر سلطانہ اور اس کے ساتھیوں کی گولیوں کا نشانہ بن چکے تھے۔ دو تین گھوڑوں کو بھی گولیاں لگیں اور وہ زمین پر گر گئے' جو زندہ بچ گئے' انہیں آڑ لینے کے لئے فوری طور پر کار ہی نظر آئی' مگر نگیشر کی حاضر دماغی اور پھرتی نے کار کو ان کے لئے پناہ گاہ کے بجائے موت کا پھندا بنا دیا۔

اس نے چند سیکنڈ کے اندر اندر کار پر دستی بم پھینک دیا۔ فاصلہ گو کہ خاصا تھا' لیکن شاید نگیشر کے جسم میں کوئی غیر معمولی طاقت حلول کر گئی تھی کہ اس نے اتنی دور ہینڈ گرنیڈ پھینکا جتنی دور پھینکنا انسان کے بس کی بات نظر نہیں آتی تھی۔ صرف یہی نہیں بلکہ وہ عین نشانے پر بھی...... یعنی کار پر ہی جا کر گرا۔ بے در پے دو دھماکے ہوئے۔ ایک دھماکہ تو گرنیڈ پھٹنے کا تھا اور دوسرا کار کے پھٹنے کا...... دوسرا دھماکہ پہلے دھماکے سے کہیں زیادہ خوفناک تھا۔ نہ جانے کس کس چیز کے پرخچے اُڑے اور دھندلی چاندنی میں آگ کا ایک گولا سا چند لمحوں کے لئے ہوا میں گھومتا دکھائی دیا۔ پھر یکدم سکوت چھا گیا۔

صرف ایک گھوڑے کی ٹاپوں کی نہایت مدھم سی آواز سنائی دے رہی تھی' جو واپس بھاگا جا رہا تھا۔ کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ اس پر کوئی پولیس والا سوار تھا یا فوجی...... بہر حال وہ جو کوئی بھی تھا' شاید اپنی جان بچا کر واپس بھاگنے میں بڑی عافیت محسوس کرتا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ تعاقب کے لئے آنے والوں میں سے وہی زندہ بچا تھا۔ شاید قدرت نے اسے اس لئے زندہ رکھا تھا کہ وہ واپس جا کر دوسروں کو بتا سکے کہ موت اسے کتنے قریب سے چھو کر گئی تھی اور اس نے کیسا خوفناک معرکہ دیکھا تھا' جس کا فیصلہ چند سیکنڈ میں ہو گیا تھا۔ جو جانیں بچا کر بھاگ رہے تھے انہوں نے چند لمحوں میں موت کے سفیروں کی جانیں لے لی تھیں۔

سلطانہ تھکے تھکے انداز میں اٹھا۔ وہ یہ دیکھنے بھی نہیں گیا کہ ان کے پیچھے آنے والوں میں سے کوئی زندہ تو نہیں تھا۔ وہ سب سے پہلے پتلی کی طرف متوجہ ہوا' جو بے حس و حرکت پڑی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور اس کے سر کے نیچے بہت سا خون جمع ہو چکا تھا۔ سلطانہ نے اس کی نبض دیکھی' دل کی دھڑکن سننے کی کوشش کی۔ نبض رکی ہوئی تھی' دل کی دھڑکنیں تھم چکی تھیں۔ سلطانہ نے اس کا سر ذرا ہلا جلا کر دیکھا تو اسے اندازہ ہو گیا کہ گولی اس کے سر میں پیچھے سے داخل ہوئی تھی اور سر میں ہی رہ گئی تھی۔ شاید دماغ میں گھس گئی تھی' اس لئے فوری طور پر اس کی موت واقع ہو گئی تھی۔

سلطانہ نے اپنا سر پتلی کے کندھے پر ٹکا دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ دادا کے بعد اس دنیا میں اس کی قریب ترین ہستی' اس کی غمگسار' اس کے دکھ درد کی ساتھی صرف پتلی ہی تھی' جس نے ہر برے بھلے وقت میں اس کا ساتھ دیا تھا اور جو اس کے چہیتے بیٹے کی ماں بھی تھی۔ وہ بیٹا جو ابھی صرف دو ماہ کا ہی تھا۔ پتلی بھی اسے اور اس کے ننھے سے بیٹے کو چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ ننھا راجکمار بھی زمین پر پڑا ہاتھ پاؤں چلا رہا تھا اور بری طرح رو رہا تھا۔ دونوں باپ بیٹا رو رہے تھے' لیکن دونوں کے رونے کی وجہ مختلف تھی۔ باپ ایک ناقابل بیان دکھ کی وجہ سے رو رہا تھا' بیٹا بھوک اور بے آرامی کی وجہ سے رو رہا تھا۔ دونوں کے رونے کی آواز اس ویرانے میں ایک بے عنوان فریاد کی طرح گونج رہی تھی۔

سلطانہ کے ساتھی اس کے گرد گھیرا ڈالے افسردگی سے گردنیں جھکائے کھڑے تھے۔ شاید ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کس طرح تسلی دیں' کیسے اس کا دُکھ بانٹیں......؟



سلطانہ خوب رو چکا تو اس کے دل کا بوجھ گویا کچھ کم ہو گیا اور آہ و زاری دھیمی پڑ گئی۔ اس کے غم میں شریک اس کے دوست بدستور سر جھکائے کھڑے تھے۔ کوئی اسے سمجھانے یا دلاسا دینے کے لئے ایک لفظ بھی نہیں بولا تھا۔ شاید انہوں نے یہی بہتر سمجھا تھا کہ اسے رونے دیا جائے یا پھر شاید انہیں بولنے کے لئے کوئی لفظ ہی نہیں سوجھا تھا۔

اچانک ہی سلطانہ خاموش ہو گیا۔ یوں لگا تھا جیسے یکدم کسی نے اس کا گلا دبا دیا ہو۔ اس کے خاموش ہونے کی وجہ یہ تھی کہ ویرانے میں اچانک ہی ایک عورت کی آواز ابھری تھی۔ ''اب بس بھی کر...... مرنے والی تو مر گئی۔ کیا اب تو بھی اس کے ساتھ ہی رو رو کے مر جائے گا؟''

ان سب کے حیرت زدہ رہ جانے کی بڑی وجہ یہی تھی کہ آواز عورت کی تھی۔ یقیناً سب کے ذہن میں یہی سوال ابھرا تھا کہ اس ویرانے میں عورت کہاں سے آ گئی؟ سلطانہ ایک جھٹکے سے سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور رائفل فوراً اس کے ہاتھ میں آ گئی' جسے وہ زمین پر پھینک چکا تھا۔ اس کے ساتھی بھی رائفلیں سنبھالتے ہوئے تیزی سے آواز کی سمت میں گھوم گئے' گو کہ انہیں یہ احساس بھی تھا کہ اس آواز میں ایک عجیب سی اپنائیت تھی۔ اس کے الفاظ کچھ کھردرے سہی' مگر شاید اس کی اپنائیت کا انداز یہی تھا۔ وہ شاید اسی طرح ہمدردی کا اظہار کرنے کی عادی تھی۔ انہیں یہ شبہ بھی ہوا تھا کہ شاید وہ سلطانہ کو جانتی تھی۔

سلطانہ کی آنکھیں آنسوؤں سے دھندلائی ہوئی تھیں اور وہاں روشنی بھی بہت کم تھی۔ اس نے ایک ہاتھ سے آنکھیں پونچھتے ہوئے آواز کی سمت میں دیکھا۔ وہ ادھیڑ عمر' سرو قد عورت ان سے تھوڑے ہی فاصلے پر کھڑی تھی۔ وہ سادہ سی سوتی ساڑھی میں تھی۔ بغل میں چھوٹی سی گٹھری دبائے ہوئے تھی۔ اس کے پیروں میں بہت پرانی سی' گرد آلود جوتیاں تھیں' مگر وہ کچھ ایسی شان اور خود اعتمادی سے کھڑی تھی جیسے کسی گاؤں کے سرپنچ یا کسی قبیلے کے سردار کی بیوی ہو۔ وہ اس

ویرانے میں اتنے نوجوانوں کو دیکھ کر ذرا بھی خوفزدہ نہیں تھی' بلکہ ان کے پاس بہت سارا اسلحہ بھی تھا۔

سلطانہ اور اس کے ساتھیوں کو اس بات پر بھی حیرت تھی کہ انہیں اس کی موجودگی کا احساس ہی نہیں ہوا تھا۔ شاید وہ اپنے جذبات میں کچھ زیادہ ہی ڈوبے ہوئے تھے اور ایسے میں' وہ اچانک نہ جانے کہاں سے نمودار ہو گئی تھی۔ انہوں نے ویرانوں میں اچانک نمودار ہونے والی عورتوں کے بارے میں اپنے بڑے بوڑھوں سے بہت قصے کہانیاں سنی تھیں۔ بزرگ کہا کرتے تھے' چڑیلیں اور ڈائنیں راتوں کو روپ بدل کر ویرانوں میں پھرتی ہیں' ان کے پیروں کا رخ پیچھے کی طرف کو ہوتا ہے۔ وہ آگے چلتی ہیں' مگر ان کے پاؤں پیچھے ہی کی طرف مڑے رہتے ہیں۔ شاید اسی لئے غیر ارادی طور پر ان سب کی نظریں عورت کے پیروں پر ہی گئی تھیں' لیکن اس کے پاؤں سیدھے تھے۔ چہرے مہرے سے بھی وہ سیدھی' شریف اور بھلی عورت لگتی تھی' جسے شاید راہ چلتے کسی مصیبت میں دیکھ کر ہمدردی جتانے کی عادت تھی۔

سلطانہ کو یہ اندازہ بھی ہوا کہ اس عورت کا تعلق بھنتو قبیلے سے ہی تھا' تاہم اس نے احتیاطاً خاصے بارعب انداز میں پوچھا۔ ''کون ہو تم؟'' رائفل کا رخ وہ پہلے ہی اس عورت کی طرف کر چکا تھا۔

درحقیقت ان سب کی رائفلوں کا رخ اسی کی طرف تھا' لیکن اسے گویا اس بات کی کوئی پروا نہیں تھی۔ اس نے سلطانہ کے سوال کا جواب دینے کی بھی زحمت نہیں کی۔ اس نے پتلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اُلٹا سوال کر دیا۔ ''یہ کون ہے...... پتنی تھی تیری......؟''

سلطانہ نے کوئی جواب نہیں دیا اور ایک ٹک اُسے گھورتا رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس عورت کے ساتھ کیا رویہ اختیار کرے؟ ایک لمحے کے لئے اسے یہ خیال بھی آیا کہ عورت کو گولی مار دینی چاہئے۔ وہ اگر چڑیل' ڈائن یا چھل پیری نہیں تھی' تب بھی مشکوک تو ضرور تھی' شاید وہ انہیں باتوں میں الجھا رہی تھی...... لیکن یہ سب کچھ سوچنے کے باوجود اس کی انگلی ٹریگر نہ دبا سکی۔ کوئی سخت قدم اٹھانے کے سلسلے میں گویا کوئی غیبی طاقت رکاوٹ بن رہی تھی۔

عورت کو جسے اپنے کسی سوال کے جواب کی درحقیقت کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے جواب کا انتظار کئے بغیر اگلا سوال داغ دیا۔ ''بہت پیار کرتا تھا تو اپنی پتنی سے...... جو اس کے مرنے پر اس طرح بلک بلک کر رو رہا تھا؟''

"تو...... تو کیا تیرے خیال میں ایک پتی کو اپنی پتنی سے...... اتنا بھی پیار نہیں ہوتا'...... کہ وہ اس کے...... مرنے پر پھوٹ پھوٹ کر روئے؟ اور پتنی بھی وہ جو دو مہینے پہلے ہی اس کے...... بچے کی ماں بنی ہو......؟" سلطانہ اٹک اٹک کر بولا۔ اس کی آواز بھی حلق میں پھنسی جا رہی تھی۔

"مجھے کیا پتا......" عورت ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ "بیس سال ہو گئے شادی کو' مگر آج تک پتی کا پیار نہیں دیکھا...... غصہ ہی غصہ دیکھا ہے...... اگر مجھے پکا وشواش ہو کہ میرا پتی میرے لئے روئے گا تو رام قسم' میں ابھی مرنے کو تیار ہوں۔" اس کے لہجے میں چھپی حسرت نے سلطانہ کو قدرے حیرت سے اس کی طرف دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ عورت کو گویا پتلی کی ناگہانی موت سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور نہ ہی اس کے دل میں اس کے لئے کوئی ہمدردی پیدا ہوئی تھی' بلکہ یہ واقعہ دیکھ کر اس کی تو اپنی ہی نہ جانے کون سی محرومیاں جاگ اٹھی تھیں۔

سلطانہ کے دل میں اس کے لئے ناپسندیدگی کی لہر سی اٹھی۔ وہ اسے گھورتے ہوئے ذرا سخت لہجے میں بولا۔ "میں نے پوچھا تھا تو کون ہے اور یہاں...... اس جنگل بیابان میں کہاں سے آئی ہے؟"

"بلدوار سے کاشی پور واپس آ رہی تھی...... پتی کے ساتھ...... گھوڑے پر تھی...... بلدوار میں میرا میکہ ہے اور کاشی پور میں سسرال...... میکے سے واپس آ رہی تھی۔ راستے میں پتی جی کو پتا نہیں' کس بات پر غصہ آ گیا۔ غصہ تو ہمیشہ ہی اس کی ناک پہ دھرا رہتا ہے۔ کچھ پتا نہیں ہوتا کہ کب' کس جگہ اور کس بات پر اسے غصہ آ جائے...... بس...... مجھے وہیں گھوڑے سے اتار کر چلا گیا۔ چار کوس پیدل چل کر آ رہی ہوں۔ یہاں اتنی گولیاں چلنے اور بم پھٹنے جیسی آوازیں سن کر میرا تو پتہ پانی ہو گیا تھا۔ ایک کھڈے میں دبکی ہوئی تھی۔ جب سب طرف خاموشی ہو گئی تو تیری اور اس بچے کے رونے کی آواز آنے لگی۔ تب میں نے ہمت کی...... کہ چلو...... دیکھوں تو سہی کیا معاملہ ہے؟"

بچے کے ذکر پر جب اس نے راجکمار کی طرف اشارہ کیا تو اسے گویا کوئی خیال آیا اور اس نے فوراً ہی سوال کر ڈالا۔ "اس بچے کی ماں تو مر گئی...... اب اسے کون پالے گا؟ یہ تو ابھی بہت ہی چھوٹا ہے......"

"یہی تو میں بھی سوچ رہا ہوں۔" سلطانہ نے اب ذرا نرمی سے کہا۔ اس کی آواز اب بھی آنسوؤں میں بھیگی ہوئی تھی۔ اس نے بچے کو اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔ بچے کو جیسے کچھ قرار ملا' اس کا

رونا بہت کم ہو گیا۔ وہ سسکیاں لینے لگا۔

اس وقت سلطانہ کے چہرے پر شاید کوئی ایسی بات تھی کہ عورت عجیب سی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ شاید کچھ سوچ رہی تھی' پھر اس نے اچانک پوچھا۔ "تم بھی تو بتاؤ تم لوگ کون ہو؟" اپنے سوال کے جواب کا انتظار کئے بغیر وہ خود ہی بولی۔ "مجھے تو تم بھنتو لگتے ہو اور ڈاکو بھی...... لگتا ہے پولیس تمہارا پیچھا کر رہی تھی۔ بہت سخت مقابلہ ہوا ہے۔"

"ہاں...... تم ٹھیک ہی سمجھی ہو۔" سلطانہ بولا۔ "اور مجھے تم بھی بھنتو لگتی ہو۔ کاشی پور اور بلدوار...... دونوں جگہ زیادہ تر بھنتو ہی آباد ہیں۔"

"ہاں...... تم ٹھیک ہی سمجھے ہو۔ ایک بھنتو دوسرے بھنتو کو دور سے پہچان لیتا ہے اور ایک بھنتو دوسرے بھنتو کے کام بھی ضرور آتا ہے۔ مجھے اس بچے پر ترس آ رہا ہے۔" عورت بہت تیز طرار معلوم ہوتی تھی' لیکن اس کے لہجے میں خلوص بھی تھا۔ "ویسے تو اس وقت تمہاری حالت بھی ایسی لگ رہی ہے کہ تم پر بھی مجھے ترس آ رہا ہے...... میرا ایک بیٹا بھی ہے...... بالکل تمہارے ہی جتنا...... ڈیڑھ سال ہوا ہم نے اس کی شادی کی تھی۔ چھ مہینے پہلے اس کے گھر میں بچہ ہوا' مگر مرا ہوا...... تب سے میری بہو بڑی اداس' بڑی دکھی رہتی ہے۔ وہ بڑی خوشی سے پال لے گی اسے...... تمہارا دل مانے تو اسے ہمارے گھر میں چھوڑ دو...... بیٹا تمہارا ہی رہے گا۔ جب چاہو' آ کر اس سے مل لیا کرنا۔ جب چاہو' اسے واپس لے جانا لیکن بس اتنا ضرور کرنا کہ اگر میری بہو کو اس نے اپنی اولاد کی طرح پیار ہو جائے تو اسے بھی کبھی کبھی اس سے ملاتے رہنا۔"

سلطانہ نے بچے کو سینے سے لگایا ہوا تھا اور حیرت سے عورت کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا' جیسے کسی غیبی طاقت نے اس کی مدد کے لئے اس عورت کو عین اس وقت وہاں بھیجا تھا' جب وہ بے پناہ دکھ کے ساتھ ساتھ شدید الجھن کے عالم میں خود کو پاگل ہوتا محسوس کر رہا تھا۔

وہ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد سنبھل کر بولا۔ "وہ سب تو بعد کی باتیں ہیں' فی الحال تو ہمارے سامنے اس بچے کو سنبھالنے اور کم از کم آج رات کے لئے کہیں پناہ حاصل کرنے کا مسئلہ ہے۔"

"کاشی پور میں شاید تمہیں پناہ بھی مل جائے گی۔ تم گاؤں کے سرپنچ سے بات کر لینا۔ ایک بھنتو دوسرے بھنتو کے کام آنے اور اپنے پناہ دینے سے اس وقت تک انکار تو نہیں کر سکتا جب

تک بہت زیادہ مجبوری نہ ہو۔ اگر ہم لوگوں میں مصیبت کے وقت اس طرح ایک دوسرے کے کام آنے کے یہ طریقے نہ ہوتے تو شاید اب تک ہندوستان میں ہمارا نام ونشان مٹ چکا ہوتا...... بس...... اب تم لوگ میرے ساتھ چلو...... باتوں میں سے برباد نہ کرو...... کاشی پور یہاں سے سات آٹھ کوس دور ہے۔"

"وہ تو مجھے پتا ہے۔ ہم لوگ ترائی کے علاقے سے اچھی طرح واقف ہیں۔" سلطانہ اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔" میں صرف یہ سوچ رہا ہوں کہ تم نے ہمیں جتنی امیدیں دلادی ہیں پتا نہیں وہ پوری بھی ہوں گی یا نہیں؟"

"یہاں کھڑے ہو کر سے برباد کرنے یا منہ اٹھا کر اِدھر اُدھر بھٹکنے سے تو پھر بھی یہ اچھا ہے کہ تم میرے ساتھ چل کر دیکھ لو کہ کیا ہوتا ہے۔" عورت نے کہا۔

پھر اچانک اسے گویا کچھ یاد آیا۔" ارے ہاں...... میں نے تمہارا نام تو پوچھا ہی نہیں۔"

وہ صرف سلطانہ سے بات کئے جا رہی تھی۔ اس کے ساتھیوں کی موجودگی کا اسے گویا احساس ہی نہیں تھا۔ سلطانہ نے ایک لمحے کے لئے کچھ سوچا پھر ٹھہرے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔" میرا نام سلطانہ ہے...... اصل نام تو سلطان تھا...... لوگوں نے بگاڑ کر سلطانہ بنا دیا ہے...... نام سے بھی بھنتو بالکل نہیں لگتا' اس طرح کے نام بھنتوؤں میں نہیں رکھے جاتے۔"

"سلطان...... سلطانہ......؟" عورت کی پیشانی پر شکنیں ابھر آئیں۔ وہ جیسے کسی سوچ میں پڑ گئی تھی اور پہلے سے زیادہ غور سے سلطانہ کو دیکھنے لگی تھی۔ پھر اچانک اس نے پوچھا۔" تم گلفی کے پوتے تو نہیں ہو؟"

"ہاں...... وہ میرے دادا تھے...... کیا تم انہیں جانتی ہو؟" سلطانہ نے کچھ حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

"کون بھنتو ہوگا جو گلفی کو نہیں جانتا۔" عورت کے لہجے میں اب اپنائیت سی آ گئی تھی۔

"تم گلفی کے پوتے ہو تو تمہارے لئے کاشی پور کے ہر گھر کا دروازہ کھل جائے گا۔ بس اب تم جلدی سے چلو...... کہیں کوئی دوسری پولیس پارٹی تمہارے پیچھے نہ آ جائے۔"

سلطانہ کو احساس ہوا کہ وہاں کھڑے کھڑے انہیں واقعی خاصی دیر ہو گئی تھی۔ اسے یہ بھی یاد آیا کہ ان کے تعاقب میں آنے والوں میں سے ایک گھڑ سوار زندہ بچ کر واپس گیا تھا۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ ابھی قلعے میں پہنچا ہوگا یا نہیں اور اگر پہنچ گیا ہوگا تو وہاں موجود انتظامیہ

کے بچے کھچے لوگ اس کی زبانی ساری صورتحال جاننے کے بعد کیا منصوبے بنا رہے ہوں گے۔"

وہ سب گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔ عورت کو سلطانہ کے حکم پر بھورے نے اپنے پیچھے بٹھا لیا۔ وہ بچے کو بھی سنبھال چکی تھی۔ سلطانہ نے تلی کی لاش گھوڑے پر اپنے آگے لاد لی۔ تلی کے بے جان وجود کو اپنے سامنے دیکھ کر ایک بار پھر اس کا دل بھر آیا' لیکن وہ اپنے آپ پر ضبط کرتے ہوئے سب سے آگے ہو لیا۔ اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور چند لمحے بعد وہ سب ایک بار پھر سلطانہ کی قیادت میں گویا ہوا کے دوش پر اڑے چلے جا رہے تھے۔ اب ان کا رخ کاشی پور کی طرف تھا۔

راستے میں سلطانہ نے ذرا گردن گھما کر اونچی آواز میں عورت سے پوچھا۔" میں نے تمہارا نام تو پوچھا ہی نہیں۔"

بھورے اپنے گھوڑے پر عورت کو پیچھے بٹھائے سلطانہ کے قریب ہی تھا۔ عورت بھی اونچی آواز میں بولی۔" میرا نام برکھا ہے۔"

سلطانہ کو اس کا نام بہت اچھا لگا۔ وہ عورت بھی اچھی معلوم ہوتی تھی۔ سلطانہ کو اس کے شوہر کے بارے میں سن کر حیرت ہوئی تھی۔ وہ نہ جانے کیونکر اس کے ساتھ اتنے غصے سے پیش آتا تھا۔ وہ تو بہت خوش مزاج اور ٹھنڈے دماغ کی عورت معلوم ہوتی تھی اور ادھیڑ عمری میں بھی اچھی خاصی پرکشش تھی۔ لگتا تھا اس کا شوہر کچھ زیادہ ہی خردماغ تھا۔ اسے اپنی اچھی بیوی کی قدر نہیں تھی۔

اچانک اسے ایک اور خیال آیا۔ اس نے عورت نے پوچھا۔" تم نے بتایا ہے کہ تمہارا پتی بہت غصے والا ہے۔ پتا نہیں وہ میرے بیٹے کے ساتھ کیا سلوک کرے۔ میں اپنے بیٹے کو کسی ایسے آدمی کے سائے میں چھوڑنا نہیں چاہتا' جو اتنا غصے والا ہو۔"

"ارے اس کا سارا غصہ صرف مجھ پر نکلتا ہے۔ گھر میں اور کسی کے ساتھ تو وہ اونچی آواز میں بات بھی نہیں کر سکتا۔" برکھا بے پروائی سے بولی۔" تمہارا بیٹا تو ویسے بھی میرے بیٹے اور بہو کے ساتھ رہے گا۔ وہ الگ گھر میں رہتے ہیں اور ان پر میرے پتی کا کوئی رعب نہیں چلتا۔ تم اس سلسلے میں بالکل چنتا نہ کرو...... اور پھر اگر کوئی بات ہوئی بھی تو میں ہوں نا...... میں اپنی جان پر کھیل جاؤں گی لیکن تمہارے بچے پر ذرا بھی آنچ نہیں آنے دوں گی۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ ذمہ داری لی ہے۔"

برکھا کے لہجے میں ایسا اعتماد اور خلوص تھا کہ سلطانہ کے دل کو قرار سا آ گیا۔ گھوڑے تیز رفتاری سے دوڑ رہے تھے اور مخالف سمت سے ہوا بھی تیز چل رہی تھی' جس کی وجہ سے ان کے کانوں میں شائیں شائیں سی ہو رہی تھی۔ انہیں تقریباً چیخ کر بات کرنا پڑ رہی تھی۔ بھورے کے پیچھے بیٹھی برکھا نے راجکمار کو اپنے اور بھورے کے درمیان رکھتے ہوئے ایک بازو سے اچھی طرح سنبھال رکھا' دوسرے بازو سے اس نے بھورے کو پکڑا ہوا تھا۔ عجیب بات یہ تھی کہ راجکمار اس کی آغوش کی پناہ میں جانے کے بعد چپ ہو گیا تھا۔ اس کا رونا دھونا بند ہو گیا تھا۔

جلد ہی وہ لوگ کاشی پور پہنچ گئے۔ وہ ایک سرسبز پہاڑی کے دامن میں واقع خاصا بڑا گاؤں تھا' بلکہ گاؤں کیا' قصبہ ہی معلوم ہوتا تھا۔ زیادہ تر مکانات بھی پکے تھے۔ وہاں کے لوگ خوشحال معلوم ہوتے تھے۔ صرف خوشحال ہی نہیں' وہ چوکس بھی تھے۔ سلطانہ اور ان کے ساتھی جب گاؤں میں داخل ہوئے تو سلطانہ کو گویا اس کی کسی نامعلوم حس نے بتا دیا کہ گاؤں والوں کو شاید علم ہو گیا تھا کہ ایک ساتھ چھ اجنبی گھڑسوار وہاں پہنچے تھے۔ اسے کچھ یوں لگا کہ کسی غیر مرئی ذریعے سے یہ خبر گاؤں کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچ گئی تھی۔

وہ چند گلی کوچوں سے گزرے اور اس دوران سلطانہ نے محسوس کیا کہ کچھ پرچھائیاں سی ان گلی کوچوں کے سروں پر منڈلا رہی تھیں' لیکن جب اس نے ذرا توجہ سے اِدھر اُدھر دیکھا تو کہیں کوئی نظر نہ آیا' مگر اس کا یہ احساس برقرار رہا کہ نظر نہ آنے والی کچھ آنکھیں ان کی نگرانی کر رہی تھیں۔ وہ اپنے اس احساس کا ذکر برکھا سے کئے بغیر نہ رہ سکا۔

برکھا نے گہری نظر سے اس کی طرف دیکھا اور بولی۔ ''تمہارا دماغ بڑا تیز ہے...... اندازہ ٹھیک ہے تمہارا...... تم خود بھگتو ہو' تمہیں پتا ہونا چاہئے کہ بھگتو ہر وقت کسی نہ کسی قسم کے خطرے میں ہوتے ہیں' اس لئے ان کے رہنے سہنے کے اپنے طور طریقے ہیں۔ ایک ساتھ چھ نئی شکلوں کا رات کے وقت گاؤں میں داخل ہونا کوئی معمولی بات نہیں...... کچھ نہ کچھ ہلچل تو ہونی ہی تھی' لیکن زیادہ تر لوگ اس بات کو محسوس نہیں کر پاتے جو تم نے محسوس کی ہے۔ شاید تمہارے ساتھیوں کو بھی پتا نہیں چلا...... لیکن تم فکر نہ کرو...... میں تمہارے ساتھ ہوں' اس لئے کسی نے سامنے آنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔''

چند لمحے بعد وہ برکھا کے دروازے پر پہنچ گئے۔ عین اس دروازے کے سامنے پیپل کا ایک تناور درخت تھا جو بہت پرانا دکھائی دے رہا تھا۔ اس درخت کے ساتھ ایک گھوڑا باندھا ہوا

تھا' جس پر زین بھی کسی ہوئی تھی۔ اس کے پاس ہی ایک لمبا تڑنگا ادھیڑ عمر آدمی بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ اس کی لمبی لمبی گھنی مونچھیں تھیں۔ سلطانہ کو اس کی شخصیت میں اپنے دادا گلفی کی جھلک نظر آئی۔ اسے فوراً ہی اندازہ ہو گیا کہ وہ برکھا کا شوہر تھا۔ عجیب بات یہ تھی کہ وہ اپنی بیوی کو گھر سے بہت دور ویرانے میں گھوڑے سے اُتار کر چھوڑ آیا تھا' لیکن وہ گھر آ کر آرام سے سونے کے بجائے گلی میں ٹہل رہا تھا اور اس کے چہرے سے بے چینی ظاہر تھی۔

برکھا پر نظر پڑتے ہی وہ گویا پھٹ پڑا۔ ''آ گئی حرافہ...... میں تو سمجھ رہا تھا کم سے کم آج رات تو جنگل بیابان میں ماری ماری پھرے گی اور شاید وہیں کوئی شیر' چیتا تجھے کھا جائے...... مگر میری ایسی قسمت کہاں...... آ گئی آرام سے گھوڑے پر بیٹھ کر۔''

عجیب بات تھی کہ وہ برکھا کے ساتھ سلطانہ اور اس کے دوستوں کو دیکھ کر ذرا بھی حیران نہیں ہوا تھا' حتیٰ کہ تپلی کی خون میں لتھڑی ہوئی لاش کو دیکھ کر بھی اس کے چہرے پر کسی قسم کی تشویش کے آثار پیدا نہیں ہوئے تھے۔ وہ برکھا سے اس طرح بات کر رہا تھا' جیسے وہ اکیلی وہاں پہنچی ہو۔ برکھا کا ردعمل بھی کچھ ایسا ہی عجیب تھا۔ اس نے گویا شوہر کی بات سنی ہی نہیں۔ وہ راجکمار کو سنبھالے بڑے اطمینان سے گھوڑے سے اتری اور سلطانہ کی طرف اشارہ کر کے بولی۔

''یہ گلفی کا پوتا ہے...... سلطانہ...... اس کی بیوی نجیب آباد قلعے کی پولیس کے ہاتھوں ماری گئی ہے...... ان کا پولیس سے مقابلہ میں نے بہت دور...... مگر اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ سب پولیس والے مارے گئے ہیں' صرف ایک زندہ بچ کر واپس بھاگا ہے۔'' سلطانہ کے دادا کا نام سن کر تو اس شخص نے قریب آ کر آنکھیں سکیڑ کر سلطانہ کو غور سے دیکھا اور خود کلامی کے سے انداز میں بولا۔

''گلفی کا پوتا......؟ مگر میں نے تو سنا تھا یہ قلعے میں قید ہے۔ اس نے گروہ کیسے بنا لیا......؟'' اس نے باری باری سلطانہ کے سب ساتھیوں کی طرف دیکھا۔

''گروہ میں نے نہیں بنایا۔'' سلطانہ بردباری سے بولا۔ ''خود بخود ہی بن گیا ہے اور آج رات ہی بنا ہے۔ مجھے تو اب یوں لگتا ہے' جیسے سنسار میں ہر کام خود بخود ہی ہوتا چلا جاتا ہے۔ آج شام جو کچھ ہوا ہے' اس کے بارے میں آج صبح تک میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ آج شام دو گھڑی پہلے مجھے گمان بھی نہیں تھا کہ دو گھڑی بعد میں کیا کر رہا ہوں گا۔''

برکھا کے شوہر کے تاثرات اب بالکل بدل گئے تھے۔ وہ اپنے غصے کو تو کیا بلکہ شاید اپنی

بیوی کو ہی بھول گیا تھا۔ وہ اب پوری طرح سلطانہ کی طرف متوجہ تھا اور اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ اس وقت اس کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ شاید اس نے سلطانہ کی فلسفیانہ سی بات زیادہ توجہ سے نہیں سنی تھی۔ وہ یکدم ہی بول اٹھا۔ ”لیکن تم لوگوں کو یہاں پناہ نہیں مل سکتی۔ مجھے وشواش ہے کہ گاؤں کا مکھیا بھی یہی کہے گا۔ گلفی بہت بڑا آدمی تھا۔ اس کا نام ہمارے سر آنکھوں پر...... ہم اس کے پوتے کی اور سب طرح سے مدد کرنے کو تیار ہیں' لیکن تم لوگوں کو گاؤں میں ٹھہرا نہیں سکتے۔ تمہارا پیچھا ضرور ہو گا...... اور اگر پولیس نے تم لوگوں کو ہمارے گاؤں میں سے ڈھونڈ نکالا تو ہم سب مارے جائیں گے۔ کاشی پور میں زیادہ تر وہ لوگ آباد ہیں جو نجیب آباد اور بریلی کے قلعوں سے یا پھر جیلوں سے آزاد ہوئے ہیں۔ قلعوں میں سات سات سال کاٹ کر بڑی مشکل سے انہیں اچھے چال چلن کی سند ملی تھی۔ ان میں سے کوئی بھی اب کسی قلعے یا جیل کا منہ دیکھنا نہیں چاہ رہا......“

”بھلے مانس...... تمہارا نام کیا ہے؟“ سلطانہ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے بڑے رسان سے پوچھا۔

”ساون......“ اس شخص نے اس اچانک سوال پر ذرا گڑگڑا کر جواب دیا۔

سلطانہ مصیبت اور تکلیف کی اس گھڑی میں بھی اس کا نام سن کر ”واہ“ کہے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ بھی آ گئی۔ ”پتی کا نام ساون...... پتنی کا نام برکھا...... رام جی نے کیا اچھی جوڑی ملائی ہے۔“

”نہ ہی ملائی ہوتی تو اچھا تھا۔“ ساون نے کھا جانے والی نظروں سے برکھا کی طرف دیکھا۔ سلطانہ کی بات سے اسے گویا ایک بار پھر اپنا غصہ یاد آ گیا تھا۔ برکھا نے کوئی جواب نہ دیا اور نہ ہی اس کے تاثرات میں کوئی تبدیلی آئی۔ اس نے شوہر کی یہ بات بھی گویا سنی ہی نہیں تھی۔ وہ شاید اس کی ہر بات اسی طرح سہہ جانے کی عادی تھی اور شاید اسی لئے اتنے برسوں سے ایسے شوہر کے ساتھ اس کا گزارا ہوتا آ رہا تھا۔

”ساون چاچا...... تم لوگ بعد میں لڑتے رہنا' مجھے تو صرف دو تین ضروری باتیں کرنی ہیں۔“

سلطانہ ہاتھ اٹھا کر متانت سے بولا۔ ”تمہیں گھبرانے کی ضرورت نہیں' ہم یہاں پناہ لینے نہیں آئے ہیں۔ ہمیں پتا ہے جو ہمیں پناہ دے گا' وہ بہت بڑی مصیبت میں پڑ سکتا ہے...... اور

ہم کسی کو مصیبت میں ڈالنا نہیں چاہتے۔ اپنی مصیبت ہم خود بھگتیں گے۔ رام جی کی دھرتی بہت بڑی ہے۔ ہم چھ سات آدمیوں کے بھی کہیں نہ کہیں سینگ سما ہی جائیں گے۔ میں تو صرف اس لئے تمہاری پتنی کے ساتھ آ گیا تھا کہ اس نے میرے بچے کو سنبھالنے کے بارے میں ایک بات کی تھی۔“

پھر اس نے برکھا کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”چاچی! ذرا اپنے پتی کو وہ بات بتاؤ۔“

برکھا نے مختصر سے الفاظ میں اپنے شوہر کو بتایا کہ اس نے ماں سے محروم ہو جانے والے ننھے راجکمار کے بارے میں کیا سوچا تھا۔ غصہ ور ساون کا چہرہ حیرت انگیز طور پر کھل اٹھا۔ سلطانہ کی توقع کے بالکل برعکس وہ برکھا کی تجویز سن کر خوش ہو گیا تھا۔ وہ تیزی سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”بالکل ٹھیک ہے...... تم ذرا بھی چنتا نہ کرو' میری بہو کی گود سونی ہے' وہ تمہارے بچے کو ماں کی طرح پالے گی۔“

سلطانہ کے مضطرب دل میں طمانیت کی ٹھنڈک سی اُتر آئی۔ ”دوسرے...... تم لوگ بس میرے لئے اتنی سی تکلیف اور اٹھا لو کہ میری پتنی کا کریا کرم خاموشی سے' مگر اچھے طریقے سے کر دو...... میں اس کے اَتم سنسکار کیلئے رک نہیں سکتا اور اس کی لاش کو لئے اِدھر اُدھر پھر بھی نہیں سکتا۔ اگر میرا یہ کام کر دو گے تو یہ مجھ پر دوسرا بڑا احسان ہو گا' جسے میں کبھی نہیں بھولوں گا۔“

”اس کی بھی تم بالکل چنتا نہ کرو' یہ کام تو ہم سب گاؤں والے مل کر کر دیں گے اور گاؤں سے باہر کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہو گی۔“ ساون فراخدلی سے بولا۔

”تم لوگ بس اپنی جان کی فکر کرو' ان باتوں کی بالکل چنتا نہ کرو۔“

”بہت بہت دھنے واد...... چاچا' چاچی۔“ سلطانہ کی آواز بھرا سی گئی' پھر اس نے گھوڑے سے اتر کر ساون اور برکھا دونوں کے پاؤں چھو لئے۔ انہوں نے اسے سینے سے لگا کر پیار کیا۔ وہ دوبارہ گھوڑے پر سوار ہوا اور اپنے ساتھیوں سمیت وہاں سے روانہ ہو لیا۔ گاؤں سے نکلنے کے بعد گو کہ وہ پیچھے کا منظر دیکھ نہیں پا رہا تھا' لیکن نہ جانے کیوں اسے کچھ ایسا لگ رہا تھا کہ اس وقت بہت سے لوگ اس گلی میں پہنچ چکے تھے جہاں ساون اور برکھا کا گھر تھا۔ سلطانہ اب اپنے آپ کو کسی حد تک مطمئن محسوس کر رہا تھا' دکھ' فکر' تشویش اور اندیشے اب بھی موجود تھے' لیکن اب ان میں گویا پہلے جیسی شدت نہیں رہی تھی۔

ساون اور برکھا نے انہیں رخصت کرنے سے پہلے ان کا ایک اور بڑا مسئلہ حل کر دیا تھا۔

انہوں نے بھنے ہوئے چنوں کا ایک تھیلا' پانی کا ایک مشکیزہ اور ضرورت کی چند دوسری چیزیں جو عجلت میں ہاتھ آ سکیں' وہ بھی ان کے حوالے کر دی تھیں' جن کے ذریعے بدترین حالات میں بھی ان کے دو چار دن گزر سکتے تھے اور وہ پیٹ کی آگ بجھا سکتے تھے۔ انہوں نے جنگل کا رخ کیا۔ فی الحال ان کیلئے یہی محفوظ جگہ تھی۔ وہاں انہیں خطرہ صرف موٹے موٹے مچھروں اور کبھی کبھار اِدھر اُدھر بھٹکنے والی جنگلی درندوں سے تھا' لیکن ان کے خیال میں وہ انسانوں کے مقابلے میں کم خطرناک تھے اور ان سے وہ آسانی سے بچ سکتے تھے یا نپٹ سکتے تھے۔

جنگل میں ایک محفوظ جگہ تلاش کر کے انہوں نے رات بسر کی اور اس رات اس محاورے کی سچائی کو محسوس کیا کہ نیند تو سولی پر بھی آ جاتی ہے۔ البتہ سلطانہ گہری نیند نہیں سو سکا۔ اس کی کئی بار آنکھ کھلی اور نیند آئی تو اس کے دوران کئی بار خواب میں اسے پتلی نظر آئی۔ شاید وہ اس کے ساتھ گزارے ہوئے دنوں کی یادیں تھیں جو خوابوں کی صورت میں اس کے لاشعور میں چکرا رہی تھیں۔

صبح اٹھنے اور پیٹ کی آگ کسی حد تک بجھانے کے بعد سلطانہ نے تجویز پیش کی کہ انہیں گجندر سنگھ کے باپ کی زمین کی طرف چلنا چاہئے۔ شاید وہاں پناہ ملنے کا کوئی امکان پیدا ہو جائے' حالانکہ حالت یہ تھی' ان میں سے کوئی بھی گجندر سنگھ کے باپ کے سامنے گجندر سے ملنے نہیں جاتا تھا۔ گجندر خود قلعے میں آتا تھا اور جب ان میں سے کسی کو اس کی زمین پر جا کر اس سے ملنا ہوتا تھا تو وہ وہاں سے کچھ دور ہی رہتے ہوئے' درختوں کے جھنڈ میں چھپ کر پہلے بھیڑیے کی اور پھر کوئل کی آواز نکالتا تھا۔ یہ گجندر کے لئے اشارہ ہوتا تھا۔ وہ خود اپنے دوست سے ملنے آ جاتا تھا۔ گجندر کا باپ تو انہیں پہچانتا بھی نہیں تھا۔ اس نے ان لڑکوں کو صرف اس وقت دیکھا تھا' جب وہ سب چھوٹے چھوٹے تھے۔ اس نے اپنے بیٹے کو سختی سے منع کر رکھا تھا کہ وہ قلعے میں رہنے والوں سے بالکل میل جول نہ رکھے' مگر جتنا اس نے منع کیا تھا' وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ گجندر کی دوستی ان لوگوں کے ساتھ اتنی ہی مضبوط ہوتی گئی تھی۔

گجندر کی زمین پر جانے کے لئے گو کہ انہیں قلعے ہی کی سمت میں سفر کرنا پڑتا اور اِدھر پولیس یا انگریز فوجیوں سے سامنا ہونے کا امکان زیادہ تھا' لیکن انہیں کئی ایسے راستے معلوم تھے' جن پر ان لوگوں سے ٹکراؤ کا خطرہ کم تھا...... اور اگر سامنا ہو بھی جاتا تو اب سلطانہ کو اس کی کچھ زیادہ پروا نہیں تھی۔ اس نے اپنے آپ کو تن بہ تقدیر چھوڑ دیا تھا اور راتوں رات ہی اس کے ذہن

میں کچھ ایسی تبدیلی آئی تھی اور اس کی سوچوں نے کچھ ایسا پلٹا کھایا تھا کہ خوف اس کے دل سے نکل گیا تھا۔ وہ یکدم ہی بالکل بے خوف اور نڈر ہو گیا تھا۔ گجندر سے ملنا اس لئے بھی ضروری تھا کہ وہ ''ترائی'' کے پورے علاقے سے' ان سب سے زیادہ اچھی طرح واقف تھا۔

انہوں نے زیادہ سفر جنگل کے اندر ہی اندر رہتے ہوئے طے کیا۔ جنگل میں انہیں اپنی رفتار کم ہی رکھنا پڑی۔ ویسے بھی انہیں وہاں پہنچنے کی کوئی جلدی نہیں تھی۔ وہ سہ پہر کے بعد گجندر کے ٹھکانے کے قریب پہنچے۔ جب گجندر کی زمین چند فرلانگ دور رہ گئی تو سلطانہ نے اپنے ساتھیوں کو درختوں کے پیچھے ہی رکنے کا حکم دیا اور خود کچھ اور آگے چلا گیا۔ زمین کے مزید قریب پہنچ اس نے پہلے بھیڑیے اور پھر کوئل کی آواز نکال کر گجندر کو سگنل دیا' لیکن اس کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔

وقفے وقفے سے اس نے کئی بار سگنل دیا' لیکن کوئی جواب نہ آیا۔ لگتا تھا کہ گجندر اپنی زمین پر نہیں تھا۔ وہ پوری کوشش کرتا تھا کہ زمین پر کم سے کم رہے۔ اس کی اپنے باپ سے نہیں بنتی تھی اور نہ ہی وہ اپنی زمین پر خوش رہتا تھا۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ باپ بیٹا الگ الگ جھونپڑیوں میں رہتے تھے۔ باپ کی جھونپڑی زمین کے ایک طرف تھی' بیٹے کی جھونپڑی زمین دوسری طرف...... باپ کا زیادہ وقت ویسے بھی اس مچان پر ہی گزرتا تھا' جو اس نے اپنی زمین کی نگرانی کے لئے ایک بڑے درخت پر بنائی ہوئی تھی۔

جب کئی بار سگنل دینے پر بھی کوئی جواب نہ ملا تو سلطانہ نے فیصلہ کیا کہ زمین کا ایک چکر لینا چاہئے' اگر گجندر کے باپ سے سامنا ہو گیا تو دیکھا جائے گا۔ وہ اپنے گھوڑے کو دلکی چلاتا ہوا کسی عام مسافر کی طرح آگے چل رہا پڑا۔ تاہم اس وقت بھی اس کے سینے پر ایک دوسرے کو کراس کرتی ہوئی دو پیٹیاں' گولیوں کی موجود تھیں اور دونوں کندھوں پر رائفلیں لٹکی ہوئی تھیں۔

اس نے دور سے ہی دیکھ لیا کہ گجندر کا باپ مچان پر بیٹھا حقہ گڑگڑا رہا تھا۔ قریب ہی اس کی بندوق درخت کی ایک شاخ کے سہارے کھڑی تھی۔ سلطانہ کا خیال تھا کہ وہ سر جھکائے اس کے سامنے سے گزر جائے گا اور گجندر کی جھونپڑی کے قریب سے گزرتے وقت اندازہ لگانے کی کوشش کرے گا کہ وہ اندر موجود ہے یا نہیں...... مگر گجندر کے باپ کا ردعمل اس کی توقع کے بالکل خلاف تھا۔ اس کی نظر جونہی سلطانہ پر پڑی' وہ ہڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے اپنی بندوق سنبھال کر اس کا نشانہ لے لیا۔ ایک لمحے کے لئے تو اس اندیشے سے سلطانہ کے اعصاب تن گئے

کہ وہ کہیں گولی ہی نہ چلا دے۔

"کیا کرنے آئے ہو میری زمینوں پر......؟ میری فصل لوٹنے آئے ہو؟" گجندر کا باپ چیخا۔

سلطانہ نے اس کی مچان کے قریب گھوڑا روک کر حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ اسے گجندر کے باپ سے ایسی بے وقوفی کی بات کی توقع نہیں تھی۔ وہ اس سے کہنا چاہتا تھا۔ "بے وقوف انسان اکیلا آدمی فصل کیسے لوٹ سکتا ہے؟ وہ کیا تمہاری فصل کاٹنے بیٹھے گا اور پھر ساری فصل ایک گھوڑے پر لاد لے جائے گا؟ فصل بھی بھلا کوئی لوٹنے کی چیز ہے؟ ہاں دشمنی میں ضرور کسی کی فصل کو آگ لگائی جا سکتی ہے...... لیکن یہ شاید آج تک کسی نے نہیں سنا ہو گا کہ کسی کے کھیتوں میں کھڑی فصل کوئی لوٹ کر لے گیا ہو۔"

تاہم اس نے یہ نہیں کہا اور ایک لمحے کے لئے مچان کے قریب رک کر آگے بڑھنے لگا، مگر گجندر کا باپ بندوق لہراتے ہوئے چیخا۔ "ذرا دور سے گزرو...... میں نہیں چاہتا میری زمین پر کسی بھنگو کے قدم پڑیں۔ تیری شکل بتا رہی ہے کہ تو بھنگو ہے۔"

سلطانہ نے گھوڑا روک لیا اور اُسے گھورتے ہوئے بولا۔ "چاچا! تم اس طرح مجھے بھنگو کہہ رہے ہو جیسے میں کوئی پلید انسان ہوں، تم خود بھنگو نہیں ہو کیا؟"

"مگر میرے پاس نیک چال چلن کی سند ہے۔" گجندر کے باپ نے اکڑ کر جواب دیا۔

"انگریزوں سے سند ملنے سے کسی کی نسل یا نسب نہیں بدل جاتا چاچا۔" سلطانہ نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ اسے اب یقین ہو گیا تھا کہ گجندر کا باپ کافی سنکی ہو گیا تھا۔ شاید اس ویرانے میں تنہائی کی زندگی اور کاشت کاری کی مشقتوں نے اس کے دماغ پر اثر ڈالا تھا۔

"اے چل...... مجھے فلسفہ نہ پڑھا اور یہاں سے دفع ہو جا......" وہ ایک بار پھر چیخا۔ وہ سلطانہ کے دونوں کندھوں پر رائفلیں دیکھ کر بھی مرعوب نہیں تھا اور اپنی توڑے دار بندوق کو لہرائے جا رہا تھا۔

سلطانہ گھوڑے پر تھا مگر گجندر کا باپ مچان پر کھڑا ہونے کی وجہ سے اس کی نسبت کچھ اونچائی پر تھا اور وہ چونکہ کھڑا ہوا تھا، شاید اس لئے سلطانہ اسے کچھ زیادہ ہی نیچے نظر آ رہا تھا۔ وہ کچھ ایسی حقارت سے سلطانہ کی طرف دیکھ رہا تھا، جیسے وہ انسان نہیں بلکہ نالی میں رینگنے والا کیڑا ہو۔

سلطانہ سر اونچا کئے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پلکیں جھپکائے بغیر چند لمحے اسی طرح اس کی طرف دیکھنے کے بعد بے ساختہ سلطانہ کے منہ سے نکل گیا۔ "اگر تم میرے دوست کے باپ نہ ہوتے تو میں تمہیں ابھی گولی مار دیتا۔"

"دوست کا باپ......؟" گجندر سنگھ کے باپ نے آنکھیں پھاڑ کر کہا اور بندوق اس کے ہاتھ سے گرتے گرتے بچی۔ "کیا اب ڈاکو بھی گجندر کے دوست ہونے لگے؟"

"تم سے کس نے کہا کہ میں ڈاکو ہوں؟" سلطانہ نے بدستور اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"تیری تو شکل پر ہی لکھا ہے کہ تو ڈاکو ہے۔ تیرے بارے میں کسی کو کسی سے کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں۔" میں کہتا ہوں فوراً دفع ہو جا یہاں سے...... میری زمین پر اپنے منحوس قدم مت رکھ...... چلا جا ورنہ گولی مار دوں گا۔"

اب سلطانہ کو خطرہ محسوس ہوا کہ گجندر کا باپ واقعی گولی چلا سکتا تھا اور اگر وہ نہ بھی چلاتا تب بھی اضطراری حالت میں اس سے لبلبی دب سکتی تھی۔ اس کی حالت کسی حد تک جنونیوں والی تھی۔ اس کی باچھوں سے کف بہہ رہا تھا۔ سلطانہ چاہتا تو اسی کی بندوق کی نال پکڑ کر ایک لمحے میں اسے جھٹکے سے نیچے گرا سکتا تھا، لیکن مسئلہ وہی تھا کہ وہ گجندر کا باپ تھا۔ کوئی اور ہوتا تو اسے اپنے الفاظ پر پچھتانے کی بھی مہلت نہ ملتی۔

سلطانہ نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر گھوڑا آگے بڑھا دیا، لیکن جاتے جاتے وہ اتنا کہے بغیر نہ رہ سکا۔ "چاچا! یہ گجندر ہی کا حوصلہ ہے کہ وہ تمہارے ساتھ رہتا ہے۔"

گجندر کا باپ غصے میں نہ جانے کیا کچھ کہتا رہا، لیکن سلطانہ نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا، تاہم اس نے کافی دور پہنچنے تک گردن گھما کر پیچھے نظر رکھی کہ گجندر کا باپ کہیں اپنے سنکی پن میں گولی چلا ہی نہ دے، لیکن پھر اسے اندازہ ہوا کہ اس میں درحقیقت اتنی بھی ہمت نہیں تھی۔ وہ بس گرجنے برسنے کا عادی معلوم ہوتا تھا۔ اس وقت وہ مچان پر کھڑا بندوق لہرا لہرا کر نہ جانے کیا کچھ کہہ رہا تھا اور غصے سے کانپ رہا تھا۔ اس حالت میں وہ بے حد مضحکہ خیز لگ رہا تھا۔ گجندر یقیناً اپنی جھونپڑی میں موجود نہیں تھا ورنہ اتنی ہنگامہ آرائی پر تو ضرور باہر آ جاتا۔ سلطانہ نے اس کی جھونپڑی سے آگے نکلنے کے بعد گھوڑے کو تیز دوڑانا شروع کر دیا۔

وہ جب اپنے ساتھیوں کے پاس واپس پہنچا تو شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ جنگل میں تو پوری طرح رات ہی اتر آئی تھی۔ سلطانہ نے اپنے ساتھیوں کو بتایا کہ گجندر کے باپ سے اس کی

ملاقات کیسی رہی تھی۔

"باپ رے باپ!" بھورے نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ "ہم تو سوچ رہے تھے کہ ہمیں گجندر کی زمین پر پناہ مل جائے گی۔ اگر ہم سب اکٹھے وہاں چلے جاتے تو شاید گجندر کا باپ غصے یا پریشانی سے وہیں پٹ سے گر کر مر جاتا۔"

"افسوس اس بات کا ہے کہ گجندر ہمارے ساتھ شامل نہیں ہوسکا۔" سلطانہ بولا۔ "اس کی کمی محسوس ہو رہی ہے' ہمیں اب جو کچھ بھی کرنا ہے' اس میں سب دوستوں کو ساتھ ہونا چاہئے تھا۔"

"تم دل چھوٹا نہ کرو۔" پریتم نے اسے تسلی دی۔ "پھر کسی دن موقع ملا تو اس کی زمین کا ایک چکر لگا لینا۔ شاید اس سے ملاقات ہو ہی جائے۔" پھر جیسے اسے کوئی خیال آیا اور وہ قدرے مایوسی سے بولا۔ "یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ گجندر ہمارے ساتھ شامل ہونا ہی نہ چاہے۔ اب ہمارے ساتھ شامل ہونے کیلئے بڑے دل گردے کی ضرورت ہے' کیونکہ ہمارے آگے اندھیرا اور پیچھے موت ہے۔"

"ابے واہ پریتم!" سلطانہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا۔ "تم تو بڑی گہری باتیں کرنے لگے ہو۔ لگتا ہے ایک ہی رات میں زندگی نے تمہیں بہت کچھ سکھا دیا ہے؟"

"اس میں کیا شک ہے سلطانہ......" بھورے سنجیدگی سے بولا۔ "ایسا لگتا ہے ذرا دیر پہلے ہم زندگی کی ندی کے ایک کنارے پر کھڑے تھے۔ چٹکی بجاتے ہی ہم چھلانگ لگا کر دوسرے کنارے پر آگئے۔"

یونہی باتیں کرتے کرتے انہوں نے بھنے ہوئے چنے کھا کر اور تھوڑا تھوڑا پانی پی کر پیٹ کی آگ بجھائی اور درختوں کے نیچے سو گئے۔ کل کے مقابلے میں آج ان کے اعصاب کافی پرسکون تھے۔ سونے والوں کو عموماً یہ احساس نہیں ہوتا کہ وہ کتنی دیر سوئے رہے۔ سلطانہ کو بھی یہ اندازہ نہیں ہوا۔ تاہم اسے یہ اندازہ ضرور ہوا کہ اس کی آنکھ کھلی تھی اور ذہن کے کسی گوشے میں اس سوال نے بھی سر اٹھایا تھا کہ کوئی اس کے چہرے قریب اتنی تیز تیز سانسیں لے رہا تھا۔ تمام تر غنودگی کے باوجود یہ سوال اس کے لئے حیرت کا باعث بنا تھا۔

جب اس نے آہستگی سے آنکھیں کھولیں تو اس کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنی چیخ روکی تھی۔ اگر اس کی چیخ نکل جاتی تو شاید اس کا کوئی برا ردعمل سامنے آتا۔

اسے اپنی آنکھوں کے سامنے بڑی سی ایک بھیانک اور سیاہ تھوتھنی نظر آئی تھی۔ دوسرے ہی لمحے اس کی آنکھیں ذرا اور بہتر طور پر دیکھنے کے قابل ہوئیں تو اسے پتا چلا کہ سیاہ بالوں سے بھرا ایک بڑا سا سر اس کے چہرے پر جھکا ہوا تھا۔ مزید ایک آدھ سیکنڈ بعد اس پر صحیح طرح واضح ہوا کہ وہ اس کی زرد آنکھوں میں بھی آسانی سے جھانک سکتا تھا۔ ان آنکھوں میں درندوں والی ایک مخصوص سی وحشت کے علاوہ عجیب سی کمینگی بھی جھلک رہی تھی۔ سلطانہ کے جسم میں سر سے پاؤں تک ایک سرد سی لہر دوڑ گئی۔ اس نے ذرا بھی حرکت کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور جس طرح لیٹا ہوا تھا' اسی طرح ساکت ہو گیا۔ وہ اگر ذرا بھی ہلنے' اٹھنے یا بھاگنے کی کوشش کرتا تو ریچھ اس پر حملہ آور ہوسکتا تھا۔ اس علاقے میں ریچھ کی موجودگی پر سلطانہ کو ایک لمحے کے لئے حیرت بھی ہوئی تھی۔ جنگلات کا یہ حصہ نشیب میں تھا اور اس علاقے میں درندے' خاص طور پر ریچھ نہیں پائے جاتے تھے۔ شاید اس لئے کہ یہاں سے بہت سی انسانی بستیاں قریب تھیں۔ ریچھ شاید انسانوں سے خطرہ محسوس کرتے ہوئے ذرا دور ہی رہتے تھے۔ یہ ریچھ شاید بھٹکتا ہوا' کسی طرف سے آنکلا تھا اور فی الحال سلطانہ کی جان کے لئے خطرہ بن گیا تھا۔

ریچھ سلطانہ کے چہرے کو اچھی طرح چاروں طرف سے سونگھ رہا تھا۔ ایک دو بار سلطانہ نے اپنے گالوں پر اس کی تھوتھنی کا لمس بھی محسوس کیا' جس پر کوئی رطوبت سی لگی ہوئی تھی۔ اس کی سانسوں کے ساتھ جانوروں کی ایک مخصوص بدبو بھی سلطانہ کے نتھنوں تک پہنچ رہی تھی اور وہ کراہت محسوس کر رہا تھا۔ اس نے اپنی سانس روک لی اور وہیں بے حس و حرکت رہتے ہوئے آہستگی سے آنکھیں گھما کر اِدھر اُدھر دیکھنے کی کوشش کی۔

وہ کم از کم یہ دیکھنے میں کامیاب ہو گیا کہ اس کے ساتھی اِدھر اُدھر لڑھکے ہوئے تھے اور بے خبر سو رہے تھے۔ ان میں سے کسی کو ریچھ کی موجودگی کا احساس نہیں تھا۔ سلطانہ کو حیرت تھی کہ ریچھ نے سونگھنے کے لئے اسی کو کیوں منتخب کیا تھا۔ اس نے اپنی رائفلیں اپنے سرہانے درخت کے سہارے کھڑی کی تھیں' لیکن اس وقت وہ زمین پر پڑی تھیں اور اس کی رسائی سے ذرا سی دور تھیں۔ ریچھ بہت چوکنا دکھائی دے رہا تھا اور اس کا انداز بتا رہا تھا کہ سلطانہ اس کی نظر میں ایک شکار ہی تھا۔ شاید وہ فیصلہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اسے کس طرح ہلاک کرے؟

ریچھ نے اسے آنکھیں کھولتے دیکھ لیا تھا اور شاید خطرہ محسوس کیا تھا کہ اس کا شکار اٹھ کر نہ بھاگ جائے۔ اس نے بڑے اطمینان سے اپنے دونوں اگلے پاؤں سلطانہ کے سینے پر رکھ

لئے۔ سلطانہ کا دم گھٹنے لگا اور اسے اپنی پسلیاں ٹوٹتی محسوس ہوئیں۔ اسے یوں لگا جیسے کسی نہ کوئی پہاڑ اس کے سینے پر رکھ دیا تھا۔ دونوں پاؤں سلطانہ کے سینے پر ٹکانے کے بعد ریچھ کچھ یوں تھوتھنی گھما کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا' جیسے کوئی پہلوان اپنے حریف کو چت کرنے کے بعد اِدھر اُدھر دیکھ کر تماشائیوں سے داد طلب کر رہا ہو۔

اس وقت سلطانہ کو اس کی توجہ اپنی طرف سے ذرا ہٹی ہوئی لگی اور اس نے اس امکان پر غور کیا کہ کیا وہ ریچھ کو اپنے اوپر سے دھکیل کر تیزی سے لوٹ لگا کر اپنی رائفل تک پہنچ سکتا تھا اور اس کا رخ ریچھ کی طرف کرتے ہوئے ریچھ کے سنبھلنے سے پہلے اس پر فائر کر سکتا تھا؟ اسے یہ کام تقریباً ناممکن نظر آیا۔ ریچھ گویا اپنا پورا وزن اسی پر ڈالے کھڑا تھا۔ اسے دھکیلنا تو درکنار' اپنی پسلیوں کو ٹوٹنے سے بچانا ہی مشکل ہو رہا تھا۔ پہلے اس نے اپنی سانس خود روکی تھی' لیکن اب ریچھ کے وزن سے رک گئی تھی۔

پھر اچانک ہی وہ وزن اس کے سینے سے ہٹ گیا اور بے اختیار اس نے ایک تیز سی سانس لینا شروع کی' لیکن دوسرے ہی لمحے اسے دہشت زدہ انداز میں فوراً ہی سانس روکنا پڑی' کیونکہ دوسرے ہی لمحے اسے اندازہ ہوا کہ اس کے ساتھ کیا ہونے والا تھا۔ دراصل ریچھ اپنی پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا تھا' لیکن فوراً ہی وہ اپنے دونوں اگلے پاؤں دوبارہ پہلے سے زیادہ وزن اور طاقت کے ساتھ یوں نیچے لا رہا تھا جیسے سلطانہ کے سینے کو پچکا کر زمین کے ساتھ برابر کر دینا چاہتا ہو۔

سلطانہ کی خوش قسمتی تھی کہ وہ بدحواس نہیں ہوا۔ ریچھ کے پاؤں اپنے سینے تک پہنچنے سے پہلے' عین آخری لمحے میں اس نے لوٹ لگائی اور دوبارہ ریچھ کے پیروں تلے دبنے سے بچ گیا ورنہ اس کا سینہ تقریباً پچک جاتا اور پسلیاں ٹوٹ جاتیں۔ اس کے خیال میں ریچھ زیادہ پھرتیلا جانور نہیں تھا' لیکن اس وقت وہ اس کی پھرتی پر حیران رہ گیا' جب اس کے پاؤں زمین پر آ کر لگے اور وہاں سلطانہ کو نہ پا کر اسے زوردار جھٹکا لگا' مگر وہ فوراً ہی اس سے سنبھلتے ہوئے سلطانہ پر جھپٹا۔ اس سے پہلے کہ رائفل سلطانہ کے ہاتھ میں آتی' ریچھ نے اس کے بازو پر جھپٹا مارنے کی کوشش کی تھی۔

عین اسی لمحے فائر کی آواز سے جنگل کا سکوت درہم برہم ہو گیا۔



ریچھ نے سلطانہ کے بازو پر پنجہ مارنے کی جو کوشش کی تھی' اگر وہ اس میں کامیاب ہو گیا ہوتا تو شاید سلطانہ کا بازو بہت زیادہ زخمی ہو جاتا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ بازو ناکارہ ہی ہو جاتا۔ اس کی خوش قسمتی تھی کہ عین اسی لمحے ہونے والے فائر کی وجہ سے اس کا بازو ریچھ کے حملے سے بال بال بچ گیا۔ ریچھ ایک بھیانک آواز نکالتا ہوا دوسری طرف لڑھک گیا تھا۔ گولی اس کی آنکھ پر لگی تھی اور شاید دوسری طرف سے نکل گئی تھی۔ اس کی کھوپڑی کا بھی کچھ حصہ اُڑ گیا تھا۔ اس کے باوجود ریچھ نے ایک بار اٹھنے کی کوشش کی' مگر دوبارہ گر پڑا اور تشنجی انداز میں چند جھٹکے لینے کے بعد اپنی جگہ ساکت ہو گیا۔

تب سلطانہ کی جان میں جان آئی۔ وہ اپنی رائفل سنبھالتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا خیال تھا کہ شاید اس کے سوئے ہوئے ساتھیوں میں سے کوئی بروقت اٹھ گیا تھا اور اس نے فائر کر کے ریچھ سے اس کی جان بچائی تھی' لیکن جب اس نے اردگرد دیکھا تو اسے پتا چلا کہ اس کے ساتھیوں میں سے صرف بھورے ہی پوری طرح بیدار ہوا تھا' لیکن شاید اچانک نیند سے اٹھ کر صورتحال دیکھتے ہی وہ بھی کچھ بدحواس سا ہو گیا تھا۔ اس نے اپنی رائفل تک نہیں اٹھائی تھی۔ باقی لوگ ابھی آنکھیں ملتے ہوئے اٹھ کر بیٹھے ہی تھے اور شاید سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے کہ ان پر کیا آفت ٹوٹی ہے۔

سلطانہ کو یہ اندازہ کر کے بہت حیرت ہوئی کہ فائر اس کے کسی ساتھی نے نہیں کیا تھا۔ اس نے اپنے محسن کی تلاش میں چاروں طرف نظر دوڑائی جس نے بروقت گولی چلا کر اسکی جان بچائی تھی۔ دوسرے ہی لمحے اسے مزید حیرت کا سامنا کرنا پڑا' جب اس نے ایک جانب موجود گھنے درختوں کی اوٹ سے گجندر سنگھ کو نکلتے دیکھا۔ وہ انہی کی طرف آ رہا تھا' اس کے ہاتھ میں بندوق تھی' جس کی نال سے ابھی تک دھوئیں کی پتلی سی لکیر بلند ہو رہی تھی۔ وہ یقیناً اس کے باپ کی

بندوق تھی، جس کے بارے میں سلطانہ کو شک ہی رہتا تھا کہ وہ شاید فائر نہیں کرتی تھی، لیکن آج اس نے اپنی افادیت ثابت کر دی تھی۔ جگندر نے یقیناً اسی سے بروقت گولی چلا کر سلطانہ کی جان بچائی تھی۔

سلطانہ کا دل احسان مندی کے جذبے سے بھر سا آیا۔ جگندر قریب آیا تو سلطانہ نے اسے سینے سے لگا لیا اور اس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے خوشی سے مغلوب لہجے میں بولا۔ ”یار...... یہ تو چمتکار ہی ہو گیا۔ ہم تمہیں ڈھونڈنے گئے تھے۔ اس وقت تو تم ملے نہیں تھے، مگر اب جیسے بھگوان نے خاص طور پر تمہیں میری جان بچانے کے لئے بھیج دیا۔“

”ہاں...... مجھے پتا چلا تھا کہ تم زمین پر آئے تھے...... باپو سے تمہارا سامنا بھی ہوا تھا اور بات بھی ہوئی تھی۔“ جگندر کے لہجے میں ایک عجیب سادھیما پن اور کچھ تھکن جھلک رہی تھی۔ اس نے بات کرتے وقت ریچھ کو ہلکی سی ٹھوکر بھی ماری۔ شاید وہ دیکھ رہا تھا کہ اس میں کچھ جان تو باقی نہیں تھی۔ ریچھ نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی۔

سلطانہ اس طرح جگندر کے اچانک پہنچنے پر ابھی تک حیران تھا۔ وہ آنکھیں ذرا پھیلائے جگندر کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”لیکن تم یہاں ہم لوگوں تک پہنچ کیسے گئے؟ ہم تو یہی سمجھ کر یہاں آرام سے ٹانگیں پھیلائے سو رہے تھے کہ ہم بڑی محفوظ جگہ پر ہیں۔ کیا تمہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ ہم یہاں ہیں؟“

”ہاں۔“ جگندر نے گہری سانس لے کر جواب دیا۔

”وہ کیسے؟“ سلطانہ نے پوچھا۔

”گھوڑے کے سموں کے نشان بتا رہے تھے کہ تم کدھر سے آئے اور کدھر گئے۔ میں نشان دیکھتا ہوا یہاں تک پہنچ گیا۔ راستے میں جب اندھیرا ہو گیا تو مجھے رُکنا پڑا، لیکن صبح کا اُجالا ہوتے ہی میں پھر چل پڑا۔ رات کو اوس پڑی تو گھوڑے کے سموں کے نشان اور بھی زیادہ اچھی طرح نظر آنے لگے۔ جہاں گھاس تھی، وہاں سموں کی وجہ سے گھاس کچلی ہوئی نظر آ رہی تھی۔“ جگندر نے گویا اپنا کوئی راز تفصیل سے بتا دیا۔

سلطانہ کی آنکھیں کچھ اور پھیل گئیں۔ وہ بے یقینی سے جگندر کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”یار! تم تو پورے کھوجی ہو گئے ہو۔ تم پولیس کے لئے کام کر سکتے ہو، وہ تمہیں کارپٹ صاحب کے برابر سمجھیں گے۔ سنا ہے پولیس کے بڑے بڑے افسروں نے ایک بار کارپٹ صاحب کو

اپنے محکمے میں نوکری کرنے کے لئے کہا تھا، بلکہ سنا ہے وہ اپنی زندگی کے زیادہ دن اپنی خوشی سے جنگلوں میں گزارتے ہیں اور آدم خور شیروں، چیتوں اور دوسرے خطرناک جانوروں کا شکار کرتے ہیں۔ انہیں بس اسی زندگی میں مزا آتا ہے۔ میرا خیال ہے تم پولیس کے محکمے میں جا کر کارپٹ صاحب کی جگہ لے سکتے ہو۔“ اس نے جگندر کے کندھے پر ہاتھ مار کر گویا اسے داد دی۔

اور وہ بولا۔ ”کارپٹ صاحب کی بات اور ہے...... وہ انگریز ہیں اور بڑے آدمی ہیں، وہ تو جہاں بھی چاہیں انہیں کوئی بڑا عہدہ مل سکتا ہے۔ ہم بھنتو کو پولیس والے گرفتار کرنے یا گولی مارنے تو آ سکتے ہیں، ہمیں اپنے محکمے میں نوکری دینے کے لئے نہیں بلا سکتے۔ چاہے ہم کھوجی تو کیا، پورے جادوگر بن جائیں...... اور ہاں...... نشان دیکھتے ہوئے کسی کا کھوج لگا کر اس تک پہنچ جانا، کوئی بڑی بات تو نہیں...... تمہیں یاد نہیں، تمہارے دادا گلفی جی نے ہی مجھے یہ ہنر سکھایا تھا۔ دو چار ملاقاتوں میں ہی انہوں نے مجھے ساری موٹی موٹی باتیں سمجھا دی تھیں۔ پھر میں نے اپنے شوق سے خود ہی اور بہت کچھ سیکھ لیا۔ موٹی موٹی باتیں تو انہوں نے تمہیں بھی سکھائی تھیں، بھول گئے کیا؟“

”نہیں بھولا تو نہیں ہوں۔“ سلطانہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ”میں سمجھا تھا تم بھول چکے ہو گے، لیکن تم نے تو پڑھے ہوئے سبق سے بھی آگے تک یاد کر لیا، اب ہم دوستوں میں تو تم ہی کارپٹ صاحب ہو۔“

دراصل اس زمانے کے ایک نہایت مشہور شکاری جم کارپٹ کا نام سارے ہندوستانیوں نے سنا ہوا تھا۔ انہوں نے شکاریات کے موضوع پر اپنے بہت سے ذاتی تجربات نہایت دلچسپ داستانوں کے انداز میں قلمبند بھی کئے۔ ان کی بہت سی کتابیں شائع ہوئیں، جن کے دنیا بھر میں تراجم بھی ہوئے اور بہت دلچسپی سے پڑھے گئے۔ اس زمانے کے بہت سے ان پڑھ یا کم پڑھے لکھے لوگ ان کا تذکرہ ”کارپٹ صاحب“ کے نام سے ہی کرتے تھے۔

پھر سلطانہ کو گویا کچھ یاد آیا اور وہ ریچھ کے پاس سے ہٹ کر جگندر کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ٹہلنے کے سے انداز میں ایک طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ”میں تمہارے باپو کے کھیتوں پر آنا نہیں چاہتا تھا، لیکن تم سے ملنا اور تمہیں حالات سے آگاہ کرنا بہت ضروری تھا۔ اس لئے مجھے آنا پڑا۔ میں نے سوچا پولیس کو خیال نہ آ جائے کہ تم بھی ہمارے دوست ہو اور وہ تمہیں تنگ کرنے نہ پہنچ جائے۔ اس لئے میں چاہ رہا تھا کہ تمہیں خبردار بھی کر دوں اور پوچھ بھی لوں کہ تمہارے اب

کیا ارادے ہیں؟ تمہارے باپو میری وجہ سے تم پر ناراض تو بہت ہوئے ہوں گے؟''

باقی دوست دائرے کی صورت میں ان کے گرد جمع ہو گئے تھے اور وہ دونوں اسی دائرے کے اندر ٹہلنے لگے تھے۔ جگندر کے ہونٹوں پر ایک بار پھر پھیکی سی مسکراہٹ ابھری اور وہ تلخی سے بولا۔ ''باپو کا جو حال ہوا اس کے لئے ''ناراض'' تو بہت چھوٹا لفظ ہے۔ وہ میرے ساتھ جو سلوک کرنا چاہ رہے تھے، وہ شاید پولیس بھی نہ کرتی۔''

''اوہو...... یہ تو بہت برا ہوا'' سلطانہ نے تاسف سے بولا۔

''نہیں...... شاید اچھا ہی ہوا۔'' جگندر نے ایک طویل سانس لی جیسے اس کے سینے سے کوئی بوجھ ہٹ گیا ہو۔ ''زندگی کی ناؤ کسی کنارے تو لگ گئی' ورنہ میں بیچ میں ہی ڈولتا رہتا۔ سوچتا ہی رہتا کہ کدھر جاؤں' کدھر نہ جاؤں...... کیا کروں' کیا نہ کروں؟ کم سے کم اب فیصلہ ہو گیا ہے۔ میری سمجھ میں آ گیا ہے کہ مجھے کیا کرنا ہے۔''

اس کے لہجے میں کوئی عجیب سی بات تھی۔ سلطانہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''کیا سمجھ میں آ گیا ہے؟''

''یہی کہ مجھے دوستوں کے ساتھ رہنا ہے۔'' جگندر کے لہجے میں بلا کا ٹھہراؤ تھا۔ ''میں باپو کو چھوڑ آیا ہوں۔''

''اوہو......'' سلطانہ کے لہجے میں اس بار بھی تاسف تھا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اس بات کو اچھا سمجھوں یا برا...... حالانکہ کل میں تمہاری تلاش میں اسی خیال سے گیا تھا کہ تم سے پوچھ لوں' تم ہمارے ساتھ چل سکتے ہو یا نہیں؟ لیکن اب تم خود آ گئے ہو تو میں جیسے الجھن میں پڑ گیا ہوں کہ یہ اچھا ہو رہا ہے یا برا؟ کہیں میں ایک باپ سے اس کا بیٹا تو نہیں چھین رہا......؟''

''وہ اب باپ کہاں رہے ہیں......؟'' جگندر کے لہجے میں دُکھ اور تلخی تھی۔ ''دشمنوں سے بھی برا سلوک ہے ان کا میرے ساتھ...... زندگی اجیرن کر رکھی تھی انہوں نے میری...... مجھے تو یوں لگتا تھا جیسے میں دنیا میں نہیں نرک میں رہ رہا تھا۔'' پھر شاید غیر ارادی طور پر اس کا لہجہ کچھ رازدارانہ سا ہو گیا۔ ''میرا خیال ہے کافی عرصے سے ان کے دماغ میں کچھ فرق آ گیا ہے۔ وہ پہلے جیسے باپو بالکل نہیں رہے۔ عجب سنکی سے ہو گئے ہیں۔ ان کے یہاں ضرور کچھ نہ کچھ گڑبڑ ہو گئی ہے۔'' اس نے اپنی کنپٹی پر انگلی رکھ کر گھمائی۔ ''اور کبھی کبھی بہت خطرناک بھی ہو جاتے ہیں۔ ڈر لگتا ہے' مجھے یا کسی اور کو مار نہ دیں۔ اس لئے میں ان کی یہ بندوق بھی لے آیا ہوں۔''

اس نے وہ بندوق اونچی کر کے دکھائی جس سے وہ ریچھ کو ہلاک کر چکا تھا۔ سلطانہ پہلی ہی نظر میں وہ بندوق دیکھ بھی چکا تھا اور اسے پہچان بھی چکا تھا۔

''چلو...... اگر تم سمجھتے ہو تمہارا فیصلہ ٹھیک ہے تو پھر اسی طرح سہی......'' سلطانہ دھیمے لہجے میں بولا۔ ''ظاہر ہے تمہارے آنے سے تو ہمیں حوصلہ ملے گا...... طاقت ملے گی...... لیکن...... کیا تمہیں پتا ہے کہ حالات کیا ہیں؟''

''مجھے سب معلوم ہو چکا ہے' ساری باتوں کی خبر مل چکی ہے۔'' جگندر اطمینان سے بولا۔ ''میں یونہی منہ اٹھا کر گھر سے نہیں چل پڑا' بہت سوچ سمجھ کر نکلا ہوں۔''

''پھر بھی...... میں چاہتا ہوں' ہمارے ساتھ کندھے سے کندھا ملانے سے پہلے ایک بار سوچ لو۔'' سلطانہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''ہمارے آگے اندھیرا اور پیچھے موت ہے۔ ہمیں خود نہیں معلوم کہ ہمیں کیا کرنا ہے' کہاں جانا ہے؟''

''کرنا کیا ہے...... ہمیں بس اپنا کوئی محفوظ ساٹھکانہ بنانا ہے اور اس کے بعد ڈاکے ڈالنے ہیں۔'' جگندر نے اطمینان سے گویا فیصلہ سنا دیا۔ ''ہم بھنتوؤں کے نصیب میں شاید ہمارے پیدا ہونے سے پہلے ہی یہ لکھ دیا جاتا ہے۔''

باقی ساتھی پہلے ہی خاموش تھے۔ اب سلطانہ بھی خاموش ہو رہا۔ ذہنوں میں ان سب کے بھی یہی تھا' لیکن ابھی تک انہیں آپس میں اس موضوع پر صحیح طرح بات کرنے کی مہلت نہیں ملی تھی۔ جگندر نے گویا ان کے دھندلے دھندلے خیالات کو الفاظ دے دیئے تھے۔ جگندر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''مجھے تمہارے ساتھ شامل ہوتے ہوئے اب اور زیادہ سوچنے کی ضرورت نہیں' تم بےفکر رہو...... میں کبھی تمہارے سامنے افسوس ظاہر نہیں کروں گا کہ میں کیوں تمہارے ساتھ شامل ہوا۔ یہ میرا اپنا فیصلہ ہے' میرا اپنا نصیب ہے' میں اس پر پچھتاؤں گا نہیں......''

''میں تم سے یہی آشا رکھتا تھا۔'' سلطانہ دھیمے لہجے میں بولا۔ ''اس کے باوجود میں تمہیں ایک بار اور سوچنے کی صلاح اس لئے دے رہا تھا کہ ہمارے اور تمہارے حالات میں پھر بھی کافی فرق ہے۔ ہمارے سر پر تو مصیبت پڑ ہی گئی تھی۔ چاہے کسی وجہ سے بھی پڑی...... لیکن ہم سب اس میں شریک ہو گئے۔ ہم نے یہی جانا کہ مصیبت ہم سب کے سروں پر آئی ہے۔ ویسے بھی ہم قلعے کے قیدی تھے' ہمارا اپنا کوئی گھر نہیں تھا' کوئی کام نہیں تھا۔ بس ذلت کی زندگی تھی اور ہم

تھے...... لیکن تمہارا تو ایک گھر ہے' زمین ہے' آزادی کی زندگی ہے' تمہارے سر پر کوئی مصیبت نہیں پڑی۔"

"مگر مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں تم سب سے زیادہ مصیبت میں تھا۔" جگندر تیزی سے بولا۔ "اس گھر میں باپو کی وجہ سے تو زندگی خراب تھی ہی...... لیکن ویسے بھی حالات کچھ اچھے نہیں تھے۔ سرکار نے بنجر ہوتے ہوئے اس علاقے میں دو بیگھہ زمین کا وہ ٹکڑا دے دیا تھا' جس پر ہم باپ بیٹا سارا سال مشقت کر کے مر جاتے تھے' لیکن ہم دونوں کے لئے سال بھر پیٹ بھرنے کا بھی انتظام نہیں ہوتا تھا۔ فاقے بھی کاٹنے پڑتے تھے۔ کبھی پاؤں میں جوتا نہیں' کبھی تن پہ کپڑا نہیں...... میں بہت تنگ آ گیا تھا اس زندگی سے...... یوں لگتا تھا جیسے میں تم لوگوں سے زیادہ بری جیل میں ہوں' مگر اس کی دیواریں اور دروازہ نہیں ہے۔ اور باپو اس زمین پر یوں اتراتا رہتا ہے جیسے وہ اپنی بہت بڑی جاگیر پر...... اپنی محل سرا میں بیٹھا ہے۔" یہ کہہ کر وہ طنزیہ سے انداز میں ہنس دیا۔

سلطانہ نے حالات کی تلخی سے جگندر کا دھیان ہٹانے کے لئے موضوع بدلا۔ "کل جب میں تمہاری طرف آیا تو تم کہاں تھے؟"

"میں قلعے کی طرف گیا ہوا تھا۔ جب میں نے وہاں بہت ہلچل دیکھی تو پھر میں نے اندر جانے کی کوشش نہیں کی۔" جگندر نے بتایا۔ "اور یہ اچھا ہی ہوا۔ ہو سکتا ہے پولیس کی نظر مجھ پر پڑتی تو وہ مجھے بھی دھر لیتی بہرحال...... مجھے تمام حالات کا پتا چل گیا۔ ایڈجوٹنٹ آنند کے قتل اور تمہارا پیچھا کرنے والی پارٹی کے مارے جانے کے بعد قلعے میں اس وقت تک بڑی ہلچل مچی ہوئی تھی' جب میں وہاں سے واپس روانہ ہوا...... اور میرا خیال ہے اب بھی حالات ویسے ہی ہوں گے۔ انسپکٹر تیرتھ سنگھ بھی آیا ہوا تھا۔ اب وہ انسپکٹر نہیں رہا' ڈی ایس پی ہو گیا ہے۔ میرا خیال ہے ہم لوگوں کی تلاش میں سب سے زیادہ سرگرمی وہ دکھائے گا۔ اس نے اور اس کی پولیس پارٹی نے قلعے میں رہنے والے سارے بھنتوؤں سے پوچھ گچھ کی۔ اس نے آس پاس کی تمام بستیوں اور دیہات میں پیغام بھی بھجوا دیا ہے کہ کوئی بنیا' برہمن یا دوسرا دکاندار تم لوگوں کے ہاتھ کوئی چیز نہ بیچے اور کسی قسم کا لین دین نہ کرے۔ اس نے تم لوگوں کے حلئے اور دوسری جو بھی معلومات ہو سکتی تھیں' وہ ان علاقوں کے خاص خاص لوگوں اور پولیس والوں کو پہنچوا دی ہیں۔ اس کا خیال شاید یہی ہے کہ تم لوگ بجنور' مراد آباد یا کسی اور شہر کا رخ کرو گے یا کم از کم کسی گاؤں'

دیہات میں چھپنے کی کوشش کرو گے۔ جنگل کی طرف اس کا دھیان نہیں گیا ہے۔"

پھر اسے جیسے کچھ خیال آیا اور وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "پتا نہیں تیرتھ سنگھ کو اتنی جلدی اتنی ترقی کیسے مل گئی ہے۔ وہ اب گورے صاحبوں سے بھی زیادہ اکڑ کر چلتا ہے۔ انسپکٹر اس کے آگے پیچھے پھرتے ہیں اور اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں۔ اس کی ہر بات کے جواب میں "جی سر...... جی سر!" کہتے رہتے ہیں۔ وہ پہلے بھی بڑا "صاحب" قسم کا آدمی تھا' لیکن اب تو اس کے ٹھاٹ دیکھنے والے ہیں۔"

"اچھا......؟" سلطانہ نے قدرے حیرت سے کہا۔ پھر دھیرے سے ہنس کر بولا۔ "چلو...... خیر یہ بھی اچھا ہے کہ پولیس ہمیں شہروں اور گاؤں' دیہات میں ڈھونڈتی رہے گی اور ہم اُدھر کا رخ ہی نہیں کریں گے۔ کم سے کم' پناہ لینے کے لئے تو ادھر نہیں جائیں گے۔ ہم اپنی الگ ہی بستی آباد کریں گے اور اس کا نام ہو گا سلطان پور......"

"بالکل ٹھیک......" بھورے نے فوراً رائفل ہوا میں بلند کر کے اس کے خیال کی تائید کی۔

اس کی بات سن کر اس کے سب ساتھیوں کے چہروں پر رونق سی آ گئی۔ انہیں اس کے الفاظ سے گویا ایک نئی زندگی کی نوید ملی تھی۔ انہوں نے بھی رائفلیں ہوا میں بلند کر کے نہ صرف اس کے خیال کو سراہا' بلکہ ہم آواز ہو کر نعرہ بھی لگایا۔ "سلطانہ کی جے......"

یوں گویا اس وقت نہ صرف ایک گروہ خود بخود تشکیل پا گیا' بلکہ سلطانہ کے ساتھیوں نے غیر رسمی انداز میں اسے اپنا سردار بھی تسلیم کر لیا۔ ویسے بھی وہ دو دن سے آنکھیں بند کر کے اسی کے حکم کی تعمیل کر رہے تھے اور اسی کے حکم پر سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر قلعے سے بھاگ لئے تھے۔ سلطانہ نے بھی اچانک سر پر پڑنے والی افتاد میں جس طرح ساری صورت حال کو سنبھالا تھا اور جس طرح انہیں اپنے ساتھ لے کر چلا تھا' اس سے پوری طرح ثابت ہو گیا تھا کہ اس میں سرداری کا منصب سنبھالنے کی صلاحیتیں موجود تھیں۔ سلطانہ کے سامنے بھورے سب سے زیادہ سعادت مند نظر آ رہا تھا' کیونکہ سارے ہنگامے کی ابتداء تو دراصل اس کی وجہ سے ہوئی تھی' لیکن سلطانہ نے اسے تنہا نہیں چھوڑا تھا اور نہ ہی یہ کہا تھا کہ اس کی مصیبت دوسرے کیوں بھگتیں۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد جگندر نے سلطانہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "ویسے قلعے کے لوگ دل ہی دل میں اس سارے واقعے پر بہت خوش ہیں۔ آنند کے مرنے کا کسی کو دکھ نہیں...... حالانکہ میرے خیال میں وہ کوئی برا آدمی نہیں تھا' لیکن لوگ کہہ رہے تھے اچھا ہوا

انگریز کا پٹھو مر گیا اور تمہارے بارے میں دبی دبی زبان میں ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے۔ یہ سب سلطان کا کام لگتا ہے' یہ لڑکا اپنے دادا گلفی سے بھی دس قدم آگے نکلے گا' جیل اور قلعے کی دیواروں نے اسے جتنا عرصہ قید رکھنا تھا رکھ لیا' اب کوئی جیل یا قلعہ اسے قید نہیں رکھ سکتا۔ وہ آزاد ہو گیا ہے تو بس' اب آزاد ہی رہے گا۔ اگر کبھی کسی جیل یا قلعے کی دیواروں کے بیچ میں پھنس بھی گیا تو انہیں توڑ کر نکل جائے گا۔"

سلطانہ کو یہ سب کچھ سننا بھلا لگ رہا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "واقعی...... اب تو قید رہنے سے میری نظر میں یہ لاکھ درجے اچھا ہو گا کہ مجھے موت آ جائے۔"

"اور اس سے بھی لاکھ درجے اچھا یہ ہو گا کہ تم سے پہلے ہمیں موت آ جائے۔" بھورے بولا۔ اس کے لہجے میں بلا کا خلوص تھا۔ سلطانہ نے اسے سینے سے لگا کر بھینچ لیا اور اس کی پیٹھ تھپتھپائی۔ وہ سب اس وقت جنگل کے اس ذرا کھلے حصے میں اِدھر اُدھر ٹہل رہے تھے۔ سلطانہ کے تین ساتھی اس کے دائیں طرف تھے اور تین ساتھی بائیں طرف...... وہ سر اٹھائے ان کے درمیان چلتے ہوئے سچ مچ ان کا سردار لگ رہا تھا۔

کچھ دور ایک گھوڑا درخت سے بندھا ہوا تھا۔ گجندر نے ان لوگوں کی تلاش میں آتے وقت راستے میں یہ گھوڑا کسی سے چھینا تھا۔ صرف یہی نہیں' اس نے ایک عقلمندی کا کام یہ بھی کیا تھا کہ کسی نہ کسی طرح ان لوگوں کے لئے کھانے پینے کے کافی سامان کا بندوبست کر کے لایا تھا' جو گھوڑے پر لدا ہوا تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ اس وقت ان کی سب سے بڑی ضرورت کیا ہو گی۔ سلطانہ اس کی دور اندیشی کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ کچھ چیزیں ان کے پاس پہلے ہی موجود تھیں۔ اب کئی دن کے لئے راشن کی طرف سے بے فکری ہو گئی تھی۔

چند لمحے بعد سلطانہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ "ہم اب بھی نجیب آباد سے زیادہ دور نہیں ہیں۔ ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہئے۔"

گجندر بولا۔ "اگر جنگل میں ہی چھپنا ہے تو ہم پچھم کی طرف چلتے ہیں۔ گارپو کے پاس جو جنگل ہیں' وہ چھپنے اور ٹھکانہ بنانے کیلئے بہت اچھے ہیں۔"

گارپو ایک قصبہ تھا' جس سے تین چار میل آگے جنگلات کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ وہ سمت بھی ایسی تھی کہ پولیس وغیرہ کو شاید ہی خیال آتا کہ بھنتولڑ کے اِدھر کا رخ کر سکتے ہیں۔ زیادہ تر

بھنتو وارداتیں کرنے کے بعد انہی علاقوں کے آس پاس رہتے تھے' جہاں ان کے اپنے قبیلے کے لوگوں کی بستیاں' آبادیاں اور گاؤں وغیرہ ہوتے تھے۔ گارپو ایسے علاقوں سے بالکل ہٹ کر تھا۔ سلطانہ فوراً گجندر کی بات کی تائید کرتے ہوئے بولا۔ "بالکل ٹھیک ہے' بہت اچھا یاد دلایا تم نے۔"

گارپو کے جنگلات وہاں سے تقریباً تیس میل دور تھے۔ انہوں نے ایک جگہ بیٹھ کر کچھ کھایا پیا' پھر اپنے نئے سفر پر روانہ ہو گئے۔ چاروں طرف چوکنا اور ہوشیار رہتے ہوئے وہ زیادہ تر ویرانوں اور ایسی پگڈنڈیوں پر سفر کرنے کی کوشش کر رہے تھے' جن پر شاذ و نادر ہی کوئی سفر کرتا تھا۔ ان کی خوش قسمتی تھی کہ راستے میں ان کا کسی سے سامنا یا مڈبھیڑ نہیں ہوئی۔ بعض جگہوں پر دور سے بیل گاڑی یا یکے میں گزرتے ہوئے کچھ دیہاتیوں کی ان پر نظر پڑی' لیکن انہوں نے بھی زیادہ توجہ سے ان کی طرف نہیں دیکھا۔

وہ جب جنگل میں داخل ہوئے تو سورج غروب ہونے کو تھا۔ کچھ دیر بعد وہ نالے کے قریب پہنچے جس کے کناروں پر گھنی جھاڑیاں تھیں۔ گزرتی سردیوں میں نالا تقریباً خشک ہو گیا تھا' لیکن اس کے وسط میں پانی کی ایک موٹی سی دھار بل کھاتی' بہتی آ رہی تھی۔ اپنے اس پورے سفر کے دوران انہوں نے پہلی بار بہتا پانی دیکھا تھا' جو صاف بھی تھا۔ کچھ نشانیوں سے انہیں اندازہ ہوا کہ وہاں سانبھر اور ہرن بھی پانی پینے آتے تھے۔ انہیں امید نظر آئی کہ وہ ایک آدھ سانبھر یا ہرن کو شکار بھی کر سکتے تھے۔ اب ان کے پاس جانور کی کھال اتارنے' اس کے ٹکڑے کرنے اور گوشت بھوننے کا بھی انتظام تھا۔

انہوں نے اس نالے کے آس پاس ہی ٹھکانا بنانے کے لئے جگہ ڈھونڈنا شروع کی۔ جلد ہی انہیں ایک بہت مناسب جگہ مل گئی اور وہ گھوڑوں کو چرنے کے لئے چھوڑ کر وہاں بیٹھ گئے۔ گجندر تو وہاں آگ جلانے کا بندوبست بھی کرنے لگا تھا' لیکن سلطانہ نے منع کر دیا۔ آگ کی روشنی بہت دور سے نظر آ سکتی ہے اور کسی کی توجہ ان کی طرف مبذول کرا سکتی تھی۔ انہوں نے آگ جلائے بغیر ہی کچھ چیزوں سے پیٹ بھرا اور نالے سے پانی پی لیا' جو ٹھنڈا اور بہت اچھا تھا۔ اندھیرا گہرا ہونے لگا تھا۔ سلطانہ اپنے ساتھیوں کے چہرے صاف طور پر تو نہیں دیکھ سکتا تھا' پھر بھی اسے محسوس ہو رہا تھا کہ ان کے چہروں سے تھکن عیاں تھی۔

"کہیں تم میں سے کوئی یہ تو نہیں سوچ رہا کہ وہ بیٹھے بٹھائے کس خواری میں پھنس گیا۔"

سلطانہ نے اچانک ہی پوچھ لیا۔

''کیسی بات کر رہے ہو سلطانہ......؟'' بھورے فوراً بول اٹھا۔ ''اب تو جو بھی نصیب میں لکھا ہے' ہم اس پر خوش ہیں۔''

''اور ہم سب کا نصیب ایک ہی ڈوری سے بندھا ہے۔'' گجندر بولا۔

''اب جینا مرنا' ہنسنا رونا......سب ایک ساتھ ہے۔'' صادق نے مضبوط لہجے میں کہا۔

''تم لوگ ساتھ ہو تو میں جیسے پہلے سے سو گنا زیادہ طاقتور ہو گیا ہوں۔'' سلطانہ نے اپنے دل میں ان کے لئے بھائیوں سے زیادہ اپنائیت محسوس کرتے ہوئے کہا۔ ''تم لوگ یہ اطمینان رکھنا کہ تم پر کوئی آنچ آنے سے پہلے سلطانہ اپنی جان دے گا۔''

''ہمیں تم پر پورا بھروسہ ہے۔'' بھورے گویا سب ساتھیوں کی ترجمانی کرتے ہوئے بولا۔ ''اور تم بھی ہم سے ایسی ہی امیدیں رکھنا۔''

سلطانہ کے دل کو اطمینان ہو گیا۔ وہ لوگ اس وقت درختوں کے بیچ میں ایک صاف سی جگہ دیکھ کر سونے کی تیاری کر رہے تھے' جب گجندر کو تقریباً دو فرلانگ کے فاصلے پر کچھ ایسی روشنی نظر آئی' جیسے کچھ لوگ جنگل میں پڑاؤ ڈال کر آگ جلائے بیٹھے ہوں۔ اس نے اپنے دوسرے ساتھیوں کو بھی اس طرف متوجہ کیا۔

''لو بھئی......ہم تو سمجھ رہے تھے ان جنگلوں میں انسانوں کا گزر نہیں ہوتا ہو گا......لیکن شاید انسانوں کے قدموں سے کوئی جگہ بچی ہوئی نہیں ہے۔'' بھورے بولا۔

''چل کر دیکھنا تو چاہئے' کیا معاملہ ہے؟ کون لوگ ہیں؟'' صادق نے تجویز پیش کی۔

''ہاں...... واقعی...... دیکھ لینا چاہئے۔'' سرجو نے اس کی تائید کی۔ ''کہیں یہ ٹھکانہ ہمارے لئے خطرناک ثابت نہ ہو۔''

وہ لوگ دبے قدموں اس طرف روانہ ہوئے۔ رائفلیں ان کے ہاتھوں میں تھیں اور وہ کسی بھی قسم کی صورتحال کا سامنا کرنے کے لئے تیار تھے۔ درختوں کی آڑ لیتے ہوئے وہ جب اس مقام تک پہنچے تو انہوں نے دیکھا' وہاں بھی دس بارہ آدمی انہی کی طرح صاف سی جگہ تلاش کر کے آگ جلائے بیٹھے تھے۔ ان کے چہروں اور کپڑوں پر کوئلوں کی کالک نظر آ رہی تھی۔ شاید وہ کوئلوں کی کسی کان میں کام کرنے والے یا پھر ریلوے کے لئے کوئلہ سپلائی کرنے والے مزدور تھے۔

جس چیز پر سلطانہ اور اس کے ساتھیوں کی نظر جم کر رہ گئی' وہ بہت سی روٹیاں تھیں' جو ان لوگوں کے سامنے رکھی ہوئی تھیں۔ وہ کپڑا بچھائے' اپنے سامنے کھانا سجائے بیٹھے تھے۔ درحقیقت وہ کھانا کھا چکے تھے۔ اس کے باوجود بہت سا کھانا ان کے سامنے بچا ہوا رکھا تھا۔ روٹیوں کے علاوہ دو تین برتنوں میں سالن اور اچار وغیرہ بھی تھا۔ روٹیاں کسی حد تک تازہ ہی معلوم ہو رہی تھیں۔ ان لوگوں میں سے کوئی بیڑی پی رہا تھا اور کوئی اپنے کسی ساتھی سے گپ شپ کر رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کہیں سفر پر جاتے وقت انہوں نے راستے میں پڑاؤ ڈالا ہے اور شاید یہ ان کا پہلا پڑاؤ تھا۔ ان کے پاس چند کلہاڑیاں بھی تھیں' جو انہوں نے ایک طرف رکھی ہوئی تھیں۔

گو کہ سلطانہ اور اس کے ساتھی کھانے کی کچھ چیزوں سے پیٹ بھر چکے تھے۔ اس کے باوجود ''باقاعدہ'' کھانے کا اہتمام دیکھ کر ان کے منہ میں پانی آ گیا۔ سلطانہ کو ان کی کلہاڑیاں دیکھ کر یہ خیال بھی آیا کہ جنگل میں کلہاڑی بھی بڑے کام کی چیز تھی۔ تاہم اس کی یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ کوئلے کا کام کرنے والے مزدوروں کے پاس کلہاڑیوں کا کیا کام تھا؟ شاید وہ انہوں نے اپنی حفاظت کے لئے ہتھیار کے طور پر رکھی ہوئی تھیں' لیکن بے وقوفی یہ کی تھی کہ انہیں بے پروائی سے ایک طرف پھینکا ہوا تھا۔

سرجو' سلطانہ کے قریب ہی تھا۔ اس نے سرگوشی کی۔ ''ان لوگوں کو رائفلیں دکھا کر ان سے کھانا چھین لیں؟ یہ تو سفر میں ہیں' انہیں آگے بھی شاید بہت کچھ مل جائے گا۔''

سلطانہ نے ایک لمحے کے لئے سوچا۔ یہ بات ٹھیک تھی کہ کھانا ان کے کام آ سکتا تھا۔ ان کے پاس اب کافی مقدار میں راشن موجود تھا' لیکن صحیح طریقے سے پکے ہوئے سالن' روٹی کی تو بات ہی اور تھی' لیکن سلطانہ اس لئے ہچکچاہٹ کا شکار تھا کہ مزدور قسم کے لوگوں کو رائفلیں دکھا کر کھانا چھیننا اسے کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ حالانکہ کھانا ان لوگوں کی ضرورت سے زیادہ ہی معلوم ہو رہا تھا۔ سلطانہ کی ہچکچاہٹ کی دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ نہیں چاہتا تھا' وہ لوگ جب اپنی منزل پر پہنچیں تو لوگوں کو افسانے سنائیں کہ انہیں کس جنگل میں کس طرح کے ڈاکو ملے تھے اور وہ لوگ کس طرح ان سے جان بچا کر نکلنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ابھی سے ان جنگلوں میں کہیں ڈاکوؤں کی موجودگی کے قصے لوگوں کی زبانوں پر آ جائیں۔ اس نے اپنے دل کی یہ بات سرگوشی میں سرجو کو بتا دی۔

وہ فوراً بولا۔ ''یہ تو کوئی مسئلہ نہیں...... میرے پاس دوسری ترکیب بھی ہے۔ تمہارے دادا

نے کچھ کرتب تو ہم سب ہی لڑکوں کو سکھائے تھے' آخر وہ کب کام آئیں گے؟"

یہ کہہ کر اس نے ذرا توقف کیا۔ دوسرے ہی لمحے جنگل کی فضا ایک چیتے کی خوفناک دھاڑ سے مرتعش ہوگئی۔ اس کے ساتھ ہی ایک ایسی گھٹی گھٹی سی آواز ابھری جیسے چیتے نے کسی ہرن پر چھلانگ لگا کر اسے گردن سے دبوچ لیا ہو۔ پھر ان آوازوں میں کچھ اور آوازوں کا زیروبم بھی شامل ہوگیا۔ ان سب آوازوں سے پتا چل رہا تھا کہ یہ واقعہ ان لوگوں کے عین قریب رونما ہو رہا تھا' جو اطمینان سے بیٹھے گپ شپ کر رہے تھے' ستا رہے تھے۔

دلچسپ بات یہ تھی کہ وہ سبھی آوازیں اکیلا سرجو نکال رہا تھا۔ صرف سرجو ہی نہیں' وہ سارے کے سارے اس طرح کی اور بیسیوں دوسری طرح کی آوازیں نکالنے میں ماہر تھے۔ یہ ہنر ان سب کو سلطانہ کے آنجہانی دادا گلفی نے سکھایا تھا اور وقت کے ساتھ ساتھ مشق کر کے انہوں نے اس میں مزید مہارت حاصل کی تھی۔

مزدور قسم کے وہ لوگ چیتے کی دھاڑ سنتے ہی ہڑبڑا کر اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ دوسرے ہی لمحے جس کا جدھر منہ اٹھا' وہ بدحواسی کے عالم میں اسی طرف دوڑ پڑا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ سب غائب ہوگئے۔ ان کے اس طرح خوفزدہ اور بدحواس ہونے پر سلطانہ اور اس کے ساتھیوں کو حیرت بھی ہوئی۔ وہ تعداد میں اچھے خاصے تھے اور ان کے پاس کلہاڑیاں بھی تھیں۔ اس کے باوجود وہ محض ایک چیتے کی آواز سن کر جس طرح دوڑے تھے' اس پر سلطانہ اور اس کے ساتھیوں کے لئے اپنی ہنسی ضبط کرنا مشکل ہوگیا تھا۔ وہ لوگ اپنی کلہاڑیاں بھی وہیں چھوڑ گئے تھے۔

جب سلطانہ اور اس کے ساتھیوں کو یقین ہوگیا کہ وہ لوگ دور پہنچ چکے ہوں گے' تب وہ درختوں کی اوٹ سے نکلے۔ وہ ہنسی جو انہوں نے کچھ دیر سے روکی ہوئی تھی' اسے مزید روکنا ان کے بس میں نہ رہا۔ وہ آگ کے قریب کھلی جگہ میں آئے اور وہاں بچھے ہوئے کپڑے پر ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہونے لگے۔

جب ہنسی ذرا تھمی تو صادق بولا۔ "وہ لوگ شاید گاربو پہنچ کر کسی چوکیدار کو قصہ سنائیں گے کہ وہ کس طرح ایک آدم خور چیتے سے جان بچا کر بھاگے ہیں۔"

نکیشر ہنس کر بولا۔ "اور چوکیدار حیران ہوگا کہ اس نے تو ان جنگلوں میں کسی آدم خور چیتے کی موجودگی کے بارے میں کبھی کوئی بات نہیں سنی۔"

سرجو بولا۔ "پھر وہ سوچے گا کہ شاید بھابڑ کے جنگلوں کی طرف سے کوئی آدم خور چیتا

بھٹک کر ادھر آ نکلا ہو۔ اس کے بعد شاید قصبے کے لوگ ٹین ڈبے اٹھا کر انہیں زور زور سے بجاتے ہوئے جنگل میں آ جائیں' وہ اپنے خیال میں 'ہانکا' کر کے چیتے کو زیادہ سے زیادہ بھگانے کی کوشش کر رہے ہوں گے اور چیتا یہاں ہوگا نہیں...... بے چارے دوسرے جانور پریشان ہو جائیں گے۔ چرند پرند اِدھر اُدھر بھاگتے پھریں گے۔"

اس تصور سے انہیں ایک بار پھر ہنسی آنے لگی۔ سرجو نے جس وقت چیتے کی آواز نکالی تھی۔ اس وقت بھی بہت سے پرندے درختوں کی شاخوں سے اِدھر اُدھر اڑے تھے اور آس پاس اندھیرے میں کچھ ہلچل محسوس ہوئی تھی' جیسے کچھ جانور اِدھر اُدھر بھاگے ہوں۔ جب سلطانہ اور اس کے ساتھی کچھ پرسکون ہوئے تو انہوں نے کھانے کی طرف توجہ دی۔

انہوں نے خوب ڈٹ کر کھانا کھایا' گو کہ کھانے کی چیزیں کچھ ایسی تازہ بھی نہیں تھیں' لیکن انہیں یوں لگ رہا تھا جیسے روٹیاں ابھی ابھی تندور سے اور سالن چولہے پر رکھی دیگچیوں سے نکالے گئے ہوں۔ خوب سیر ہو کر کھانا کھانے کے بعد انہوں نے ایک بار پھر نالے میں بہتی ہوئی موٹی سی دھار کا ٹھنڈا میٹھا پانی پیا تو ان پر خمار سا طاری ہونے لگا۔ یہ پیٹ بھرنے کا نشہ تھا۔ رات چونکہ کافی بیت چکی تھی اور ٹھنڈ بڑھ گئی تھی۔ اس لئے اس آگ کی تپش بھی خوب مزا دے رہی تھی' جو مزدور جلتی چھوڑ گئے تھے۔

مزدوروں کی چھوڑی ہوئی کلہاڑیاں بھی اب ان کے پاس تھیں اور وہ سوچ رہے تھے کہ اپنا باقی سامان بھی وہاں لے آئیں اور وہیں ڈیرہ ڈال دیں۔ رہنے کے لئے وہ جگہ بری نہیں تھی۔ ابھی وہ اس بارے میں بات چیت کر ہی رہے تھے کہ اچانک ایک گورا درختوں کے پیچھے سے نکل کر ان کے سامنے آ گیا۔ گورے کا رعب ویسے ہی بچپن سے ان کے ذہنوں میں بیٹھا ہوا تھا اور پھر وہ واقعی ایک بھوت کی طرح اچانک اندھیرے سے نکل کر ان کے سامنے آ گیا تھا کہ وہ ہکا بکا رہ گئے۔ وہ فوری طور پر کوئی بھی ردعمل ظاہر نہ کر سکے' حتیٰ کہ کسی نے اپنی رائفل کا رخ بھی اس کی طرف نہیں کیا۔

وہ یقیناً کوئی غیر معمولی آدمی تھا۔ اس کے آنے کی ذرا سی بھی آہٹ نہیں ہوئی تھی۔ سلطانہ کے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ شاید وہ گورا اپنے ساتھ پولیس یا فوجی پارٹی لیکر انہیں گرفتار کرنے آیا تھا۔ آخر کار انہیں تلاش کر لیا گیا تھا اور اب شاید ان کی زندگیوں کا انجام قریب ہی تھا۔ اسے اس بات پر بھی پچھتاوا ہو رہا تھا کہ وہ آگ دیکھ کر اس کے قریب آ گئے تھے اور

انہوں نے اس آگ کو جلتا بھی رہنے دیا تھا۔ جس طرح وہ آگ دیکھ کر اس طرف آ گئے تھے' اسی طرح شاید گورا صاحب اور اس کے ساتھی بھی اس طرف متوجہ ہو گئے ہوں گے۔ اس سے پہلے انہوں نے جہاں پڑاؤ ڈالا تھا' وہاں آگ نہ جلا کر عقلمندی کی تھی۔

یہ سب خیالات سلطانہ کے ذہن میں آنے کے باوجود شاید چند باتیں ایسی تھیں جنہوں نے لاشعوری طور پر انہیں کوئی فوری ردعمل ظاہر کرنے سے روکا تھا۔ ایک تو گورے صاحب کے ہونٹوں پر بڑی دوستانہ سی مسکراہٹ تھی۔ وہ کافی ملنسار آدمی معلوم ہوتا تھا۔ دوسرے وہ حلیے سے شکاری معلوم ہوتا تھا۔ اس کے جسم پر خاکی رنگ کی موٹی سی قمیص تھی' جس میں بڑی بڑی جیبیں تھیں۔ پتلون بھی اسی رنگ کی تھی جو اوپر سے ڈھیلی اور نیچے سے چوڑی دار پاجامے کی طرح تنگ تھی اور گھٹنوں سے ذرا نیچے تک وہ اس کے لمبے بوٹوں میں ٹھنسی ہوئی تھی۔

اس کے کندھے پر ایک رائفل ضرور موجود تھی' لیکن وہ کچھ اس طرح لٹکی ہوئی تھی' جیسے گورا صاحب اس کی موجودگی سے ہی بے خبر ہو۔ اگر وہ پولیس یا فوج کا کوئی افسر ہوتا اور اس کے ساتھیوں نے سلطانہ کے گروہ کے گرد گھیرا ڈالا ہوتا تو اس کے چہرے پر اتنا اطمینان اور بے پروائی نہیں ہو سکتی تھی' بلکہ اگر اس کے ساتھ اس وقت اندھیرے میں اردگرد کے درختوں کی اوٹ میں موجود ہوتے تو شاید وہ خود بھی یوں ان کے سامنے نہ آتا' بلکہ وہیں سے انہیں للکارتا اور ہتھیار ڈالنے کا حکم دیتا۔

ان کا فوری طور پر کوئی ردعمل ظاہر نہ کرنا' ان کے حق میں بہتر ہی رہا' کیونکہ گورے صاحب نے انہیں کوئی حکم دینے کے بجائے نہایت بے تکلفی سے' اچھی خاصی صاف اردو میں پوچھا۔ ''کیا حال چال ہے دوستو......؟ کیا آپ لوگ بھی جنگل میں شکار کے لئے آئے ہوئے ہیں؟''

اس کے سوال کے انداز سے ظاہر ہو گیا کہ وہ شکاری تھا۔ انگریز شکاری سر پر ہیٹ بھی ضرور رکھتے تھے' لیکن اس کے سر پر ہیٹ یا کسی بھی قسم کی ٹوپی نہیں تھی۔ اس کے سنہرے بال منتشر تھے اور ان میں دو تین تنکے بھی اٹکے ہوئے تھے۔ اس کے انداز سے کچھ ایسا لگ رہا تھا' جیسے اسے اپنے حلیے کی بلکہ شاید دنیا کی کسی بھی چیز کی کوئی پروا نہیں تھی۔ اب سلطانہ کو یقین ہو گیا کہ وہ پولیس یا فوج کا کوئی ایسا افسر ہرگز نہیں ہو سکتا تھا' جو مفرور مجرموں کو پکڑنے نکلا تھا اور جس کی پارٹی مجرموں کے گرد گھیرا ڈال چکی تھی۔

سلطانہ سنبھل کر...... لیکن ذرا اٹک اٹک کر بولا۔ ''ہاں...... ہم لوگ بھی...... شکار ہی کے لئے...... نکلے ہوئے ہیں۔''

''کس جانور کا شکار کرتے ہیں آپ؟'' گورے نے دلچسپی سے پوچھا۔

''سانبھر...... ہرن...... پہاڑی بکرا...... جو بھی مل جائے۔ اصل میں ہم تو ماس...... یعنی گوشت کے لئے شکار کرتے ہیں۔'' سلطانہ نے جواب دیا۔

''اچھا...... اچھا......'' اس نے مطمئن انداز میں سر ہلایا۔

وہ ان لوگوں کے بارے میں کچھ زیادہ تجسس میں مبتلا نظر نہیں آ رہا تھا اور سلطانہ سے ذرا سی بات کر کے تو گویا یکدم مطمئن ہو گیا تھا' لیکن سلطانہ نے مزید صفائی پیش کرنے کے سے انداز میں کہا۔ ''ہم دراصل نواب آف رامپور کے آدمی ہیں' ان کی جاگیر پر رہتے ہیں۔ انہیں بریلی' نجیب آباد اور گارپو میں کچھ کام تھے۔ ہم ان کے وہ کام نپٹانے کے لئے سفر پر نکلے ہوئے ہیں۔''

پھر اس نے اپنے پاس کلہاڑیوں کی موجودگی کا جواز بھی گھڑنے کی کوشش کی۔ ''ہماری بیل گاڑیاں گارپو میں کھڑی ہیں۔ ان کے پہیے ٹوٹ گئے تھے۔ ہم نے سوچا جنگل سے پہیوں کے لئے شیشم کی لکڑی بھی کاٹ لیں گے اور کچھ شکار بھی کر لیں گے۔ یہ دونوں کام ہم اب صبح ہی کریں گے۔''

گورے کو گویا اس کی وضاحتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ ہمدردانہ لہجے میں بولا۔ ''ان جنگلوں میں شیشم کے درخت نہیں ہوتے۔ شیشم کی لکڑی کے لئے تمہیں نینی تال کی طرف جانا پڑے گا۔'' اس نے بلندی کی طرف اشارہ کیا۔

''اگر ضرورت پڑی تو ادھر چلے جائیں گے۔ ہمارے پاس بہت سمے ہے۔ ہم تو لمبے سفر پر نکلے ہوئے ہیں۔'' سلطانہ مسکراتے ہوئے بولا۔ اب اس کی خود اعتمادی لوٹ آئی تھی۔

گورے نے بے دھیانی سے سر ہلایا اور آگے آ کر الاؤ کے قریب اکڑوں بیٹھ گیا۔ اس نے اپنی جیب سے ایک لمبا سا سگار نکالا اور اسے آگ سے لگانے کے بعد گہرے گہرے کش لینے لگا۔ سلطانہ اور اس کے ساتھی سگار کو انگریزی بیڑی کہتے تھے۔ اسے دیکھ کر انہیں بھی خیال آ گیا کہ گجندر ان کے اور اپنے لئے بھی بیڑیاں لایا تھا۔ انہوں نے بھی بیڑیاں سلگا لیں اور ہلکے ہلکے کش لینے لگے۔

گورا ساری دنیا سے بے نیاز اور اپنی جگہ بالکل مطمئن و مسرور نظر آ رہا تھا۔ کچھ دیر وہ سب خاموش رہے تو شاید بھورے کو عجیب لگا۔ اس نے اپنی دانست میں گورے سے ہمدردی ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ ”صاحب! مانا کہ آپ کے پاس رائفل ہے پھر بھی آپ کو رات میں اس طرح اکیلے جنگل میں نہیں پھرنا چاہئے' ہم تو جب بھی آتے ہیں' ٹولی کی شکل میں آتے ہیں۔ اسی لئے رات کو جنگل میں ڈیرا بھی ڈال لیتے ہیں۔ آپ اکیلے پھر رہے ہیں...... آپ کی بیوی اور بچوں کو آپ کی فکر ہو رہی ہوگی۔“

گورا شاید اس کی بات سے محظوظ ہوتے ہوئے مشفقانہ سے انداز میں مسکرایا اور بولا۔ ”میری زندگی جنگلوں میں ہی گزری ہے اور اکیلے ہی گزری ہے۔ میری نہ کوئی بیوی ہے اور نہ بچے...... جو میرے لئے فکر مند ہوں۔ میں اپنی بہن کے پاس کالا ڈونگی میں رہتا ہوں۔“

کالا ڈونگی' گارپو سے چند میل کے فاصلے پر تھا۔ گورے کی بات سن کر سلطانہ کا دل تیزی سے دھڑک اٹھا۔ اسے کافی حد تک اندازہ ہوگیا کہ وہ گورا صاحب کون تھا۔ پھر بھی اس نے اپنے اندازے کی تصدیق کیلئے پوچھ لیا۔ ”صاحب جی! آپ کا نام کیا ہے؟“

”جم کاربٹ......“ گورے نے سادگی سے جواب دیا۔ ”شاید تم لوگوں نے میرا نام کہیں سنا ہو' میں بھی چھوٹا موٹا شکاری ہوں۔“

سلطانہ کے ساتھیوں کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ان کے ذہن میں ابھی تک نہیں آیا تھا کہ ان کے سامنے بیٹھا ہوا گورا ”کارپٹ صاحب“ ہو سکتا ہے۔ ان سب نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔ ان کی آنکھوں میں اس کیلئے گہری عقیدت امڈ آئی۔ بھورے بولا۔ ”ارے صاحب...... آپ خود کو چھوٹا موٹا شکاری کہہ رہے ہیں۔ آپ تو مہان شکاری ہیں...... مہان...... سارا ہندوستان آپ کو جانتا اور مانتا ہے۔ کتنے گاؤں' دیہات اور بستیوں کو آپ نے آدم خور شیروں اور چیتوں سے چھٹکارا دلایا ہے۔“

جم نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بے پروائی سے ہاتھ ہلایا۔ گویا اس کی نظر میں یہ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ پھر وہ سگار کا ایک کش لے کر دھیمے لہجے میں بولا۔ ”ہر انسان کی زندگی گزارنے کا کوئی نہ کوئی طریقہ ہوتا ہے۔ میرا طریقہ بس اب کچھ ایسا ہی بن گیا ہے۔ میرے لئے یہی زندگی ہے۔“

سلطانہ کو ”کارپٹ صاحب“ کا تازہ ترین واقعہ یاد تھا۔ انہوں نے کچھ ہی دنوں پہلے ایک

ایسی آدم خور شیرنی کو مارا تھا جو چمپاوتی کے علاقے میں سیکڑوں انسانوں کو کھا چکی تھی اور سیکڑوں کو چیر پھاڑ کر پھینک چکی تھی۔ اسے پکڑنے' مارنے یا کہیں دور بھگانے کے لئے سارے جتن کئے گئے تھے' کتنی ہی مرتبہ ”ہانکا“ کیا گیا تھا۔ کئی شکاری اسے مارنے کے لئے کئی کئی راتوں تک جنگلوں میں مچان پر گھات لگا کر بیٹھے رہے۔ ان میں سے کوئی مشکل سے ہی اس کی ایک آدھ جھلک دیکھنے میں کامیاب ہو سکا۔ اسے مارنا تو دور کی بات' کوئی اسے زخمی کرنے میں بھی کامیاب نہیں ہوا۔

شکاریوں سے مایوس ہو کر پجاریوں نے اس شیرنی کو ہلاک کرنے کے لئے بڑے منتر پڑھے اور درختوں کے نیچے بیٹھ کر جاپ کئے۔ مسلمانوں نے وظیفے پڑھے' مگر اس شیرنی کی موت کارپٹ صاحب کے ہاتھوں لکھی تھی۔ آخر میں تو سرکار نے اس شیرنی کو ہلاک کرنے پر دو ہزار روپے کا انعام بھی رکھ دیا تھا۔ کارپٹ صاحب نے وہ انعام نہیں لیا تھا۔ انہوں نے وہ رقم کچھ ایسے گھرانوں میں تقسیم کرنے کیلئے کہہ دیا تھا' جن کے آدمی شیرنی کا نوالا بن گئے تھے۔

سلطانہ کو اس عجیب اتفاق پر حیرت ہو رہی تھی کہ اس نے آج صبح ہی مذاق میں جگندر کو ”کارپٹ صاحب“ کا خطاب دیا تھا اور آج رات وہ جنگل میں اصل کارپٹ صاحب کو زندہ سلامت اپنے سامنے بیٹھا دیکھ رہا تھا۔ اسے کارپٹ صاحب کو دیکھ کر خوشی تو بہت ہو رہی تھی' لیکن ساتھ ہی بہت سے اندیشوں سے دل بھی دھڑک رہا تھا۔ کارپٹ صاحب ہی ایک ایسا آدمی تھا جو سرکار کو سلطانہ اور اس کے ساتھیوں کا سراغ لگا کر دے سکتا تھا۔



سلطانہ کو معلوم تھا کہ ''کارپٹ صاحب'' ایک ایسا آدمی تھا جو سانپ کے گزر جانے کے بعد مٹی پر موجود اس کے نشانات دیکھ کر بتا دیتا تھا کہ سانپ کون سی نسل کا تھا' کتنا لمبا تھا اور کتنی دیر پہلے وہاں سے گزرا تھا۔ ایسے آدمی کے لئے سلطانہ اور اس کے ساتھیوں کا سراغ کسی کو دینا کوئی مسئلہ نہیں تھا' خواہ وہ کسی بھی سمت میں اور کتنی ہی دور نکل جاتے۔ سلطانہ کو اب افسوس ہو رہا تھا کہ اس نے صبح کارپٹ صاحب کا نام منہ سے نکالا ہی کیوں تھا۔ اس کے تو وہم گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ شخص اسی روز ایک خطرہ بن کر اس کے سر پر مسلط ہو جائے گا۔

کچھ دیر تشویش میں مبتلا رہنے کے بعد ایک خیال اس کے دل میں یہ بھی آیا کہ کارپٹ صاحب کو ہلاک کر دینا چاہئے تاکہ اس خطرے سے نجات مل جائے۔ کارپٹ صاحب کو مارنا کوئی مشکل کام نہیں تھا' کیونکہ وہ تنہا تھا اور نہایت بے پروائی سے ڈھیلے ڈھالے انداز میں ان کے درمیان بیٹھا تھا' جبکہ سلطانہ اور اس کے ساتھی ان درندوں کی طرح چوکس اور چوکنا تھے' جنہیں اپنے اردگرد کی ہر چیز سے خطرہ محسوس ہوتا ہے۔ کارپٹ صاحب کو شاید یاد بھی نہیں تھا کہ اس کے کندھے پر ایک رائفل بھی جھول رہی تھی۔

سلطانہ نے کارپٹ صاحب کو ہلاک کرنے کے بارے میں ایک لمحے کے لئے سوچا ضرور' لیکن دوسرے ہی لمحے نہ جانے کیوں اسے اپنے اس خیال پر شرم سی محسوس ہوئی۔ اسے یوں لگا جیسے وہ ایک انتہائی بزدل اور دھوکے باز انسان ہے' صرف یہی نہیں بلکہ وہ کمینگی اور گھٹیا پن کی اس منزل پر پہنچ چکا ہے کہ دھوکے سے اپنے دوست کی پیٹھ میں خنجر گھونپنے کا ارادہ کر رہا ہے۔ سلطانہ نے اپنے آپ کو اپنی ہی نظر میں گرتا محسوس کیا۔

دراصل کارپٹ صاحب کا بے فکری اور لاابالی پن سے بیٹھنے کا انداز ہ یہی ظاہر کر رہا تھا کہ اس نے سلطانہ اور اس کے ساتھیوں کو دل ہی دل میں اپنے دوست کا درجہ دے دیا ہے اور وہ ان

کی طرف سے کوئی خطرہ محسوس نہیں کر رہا۔ اس وقت وہ گویا فرصت کے لمحات میں کسی تفریح گاہ میں اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھا تمباکو نوشی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ صرف یہی نہیں اس کے چہرے پر ایک عجیب سی معصومیت بھی تھی۔ سلطانہ نے چند لمحے بغور اس کی طرف دیکھا اور اسے ہلاک کرنے کے خیال پر دل ہی دل میں لعنت بھیج دی۔ اسے کارپٹ صاحب کا چہرہ دیکھ کر نہ جانے کیوں یہ اطمینان بھی ہو گیا تھا کہ یہ شخص ان کے بارے میں کبھی مخبری نہیں کرے گا کہ ایک رات جنگل میں اس کی ملاقات چند مسلح نوجوانوں سے ہوئی تھی' جو شکل صورت سے بھتو لگ رہے تھے۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کارپٹ صاحب کو دنیا کے معاملات سے کوئی دلچسپی ہی نہیں تھی۔ وہ اپنی ہی دنیا میں مگن رہنے والا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ بہرحال سلطانہ نے دل ہی دل میں اس کے قتل کا ارادہ ترک کرنے کے بعد اپنے آپ کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ اسے کچھ یوں لگا کہ اگر وہ اندیشوں اور وسوسوں میں مبتلا ہو کر اسے قتل کر بیٹھتا تو شاید ایک عجیب سے پچھتاوے کی اذیت زندگی بھر اس کا پیچھا نہ چھوڑتی۔

تاہم اب سلطانہ دل ہی دل میں یہ دعا ضرور کر رہا تھا کہ کارپٹ صاحب جلد از جلد وہاں سے چلا جائے۔ شاید اس کی یہ دعا قبول ہو گئی کیونکہ وہ اپنا سگار ختم کرتے ہی اٹھ کھڑا ہوا اور خوشگوار لہجے میں بولا۔ ''اچھا دوستو...... اب میں چلتا ہوں' زندگی رہی تو پھر کسی جگہ یونہی ملاقات ہو گی۔''

اس نے اپنے سگار کا ٹوٹا جلتی آگ میں پھینکا اور ہاتھ پیشانی تک لے جا کر سب کو سلام کا اشارہ کرتے ہوئے وہاں سے رخصت ہو گیا۔ اسے اندھیرے میں درختوں کے درمیان غائب ہوئے کئی منٹ گزر گئے' تب ان لوگوں کی خاموشی ٹوٹی۔

بھورے بولا۔ ''عجیب آدمی تھا' ہمیں حیران کر گیا......''

سلطانہ ہنس کر بولا۔ ''حالانکہ حیران اسے ہونا چاہئے تھا' مگر اُلٹا ہم حیران ہو رہے ہیں۔''

پھر ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ بولا۔ ''مجھے اس گورے سے کوئی خطرہ محسوس نہیں ہو رہا۔ یہ ایک بالکل ہی عجیب سا اور دوسروں سے الگ تھلگ سا آدمی تھا۔ مجھے لگتا ہے شاید صبح تک یہ بھول جائے گا کہ اس کی ہم سے ملاقات ہوئی تھی...... لیکن میں سوچ رہا ہوں کہ احتیاط اچھی چیز ہے۔ ہمیں یہاں سے روانہ ہو جانا چاہئے۔''

اس کے ساتھیوں نے اس کی بات سے اتفاق کیا اور وہ اپنا سامان سمیٹ کر، گھوڑوں پر بیٹھ کر مشرق کی سمت روانہ ہو گئے۔ جلد ہی جنگل سے نکل کر وہ ایک ایسی پگڈنڈی پر پہنچ گئے جس پر موجود نشانات سے پتا چلتا تھا کہ لوگ اس پر اپنے مویشیوں کے ریوڑ اور بیل گاڑیوں وغیرہ کے ساتھ سفر کرتے تھے۔ مدھم چاندنی میں وہ سب ہنستے، بولتے سست رفتاری سے چلے جا رہے تھے۔ کبھی کبھی تو ان میں سے کوئی اپنی زبان میں روایتی سا گیت گانا بھی شروع کر دیتا تھا۔ ان کا انداز کچھ ایسا تھا جیسے وہ تفریحی سفر پر نکلے ہوئے ہوں۔ کوئی انہیں دیکھ کر نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ اپنی کشتیاں جلا کر نکلے ہیں اور ان کے سامنے کوئی منزل نہیں۔

گجندر بولا۔ ''یہ اونچی نیچی...... ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈی جس پر گڑھے پڑے ہوئے ہیں تمہیں معلوم ہے اس کا نام کیا ہے؟''

سلطانہ سمیت سب نے نفی میں سر ہلا دیا۔ گو کہ یہ علاقہ اور پگڈنڈی سلطانہ کی دیکھی ہوئی تھی، لیکن اس کے نام سے وہ بھی ناواقف تھا۔ گجندر بولا۔ ''اس کا نام ٹھنڈی سڑک ہے۔''

وہ سب زور زور سے ہنسنے لگے۔ انہیں معلوم تھا اور وہ دیکھ کر بھی آئے تھے کہ اس نام کی کی، دلی میں ایک سڑک موجود تھی مگر وہ نہایت صاف ستھری، کشادہ اور ہموار تھی۔ انہوں نے سنا تھا کہ روزانہ صبح منہ اندھیرے پانی کی مشکیں کمر پر لٹکائے آتے تھے اور پوری سڑک کو دھویا جاتا تھا۔

گجندر سنگھ بھی ہنستے ہوئے بولا۔ ''جس کسی نے بھی اس پگڈنڈی کا نام ٹھنڈی سڑک رکھا ہے، خوب رکھا ہے۔''

وہ اس پگڈنڈی پر کئی میل سفر کر چکے تو ایک جگہ انہیں روشنی نظر آئی۔ یہ روشنی ایک بڑی سی جھونپڑی جیسے مکان سے آ رہی تھی۔ جس کا دوازہ کھلا ہوا تھا۔ عین اسی جگہ ایک اور پگڈنڈی 'ٹھنڈی سڑک' کو قطع کرتی ہوئی گزر رہی تھی اور یوں گویا وہاں ایک چوراہا سا بن گیا تھا۔ وہ جھونپڑی اس چوراہے کے قریب تھی۔

بھورے جھونپڑے کو دیکھ کر بولا۔ ''مجھے پیاس لگی ہے۔''

سلطانہ نے اس کی طرف دیکھ کر آنکھ ماری اور بولا۔ ''پیاس تو مجھے بھی لگی ہے۔''

گجندر ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ ''ہمارے قبیلے کے لوگوں میں یہی خرابی ہے، ہمارے پیٹ بھرے ہوں اور ہم خطروں سے بچ کر نکل آئیں تو ہمیں مستی سوجھنے لگتی ہے۔ یہ خرابی

ہمارے خون میں شامل ہے، لیکن میں تمہیں خبردار کرنا چاہتا ہوں کہ اس جھونپڑی میں ہمارے لئے خطرہ بھی ہو سکتا ہے۔ میں نے اس سے پہلے اس راستے پر یہ جھونپڑی نہیں دیکھی، شاید یہ کچھ ہی عرصہ پہلے بنی اور آباد ہوئی ہے۔ کیا پتا اس میں کون رہتا ہو؟''

''یہی پتا کرنے تو ہم جا رہے ہیں۔'' بھورے اطمینان سے بولا۔ وہ اور گجندر جھونپڑی کی طرف بڑھے۔ قریب ہی جامن کے چند درخت موجود تھے، باقی لوگ ان کی آڑ میں ہو گئے۔

بھورے نے دروازے کے قریب پہنچ کر ہانک لگائی۔ ''اندر کوئی ہے...... پینے کے لئے پانی مل جائے گا؟ ہم سات آدمی ہیں۔''

اندر سے کوئی جواب نہ ملا البتہ ایک آدمی دروازے پر آ گیا، جسے دیکھ کر ان سب کو جھٹکا سا لگا۔ وہ دھوتی باندھے ہوئے تھے، لیکن اس کی قمیص پولیس کی وردی والی تھی۔ اس کے سر پر پولیس کی مخصوص سرخ پگڑی تھی، جس پر سامنے کی طرف پیتل کا بیج بھی لگا ہوا تھا۔ شاید وہ اس وقت کپڑے تبدیل کر رہا تھا، جب بھورے نے پانی کے لئے آواز لگائی۔ اب سلطانہ کو یاد آیا۔ کچھ عرصہ پہلے اس نے سنا تھا کہ انگریز سرکار ویرانوں میں بھی بعض ایسی جگہوں پر پولیس کی چوکیاں قائم کر رہی تھی جہاں سے ڈاکوؤں کی آمد و رفت کا شبہ محسوس کیا جاتا تھا۔ جھونپڑی کے انداز میں بنا ہوا یہ کچا پکا سا مکان بھی دراصل اسی قسم کی ایک پولیس چوکی تھی۔ یہ بھی طے تھا کہ دروازے پر آنے والا آدمی وہاں اکیلا نہیں رہتا ہو گا۔

سلطانہ کے خیال میں وہ اور اس کے ساتھی بدقسمتی سے عین اس پولیس چوکی کے دروازے پر پہنچ گئے تھے اور ایک پولیس والے سے ان کا سامنا ہو ہی گیا تھا تو اب چوکی پر حملہ کرنا بھی ضروری ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا اور وہ سب بندوقوں کے بجائے کلہاڑیاں بلند کر کے چوکی کی طرف دوڑے۔ بھورے اور گجندر نے سے پہلے ہی کلہاڑیاں ہوا میں بلند کر لی تھیں، لیکن اس نے بروقت پیچھے ہٹ کر اپنے آپ کو بچا لیا تھا۔ پھر اس نے اندر گھس کر دروازہ بند کرنے کی کوشش کی، لیکن گجندر نے دروازے میں پاؤں پھنسا کر اس کی یہ کوشش ناکام بنا دی۔

اس دوران سلطانہ اور دوسرے ساتھی بھی پولیس چوکی کے دروازے تک پہنچ چکے تھے۔ کلہاڑیاں لہراتے ہوئے وہ شور مچانے کے سے انداز میں جنگلی قبائلیوں جیسی آوازیں بھی نکال رہے تھے۔ ایسی آوازیں جنگلی قبائلی عام طور پر کہیں یلغار کرتے وقت اور حملہ آور ہوتے وقت ہی

نکالتے تھے۔ ان کا مقصد دشمن کو مزید خوفزدہ کرنا ہوتا تھا۔ سلطانہ اور اس کے ساتھی اس مقصد میں کچھ زیادہ ہی کامیاب رہے تھے۔ پولیس والا بے چارہ بری طرح بدحواس ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔ شاید وہ یہی سوچ رہا تھا کہ جنگل سے نہ جانے کون سی بلائیں نکل کر ان پر حملہ آور ہو گئی تھیں۔

دوسرے ہی لمحے بھورے کی کلہاڑی نے اس کا سر دو حصوں میں تقسیم کر دیا اور وہ کٹے ہوئے درخت کی طرح پیچھے جا گرا۔ وہ سب اس کی لاش کو پھلانگتے ہوئے اندر پہنچے تو انہیں ایک میز کے پاس لکڑی کی کرسیوں پر دو سپاہی اور بیٹھے دکھائی دیئے۔ وہ بھی اپنے ساتھی کی طرح ادھوری وردیوں میں تھے' وہ ہاتھوں میں پیتل کے گلاس پکڑے ہکا بکا بیٹھے تھے۔ شاید وہ ابھی سمجھنے کی کوشش ہی کر رہے تھے کہ باہر کیا ہو رہا ہے اور چوکی پر کون سی آفت ٹوٹ پڑی ہے۔

جھونپڑی نما وہ کمرہ خاصا بڑا تھا' لیکن اس میں تین چار پائیاں بھی پڑی تھیں اور میز کرسیاں بھی لگی ہوئی تھیں۔ سلطانہ اور اس کے ساتھیوں کے گھس آنے کے بعد تو گویا کمرہ کھچا کھچ بھر گیا۔

ایک سپاہی کی جونہی سمجھ میں آیا کہ چوکی پر حملہ ہو گیا ہے' اس نے قریبی کھڑکی سے چھلانگ لگانے کی کوشش کی۔ وہ اس وقت کھڑکی سے تقریباً نکل چکا تھا' جب سلطانہ نے پوری طاقت سے اس پر کلہاڑی کا وار دیا۔ اس کی ٹانگ ابھی کھڑکی کے اندر ہی تھی جب کلہاڑی اس کی پنڈلی پر پڑی۔ کھڑکی کی چوکھٹ نے قصائی کی مڈھی کا کام دیا اور سپاہی کی ٹانگ گھٹنے سے ذرا نیچے سے کٹ کر اندر آ گری جبکہ وہ خود ایک دردناک چیخ کے ساتھ باہر جا گرا۔

دوسرے سپاہی نے اس دوران دیوار پر لٹکی ہوئی بندوق اتارنے کی کوشش کی تھی' لیکن اس کا ہاتھ ابھی اسے چھو نہیں پایا تھا کہ گجندر کی کلہاڑی اس کے سر پر پڑی۔ اس کا سر بھی اس کے ساتھی کی طرح دو حصوں میں تقسیم ہو گیا اور وہ دھم سے پیچھے جا گرا۔ سلطانہ نے کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا۔ جس سپاہی کی ٹانگ کٹ چکی تھی' وہ بری طرح کراہتے ہوئے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا' اس کی کٹی ہوئی ٹانگ سے بھل بھل خون بہہ رہا تھا۔ اس نے کھڑے ہونے کی کوشش کی' لیکن توازن برقرار نہ رکھ سکنے کی وجہ سے دوبارہ زمین پر گر پڑا۔

سلطانہ نے نگیشر کو اشارے سے کھڑکی کے پاس بلایا اور کھڑکی سے باہر پڑے سپاہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''جب گھوڑے کی ٹانگ ٹوٹ جاتی ہے...... وہ دوڑنے اور چلنے کے قابل نہیں ہوتا...... تکلیف میں رہتا ہے...... تو اسے اس تکلیف سے چھٹکارا دلانے کے لئے

کیا کرتے ہیں؟''

''گولی مار دیتے ہیں۔'' نگیشر نے کلہاڑی چار پائی پر رکھ کر کندھے سے رائفل اتارتے ہوئے کہا۔

سپاہی جان بخشی کے لئے ہاتھ جوڑتا رہ گیا' لیکن نگیشر نے نشانہ باندھ کر اسے گولی ماردی' جو عین اس کی پیشانی کے بیچ میں لگی۔ وہ زمین پر اٹھ بیٹھا تھا۔ گولی لگتے ہی دوبارہ چت ہو گیا اور پھر وہیں ساکت ہو گیا۔

اب ان لوگوں نے پولیس چوکی کا جائزہ لینا شروع کیا۔ میز پر دو لالٹینیں روشن تھیں۔ کپڑے میں لپٹی ہوئی بہت سی روٹیاں اور ایک دیگچی میں سالن بھی تھا۔ کمرے کے ایک حصے میں مٹی کا چولہا بنا ہوا تھا اور وہاں کھانے پکانے کے انتظامات موجود تھے۔ گھڑونچی پر پانی کے تین بڑے بڑے گھڑے بھی رکھے ہوئے تھے۔ ایک سٹول پر مٹی کا ایک اور بڑا سا برتن طشتری سے ڈھکا رکھا تھا۔ وہ کونڈی معلوم ہو رہی تھی۔ لکڑی کا ایک موٹا مگر چھوٹا سا ڈنڈا بھی پاس رکھا ہوا تھا جسے ''گھوٹنا'' کہا جاتا تھا۔ گھوٹنے کی مدد سے کونڈی میں مرچ مصالحے اور دوسری چیزیں رگڑ کر چٹنی وغیرہ تیار کی جاتی تھی' لیکن گجندر نے جب اس کونڈی سے طشتری ہٹائی تو کمرے میں گلاب اور باداموں کی ٹھنڈی میٹھی سی مہک پھیل گئی۔ کونڈی میں کچی لسی جیسا سفید سیال بھرا ہوا تھا جس میں گلاب کی پتیاں تیر رہی تھیں۔

گجندر نے جھک کر اس سیال کو سونگھا اور ہنس کر بولا۔ ''ارے' یہ تو ٹھنڈائی ہے۔ ان پولیس والوں نے اس بیابان میں بھی بڑے مزے سے رہنے کا بندوبست کیا ہوا تھا۔''

ٹھنڈائی ایک قسم کا مشروب تھا' جس میں خشخاش' بادام اور دیگر میووں کے علاوہ بھنگ بھی استعمال ہوتی تھی۔ پینے والوں کو وہ ایک الگ ہی قسم کا سرور دیتی تھی۔

''چلو یہ بھی اچھا ہے...... یہاں ہماری خاطر تواضع کا بندوبست ہے۔'' سلطانہ نے کہا اور وہ سب اطمینان سے چار پائیوں پر بیٹھ کر ٹھنڈائی پینے لگے۔ وہ سات آدمی تھے۔ ٹھنڈائی تھوڑی دیر میں ہی ختم ہو گئی' تاہم سب کو ہلکا سا سرور اور فرحت محسوس ہونے لگی۔ کمرے میں دو لاشیں پڑی تھیں اور ان کے اردگرد کافی خون پھیلا ہوا تھا' لیکن سلطانہ اور اس کے ساتھیوں کو گویا اس کی ذرا بھی پروا نہیں تھی۔

ٹھنڈائی ختم کرنے کے بعد انہوں نے چوکی کا مزید جائزہ لیا تو انہیں وہاں پولیس کی تین

فاضل وردیاں، بارہ بور کی بندوقیں اور بہت سے کارتوس بھی مل گئے۔ وہ انہوں نے اپنے قبضے میں لے لئے۔ ہتھیار اور کھانے کی چیزیں اس وقت ان کے لئے سب سے زیادہ اہم تھیں۔ لگتا تھا کہ قسمت اس معاملے میں بھی ان کا ساتھ دے رہی تھی۔ ان کے پاس ان چیزوں میں بھی اضافہ ہوتا جارہا تھا۔

وہ جب وہاں سے روانہ ہونے لگے تو سرجو نے تجویز پیش کی۔ ''ہمیں پولیس چوکی کو آگ لگا دینی چاہئے۔''

انہیں اس تجویز کے فائدے یا نقصان کا کوئی خاص اندازہ نہیں تھا' لیکن نہ جانے کیوں سب ساتھیوں کو یہ پسند آئی۔ انہوں نے لالٹینوں سے مٹی کا تیل لکڑی کی دیواروں پر چھڑکا اور انہیں آگ دکھا کر باہر نکل گئے۔ باہر پڑے سپاہی کی لاش بھی اٹھا کر انہوں نے اندر پھینک دی۔ پھر کچھ دور جا کر وہ جھونپڑی نما اس کچے پکے مکان کو آگ پکڑتے دیکھتے رہے۔

جب شعلے کافی بلند ہونے لگے تو پریتم بولا۔ ''چلو یہ بھی اچھا ہوا کسی کو ان کی چتا تیار نہیں کرنی پڑی۔''

صادق بولا۔ ''ان کی موت ہمیں اس طرف لائی تھی۔ ہمارے آنے سے ایک منٹ پہلے تک ان بے چاروں نے سوچا بھی نہیں ہوگا کہ ان کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔''

''پولیس والوں میں 'بے چارے' کم ہی ہوتے ہیں۔'' سلطانہ بولا۔ ''شاید تم بھول گئے ہو...... ہم جیسے غریب بھٹولڑ کے جب کسی چھوٹی موٹی واردات کے سلسلے میں بھی ان کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں تو یہ ان کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں۔''

گجندر ہنس کر بولا۔ ''اگر یہ اب کسی پولیس والے کے ہتھے چڑھ گیا تو سب کچھ بہت اچھی طرح یاد آجائے گا۔ فی الحال تو شاید ٹھنڈائی دماغ کو چڑھی ہوئی ہے۔''

صادق کھسیانا سا ہوگیا۔ پولیس چوکی پوری طرح شعلوں میں چھپ گئی تھی۔ جلتے وقت لکڑی کے چٹخنے کی آوازیں رات کے سناٹے میں عجیب سا تاثر پیدا کر رہی تھیں۔ ہوا کے ساتھ آگ سے چنگاریاں نکل کر اِدھر اُدھر اُڑ رہی تھیں۔ شعلوں کی نارنجی روشنی' آس پاس موجود جامن کے درختوں پر رقص کرتی نظر آرہی تھی۔ سلطانہ اور اس کے ساتھی چند قدم دور کھڑے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔

''ہم نے اب تک جو بھی زندگی گزاری' یوں سمجھو وہ ساری کی ساری اس آگ میں جل گئی

ہے۔'' چند لمحوں کی خاموشی کے بعد سلطانہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ ''آج سے ہم ایک نئی زندگی شروع کر رہے ہیں۔ کچھ دیر بعد جو سورج نکلے گا وہ ہمارے لئے ایک نیا سورج ہوگا۔''

یہ کہہ کر سلطانہ ایک درخت کی اوٹ میں چلا گیا۔ چند لمحے بعد وہ واپس آیا تو پولیس کی وردی میں تھا۔ پولیس چوکی میں سے جو تین وردیاں ان کے ہاتھ لگی تھیں' ان میں سے ایک اس نے پہن لی تھی۔ پھر اس نے بھورے اور گجندر کو اشارہ کیا۔ وہ بھی درختوں کی اوٹ میں گئے اور اپنے کپڑوں کی جگہ پولیس کی وردی پہن کر آگئے۔

سلطانہ بولا۔ ''پولیس کی یہ لال پگڑی مجھے اچھی نہیں لگ رہی۔'' اس نے اپنی پگڑی اتار کر پھینک دی۔ بھورے اور گجندر نے بھی اس کی تقلید کی۔

سلطانہ بولا۔ ''پولیس اور فوج کی وردی میں صرف پگڑی ہی کا فرق ہے۔ فوجی لوگ پگڑی کی جگہ ٹوپی پہنتے ہیں۔ صرف سکھ فوجیوں کو پگڑی پہننے کی اجازت ہے۔ ہمیں جب کہیں سے ٹوپیاں مل جائیں گی تو ہم وہ پہن لیں گے۔ اپنے باقی ساتھیوں کے لئے ہمیں وردیوں کی بھی ضرورت ہوگی' وہ بھی کہیں نہ کہیں سے مل ہی جائیں گی۔ آج سے ہماری اپنی مکتی فوج ہے' یعنی ہم خود مکتی فوجی ہیں۔''

پھر وہ بھورے کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''آج سے تم بریگیڈیئر بھورے ہو۔''

سب ہنسنے لگے۔ سلطانہ نے رائفل کی نال سرجو کی گردن پر رکھ دی اور غرانے کے سے انداز میں بولا۔ ''اس میں ہنسنے کی کوئی بات نہیں۔''

سب کی ہنسی یکدم رک گئی۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد سلطانہ نے سرجو کی گردن سے رائفل کی نال ہٹالی اور گجندر کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''تم آج سے کرنل گجندر ہو' تم ہمیں نینی تال کے جنگلوں میں لے کر چلو گے' پریتم اور نکشر دونوں ایڈجوٹنٹ ہوں گے' سرجو اور صادق سپاہی ہوں گے۔''

صادق پر ٹھنڈائی کا کچھ زیادہ اثر ہوگیا تھا۔ وہ خمار زدہ سی آواز میں بولا۔ ''اور تم جنرل ہو...... جنرل سلطانہ......''

''نہیں...... میں جنرل بننا نہیں چاہتا۔'' سلطانہ نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں اب اپنے زمانے کا سب سے بڑا ڈاکو بنوں گا...... اپنے دادا گلفی سے بھی بڑا ڈاکو...... مگر ایسا ڈاکو جس کے نام سے امیر کانپیں گے...... جس کے ذکر سے پولیس اور فوج کی نیندیں حرام ہوں گی' لیکن

غریب جس کا نام سن کر خوشی سے نعرے لگائیں گے۔"

یہ کہتے ہوئے سلطانہ پلکیں جھپکائے بغیر تاریک افق کی طرف دیکھ رہا تھا اور خواب کی سی کیفیت میں بول رہا تھا۔ اسے گویا افق پر کچھ لکھا ہوا نظر آ رہا تھا' جسے دیکھ کر وہ پڑھ رہا تھا۔ شاید وہ اس کی قسمت کا' اس کے مستقبل کا حال تھا' جو کسی غیبی طاقت کی مدد سے اسے نظر آ رہا تھا۔ حالانکہ حقیقت میں سلطانہ سمیت ان سب کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ کبھی واقعی ایسا بھی ہو سکتا تھا۔ تاہم وہ سب خاموش کھڑے سحر زدہ سی حالت میں سلطانہ کی طرف دیکھ رہے تھے' جو خود بھی سحر زدہ سا دکھائی دے رہا تھا۔

جب پولیس چوکی میں بھڑکتے شعلے مدھم پڑنے لگے اور اس کے در و دیوار کوئلہ ہو کر ڈھیر ہو چکے تو وہ لوگ گھوڑوں پر بیٹھ کر آگے روانہ ہو گئے۔ فضا میں لکڑی کے علاوہ انسانی گوشت کے جلنے کی بو بھی پھیلی ہوئی تھی۔ صبح کاذب کے آثار نمودار ہو رہے تھے اور وہ ذرا سا بھی اجالا پھیلنے سے پہلے گارپو سے زیادہ سے زیادہ دور نکل جانا چاہتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ اس علاقے سے ان کے گزرنے کے آثار دریافت ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ اس کے بعد انہی علاقوں میں ان کا سراغ لگانے کی کوشش کی جائے گی۔ اس سے پہلے انہیں کسی ایسے علاقے میں پہنچ جانا چاہئے تھا' جہاں ان کی موجودگی کا امکان پولیس کو ذرا کم ہی نظر آتا۔

راستے میں سلطانہ' بھورے سے مخاطب ہوا۔ "جو کچھ ہم پیچھے چھوڑتے جا رہے ہیں' وہ پولیس پر ہماری دہشت قائم کرنے کے لئے کافی ہوگا۔"

"بے شک......" بھورے نے تائید کی۔ "پولیس نے شاید کبھی سوچا بھی نہیں ہوگا کہ حد سے زیادہ غریب' مسکین گھروں کے وہ لڑکے جنہیں وہ فقیروں سے بھی بدتر سمجھتے تھے اور جب چاہتے تھے انہیں کان سے پکڑ کر مجمع کے سامنے اُلٹا لٹا کر ان کی پیٹھ پر ڈنڈے برسا سکتے تھے...... وہ جب پنجرہ توڑ کر نکلیں گے تو ان کی غلام روحیں آزاد ہو کر کیسا غدر مچائیں گی۔ اب انہیں پتا چلے گا کہ ہم کمزور سے لوگوں کی آتمائیں کتنی طاقت ور تھیں۔"

سلطانہ نے گردن گھما کر دوسرے ساتھیوں کو مخاطب کیا۔ "اب بھی وقت ہے' تم میں سے کسی کو ڈر لگ رہا ہو' کسی کو گھر کی یاد ستا رہی ہو' کسی کے دل میں یہ خیال آ رہا ہو کہ آگے چل کر پتا نہیں کیا ہوگا' وہ واپس جا سکتا ہے' میں کسی کو نہیں روکوں گا' کسی سے کوئی شکوہ نہیں کروں گا۔"

"کیسی بات کر رہے ہو سلطانہ......؟" صادق فوراً بول اٹھا۔ "ہم تو اپنے پیچھے سارے

دروازے بند کر آئے ہیں۔ واپسی کا اب کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا......اور یہ خیال بھی دل میں مت لانا کہ مصیبت کے وقت میں ہم تمہیں چھوڑ کر بھاگ جائیں گے۔ ہم تمہاری ڈھال بن کر ساتھ رہیں گے' کوئی گولی اگر تم تک پہنچی تو ہمارے بدن سے گزر کر پہنچے گی۔"

"ہاں......صادق نے یہ ہم سب کے دل کی بات کی ہے۔" سرجو بول اٹھا۔

"تم بھی مجھے کبھی اپنے سے پیچھے نہیں پاؤ گے۔ جہاں تمہارا پسینہ گرے گا' سلطانہ وہاں اپنا خون بہائے گا۔" سلطانہ نے جذبات سے مغلوب لہجے میں کہا۔

اسی طرح باتیں کرتے' کبھی سفر کرتے اور کبھی قیام کرتے وہ پہلے مشرق میں بلدوانی پہنچے۔ پھر انہوں نے شمال میں نینی تال کی طرف سفر شروع کر دیا۔ سلطانہ کا خیال تھا کہ پولیس ان کے بارے میں یہ کبھی نہیں سوچے گی کہ وہ پہاڑوں پر چڑھ جائیں گے اور نینی تال پہنچ جائیں گے۔ وہ "ترائی" کے علاقوں کے رہنے والے تھے اور ہمیشہ نشیب کی طرف سفر کرتے تھے۔ نینی تال کی طرف جاتے وقت وہ دن میں جنگلوں' جھاڑیوں میں چھپ جاتے اور رات کو سفر کرتے۔ اس لئے انہوں نے پندرہ سولہ میل کا فاصلہ تین دن میں طے کیا۔

وہ نینی تال کی آبادی سے بچتے ہوئے' اس سے ایک میل دور' بلندی کی طرف چلے گئے۔ وہاں سے نینی تال کے مکانوں کی چھتیں نظر آ رہی تھیں۔ وہاں کی مشہور بریوری' یعنی شراب کی فیکٹری بھی دکھائی دے رہی تھی' جس کے سامنے سبزہ زار پر انگریزوں کے گھوڑے بندھے ہوئے تھے۔ بلدوانی سے کاروں میں نینی تال آنے والے انگریز زیادہ تر سفر تو کاروں میں ہی طے کرتے تھے' لیکن نہ جانے کیوں آخری ایک دو میل وہ گھوڑوں پر بیٹھ کر آتے تھے۔ شاید پہاڑی راستے کے اس ٹکڑے پر کار میں سفر کرتے ہوئے کچھ خوف محسوس کرتے تھے۔

سلطانہ نے اپنی نئی پناہ گاہ سے صادق کو آبادی بھیجا' تا کہ وہ اِدھر اُدھر سے کچھ سن گن لے کر معلومات حاصل کر کے آئے کہ پولیس ان کی تلاش کے سلسلے میں کیا کر رہی تھی۔ ان کے ساتھ سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ ان کے حلئے بہت خراب ہو گئے تھے' صادق اور سرجو کے کپڑے تو پھٹ ہی گئے تھے' تاہم صادق کسی نہ کسی طرح اپنا حلیہ کچھ ٹھیک کر کے شہر کی طرف روانہ ہوا۔ نینی تال میں چونکہ ریڈیو بھی تھے اور اخبار بھی آتے تھے۔ اس لئے تازہ ترین حالات کا پتا چل سکتا تھا۔

کئی گھنٹوں بعد صادق خبر لے کر آیا کہ ان لوگوں کی تلاش کا کام ڈی ایس پی تیرتھ سنگھ

کے سپرد کیا گیا تھا' جو اپنے بارہ ماتحتوں کے ساتھ انہیں تلاش کر رہا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے پنجاب سے بارہ "باوریا" کھوجی بھی اپنی مدد کے لئے بلوائے تھے۔ "باوریا" کھوجیوں کو پورے ہندوستان میں سب سے ماہر کھوجی سمجھا جاتا تھا۔ فی الحال تیرتھ سنگھ نے چڑھائی کی طرف رخ نہیں کیا تھا اور نہ ہی نینی تال آنے کا کوئی ارادہ ظاہر کیا تھا۔

بہر حال یہ مہم تیرتھ سنگھ کے سپرد کئے جانے سے ظاہر ہوتا تھا کہ انگریز سرکار کی نظر میں اس کی بڑی اہمیت تھی۔ ویسے تو اس کی اہمیت کا پتا اس بات سے بھی چلتا تھا کہ تھوڑے ہی عرصے میں اسے انسپکٹر سے براہ راست ڈی ایس پی بنا دیا گیا تھا۔ سلطانہ کو یاد تھا کہ جب تیرتھ سنگھ نے نجیب آباد کے قلعے میں آنا جانا شروع کیا تھا تو وہ محض ایک اے ایس آئی تھا۔

پہلی جنگ عظیم کے دوران انگریزوں نے اپنی فوجی طاقت بڑھانے کے لئے ہندوستانی پولیس کے بہت سے افسروں کو بھی فوجی ڈیوٹی دینے کے لئے ولایت بلوایا تھا' تیرتھ سنگھ بھی ان افسروں میں شامل تھا۔ جنگ ختم ہونے کے بعد کئی افسر تو ولایت میں ہی رہ گئے تھے۔ تیرتھ سنگھ نے وہاں نہ جانے کون سا کارنامہ دکھایا تھا کہ وہ واپس آیا تو اسے ڈی ایس پی بنا دیا گیا۔ صرف یہی نہیں اسے رائے بہادر کا خطاب بھی مل چکا تھا۔ اس ترقی اور اعزاز کی وجہ یہ بتائی گئی تھی کہ اس نے اپنی ملازمت کے دوران سب سے زیادہ بھگوڑوں اور دوسرے مجرموں کو گرفتار کیا تھا۔

سلطانہ کے لئے یہ خبر کچھ زیادہ تشویش کا باعث نہیں تھی کہ تیرتھ سنگھ کو اس کی تلاش اور گرفتاری پر مامور کیا گیا تھا۔ اس کے لئے یہ بات زیادہ تشویشناک تھی کہ تیرتھ سنگھ نے پنجاب سے بارہ "باوریا" کھوجی اپنی مدد کے لئے بلوائے تھے۔ اس نے اپنے دادا گلفی سے سنا تھا کہ کوئی بھی باوریا کھوجی اپنی جگہ "کارپٹ صاحب" سے کم نہیں تھا۔ وہ کسی بھی گروہ کے قدموں کے نشان دیکھ کر بتا دیتا تھا کہ اس میں کتنے آدمی شامل تھے' کون کس عمر کا تھا' کون تیز چلتا تھا اور کون آہستہ' کون زخمی تھا اور کون لنگڑا رہا تھا' کون بزدل تھا' کون بہادر...... اور ان میں سے کون سے دو آدمی آپس میں بھائی تھے۔ ان کی اس خوبی کے بارے میں سوچ کر تو بھورے اور پریتم بھی خوفزدہ ہو گئے۔

بہر حال ان تازہ معلومات کی روشنی میں سلطانہ نے مزید ایک ہفتہ نینی تال کے قریب ہی رکنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے اندازے کے مطابق فی الحال انہیں یہاں کم خطرہ تھا۔ البتہ جس جگہ وہ اس وقت رکے ہوئے تھے' وہ زیادہ محفوظ معلوم نہیں ہوتی تھی۔ وہ کسی محفوظ جگہ کی تلاش میں نکل

کھڑے ہوئے۔

نینی تال جھیل جسے مقدس سمجھا جاتا تھا۔ اس کے مغربی کنارے پر انہیں ایک شاندار اور محفوظ جگہ مل گئی۔ وہاں پانی کے سامنے تقریباً سو فٹ اونچی ایک ایسی چٹان تھی جس پر قدرتی طور پر کچھ ٹیڑھے ترچھے قدمچے سے بن گئے تھے' جن کے ذریعے اوپر چڑھا جا سکتا تھا۔ اس کی چوٹی پر بہت بڑے پیالے سے مشابہ ایسا گڑھا موجود تھا' جس کے اردگرد خوبصورت گھنے درختوں کا گھیرا تھا۔ ان درختوں کی وجہ سے گڑھے میں چھاؤں تھی۔ یہ گڑھا شاید کسی زمانے میں کوئی تالاب تھا' جو خشک ہو گیا تھا۔

چٹان کی ساخت سے بالکل اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ اس کے اوپر کوئی ایسی جگہ ہو گی' جسے پناہ گاہ کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہو گا۔ اس میں پچاسوں آدمیوں کے چھپنے کی گنجائش تھی۔ سلطانہ اور اس کے ساتھیوں نے وہاں صحیح معنوں میں اپنا پہلا ٹھکانہ بنا لیا۔ گھوڑے انہوں نے وہاں سے دور نشیب میں درختوں سے باندھ دیئے۔ وہاں گھوڑوں کی موجودگی مشکوک نظر نہیں آتی تھی۔ سیر و سیاحت کے لئے آنیوالے بہت سے افراد ایسے سبزہ زاروں اور درختوں کے جھنڈوں میں اپنے گھوڑے باندھ دیتے تھے۔ یہاں انہیں یہ فائدہ بھی تھا کہ وہ روزانہ مقدس جھیل میں نہا بھی سکتے تھے اور کپڑے بھی دھو سکتے تھے۔ پہلے ہی دن انہوں نے کچھ ضروری چیزوں کا بندوبست کر لیا' جن کی وجہ سے وہاں ان کا قیام مزید آسان ہو سکتا تھا۔ اس جگہ قیام کی پہلی رات انہوں نے مسلسل کئی دن کی بے آرامی اور اعصابی تناؤ کے بعد پہلی بار کچھ سکون محسوس کیا۔

ایک اور اچھی بات یہ تھی کہ آس پاس کے جنگلوں میں شکار بھی دستیاب تھا۔ جگندر دوسرے ہی روز ایک ہرن شکار کر لایا۔ رات کو وہ اسے اپنی پناہ گاہ میں آگ پر بھوننے بیٹھے تو نشیب میں تاروں کی مدھم سی روشنی میں سبزہ زاروں اور پہاڑوں کے درمیان جھلملاتی جھیل کا منظر نہایت خوبصورت لگ رہا تھا۔ سلطانہ نے اپنے وجود میں ایک نئی تازگی اور فرحت اُترتی محسوس کی۔ اسے یوں لگا جیسے رام جی نے خاص طور پر خود اس جگہ کی طرف اس کی رہنمائی کی تھی۔ رام جی بھی اسے پولیس کے ہتھے چڑھنے سے محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔

وہ خوابناک سے لہجے میں اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوا۔ "تمہیں پتا ہے...... ہزاروں سال پہلے رام جی اور سیتا جی بھی دریائے گوداوری کے کنارے ایک بہت خوبصورت جگہ پر پہنچے تھے۔ شاید وہ بھی ایسی ہی کوئی جگہ ہو۔ اس کا نام پنچاوتی تھا۔" اس نے آگ کے گرد بیٹھے اپنے

ساتھیوں کے چہروں پر نظر ڈالی۔شعلوں کی نارنجی روشنی میں ان کے سانولے چہرے دمک رہے تھے اور آنکھیں درندوں کی آنکھوں کی طرح جھلملا رہی تھیں۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد سلطانہ ہلکی سی ہچکچاہٹ کے بعد بولا۔"میرا دل چاہ رہا ہے، میں اس جگہ کا نام بھی پنچاوتی رکھ دوں۔ آئندہ جب بھی مجھے سکون اور آرام کی ضرورت ہوا کرے گی، میں یہیں آجایا کروں گا۔"

بھورے ہنس کر بولا۔"سکون اور آرام کی تلاش میں تو بڑے لوگ ایسی جگہوں پر جاتے ہیں۔ہم جیسے لوگوں کو سکون اور آرام کے لئے نہیں، پناہ کے لئے ایسی جگہوں کی ضرورت پڑتی ہے۔نام تو تم جو چاہو رکھ دو،ہمیں کون سا اس نام کو منظوری کے لئے سرکار کے پاس بھیجنا ہے۔"

یوں سلطانہ کی مرضی اور ساتھیوں کی تائید سے اس جگہ کا نام 'پنچاوتی' طے پا گیا۔نشیب میں واقع جھیل اور اس کے آس پاس کی جگہ ویسے بھی مقدس ہی سمجھی جاتی تھی۔ بہت سے لوگ اس جھیل میں بھی اسی طرح اشنان کرنے اور منتیں ماننے آتے تھے، جس طرح گنگا پر جاتے تھے۔

ان لوگوں نے خاصے آرام سے پندرہ دن پنچاوتی میں گزار دیئے اور کسی کی نظر میں نہیں آئے۔اس کے بعد ایک بار پھر تازہ خبریں لانے کے لئے صادق کو شہر بھیجا گیا۔ وہ خاصا وقت نینی تال میں گزار کر آیا اور ایک اچھی خبر یہ لایا کہ باوریا کھوجی بھی ان کا کھوج لگانے میں ناکام رہے تھے اور پولیس نے انہیں پنجاب واپس روانہ کر دیا تھا۔خبروں سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان کی تلاش کی مہم کچھ ٹھنڈی پڑ گئی تھی۔اس سے سلطانہ کا حوصلہ بلند ہوا اور اس نے نجیب آباد کی طرف واپس جانے کا قصد کر لیا۔

وہ نشیب میں بلدوانی کی طرف روانہ ہوئے، لیکن ٹھنڈی سڑک اور گارپو کے جنگلوں سے بچتے ہوئے گزرے۔ آتے وقت انہوں نے جو راستے اختیار کئے تھے، واپس جاتے وقت وہ ان میں سے کسی سے بھی نہیں گزرے۔ وہ رات میں سفر کرتے اور دن میں درختوں کا کوئی جھنڈ تلاش کر کے اس کے درمیان چھپ کر آرام کرتے۔ راستے میں بہت سی نشانیوں اور کچھ اُڑتی اُڑتی خبروں سے کافی حد تک ان کے اس اندازے کی تصدیق ہو گئی کہ ان کی تلاش کی مہم ٹھنڈی پڑ گئی ہے۔شاید ان کے بارے میں فرض کر لیا گیا تھا کہ وہ کسی اور صوبے کی طرف نکل گئے ہیں۔ان کے بارے میں یہ شاید کسی کو گمان بھی نہیں گزر سکتا تھا کہ وہ واپس نجیب آباد کی طرف بھی آسکتے تھے۔راستے میں سلطانہ کا اپنے بیٹے راجکمار کو دیکھنے کے لئے جانے کو بڑی شدت سے دل چاہا،

لیکن اس نے خود پر ضبط کیا۔ابھی اس قسم کی کوئی کوشش خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔

نگینشر اور بھورے اپنی بیویوں کے پاس جانے کے لئے بے چین تھے، لیکن جب سلطانہ نے اپنے بیٹے کو دیکھنے کے لئے جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا تو انہیں بھی اپنی خواہشوں کا گلا گھونٹنا پڑا۔ ویسے ان کا مقصد اپنی بیویوں کی خیر و عافیت معلوم کرنا بھی تھا۔ دونوں کے سسر "نیک معاش" تھے اور قلعے سے دور، دو مختلف بستیوں میں رہتے تھے۔ قلعے سے فرار ہوتے وقت ان دونوں نے اپنی بیویوں کو ہدایت کی تھی کہ ہنگامے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ بھی فرار ہو جائیں اور اپنے والدین کے پاس پہنچ جائیں۔ وہاں سے بھی یقیناً انہیں روپوش ہونا پڑا ہوگا، ورنہ وہ بھی تفتیش اور پوچھ گچھ کی زد میں آسکتی تھیں۔ انہیں ابھی صحیح طور پر اپنی بیویوں کے بارے میں پتا بھی چلانا تھا کہ وہ کہاں تھیں، کس حال میں تھیں؟ توقع انہیں یہی تھی کہ ان کی بیویوں کے بارے میں یہ تاثر قائم ہوا ہوگا کہ ان کے شوہر انہیں اپنے ساتھ ہی لے گئے ہیں۔

ان سب کو ہی اپنے دل پر پتھر رکھ کر اپنے پیاروں سے ملاقات کا ارادہ ملتوی کرنا پڑا۔ سلطانہ کو یہ دیکھ کر دل ہی دل میں خوشی ہوئی کہ اس کے ساتھی اس کے حکم پر اپنی بڑی سے بڑی خواہش کو تیاگ دینے کے لئے تیار رہتے تھے، جس قسم کا نظم و ضبط وہ اپنے گروہ میں قائم کرنا چاہتا تھا، اس کے لئے سب سے پہلے یہی چیز ضروری تھی۔

اس نے ایک طرح سے بھورے اور نگینشر کو تسلی دینے کی کوشش کی۔"تم بے فکر رہو...... موقع ملتے ہی میں مراد آباد میں پنچایت کو پیغام بھجواؤں گا۔ وہ تمہاری بیویوں کے بارے میں سارے حالات معلوم بھی کر لیں گے اور اگر اس سلسلے میں کسی مدد کی ضرورت ہوئی تو وہ بھی کریں گے۔ آخر میرے دادا زندگی بھر انہیں نذرانہ بھجواتے رہے ہیں......اور ذرا حالات بہتر ہو جائیں تو میں بھی بھجوانا شروع کر دوں گا۔ پنچایت کے لوگ ایسے موقعوں پر ہمارے کام نہیں آئیں گے تو پھر کب آئیں گے؟"

اس کی بات سن کر بھورے اور نگینشر بالکل مطمئن نظر آنے لگے۔

اگلے دو مہینے انہوں نے نجیب آباد کے قریبی جنگلوں میں ہی گزار دیئے۔ ان جنگلوں میں سب سے زیادہ جو درخت پائے جاتے تھے انہیں "سال" کے درخت کہا جاتا تھا۔ ان میں ایک لیسدار سا پھل بھی لگتا تھا جو مجبوری میں کھایا بھی جا سکتا تھا اور پیٹ کی آگ بجھائی جا سکتی تھی، لیکن انہیں اس کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی۔ انہوں نے تھوڑے سے دنوں میں ہی پیشہ ور

شکاریوں کے انداز میں جنگل میں زندگی گزارنا سیکھ لیا تھا۔ وہ کوئی خاص تنگی یا بے آرامی محسوس نہیں کرتے تھے۔ ان کے پاس ضرورت کی تقریباً ہر چیز تھی۔ دو فاضل گھوڑے بھی تھے' جن پر تمام سامان لدا رہتا تھا۔ نقد رقم بھی ان کے پاس ہوتی تھی۔

ضرورت پڑنے پر ان میں سے کوئی رات کا اندھیرا پھیلنے کے بعد کسی قریبی بستی میں جا کر خریداری بھی کر لاتا تھا۔ نقد رقم کے لئے وہ کبھی کبھار کوئی واردات کر لیتے تھے۔ انتہائی ضرورت کے بغیر وہ واردات نہیں کرتے تھے۔ وہ چاہ رہے تھے کہ ان کی تلاش کا معاملہ کچھ اور ٹھنڈا پڑ جائے۔ وارداتوں کی وجہ سے ابھی ان کی طرف کسی کی مزید توجہ مبذول نہ ہو۔ فی الحال وہ گویا خود ہی اپنے آپ کو جنگلوں میں روپوشی کی زندگی گزارنے کی تربیت دے رہے تھے۔ ویسے تو انہیں گلفی دادا نے جنگل کی زندگی کے بارے میں بہت سی باتیں بتائی تھیں اور جس حد تک ممکن ہو سکا تھا' تھوڑے بہت تجربات بھی کرائے تھے۔ اس کے باوجود خود اپنے بل بوتے پر مسلسل جنگل میں رہنے کی بات ہی کچھ اور تھی۔ وہ روز ہی کوئی نہ کوئی نئی بات سیکھتے تھے۔ جنگل میں ان کا قیام طویل ہوتا گیا۔

انہیں ایک دوسرے کے تجربات سے بھی فائدہ اٹھانے کا موقع ملتا تھا۔ ہر ایک رے سے الگ کچھ نہ کچھ باتیں معلوم تھیں۔ جنگل کی زندگی کا سب سے زیادہ تجربہ گجندر کو تھا۔ اس نے انہیں بتایا تھا کہ کون سے پھل کھانے چاہئیں اور کون سے نہیں...... کن پھلوں اور پودوں کو ہاتھ نہیں لگانا چاہئے۔ جہاں اوس پڑ چکی ہو' وہاں آگ جلانے کے لئے لکڑی کس طرح تلاش کرنی چاہئے اور بارش میں آگ کو کس طرح روشن رکھا جائے۔ بغیر شاخوں والے درخت پر کس طرح چڑھا جائے اور بوقت ضرورت درخت پر سونے کا انتظام کس طرح کیا جائے۔

ایسی ہزاروں باتوں کے علاوہ ان کا نشانہ بھی بہت بہتر ہو گیا۔ اس دوران انہوں نے بہت مشق کی تھی۔ سب سے اچھا نشانہ سلطانہ کا تھا۔ وہ تو اڑتی چڑیا کو بھی مار کر گرا سکتا تھا۔ اتفاق سے جو گھوڑا اس کے ہاتھ آیا تھا' وہ بھی بہت اچھی نسل کا تھا۔ سلطانہ نے اس کا نام چیتک رکھ دیا تھا۔ مارواڑی زبان میں اس کا مطلب چیتا تھا۔ سلطانہ نے سنا تھا کہ مارواڑ کے آنجہانی مہاراجہ پرتاب سنگھ کے گھوڑے کا نام بھی چیتک تھا۔

سلطانہ کبھی کبھی جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھتا کہ کسی روز وہ اپنے چیتک پر سوار ہو کر راجپوتانہ جائے گا اور چتوڑ گڑھ کے قلعے میں داخل ہو گا تو راستے کے دونوں طرف بڑے بڑے

ٹھاکر اور بنئے صفیں بنائے اس کے استقبال کے لئے کھڑے ہوں گے۔ اس کا استقبال بالکل اسی طرح کیا جائے گا' جس طرح مہاراجہ پرتاب سنگھ کا کیا جاتا تھا۔ بنئے اور ٹھاکر نعرے لگائیں گے۔ ''راجپوت سلطان کی جے......''

ان کی بیویاں ایک دوسرے کو بتائیں گی۔ ''یہ دراصل مہارانا پرتاب سنگھ کا دوسرا جنم ہے۔''

سلطانہ اپنے سامنے کھڑے گھوڑے کی رکاب میں پاؤں رکھے بغیر اچانک چھلانگ لگا کر اس پر بیٹھ جاتا تھا اور جس رفتار سے گھوڑا بھگاتا تھا' اس کی وجہ سے بعض اوقات اس کے اپنے ساتھی بھی اس کی گرد کو نہیں پہنچ پاتے تھے۔ اس کے باوجود وہ خود کو اچھا گھڑسوار نہیں سمجھتا تھا۔ ساتھی اس کی گھڑسواری کی تعریف کرتے تو وہ ٹھنڈی سانس لے کر کہتا۔ ''میں تو کچھ بھی نہیں ہوں' دادا تو دوڑتے گھوڑے سے کسی بیل گاڑی میں بھی کود جاتے تھے۔ یہ کام مجھے ابھی تک نہیں آیا۔''

تاہم وہ دوڑتے گھوڑے سے بھی صحیح نشانہ لگا لیتا تھا اور کہتا تھا۔ ''اگر میں چیتک پر سوار ہوں تو پولیس مجھے کبھی نہیں پکڑ سکتی۔''

جنگلوں میں قیام کے دوران ہی اس نے پنچایت کو نذرانہ بھجوانا بھی شروع کر دیا۔ وہ کہتا۔ ''بھئی کیا پتا کب پنچوں کی مدد کی ضرورت پڑ جائے۔''

اس کے ساتھی محسوس کرتے کہ سلطانہ کو کسی غیبی طاقت کی مدد حاصل تھی۔ وہ جب بھی کسی خاص واردات پر نکلنے کی تیاری کرتے' سلطانہ گھوڑے سے اتر کر' آنکھیں بند کر کے' ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو جاتا۔ وہ کھڑے کھڑے ہی کچھ دیر کے لئے گویا مراقبے میں چلا جاتا تھا۔ وہ زیر لب شاید کچھ بڑبڑا رہا ہوتا تھا لیکن قریب کھڑے کسی ساتھی کو بھی کوئی لفظ سنائی نہ دیتا۔ وہ جب آنکھیں کھولتا تو ان میں گویا خون اترا ہوا دکھائی دیتا۔ اس کے چہرے پر ایک نیا ہی اعتماد ہوتا۔ رگ و پے میں گویا بجلیاں بھر جاتیں۔ وہ کچھ اس طرح واردات پر روانہ ہوتا جیسے عقاب اپنے شکار پر جھپٹنے لگا ہو۔

وہ اکثر سفر میں رہتے لیکن قیام کسی نہ کسی جنگل میں ہی رہتا۔ وہ ایک جنگل کی طرف سفر کرتے رہتے۔ مستقل ایک ٹھکانہ نہ بنانے میں یہ مصلحت بھی تھی کہ کوئی ان کا سراغ لگاتا ہوا ان تک نہ پہنچ سکے۔ اپنی شناخت چھپانے کیلئے انہوں نے داڑھیاں اور سر کے بال بڑھا لئے تھے۔

صادق اور سرجو کی داڑھیاں بہت چھدری تھیں۔ ٹھوڑی پر تو بال بہت ہی کم تھے چنانچہ انہوں نے اپنے حلئے میں مزید تبدیلی لانے کے لئے سر منڈوا دیئے۔ کبھی کبھی وہ گیروے رنگ کا کپڑا جسموں پر لپیٹ لیتے‘ موٹے موٹے منکوں اور لہسن کی پوتھیوں کی مالائیں گلے میں ڈال لیتے‘ ماتھے پر بڑے بڑے تلک لگا لیتے اور کسی گاؤں یا قصبے کے مندر میں چلے جاتے۔ سلطانہ مندر کے پجاری کو بتاتا کہ وہ ہردوارے سے آئے ہوئے سادھو ہیں اور اکثر سفر میں رہتے ہیں۔ وہ آرام سے کئی کئی رات مندر میں قیام کرتے۔ ان کی خوب خاطر تواضع ہوتی۔

دن میں وہ گاؤں یا قصبے کی گلی کوچوں میں گھومتے پھرتے۔ بظاہر دھرم کا تھوڑا بہت پرچار کرتے۔ کبھی راستے میں کسی کو روک کر نصیحتیں کرتے‘ لیکن درحقیقت وہ چاروں طرف کا جائزہ لے رہے ہوتے تھے۔ وہ دیکھتے تھے کہ کون سے مکان پکے ہیں اور کس کے در و دیوار سے خوشحالی ٹپک رہی ہے۔ کس مکان میں آنے جانے والی عورتوں نے سونے کے زیادہ زیور پہنے ہوئے ہیں‘ کون سی دکان مال و اسباب سے بھری ہوئی ہے اور کس کا مالک زیادہ خوشحال بنیا دکھائی دے رہا ہے۔ وہ آنکھ بچا کر چونے کی ڈلی سے ایسے مکانوں اور دکانوں پر نشان لگا دیتے۔ کم امیر دکھائی دینے والوں کے مکان پر ایک لکیر‘ ذرا زیادہ امیروں کے مکانوں پر دو لکیریں اور کافی دولت مند نظر آنے والوں کے مکانوں پر تین لکیریں...... رات میں ان لکیروں کی مدد سے مکان کو پہچانا جاسکتا تھا۔

پھر وہ پجاری کی خدمت میں پانچ دس روپے کا نذرانہ پیش کر کے بظاہر وہاں سے رخصت ہو جاتے‘ لیکن دوسری رات اس گاؤں یا قصبے پر قیامت ٹوٹ پڑتی۔ سات گھڑ سوار چہروں پر ڈھاٹے باندھے آندھی طوفان کی طرح گاؤں میں داخل ہوتے‘ ایک ایک گھڑ سوار کے پاس دو دو تین تین رائفلیں اور مشعلیں ہوتیں۔ آگ لگانے کے لئے مٹی کے تیل اور پٹرول کے ڈبے ہوتے‘ مکانوں کے دروازے اور تالے ٹوٹ جاتے۔ اور دندناتے ہوئے اندر گھس جاتے‘ مزاحمت کرنے والوں کے جسم گولیوں سے چھلنی ہو جاتے۔ بعض گھروں کو آگ لگا دی جاتی۔



کسی بھی بستی‘ گاؤں‘ قصبے یا شہر میں سلطانہ ڈاکو اور اس کے ساتھیوں کی آمد وہاں کے امیر اور خوشحال لوگوں کے لئے موت اور تباہی و بربادی کا پیغام ہوتی تھی۔ ان میں سے جو بھی اس گروہ کے سامنے مزاحمت کی کوشش کرتا تھا‘ موت اس کا مقدر ہوتی تھی۔ مزاحمت نہ کرنے والوں کا صرف مال ہی جاتا تھا‘ لیکن مزاحمت کرنے والوں کی تو جان اور مال دونوں ہی جاتے تھے۔ کسی کا جسم گولیوں سے چھلنی ہو جاتا اور کسی کو خنجروں سے کاٹ کر رکھ دیا جاتا۔

دولت مند بنیوں‘ برہمنوں اور ٹھاکروں نے اپنا مال عجیب عجیب جگہوں پر چھپایا ہوتا تھا‘ جہاں عام آدمی کا تو خیال بھی نہیں جاسکتا تھا۔ مال کے بارے میں جاننے کے لئے انہیں بعض اوقات عورتوں اور مردوں پر کافی تشدد کرنا پڑتا تھا۔ بعض لوگ تو موت کو بھی گلے لگا لیتے تھے لیکن اپنے مال کے بارے میں زبان کھولنا گوارا نہیں کرتے تھے۔ تاہم زیادہ تر سلطانہ اور اس کے ساتھیوں کے اندازے ہی ٹھیک نکلتے تھے اور وہ سیدھے مال تک جا پہنچتے تھے۔ کبھی کبھی تو کسی عجیب و غریب اتفاق کے تحت بھی مال خود بخود ان کی جھولی میں آ گرتا تھا۔

ایک بار وہ ایک گھر میں گھسنے اور گھر والوں کو باورچی خانے میں بند کرنے کے بعد گھر کی تلاشی لے رہے تھے کہ گجندر سنگھ کو کسی چیز سے ٹھوکر لگ گئی اور اس کی انگلی ٹریگر پر ہونے کی وجہ سے رائفل چل گئی۔ غنیمت یہ تھا کہ نال کا رخ چھت کی طرف تھا ورنہ حادثاتی طور پر گولی کسی کو لگ سکتی تھی اور وہ مر سکتا تھا۔ رائفل چلنے کی وجہ سے چھت سے بہت سا پلستر اور دوسری چیزیں گریں تو سلطانہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ان میں کئی زیورات بھی شامل تھے۔

دراصل بنیئے نے کمرے کی چھت کے نیچے لکڑی کے تختوں وغیرہ سے ایک اور مصنوعی چھت بھی بنوائی ہوئی تھی۔ اصلی اور نقلی چھت کے درمیان خالی جگہ میں اس نے نقدی اور زیورات چھپائے ہوئے تھے۔ مصنوعی چھت کا راز فاش ہونے کے بعد سلطانہ اور اس کے

ساتھیوں نے اسے ادھیڑ ڈالا اور ایک چھوٹا موٹا خزانہ ان کے ہاتھ آ گیا۔ بنیا ان کے اندازوں سے کہیں زیادہ امیر تھا۔ سلطانہ نے قہقہہ لگاتے ہوئے گجندر کی پیٹھ پر تھپکی دی' جس کی غلطی سے یہ خزانہ دریافت ہوا تھا۔

گجندر نوٹوں کی ایک گڈی ہوا میں اچھالتے ہوئے بولا" میرے باپو نے بیابان میں دو بیگھہ زمین پر مشقت کرتے زندگی گزار دی اور اس کی کمائی سے ہم دو وقت پیٹ بھر کر روٹی بھی نہیں کھا سکے۔ جب ہم نے اپنی 'نیک معاشی' کی سند آگ میں جلا دی اور 'بدمعاشی' پر کمر باندھ لی تو ایک ایک رات میں ہمارے پاس اتنی دولت آنے لگی' جتنی میرے باپو نے شاید کبھی سپنے میں بھی نہیں دیکھی ہوگی۔"

"اور پھر یہ بھی تو دیکھو کہ ہماری شرافت کی زندگی کا ہمیں کوئی اور صلہ بھی نہیں مل رہا تھا۔" سلطانہ کے ہونٹوں پر بھی شکوہ آ گیا۔" سماج میں دو کوڑی کی بھی عزت نہیں تھی ہماری......"

پھر انہوں نے مال سمیٹا اور وہاں سے نکل آئے۔ یہ ان کی اب تک کی سب سے بڑی ڈکیتی تھی۔ گجندر سے رائفل چل گئی تھی' اس وقت وہ اس کے کان کے بالکل قریب تھی۔ دھماکے سے اس کے اس کان کی سماعت کچھ متاثر ہو گئی تھی' لیکن آنے والے دنوں میں رفتہ رفتہ وہ کچھ بہتر ہو گئی۔ اس دوران یہ بات لوگوں کے علم میں آ گئی تھی کہ ڈاکے مارنے والا گروہ سلطانہ اور اس کے ساتھیوں کا ہے۔ لوگ یہ بھی جان گئے تھے کہ سلطانہ اپنے ساتھیوں کا سردار ہے۔

سلطانہ کا گروہ ہمیشہ حالت سفر میں رہتا تھا۔ وہ لوگ جنگلوں میں ہی قیام کرتے تھے۔ آبادیوں میں وہ صرف ڈاکے ڈالنے ہی جاتے تھے۔ اس دوران سلطانہ کے کچھ ایسے ذرائع بن گئے تھے' جن سے اسے نجیب آباد شہر اور قلعے کی خبریں ملتی رہتی تھیں۔ اسے پتا چلا تھا کہ تیرتھ سنگھ نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔ وہ اس کا سراغ پانے کی کوششوں میں لگا ہوا تھا اور اس کی ڈکیتیوں کا پورا ریکارڈ رکھ رہا تھا۔ وہ اس کی تلاش میں مختلف سمتوں میں گاہے گاہے پولیس پارٹیاں بھی روانہ کرتا رہتا تھا' جو ظاہر ہے ناکام واپس آتی رہتی تھیں۔

تیرتھ سنگھ کو سلطانہ کی گرفتاری میں تو کیا کامیابی ہونا تھی' اسے الٹا ایک اور مصیبت پڑ گئی تھی۔ سلطانہ اور اس کے دوستوں کے کامیاب فرار نے بھنتو قبیلے کے نوجوانوں کو گویا کسی قسم کی نیند سے بیدار کر دیا تھا۔ ان کے کانوں تک وہ سارے قصے پہنچے تھے کہ کس طرح سلطانہ کے گروہ نے اپنے تعاقب میں آنے والوں کو ہلاک کر دیا تھا اور اس کے بعد کس بے خوفی سے وہ پورے

روہیل کھنڈ میں ڈاکے مارتے پھر رہے تھے اور پولیس ان کا کچھ بھی نہیں بگاڑ پا رہی تھی۔ ان باتوں نے گویا دوسرے نوجوانوں کو بھی حوصلہ دیا تھا۔ وہ موقع پا کر ایک ایک کر کے قلعے سے فرار ہونے لگے تھے۔ گو کہ یہ پتا نہیں چل رہا تھا کہ وہ کہاں جاتے تھے اور کیا کرتے تھے لیکن ان میں یہ ایک قسم کا رجحان ضرور پیدا ہو گیا تھا۔ یہ ایک طرح کی بغاوت کا رجحان تھا۔ نوجوان نسل اب قیدی بن کر رہنے کے لئے تیار نہیں تھی۔ لگتا یہی تھا کہ یہ راہ انہیں سلطانہ نے دکھائی تھی۔

اس کے علاوہ ایک تبدیلی یہ آئی تھی کہ اب نجیب آباد اور دوسرے شہروں' دیہات یا بستیوں میں اگر پولیس کسی بھنتو کو اس ارادے سے گرفتار کرنے جاتی تھی کہ اسے لا کر کسی قلعے میں قید کر دیا جائے تو انہیں شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب وہ غلامی کی زندگی گزارنے کے لئے تیار نہیں تھے اور انہیں تحریک سلطانہ ہی سے مل رہی تھی۔ وہ گویا ڈاکو کے بجائے غائبانہ طور پر ان کا لیڈر بن گیا تھا۔ وہ ان کے درمیان موجود نہیں تھا' لیکن لوگ جیسے اس کے پیچھے چلنا چاہ رہے تھے۔

ادھر ڈاکہ زنی کے سلسلے میں سلطانہ کی افتادِ طبع نے بھی ایک عجیب ہی فضا تخلیق کر دی تھی۔ ڈاکوں کا سلسلہ شروع کرتے ہی اس نے ایک کام یہ بھی شروع کر دیا تھا کہ جس طرح وہ امیروں اور دولت مندوں کو پہلے سے تاڑ لیتا تھا' اسی طرح وہ کچھ غریبوں اور ضرورت مندوں کا بھی پہلے سے پتا کر لیتا تھا۔ جب وہ ڈاکا ڈال کر اپنے ساتھیوں کے ہمراہ فرار ہونے لگتا تو ان لوگوں کے دروازوں پر باقاعدہ دستک دے کر با آواز بلند کہتا۔" تم لوگوں کو مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں...... باہر آؤ...... میں تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔"

جب کوئی باہر آتا تو سلطانہ کچھ رقم یا سونے چاندی کا کوئی زیور اس کے ہاتھ پر رکھ کر رخصت ہو جاتا۔ یوں اس کی شہرت کچھ ایسی بن گئی کہ رفتہ رفتہ اسے دستک دے کر کسی کو بلانے کی ضرورت ہی نہ رہی۔ کسی بھی گاؤں' قصبے میں جب خبر پھیلتی کہ سلطانہ کا گروہ وہاں گھس آیا ہے اور اس نے کسی ساہوکار کو کنگال کر دیا ہے تو غریب اور ضرورت مند خود ہی راستوں میں آ کر کھڑے ہو جاتے۔ سلطانہ نقدی اور زیورات ان کی طرف اچھالتا ہوا نکل جاتا۔ لوگ ان چیزوں کو لوٹنے کے لئے اس طرح ٹوٹ پڑتے جیسے بچے اس زمانے میں کسی بارات کے جاتے وقت لٹائے جانے والے سکوں کے لئے جھپٹ پڑتے تھے۔

کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوتا کہ سلطانہ لوٹ مار کا تقریباً سارا ہی مال راستے میں لٹا آتا۔ یعنی

ایک طرف سے لوٹ کر دوسری طرف لٹا دیتا۔ اس کے پاس اپنے ساتھیوں کے درمیان تقسیم کرنے کے لئے برائے نام ہی مال رہ جاتا۔ اس کے ساتھی کبھی کبھی اس کی اس عادت پر ناگواری کا اظہار بھی کرتے، لیکن وہ بہرحال سعادت مند اور تابع فرمان بھی تھے۔ اسے دل و جان سے سردار تسلیم کرتے تھے۔ اس لئے صرف دبی دبی زبان میں ہی سمجھانے کی کوشش کرتے تھے۔ لیکن کسی نے کبھی باقاعدہ احتجاج یا مخالفت کرنے کے بارے میں شاید سوچا بھی نہیں تھا۔

اِدھر سلطانہ کی نفسیات کچھ ایسی بن گئی تھی کہ غریبوں کی مدد کرتے وقت اسے مال دولت کی کوئی پروا نہیں رہتی تھی۔ اس کی کوشش ہوتی تھی کہ اسے راستے میں جتنے غریب اور ضرورت مند کھڑے نظر آئیں، ان میں سے کوئی خالی ہاتھ نہ جائے۔

چنانچہ لوگ اپنی اپنی ضروریات کے سلسلے میں فریادیں لے کر اس کے راستے میں کھڑے ہونے لگے۔ صورتحال یہ ہوتی کہ اِدھر وہ دولت مندوں کو لوٹ کر ان کے گھر کے کسی کمرے میں بند کر کے نکلتا اور اُدھر اس کے راستے میں کھڑے ضرورت مندوں میں سے کوئی بڑھیا پکارتی۔

''اے سلطانہ!...... چاند کی چودھویں کو میری بیٹی کا بیاہ ہے اور میرے پاس جہیز بنانے کو کچھ نہیں۔''

سلطانہ اس کی پھیلی ہوئی جھولی میں سونے چاندی کے زیورات اور خاصی نقدی ڈال دیتا۔

اس وقت وہ ڈاکو کے بجائے کوئی رحمدل اور فیاض بادشاہ معلوم ہوتا۔ صورت حال یہ ہوگئی تھی کہ زیادہ مال دولت رکھنے والے اس خوف سے کانپتے رہتے تھے کہ سلطانہ ان کے گھر کا رخ نہ کر لے اور غریب دعا کرتے تھے کہ سلطانہ ان کے گاؤں، قصبے یا شہر میں آجائے۔ وہ جب ڈاکا ڈال کر رخصت ہوتا تو اس کے پیچھے نعرے لگ رہے ہوتے تھے۔ ''سلطانہ ڈاکو کی...... جے...... سلطانہ ڈاکو کی...... جے۔''

وہ ہندوستان کی تاریخ کا پہلا اور شاید آخری ڈاکو تھا جس کے لئے درازی عمر اور زندہ باد کے نعرے لگتے تھے۔ پولیس بعد میں ڈکیتی کے سلسلے میں تفتیش کیلئے آتی تو جن غریبوں کو وہ بہت کچھ دے کر گیا ہوتا تھا، وہ صاف مکر جاتے کہ انہیں سلطانہ سے کچھ نہیں ملا۔ ان میں سے زیادہ تر یہی کہتے کہ ڈکیتی کے بعد وہ صبح تک گھروں میں ہی دبکے رہے تھے۔ سلطانہ کے گروہ کے سامنے آنے کی بھلا ان میں کہاں ہمت تھی؟ ویسے بھی اس کا گروہ آندھی طوفان کی طرح آتا تھا اور نہ جانے کس کس کا گھر برباد کرتا ہوا اسی طرح غائب ہو جاتا تھا۔ غرضیکہ بہت ہی کم عرصے میں وہ

ایک افسانوی سا کردار بن گیا تھا۔

گلیوں، بازاروں، کھیتوں اور چوپالوں میں جس طرح اس کے بارے میں باتیں ہوتیں، اس سے یوں لگتا جیسے وہ اسی دور کی، حقیقت کی دنیا کے بجائے قصے کہانیوں کا کوئی کردار ہے۔ کبھی کبھی لوگ ایک دوسرے کو متاثر کرنے کیلئے اس کے بارے میں رنگ آمیزی اور مبالغے کے ساتھ بھی باتیں کرتے۔ جن غریبوں نے اس کی ایک جھلک بھی دیکھی تھی وہ اس پر فخر کا اظہار کرتے کہ انہوں نے سلطانہ کو دیکھا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ غریب لوگ اس کے روپ میں ایک نجات دہندہ کو دیکھنے لگے تھے۔ تاریخ کے کچھ صفحات کو اگر بین السطور پڑھا جائے تو کچھ ایسا محسوس ہوتا، جیسے غریبوں، غلاموں اور مصیبت زندہ زدگان کو عموماً کسی معجزے یا معجزاتی سی شخصیت کا انتظار رہتا ہے جو آ کر انہیں غربت، غلامی اور مصائب سے نجات دلا دے۔ ایسا لگتا تھا کہ اس بار لوگوں نے ایک ڈاکو میں اسی شخصیت کو تلاش کرنا شروع کر دیا تھا۔

نوبت یہ بھی آگئی کہ سلطانہ جب کسی گاؤں یا قصبے کو لوٹنے کے بعد روانہ ہونے لگتا تو کئی نوجوان اس کے گھوڑے کے ساتھ دوڑتے ہوئے التجائیں کرنے لگتے کہ وہ انہیں بھی اپنے ساتھ لے چلے اور اپنے گروہ میں شامل کرلے۔ سلطانہ کافی دنوں تک ایسے نوجوانوں کو ٹالتا رہا۔ اسے معلوم تھا کہ ان پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ سلطانہ اور اس کے گروہ کا ساتھ دینا ہر ایک کے بس کی بات نہیں تھی۔ اسے یقین تھا کہ اگر ان میں سے کوئی پکڑا گیا اور پولیس نے اس پر اپنے روایتی تشدد کے حربے آزمائے تو وہ جلد ہی گروہ کے بارے میں ہر بات اگل دے گا۔

جب نوجوانوں کا اصرار اسی طرح جاری رہا تو آخر کار اسے ان میں سے کچھ نوجوانوں کا انتخاب کرنا ہی پڑا، لیکن اس نے پہلے انہیں مختلف طریقوں سے آزمایا اور یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ وہ کس حد تک اس کے وفادار ہو سکتے ہیں۔ ان میں سے بہت سے تو انہی مراحل کے دوران ہی مسترد ہو گئے۔ اس پہلی چھانٹی کے بعد اس نے انہیں انفرادی طور پر وارداتیں کرنے کے لئے چھوڑ دیا۔ ان کا صحیح معنوں میں سلطانہ سے کوئی تعلق نہیں تھا، لیکن وہ محسوس یہی کرتے تھے کہ وہ سلطانہ کی سرپرستی میں کام کر رہے ہیں۔ وہ سلطانہ کی سرگرمیوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے، لیکن انہیں لگتا تھا کہ وہ سلطانہ کے ساتھی ہیں۔

ان کے لئے یہ بہت بڑا نفسیاتی سہارا ہوتا تھا۔ ان میں زبردست خود اعتمادی اور بے خوفی پیدا ہو جاتی تھی۔ سلطانہ نے ہر ہفتے دس دن بعد ان سے ان کی ''کارکردگی'' اور اس دوران پیش

آنے والے واقعات کی رپورٹ لینے کے لئے ایک طریقہ کار طے کرلیا۔ اس طرح کچھ عرصے میں اسے اندازہ ہونے لگا کہ کون کتنے پانی میں ہے۔ اس مرحلے میں بھی کافی نوجوانوں کی ویسے ہی چھانٹی ہوگئی اور کچھ کو سلطانہ نے مسترد کر دیا۔ یوں اس کڑے انتخابی طریقہ کار سے گزرنے کے بعد اس کی نظر میں چند نوجوان رہ گئے جو اس کے خیال میں کام کے تھے۔ اس نے انہیں اپنے گروہ میں شامل کرلیا۔ اب سلطانہ سمیت گروہ بیس نوجوانوں پر مشتمل تھا۔

سلطانہ اور اس کے پرانے ساتھی ایک کے بعد دوسرے جنگل میں قیام کرتے کرتے تنگ آچکے تھے۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ اب انہیں کسی ایک جگہ اپنا کیمپ بھی بنا لینا چاہئے۔ کافی تلاش کے بعد آخر کار انہیں مراد آباد کے شمال میں ایک دور دراز مقام پر جنگلوں میں گھری ہوئی، چھوٹے سے میدان جیسی ایک جگہ مل گئی۔ پور نامی ایک گاؤں یہاں سے آٹھ دس میل کے فاصلے پر تھا۔ چھوٹے سے اس صاف قطعہ زمین کے تین طرف اونچی اونچی ایسی گھاس کے جھنڈ تھے، جسے ہاتھی بڑی رغبت سے کھاتے تھے۔ اس سے آگے درختوں کے دائرے تھے۔

چوتھی سمت میں تیزی سے بہتا ہوا ایک پہاڑی نالا تھا، جو جنوب کی طرف آٹھ دس میل آگے جا کر گنگا میں گر رہا تھا۔ نالا زیادہ بڑا نہیں تھا اور نہ ہی گہرا تھا۔ اس میں کشتی نہیں تیر سکتی تھی۔ نالے کے دوسری طرف بھی گولر اور سال کے درختوں کے جھنڈ تھے، جبکہ گھاس والی تین اطراف سے آگے بھی درخت ہی درخت تھے۔ یہ ایک ایسی جگہ تھی جہاں وہ خود پوشیدہ رہتے ہوئے تینوں اطراف میں نظر رکھ سکتے تھے اور کسی پولیس پارٹی وغیرہ کی آمد سے بروقت آگاہ ہو سکتے تھے، جبکہ چوتھی سمت یعنی نالے کی طرف سے کسی کی آمد کا خطرہ نہیں تھا۔ یہاں شکار بھی وافر پایا جاتا تھا۔ تھوڑی سی دشواری بس یہ تھی ان کے اندازے کے مطابق سخت سردی کے موسم میں پانی کا نالا خشک ہو جاتا تھا، یعنی اس موسم میں پانی کی تنگی ہو سکتی تھی، لیکن اس مسئلے کا حل نکالنا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ انہوں نے وہاں سرکنڈوں سے تین خاصی بڑی بڑی جھونپڑیاں تیار کرلیں اور وہاں سے کچھ فاصلے پر ایک درخت پر مچان بھی بنالی۔ طے یہ پایا کہ باری باری ہر آدمی مچان پر ڈیوٹی دیا کرے گا اور ہر وقت وہاں کوئی نہ کوئی موجود رہے گا۔ مچان پر ڈیوٹی دینے والا کسی بھی قسم کے خطرے سے سب کو کافی پہلے آگاہ کرسکتا تھا۔ ان کے قبیلے کے لوگوں کی نظریں قدرتی اور پیدائشی طور پر بہت تیز ہوتی تھیں۔ جو مچان انہوں نے تیار کی تھی، اگر موسم صاف ہوتا تو وہ اس پر بیٹھ کر جس پور گاؤں کو بھی دیکھ سکتے تھے۔ درختوں کی شاخوں سے بنائی ہوئی ایک سیڑھی انہوں

نے مستقل طور پر اس درخت سے لگا کر چھوڑ دی، جس پر مچان لگی ہوئی تھی۔

کیمپ تیار کرنے کے بعد سلطانہ اور اس کے ساتھیوں نے بڑا اطمینان محسوس کیا۔ یہاں کسی کو ان کے کیمپ کی موجودگی کا شبہ نہیں ہو سکتا تھا اور جب تک کوئی ان کے ساتھ نہ آتا، یہاں نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اس کیمپ کی تیاری اور یہاں تمام ضروری ساز و سامان جمع کرنے میں سلطانہ اور اس کے ساتھیوں کو دو مہینے لگ گئے۔ گھوڑے کھڑے کرنے کے لئے انہوں نے لکڑی کا جنگلا لگا کر ایک طرح کا اصطبل بھی بنا لیا۔ حتیٰ کہ روٹیاں پکانے کے لئے تندور بھی لگا لیا۔ اسلحہ رکھنے کے لئے دو بڑی الماریاں بھی کھڑی کرلیں۔

اس دوران چھوٹی موٹی ڈکیتیوں کا سلسلہ بھی جاری رہا، لیکن دو مہینے تک ایک گاؤں میں دوبارہ نہیں جاتے تھے اور سمتیں بدلتے رہتے تھے۔ کبھی وہ ڈاکا ڈالنے شمال کی طرف جاتے اور کبھی جنوب کی طرف، کبھی مشرق اور کبھی مغرب کی طرف...... تاکہ کسی کو ان کے کیمپ کے محل وقوع کا اندازہ نہ ہو سکے، کوئی یہ نہ جان سکے کہ وہ کدھر سے آتے ہیں اور کہاں چلے جاتے ہیں۔ ڈاکے ڈالنے کے لئے وہ بہت دور تک بھی چلے جاتے تھے اور جتنی زیادہ دور جاتے، اتنے ہی زیادہ مال و متاع سے لدے پھندے واپس آتے تھے۔

کبھی کبھی وہ قریب قریب واقع پانچ سات دیہات میں ایک ہی رات میں ڈاکا ڈالتے اور وہاں کے تمام خوشحال لوگوں کے گھروں کا صفایا کر دیتے۔ البتہ حسن پور میں انہوں نے کبھی ڈاکا نہیں ڈالا، حالانکہ وہ ان کے کیمپ کے سب سے زیادہ قریب تھا، لیکن قریب ترین ہونے کی وجہ سے انہوں نے اسے اپنا گاؤں شمار کرنا شروع کر دیا تھا اور یہ بات گویا طے تھی کہ خود اپنے ہی گاؤں میں کوئی ڈاکا نہیں ڈال سکتا تھا۔ آٹا، گھی، چاول اور اس طرح کی دوسری چیزیں لینے البتہ وہ وہاں جاتے تھے۔ اس کے لئے انہوں نے یہ طریقہ وضع کیا تھا کہ منہ اندھیرے ان میں سے دو تین آدمی وہاں پہنچ جاتے جب بعض دکاندار آنکھیں ملتے ہوئے دکانیں کھول رہے ہوتے تھے سلطانہ کے آدمی ان سے راشن لیتے، باقاعدہ ادائیگی کرتے بلکہ دو چار روپے زیادہ ہی دے دیتے اور بوریاں گھوڑوں پر لاد کر لے آتے۔

ایک بار وہ رات گئے ایک قصبے کے ایک ایسے مکان میں داخل ہوئے جو انہوں نے پہلے سے تاڑا ہوا تھا اور ان کے اندازے کے مطابق کسی خوشحال آدمی کا تھا۔ وہ دروازہ توڑ کر اندر داخل ہوئے تو گھر کی عورتیں خوف سے رونے لگیں۔ گھر کا مالک دھوتی اور بنیان میں تھا۔ وہ آنکھیں

ملتا ہوا اٹھا تھا اور اتنے ڈاکوؤں کو سامنے پا کر اس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ سلطانہ نے رائفل کی نال اس کے سینے پر رکھتے ہوئے جب اسے قریب سے دیکھا تو ایک لمحے کے لئے اپنی جگہ ساکت سا ہو گیا۔ یہ وہی بنیا تھا جسے سلطانہ اور اس کے ساتھیوں نے لڑکپن میں دلی سے واپس آتے وقت ٹرین میں لوٹا تھا۔

سلطانہ اور اس کے دوست اس وقت جارج پنجم کا دربار دیکھ کر دلی سے واپس آ رہے تھے۔ بنئے کے ساتھ اس کی بیوی اور بیٹیاں بھی تھیں۔ سلطانہ نے ان سب کے زیورات اتروا لئے تھے۔ بنئے کی بیوی کے سر سے اتارا ہو منگل سوتر جس میں بہت سا سونا جڑا ہوا تھا' سلطانہ کی شادی کے موقع پر ''موچھ'' کی رقم کے طور پر دیا گیا تھا۔ یہ بات یاد آئی تو سلطانہ کو پتلی اور اس کی ناگہانی موت بھی یاد آ گئی۔ پھر اسے وہ وقت بھی یاد آیا جب قلعے میں پولیس انسپکٹر تیرتھ سنگھ کے سامنے شناختی پریڈ میں بنئے نے اسے پہچان لیا تھا اور تھپڑ مارنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے شناخت کرنے کی وجہ سے ہی سلطانہ کو لمبی سزائے قید ہوئی تھی۔

وہ سب باتیں یاد آئیں اور وہ سب مناظر کسی تیز رفتار فلم کی طرح آنکھوں کے سامنے سے گزرے تو سلطانہ کا ذہن سنسنانے لگا۔ وہ یکدم ہی ساکت سا ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھیوں نے بھی اس کی بدلتی ہوئی کیفیت کو محسوس کر لیا تھا' لیکن وہ اس کی وجہ سمجھنے سے قاصر تھے' کیونکہ انہوں نے بنئے اور اس کی بیٹیوں وغیرہ کو نہیں پہچانا تھا۔ اتنے برسوں میں اس کے خدوخال میں بہت فرق آ گیا تھا۔ اس کی بیٹیوں میں بھی کافی تبدیلیاں آ گئی تھیں۔ اب تو اس کی سب سے چھوٹی بیٹی کی گود میں بھی چھوٹا سا بچہ تھا۔ بنئے نے بھی سلطانہ کو نہیں پہچانا تھا' کیونکہ اس وقت اس کے چہرے پر گھنی داڑھی اور سر پر پگڑی تھی' لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ بنئے کی بیوی نے سلطانہ کو پہچان لیا تھا۔

سلطانہ پر نظر پڑتے ہی گویا اس کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی تھی۔ دوسرے ہی لمحے غیر ارادی سے انداز میں اس کا ہاتھ اپنے سر پر چلا گیا تھا۔ یقیناً اسے اپنا منگل سوتر یاد آ گیا تھا۔ اس کی اسی حرکت سے سلطانہ کو اندازہ ہوا کہ عورت نے اسے پہچان لیا تھا۔ سلطانہ کے ذہن میں زبردست کشمکش جاری تھی۔ بنئے کی دو تین بیٹیوں اور اس کے ننھے سے نواسے کے رونے کی آواز اسے کہیں دور سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ بنئے کو پہچاننے کے باوجود وہ رائفل کا ٹریگر دباتے دباتے رہ گیا تھا۔ چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد اس کے ذہن نے پلٹا کھا

لیا۔

گھر کے مالک کے سینے پر بندوق کی نال رکھنے کے بعد سلطانہ کا پہلا جملہ عام طور یہ ہوتا تھا۔ ''چل بے سود خور...... جلدی بتا...... روپیہ' پیسہ' ہیرا موتی' سونا چاندی اور زیور گہنا کہاں ہے؟''

اس کے ساتھی اس وقت بھی بے تابی سے منتظر تھے کہ وہ مال متاع کے بارے میں بنئے کے منہ سے کچھ اگلوائے تاکہ وہ لوٹ مار شروع کریں' لیکن یہ دیکھ کر ان کی بے چینی میں اضافہ ہو گیا کہ سلطانہ نے بنئے کے سینے سے رائفل کی نال ہٹا لی تھی۔ بنئے نے ایک طویل سانس لی۔ اس کی سانس شاید اب تک سینے میں ہی اٹکی ہوئی تھی۔

سلطانہ سرخ سرخ آنکھوں سے اسے گھورتے ہوئے گھٹی گھٹی سی آواز میں بولا۔ ''کیا میری شکل دیکھ کر تمہیں کچھ یاد نہیں آ رہا؟''

بنئے نے اب ذرا اور غور سے اس کی طرف دیکھا' پھر بے چارگی سے نفی میں سر ہلا دیا۔ سلطانہ نے گویا اسے یاد دلانے کی کوشش کی۔ ''تم نے اس وقت میرے منہ پر تھپڑ مارنے کی کوشش کی تھی' جب میں جواب میں تمہارے منہ پر تھپڑ نہیں مار سکتا تھا۔''

تب بنئے نے یکدم ہی اسے پہچان لیا اور اس کی حالت غیر ہونے لگی۔ اس کے گالوں کا گوشت پھڑکنے لگا۔ اس نے ہاتھ جوڑ دیئے اور گھگھیاتے ہوئے بولا۔ ''مجھے شما کر دیجئے مہاراج...... مجھے معاف کر دیجئے...... وہ میری غلطی تھی...... میں آپ کا دوشی ہوں...... مگر آپ کی بنتی کرتا ہوں...... مجھے جان سے نہ ماریئے۔'' اس نے سلطانہ کے پیروں میں گرنے کی کوشش کی' لیکن سلطانہ پیچھے ہٹ گیا۔

''اگر مجھے تم کو مارنا ہوتا تو اب تک تمہاری لاش ٹھنڈی بھی ہو گئی تھی۔'' سلطانہ خلاف توقع نہایت نرم لہجے میں بولا۔ ''کئی سیکنڈ پہلے میری انگلی لبلبی دباتے دباتے رہ گئی۔ اس وقت کسی کو مارنے کا کیا فائدہ...... جب کوئی کمزور' مجبور اور بے بس ہو...... ہاتھ جوڑ کر آپ سے معافی مانگ رہا ہو۔ سلطانہ میں اور تم جیسے ایک معمولی بنئے میں کوئی فرق تو ہونا چاہئے۔''

پھر اسے گویا کچھ یاد آیا اور وہ زہریلے سے انداز میں ہنسا۔ ''تم نے مجھے مہاراج کہا......؟ تمہیں اچھی طرح پتا ہے میں برہمن نہیں...... ایک گھٹیا ذات کا آدمی ہوں۔ تم جیسے لوگ تو ہمیں اپنی رسوئی میں قدم بھی نہیں رکھنے دیتے۔ غلطی سے اگر ہمارا پاؤں تمہاری رسوئی میں پڑ جائے تو

تم لوگ اسے گنگا جل سے دھوتے ہو...... لیکن اس سے تم جو کچھ کہہ رہے ہو اس کا مطلب ہے جب جان اور مال کو خطرہ ہو تو تم کسی نیچ ذات کو بھی مہاراج کہہ سکتے ہو۔ اسے سر آنکھوں پر بٹھا سکتے ہو؟''

''بس اب غصہ تھوک دیجئے مہاراج میری جو بھی خطا ہے اسے بھول جائیے...... اس گھر میں جو کچھ بھی موجود ہے وہ سب لے جائیے...... بس ہماری جان بخش دیجئے۔'' اس نے ایک بار پھر سلطانہ کے پاؤں پکڑنے کی کوشش کی۔ سلطانہ نے اس بار بھی اس کی کوشش ناکام بنادیا۔

''مجھے تمہارا مال بھی نہیں چاہئے......'' سلطانہ بولا۔ ''دادا نے ڈکیتی کے جو اصول بتائے تھے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ زندگی میں ایک بار جس آدمی کو لوٹ لو اسے دوبارہ کبھی نہ لوٹنا۔ ہم بہت سال پہلے تمہیں لوٹ چکے ہیں بے خبری میں تمہارے گھر میں ضرور آگئے لیکن اب تمہیں پہچان لیا ہے تو دوبارہ ہرگز نہیں لوٹیں گے۔ بس...... اب تم بے فکر ہو کر آرام سے سو جاؤ ہم چلتے ہیں......'' وہ واپسی کے لئے مڑ گیا۔

اس کے ساتھی اس کے فیصلے پر کچھ مضطرب تھے لیکن سردار کے سامنے کچھ بول نہیں سکتے تھے۔ اس لئے اس کی تقلید میں انہوں نے بھی بندوقیں جھکا لیں اور واپسی کیلئے مڑے۔ بنئے اور اس کے پورے کنبے کی آنکھیں حیرت سے پھیلی ہوئی تھیں۔ انہیں شاید اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ پھر بنیا گویا کسی خواب سے چونکا اور لپک کر اس کا بازو پکڑتے ہوئے بولا۔ ''مہاراج! آپ ساہوکار دیانند کے گھر سے بھوجن کئے بغیر نہیں جاسکتے...... میری پتنی اور بیٹیاں ذرا سی دیر میں آپ سب کیلئے کھانا تیار کردیں گی۔ آپ کھانا کھائے نہیں جاسکتے۔''

سلطانہ نے ترچھی نظر سے اس کے ہاتھ کو دیکھا جس سے اس نے سلطانہ کا بازو پکڑا ہوا تھا۔ وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''ساہوکار جی یہ آپ کیا کررہے ہیں؟ آپ نے اپنے ہاتھ سے ایک نیچ ذات کا بازو پکڑ لیا؟ اب تو آپ کو اشنان کرنا پڑے گا اگر پوری طرح نہیں نہائے تب بھی کم سے کم ہاتھ تو دھونا ہی پڑے گا وہ دیکھئے...... آپ کی پتنی بھی آپ کی اس حرکت پر غصے سے آپ کی طرف دیکھ رہی ہیں۔''

بنئے کی بیوی نے گھبرا کر جلدی سے اپنے شوہر کی طرف سے نظر ہٹالی اور ذرا کھسیانی سی نظر آنے لگی۔ بنیا ایک بار پھر ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ''مہاراج! آپ آج ہمیں جتنا چاہے ذلیل کرلیجئے ہمیں معلوم ہوگیا ہے کہ یہ اونچی نیچی ذات والی ساری باتیں غلط ہیں۔ سب انسان برابر

ہیں...... بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ آج ہم خود کو آپ کے سامنے نیچ ذات محسوس کررہے ہیں۔ ہم بنتی کرتے ہیں کہ ہماری طرف سے آپ کے دل میں جو میل آیا ہوا ہے اسے نکال دیجئے۔ ہماری غلطی کو معاف کردیجئے۔''

''غلطی معاف کردی ہے تبھی تو واپس جارہے ہیں۔'' سلطانہ بولا۔

''لیکن جب تک آپ ہمارے گھر میں کھانا نہیں کھائیں گے ہم سمجھیں گے کہ آپ نے ہمیں معاف نہیں کیا۔'' ساہوکار دیانند نے ایک بار پھر سلطانہ کا بازو پکڑ لیا اور اسے طویل و عریض برآمدے کی طرف کھینچنے لگا جہاں قالین بچھا ہوا تھا۔

اس کے اصرار کے سامنے آخرکار سلطانہ اور اس کے ساتھیوں کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔ انہوں نے اس کی دعوت قبول کرلی اور قالین پر جا بیٹھے۔ بنئے کی ایک بیٹی نے پانی کا لوٹا پکڑا اور دوسری نے سلفچی اٹھالی۔ وہ دونوں یوں سب ڈاکوؤں کے ہاتھ دھلانے لگیں جیسے وہ انتہائی معزز مہمان ہوں۔ لڑکیوں کا انداز خادماؤں والا تھا۔ سلطانہ کو یہ ساری صورتحال خاصی ستم ظریفانہ سی لگ رہی تھی۔ وہ لوگ زندگی میں شاید پہلی بار ایسے معززانہ انداز میں کھانا کھانے بیٹھے تھے۔

ساہوکار بنئے کے گھر میں ہلچل سی برپا ہوگئی تھی۔ اس کی بیوی اور بیٹیاں جلدی جلدی کھانا پکانے میں جت گئیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے ان کے گھر میں ڈاکوؤں کی بارات آگئی ہو۔ وہ تو غنیمت تھا کہ بنئے کا گھر خاصا وسیع تھا اس لئے سب آدمی اور ان کے گھوڑے آسانی سے اندر کھپ گئے تھے۔ جلد ہی گرما گرم اور گھی میں تر تراتے پراٹھے اور دال کی تھالیاں ان کے سامنے آگئیں جن میں مکھن بھی پڑا ہوا تھا۔ اچار کی خوشبو سے بھی فضا مہک رہی تھی۔ ایک طویل عرصے بعد انہیں ایسا تازہ اور گرما گرم کھانا نصیب ہوا تھا۔ کسی کو بھی یاد نہیں رہا کہ وہ کتنے پراٹھے کھا گیا۔ خوب شکم سیر ہو کر کھانے کے بعد انہوں نے کورے مٹکوں کا ٹھنڈا ٹھنڈا پانی پیا تو ان پر خمار سا طاری ہوگیا۔ انہوں نے گاؤ تکیوں سے ٹیک لگایا تو بس بیٹھے ہی رہ گئے۔ اب ان کا گویا وہاں سے اٹھنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ ان کی بندوقیں ایک طرف دیوار کے ساتھ لگی کھڑی تھیں۔

بنیا ایک ادنیٰ خادم کی طرح ایک طرف ہاتھ جوڑے کھڑا تھا۔ بھورے نے مخمور سے انداز میں ہنستے ہوئے اسے مخاطب کیا۔ ''اگر اس وقت کسی طرح تم پولیس کو ہمارے بارے میں خبر کردو تو ہم اس طرح ان کے قابو میں آجائیں گے جیسے چوہے دان میں پھنسے ہوئے چوہے......''

''اب میں ایسی غلطی کبھی نہیں کرسکتا سرکار!'' ساہوکار دیانند عاجزی سے بولا۔

سلطانہ اٹھتے ہوئے بولا۔ ”اس سے پہلے کہ کوئی اور ایسی غلطی کرے، ہمیں یہاں سے روانہ ہو جانا چاہئے۔“

اس نے بنئے کا شکریہ ادا کیا اور وہ لوگ اس قصبے میں ڈاکا مارے بغیر واپس چلے گئے۔ راستے میں بھورے نے دیانند کے بارے میں بات کرتے ہوئے سلطانہ سے کہا۔ ”بنئے کی تو کایا ہی پلٹ گئی۔“

سلطانہ اس کی طرف دیکھ کر گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”پھر بھی میرا تمہیں مشورہ یہی ہے کہ کسی بنئے پر کبھی بھروسہ نہ کرنا۔“

”اچھا......؟“ بھورے نے قدرے حیرت سے سر ہلایا۔

”ہاں......“ سلطانہ بولا۔ ”اگر چاہو تو کسی وجہ سے بنئے کے ساتھ مہربانی کا سلوک ضرور کرو، لیکن اسے کبھی دوست مت سمجھنا اور اس کی طرف پیٹھ کر کے کبھی بے فکر نہ ہو جانا، کچھ پتا نہیں وہ کب، کس وجہ سے تمہاری پیٹھ میں خنجر گھونپ دے۔“

اس کے بعد کچھ عرصے کے دوران ان لوگوں کے درمیان ساہوکار دیانند کا تذکرہ ہوتا رہا۔ ان کی زندگی میں ہر تھوڑے عرصے بعد کوئی نہ کوئی ایسا واقعہ ضرور پیش آ جاتا جو قدرے غیر معمولی اور ذرا عجیب ہوتا تھا۔ ایک بار وہ ڈاکا مار کر واپس آ رہے تھے اور صبح کا اجالا نمودار ہو چکا تھا۔ اچانک نہ جانے کس طرف سے ایک بڑا سا کتا نمودار ہوا اور بھونکتا ہوا ان کے پیچھے آنے لگا۔ سلطانہ کو اس کے بھونکنے سے الجھن ہونے لگی۔ اس نے گھوم کر دیکھتے ہوئے اس پر گولی چلا دی، مگر وہ بچ گیا۔

سلطانہ کو اس پر حیرت ہوئی کیونکہ چلتے گھوڑے پر بھی اس کا نشانہ خطا نہیں ہوتا تھا۔ کتے کا بھونکنا کم ہو گیا، لیکن وہ بدستور ان کے پیچھے آتا رہا۔ سلطانہ نے کئی بار مڑ کر اس کی طرف دیکھا، لیکن دوبارہ اس پر گولی نہیں چلائی حتیٰ کہ وہ ان کے کیمپ تک ان کے سامنے آ گیا۔ سلطانہ ایک چارپائی پر بیٹھا تو کتا اس کے پیروں کے پاس بیٹھ گیا۔ سلطانہ چند لمحے غور سے اس کی طرف دیکھتا رہا، پھر اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوا۔ ”یہ اگر میری گولی سے بچ گیا ہے اور یہاں تک پہنچ گیا ہے تو شاید کوئی نظر نہ آنے والی شکتی اس کی حفاظت کر رہی ہے اور شاید اسی نے اسے یہاں بھیجا ہے۔“

پھر ایک لمحے سوچ کر وہ بولا۔ ”اب ہم اس سے اپنی رکھوالی کا کام لیں گے۔ ہم اسے

سکھائیں گے کہ یہ کیمپ کے اردگرد گھومتا پھرتا رہا کرے اور اگر دور سے کسی کو آتے دیکھے گا تو بھونک کر ہمیں خبردار کر دیا کرے گا۔ انگریز سرکار اپنے وفاداروں کو رائے بہادر کا خطاب دیتی ہے۔ یہ ہمارا وفادار ہو گا، اس لئے میں بھی اس کا نام رائے بہادر رکھ رہا ہوں۔“

کتے کا حال گو کہ اس وقت اچھا نہیں تھا، لیکن وہ کسی اچھی نسل کا معلوم ہوتا تھا۔ شاید کسی وجہ سے کسی نواب یا جاگیردار کے کتا خانے سے نکل آیا تھا۔ وہ وہیں رہ گیا اور تھوڑے دنوں میں اس کی صحت بہت اچھی ہو گئی۔ وہ واقعی ایک بہترین کتا تھا اور رکھوالی کا کام بہت اچھی طرح کرنے لگا تھا۔ تاہم رات کو وہ سلطانہ کے پیروں کے پاس سوتا تھا۔ کسی ڈاکے پر جاتے وقت سلطانہ سے درخت کے ساتھ باندھ جاتا۔ وہ لوگ واپس آتے تو وہ بہت جوش و خروش سے اچھل کود کر ان کا استقبال کرتا۔

ایک روز سلطانہ کو نہ جانے کیا سوجھی کہ وہ ایک خاصا طویل سفر کر کے اکیلا گجندر سنگھ کے باپ کو دیکھنے جا پہنچا کہ وہ کس حال میں ہے۔ اس نے گجندر کو بھی نہیں بتایا کہ وہ اس کے باپ کو دیکھنے جا رہا ہے۔ گجندر نے اس دوران کبھی اپنے باپ کا ذکر نہیں چھیڑا تھا، لیکن سلطانہ میں سوچا کرتا تھا کہ اسے کبھی نہ کبھی اپنے باپ کی یاد تو آتی ہو گی اور شاید اس بات پر افسوس ہوتا ہو کہ وہ اسے چھوڑ آیا تھا۔ تاہم اسے کبھی گجندر سے اس موضوع پر بات کرنے کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔

وہ جب گجندر کے باپ کی زمین پر پہنچا تو رات کا وقت تھا۔ آسمان پر آدھے سے زیادہ چاند چمک رہا تھا۔ گجندر کا باپ اس وقت بھی اپنی مچان پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے پاس اب ایک اور پرانی سی بندوق تھی، جس کا کنڈا ٹوٹا ہوا تھا۔ شاید وہ ایک عرصے سے فائر کرنے کے قابل نہیں رہی تھی، لیکن گجندر کا باپ اسے سینے سے لگائے بیٹھا تھا۔ سلطانہ نے مچان کے نیچے عین اسی جگہ گھوڑا لے جا روکا، جہاں وہ کافی عرصہ پہلے آ کر رکا تھا اور گجندر کے باپ نے اسے خوب جھاڑا پھٹکارا تھا۔

گجندر کے باپ نے دور ہی سے اسے دیکھ کر بندوق سیدھی کر لی تھی، لیکن لبلبی نہیں دبائی۔ جب سلطانہ اس کے قریب پہنچ کر رکا اور چاندنی اس کے چہرے پر پڑی تو اسے پہچان کر گجندر کے باپ کے ہاتھوں سے بندوق گر گئی۔ پھر وہ خود بھی گرنے ہی کے سے انداز میں چھلانگ لگا کر مچان سے نیچے آ گیا اور سلطانہ کے پاؤں کو ہاتھ لگا کر چومنے لگا۔ پھر اس نے زور زور سے نعرہ لگانا شروع کر دیا۔ ”سلطانہ ڈاکو کی جے...... سلطانہ ڈاکو کی جے......“

"خاموش......" آخر سلطانہ نے ڈانٹ کر اسے چپ کرایا۔ "میں یہاں تم سے اپنی جے جے کار کرانے نہیں آیا۔" اسے اس بات پر قطعی حیرت نہیں ہوئی کہ اس کی شہرت...... یا رسوائی گجندر سنگھ کے باپ تک بھی پہنچ گئی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اس کے افسانے پورے خطے میں پھیلتے جا رہے تھے۔ جنگلوں اور بیابانوں میں بیٹھے ہوئے لوگ بھی اس کے نام سے آگاہ ہو چکے تھے اور اس کی ایک خاص قسم کی دہشت روہیل کھنڈ سے بھی بہت آگے تک پھیل چکی تھی۔

"تو پھر کس لئے آئے ہو؟" گجندر کے باپ نے سادگی سے پوچھا۔

"میں تو بس یونہی دیکھنے آ گیا تھا کہ تم کس حال میں ہو۔" سلطانہ نے جواب دیا۔

"میں ٹھیک ہوں...... مجھے کچھ نہیں ہوا...... مگر پھر بھی تم میرا بیٹا مجھے واپس کر دو۔" گجندر کا باپ بولا۔ اس کے لہجے میں ایک بار پھر پرانی اکڑ اور ضد جھلکنے لگی تھی۔

"اسے میں تم سے چھین کر نہیں لے گیا ہوں۔ وہ خود میرے پاس آیا تھا...... اور سچی بات تو یہ ہے کہ تم نے اسے دھکے دے کر میرے پاس بھیجا تھا۔ تم بہت کٹھور آدمی ہو۔ باپوں جیسے باپ نہیں ہو۔ تمہارے دل میں اولاد کیلئے وہ محبت نہیں ہے جو ایک باپ کے دل میں ہونی چاہئے...... اور اب تو ویسے بھی اس کا تمہارے پاس آنا ٹھیک نہیں ہے۔ پولیس فوراً اسے پکڑ کر لے جائے گی۔" سلطانہ تلخی سے بولا۔

"ہاں...... یہ بات تو ہے۔" گجندر کے باپ نے داڑھی کھجاتے ہوئے تسلیم کیا۔ "پولیس دو تین بار اس کے بارے میں پوچھ گچھ کرنے آئی تھی۔ ایک بار تو انہوں نے مجھے لے جا کر دو تین دن کیلئے حوالات میں بھی بند کر دیا تھا۔ شکر ہے مارا پیٹا نہیں۔"

"بس...... گجندر کی طرف سے اب صبر کر لو، وہ خود بھی تمہارے پاس آنا نہیں چاہتا۔" سلطانہ نے کہا۔ پھر اس نے اپنے لبادے میں سے ایک تھیلی نکالی اور گجندر کے باپ کو تھماتے ہوئے کہا۔ "یہ رکھ لو...... ہزار روپے ہیں، ان سے اپنے لئے دو بیل اور ضرورت کی کچھ چیزیں خرید لو، اپنی دو بیگھہ زمین پر ہل بھی تم خود ہی چلاتے ہو۔ میں چاہتا ہوں تمہیں اس مشقت سے چھٹکارا مل جائے۔"

"جیتا رہ...... جیتا رہ میرے بچے......" گجندر کے باپ کا لہجہ یکدم بدل گیا۔ "اس کا مطلب ہے تمہارے بارے میں لوگ باگ جو باتیں کرتے ہیں، وہ ٹھیک ہی ہیں۔......" پھر اس نے تھیلی ہوا میں بلند کر کے نعرہ لگایا۔ "سلطانہ ڈاکو کی جے......"

"بس...... بس......" سلطانہ نے ہاتھ اٹھا کر فوراً اسے روکا۔ "میرا ڈھنڈورا پیٹنے کی ضرورت نہیں۔"

اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔

اس سال بہت بارشیں ہوئیں۔ سلطانہ نے سنا تھا کہ کسی بہت بڑے سادھو سنت نے ہردوار میں گنگا کے کنارے بیٹھ کر کوئی خاص پوجا کی تھی اور دیوتاؤں سے بارش کی دعا مانگی تھی۔ دیوتاؤں نے اس کی دعا سن لی تھی اور کچھ زیادہ ہی بارشیں برسا دی تھیں۔ جنگل جل تھل ہو گئے تھے۔ ان لوگوں کے کیمپ کے گرد جو گھاس پھیلی ہوئی تھی، وہ حصہ دلدلی سا ہو گیا تھا۔ کیمپ کے قریب جو نالا بہہ رہا تھا، اس میں طغیانی آ گئی تھی اور کبھی کبھی اس کا پانی کیمپ تک آ جاتا تھا۔ اس روز بھی ایسے ہی طوفانی سے موسم میں سلطانہ اور اس کے ساتھی اپنی جھونپڑیوں میں سکڑے سمٹے بیٹھے تھے۔ آسمان پر گہرے سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے۔ بجلی کڑک رہی تھی اور بادلوں کی خوفناک گرج سن کر سلطانہ کا کتا 'رائے بہادر' کانپنے لگا تھا۔ تیز ہواؤں سے جھونپڑیوں کے در و دیوار لرز رہے تھے۔ لکڑی کے تختوں، گھاس پھوس اور مٹی سے بنی ہوئی چھتیں ٹپکنے لگی تھیں۔ لکڑی کی ان الماریوں تک میں پانی چلا گیا تھا، جن میں اسلحہ اور گولہ بارود رکھا رہتا تھا۔

انہیں اس کیمپ میں رہتے ہوئے ایک سال ہو چلا تھا اور ابھی تک پولیس کو ان کی اس کمین گاہ کا پتا نہیں چلا تھا۔ تاہم سلطانہ ہر ہفتے دس دن میں ایک مرتبہ گجندر سنگھ کو ارد گرد کے علاقے اور نجیب آباد والے قلعے کے حالات معلوم کرنے کے لئے بھیجتا رہتا تھا۔ آج صبح چونکہ بارش نہیں ہو رہی تھی، اس لئے سلطانہ نے گجندر کو اسی کام کے لئے روانہ کر دیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد بارش شروع ہو گئی تھی جو رفتہ رفتہ تیز ہو گئی تھی۔ اب شام ہونے کو تھی اور شام سے پہلے ہی اندھیرا سا پھیلنے لگا تھا۔ گجندر ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ اب تو سلطانہ کو بھی اس کے بارے میں تشویش ہونے لگی تھی۔ بارش میں بندوق کے ناکارہ ہونے کا خطرہ تھا، اس لئے انہوں نے ڈاکے کی غرض سے بھی کہیں جانے کا پروگرام نہیں بنایا تھا۔

آخر کار مچان پر بیٹھے ہوئے ایک نوجوان نے اطلاع دی کہ گجندر آ رہا ہے۔ گھاس والے حصے کے قریب پہنچ کر گجندر چھلانگ لگا کر گھوڑے سے اتر آیا اور محفوظ راستہ تلاش کر کے کیمپ کی سمت آنے لگا، ورنہ وہ گھوڑے سمیت گھاس والی دلدلی زمین میں ڈوب سکتا تھا۔ وہ کچھ گرتا پڑتا سا کیمپ میں پہنچا۔ سلطانہ نے خود جھونپڑی سے باہر آ کر اس کا استقبال کیا۔ وہ بہت تھکا ہوا

دکھائی دے رہا تھا' مگر اس کے باوجود خوش معلوم ہوتا تھا۔

"سلطانہ...... آج میں تمہارے بیٹے کو دیکھ کر آ رہا ہوں۔" اس نے گویا سلطانہ کو کوئی اہم خبر سنائی۔ "آج میں گھومتا پھرتا کاشی پور کی طرف جا نکلا تھا۔ تمہیں پتا ہے وہ پورے دو سال کا ہو گیا ہے؟"

"میرا بیٹا...... راجکمار...... دو سال کا ہو گیا......؟" سلطانہ کے ہونٹوں سے سرسراتی سی آواز نکلی۔ اس کے دل سے تاسف کی ایک لہر سی ابھری اور اس لمحے اسے اپنا وجود بہت کمزور محسوس ہوا۔ اس نے آخری بار اپنے بیٹے کو اس وقت دیکھا تھا' جب وہ چھ ماہ کا بھی نہیں ہوا تھا۔ اس کے بعد سے زندگی نے مہلت ہی نہیں دی تھی اور حالات بھی کچھ ایسے رہے تھے کہ وہ کاشی پور جا ہی نہیں سکا تھا۔ دو تین بار اس نے ارادہ بھی کیا' لیکن ہر بار کوئی نہ کوئی بری خبر آ گئی' کوئی نہ کوئی خطرہ لاحق ہو گیا۔

"کیسا ہے وہ......؟" ایک لمحے بالکل گم صم رہنے کے بعد سلطانہ نے بے تابی سے گجندر کے ہاتھ تھامتے ہوئے پوچھا۔

"بہت اچھا ہے...... اچھے حال میں ہے...... اس بے اولاد جوڑے نے اسے بہت اچھی طرح رکھا ہوا ہے۔ لگتا ہے وہ دل و جان سے اسے چاہتے ہیں اور بڑے پیار سے اس کی پرورش کر رہے ہیں۔" گجندر نے بتایا۔ سلطانہ کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔

"وہ جب پانچ چھ سال کا ہو جائے گا تو میں اسے اپنے پاس لے آؤں گا۔" وہ بے ساختہ بول اٹھا۔

"یہ ان کے ساتھ زیادتی ہو گی۔" گجندر نے گویا جرأت سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "ان کی جو بھی حیثیت ہے' اس کے حساب سے وہ اسے راجکماروں کی طرح ہی رکھ رہے ہیں' خاص طور پر وہ عورت...... اس کی منہ بولی ماں تو اس سے بہت ہی پیار کرتی ہے۔ آج جب میں وہاں پہنچا تو وہ اس کا دوسرا جنم دن منا رہے تھے' اسے خوب بنا سنوار رکھا تھا۔ وہ سچ مچ راجکمار...... یا پھر ننھا سا دولہا لگ رہا تھا۔ اس کی منہ بولی ماں خوشی سے نہال ہو رہی تھی اور پورے گاؤں میں جلیبیاں اور لڈو بانٹتی پھر رہی تھی۔ مجھے تو یہ سوچنا بھی مشکل لگتا ہے کہ اگر تم نے اس عورت سے اس کا بیٹا...... میرا مطلب ہے' اگر تم نے اس عورت سے اپنا بیٹا واپس لے لیا تو وہ کیسے جیئے گی؟ مجھے تو آج تک پتا ہی نہیں تھا کہ کسی کے دل میں لے پالک اولاد کے لئے اتنا پیار ہو سکتا ہے۔"

گجندر کی باتیں سن کر سلطانہ کو چپ سی لگ گئی۔ کئی لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ بولا۔ "چلو...... خیر...... جب وقت آئے گا تو دیکھیں گے کہ کیا کرنا چاہئے اور کیا نہیں...... ویسے بھی...... کیا پتا تقدیر میں کیا لکھا ہے۔" اس کے چہرے پر کرب سا اُبھر آیا تھا۔ گو کہ اس وقت وہ یقینی طور پر اپنی اندرونی کیفیات کو چھپائے رکھنے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔ وہ اکثر ہی کوشش کرتا تھا کہ اس کے اصلی جذبات اور احساسات اس کے چہرے سے ظاہر نہ ہوں۔

چند لمحے کی خاموشی کے بعد گجندر نے بھورے کو مخاطب کیا۔ "تمہاری بیوی میکے میں ہے اور ٹھیک ٹھاک ہے' وہ تمہیں بہت یاد کرتی ہے۔ شکر ہے پولیس نے اسے تنگ نہیں کیا۔"

بیوی کے ذکر پر بھورے کی حالت عجیب سی ہو گئی۔ اس نے سلطانہ کی طرف دیکھا اور التجائیہ سے لہجے میں بولا۔ "سلطانہ...... اگر تمہاری اجازت ہو تو میں اپنی بیوی کو یہاں لے آؤں؟ اب تو ہمارے پاس رہنے کو جگہ ہے......"

"دماغ تو ٹھیک ہے تمہارا......؟" سلطانہ سرخ سرخ آنکھوں سے اسے گھورتے ہوئے غرّا اٹھا۔ "بیوی کو یہاں رکھو گے؟ پچیس چھڑے چھانٹ مردوں کے بیچ میں؟"

اس وقت تک گروہ میں پانچ آدمیوں کا اور اضافہ ہو چکا تھا۔ اب گروہ پچیس آدمیوں پر مشتمل تھا۔

"تو کیا ہوا......؟" بھورے عاجزی سے بولا۔ "باقی سب تو اس کے دیور' جیٹھ بلکہ بھائیوں کی طرح ہوں گے۔ ہم اپنا کچھ الگ رہنے کا بندوبست کر لیں گے...... کھانے پکانے کا بھی سب کو کچھ نہ کچھ آرام ہو جائے گا۔ وہ بڑی محنتی اور سگھڑ لڑکی ہے...... رام قسم اب پتنی کے بغیر رہنا بہت مشکل ہوتا جا رہا ہے۔" وہ اٹک اٹک کر بول رہا تھا۔

"ابے...... ہم باقی سب کیا برف کے بنے ہوئے ہیں جو بیویوں کے بغیر رہ رہے ہیں؟ اور مجھے دیکھ...... میں تو بیٹے کے بغیر بھی رہ رہا ہوں۔" سلطانہ کے لہجے میں تیزی آ گئی۔

"تمہاری بات اور ہے...... تمہاری بیوی مر گئی ہے نا...... بیوی مر جائے تو مرد کو صبر سا آ جاتا ہے مگر جس کی بیوی زندہ ہو اور میاں' بیوی دونوں ایک دوسرے کی یاد میں تڑپ رہے ہوں تو بات کچھ اور ہوتی ہے۔" بھورے گویا اسے قائل کرنے کی کوشش جاری رکھے ہوئے تھا۔

✣...... ✦ ......✣

سلطانہ نے قہر آلود نظروں سے بھورے کی طرف دیکھا اور ایک لمحے کی خاموشی کے بعد فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ ''میں اس سلسلے میں تم سے بحث کرنا نہیں چاہتا۔ اگر تم بیوی کی یاد میں اتنا ہی تڑپ رہے ہو تو تم اس کے پاس واپس جاسکتے ہو اور اگر اسے بلانا چاہتے ہو تو خود یہاں سے کہیں اور چلے جاؤ۔ وہیں اسے بلا لینا۔ اس کیمپ میں بہرحال کوئی عورت اور کوئی بچہ نہیں رہ سکتا۔ چاہے وہ میری بیوی اور میرا بچہ ہی کیوں نہ ہو......''

ایک لمحے کیلئے رک کر اس نے گویا اپنے اندر ابلتے ہوئے غصے پر قابو پانے کی کوشش کی' پھر سلسلۂ کلام جوڑا۔ ''کسی بھی عورت یا بچے کی موجودگی گروہ کو کمزور کردے گی۔ جیسے تیسے ہم اپنی حفاظت تو کرلیں گے۔ دشمن سے بھی لڑیں گے' لیکن عورت اور بچے کی حفاظت کرنا بہت مشکل ہوگا۔ انہیں بچاتے بچاتے ہم خود مارے جائیں گے۔ یہ خیال دل سے نکال دو...... یا پھر خود گروہ سے نکل جاؤ۔''

صرف بھورے ہی نہیں' دوسرے ساتھی بھی دم بخود سے بیٹھے رہ گئے۔ وہ بے یقینی سے سلطانہ کی طرف دیکھتے رہ گئے۔ انہیں توقع نہیں تھی کہ سلطانہ' بھورے سے بھی اتنے دوٹوک انداز میں بات کرے گا۔ وہ سلطانہ کا نائب تھا اور سلطانہ کے بعد گروہ میں وہی سب سے زیادہ دلیر اور باصلاحیت نوجوان تھا۔ سلطانہ اسے دایاں بازو کہتا تھا' لیکن آج وہ اس بازو کو اپنے وجود سے الگ کرنے پر بھی تیار تھا۔

دراصل ان پڑھ اور گنوار سلطانہ نے بھی اپنی اس نئی زندگی کے آغاز پر' تھوڑے ہی عرصے میں بہت سی کام کی باتیں سمجھ لی تھیں۔ بہت سے نکتے خود بخود اس کے ذہن میں بیٹھ گئے تھے۔ کوئی غیبی قوت جیسے اسے سب کچھ سمجھاتی تھی۔ اس نے دل ہی دل میں اپنے لئے جو اصول مرتب کئے تھے' ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ اسے گروہ میں بڑی سخت پابندیاں اور نظم وضبط رکھنا

ہے۔ اس کا گروہ دراصل اس کا چھوٹا سا لشکر تھا اور اسے معلوم تھا کہ لشکر نظم وضبط کے بغیر نہیں چلتے۔ اسے تو اس لئے اور بھی زیادہ ہوشیار رہنا تھا کہ اس کے چاروں طرف دشمن ہی دشمن تھے۔ اس کا کوئی ایک دشمن نہیں تھا کہ اس سے نپٹ کر وہ آرام سے بیٹھ جاتا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ جس جنگ میں کود پڑا ہے' اس کا اختتام اس کی موت پر ہی ہوگا۔ اگر وہ کسی کمزوری کو خود پر غالب نہ آنے دیتا تو شاید زیادہ دیر تک موت سے آنکھ مچولی کھیل سکتا تھا۔

بھورا یکدم ہی جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ اس کا منہ لٹک گیا۔ تب سلطانہ نے نرمی سے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ''اپنے جذبات پر قابو پانا اور ان سے دھیان ہٹانا سیکھو۔ یہ بس ایک وقتی اُبال ہوتا ہے۔ اس کے آگے ہتھیار ڈالنا ہم جیسے لوگوں کے لئے بالکل ٹھیک نہیں۔ انسان کا دل تو بہت کچھ چاہتا ہے' لیکن کبھی کبھی اس کی کوئی تمنا اسے موت کے منہ میں بھی لے جاتی ہے۔''

پھر اس کی آواز کچھ اور دھیمی ہوگئی۔ وہ انگلی سے اپنے سینے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''مجھے دیکھو...... میرا بیٹا آج دو سال کا ہوگیا ہے۔ اس کا جنم دن منایا جارہا ہے۔ وہ دولہا بنا بیٹھا ہے۔ میں اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے تڑپ رہا ہوں' لیکن اسے دیکھنے نہیں جاسکتا' کیونکہ اس وقت اسے دیکھنے جانا مناسب نہیں ہے۔ اگر میں اندر ہی اندر اپنے آپ سے لڑسکتا ہوں تو تم بھی لڑسکتے ہو۔''

وہ خاموش ہوا تو بڑے سے جھونپڑے میں سکوت چھا گیا۔ ہلکی ہلکی بارش اب بھی جاری تھی۔ اس کی ٹپ ٹپ کے سوا کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ چرند' پرند اور درندے بھی نہ جانے کہاں دبکے ہوئے تھے۔

چند لمحے کی خاموشی کے بعد سلطانہ نے بھرائی ہوئی سی آواز میں نکیشر اور پریتم کو حکم دیا۔
''ٹھنڈائی بناؤ' سب کو پلاؤ' خوب پلاؤ......''

ٹھنڈائی تیار ہونے میں خاصی دیر لگتی تھی۔ جب تیار ہوگئی تو سب مٹی کے پیالے بھر بھر کر پینے لگے۔ وہ گویا اپنے اپنے اندر کا غم غلط کرنے کی کوشش کررہے تھے۔ تھوڑی دیر میں سب سرور میں آگئے اور کچھ دیر پہلے کی تلخ سی صورت حال گویا بھول گئے۔ سب ہنسی مذاق کرنے لگے۔ ایک دوسرے کو چھیڑنے لگے۔ اب اگر کوئی وہاں کی جھانکتا تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کچھ دیر پہلے وہاں کی فضا کیسی بوجھل تھی۔ سلطانہ کو سرور کے عالم میں اس بات کی زیادہ خوشی محسوس ہوئی کہ وہ ایک نازک اور مشکل صورتحال کو سنبھالنے میں کامیاب رہا تھا۔

اچانک سلطانہ خمار زدہ سے لہجے میں بولا۔ ”جب میرا بیٹا پانچ چھ سال کا ہو جائے گا تو میں اسے اپنے پاس لے آؤں گا۔ میں اس کی منہ بولی ماں کے پاؤں پکڑ لوں گا...... اس کی منت خوشامد کر لوں گا...... وہ اسے میرے ساتھ آنے کی اجازت دے دے گی۔ اس وقت تک وہ ہمارے ساتھ رہنے کے قابل ہو جائے گا۔ میں ایسا انتظام کر دوں گا کہ وہ پانچ چھ سال کی عمر تک گھڑسواری اور بندوق چلانا سیکھ لے۔ میں اس کیلئے ایک آدمی گاؤں میں چھوڑ دوں گا جو اسے یہ سب کچھ سکھائے گا۔ پھر وہ ہمارے ساتھ رہے گا تو کسی کو کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ تم میں سے کسی کو شکایت کا موقع نہیں ملے گا......“

کسی نے اس کی بات پر اعتراض نہیں کیا۔ گجندر تو ٹھنڈائی کا پیالا اونچا کرتے ہوئے مخمور سے لہجے میں بولا۔ ”شکایت کیسی؟ ہم سب اس سے پیار کریں گے۔ وہ ہمارا سب سے چھوٹا ساتھی ہوگا...... ہم سب کا اکلوتا بھتیجا ہوگا......“

سب نے مختلف آوازیں بلند کر کے گویا اس کی تائید کی۔ سلطانہ جذبات سے مغلوب لہجے میں بولا۔ ”مجھے تم سب سے یہی امید تھی۔“



دوسرے روز وہ ایک چھوٹے سے گاؤں کو لوٹنے چلے گئے‘ جہاں انہوں نے ایک گولی بھی نہیں چلائی‘ کیونکہ ان کی بندوقوں میں پانی چلا گیا تھا۔ انہوں نے احتیاطاً اپنی بندوقیں اور رائفلیں استعمال نہیں کیں۔ ان کی جگہ انہوں نے خنجر اور تلواروں سے کام چلایا اور گاؤں کے ہر دکاندار اور خوشحال دکھائی دینے والے ہر شخص کو لوٹ لیا۔ اس کے باوجود کچھ زیادہ مال ان کے ہاتھ نہیں لگا۔ شاید بارشوں کی وجہ سے کام دھندا مندا تھا۔

کم مال ہاتھ لگنے کے باوجود سلطانہ خوش تھا۔ ڈاکا ڈالنے میں اسے جو لطف آتا تھا‘ اس کے لئے وہی کافی ہوتا تھا۔ جب موٹی توندوں والے بنئے اور شکلوں سے ہی چالاک دکھائی دینے والے ٹھاکر اس کے سامنے تھر تھر کانپتے تھے تو اندر ہی اندر اسے ایک عجیب سی خوشی کا احساس ہوتا تھا۔

ویسے تو اس خوشی کا آغاز اسی وقت سے ہو جاتا تھا جب ان کے گھوڑے دندناتے ہوئے کسی گاؤں یا قصبے میں داخل ہوتے تھے اور خوف و دہشت کی لہر ایک سرے سے دوسرے سرے تک دوڑ جاتی تھی۔ اس روز انہیں دکانداروں کے نقدی کے صندوقچوں اور خوشحال لوگوں کے

گھروں میں‘ دیواروں میں نصب تجوریوں میں زیادہ مال نہیں ملا‘ لیکن اس سے سلطانہ کی سخاوت میں کوئی کمی نہیں آئی۔

وہ جب گاؤں سے نکلنے لگے تو حلیوں سے ہی بدحال اور غریب دکھائی دینے والے بہت سے لوگ ان کے راستوں میں دیواروں سے لگے کھڑے تھے۔ وہ نعرے لگانے لگے۔ ”سلطانہ ڈاکو کی جے...... سلطانہ ڈاکو کی جے......“

سلطانہ نے حسب روایت لوٹ کے مال میں سے سکے اور نوٹ ان کی طرف اچھالنے شروع کر دیئے۔ یہ اس کی خوشی کے لمحات کا نقطۂ عروج ہوتا تھا‘ جب وہ لوٹا ہوا مال غریبوں میں لٹاتا تھا۔ وہ اپنے ساتھیوں سے بھی روپیہ پیسہ لے کر لٹاتا چلا گیا۔ حتیٰ کہ اس نے دو چند زیورات بھی ہوا میں اچھال دیئے جو اس گاؤں سے بمشکل ان کے ہاتھ لگے تھے۔

وہ جب اپنی پناہ گاہ میں واپس پہنچے اور سلطانہ نے مال کی تقسیم کے لئے بیٹھنے کا ارادہ کیا تو بھورے نے اسے بتایا کہ ان کے پاس تقسیم کرنے کے لئے مال ہے ہی نہیں...... ان لوگوں نے جو کچھ لوٹا تھا‘ سلطانہ سب کا سب وہیں لٹا آیا تھا۔

یہ سن کر سلطانہ نے زندگی سے بھرپور قہقہہ لگایا۔ اس کے قہقہے سے سیلن زدہ جھونپڑے کے چوبی در و دیوار لرز کر رہ گئے۔ اس نے باری باری اپنے سب ساتھیوں کے چہرے غور سے دیکھے‘ پھر اپنی ہنسی ضبط کرتے ہوئے بولا۔ ”تم لوگ شاید اس وقت یہ سوچ رہے ہو کہ آخر ہم کیچڑ بھرے راستوں پر اتنا سفر کر کے...... بارش میں بھیگتے...... اور ذلیل و خوار ہوتے اس گاؤں کو لوٹنے گئے ہی کیوں تھے‘ اگر ہمیں خالی ہاتھ ہی واپس آنا تھا؟“

”نہیں سردار...... بھورے نے گویا سب ساتھیوں کی ترجمانی کرتے ہوئے جواب دیا۔ ”ہم ایسا نہیں سوچ سکتے۔ تمہاری خوشی میں ہم سب کی خوشی ہے۔ اگر ایک ڈکیتی سے خالی ہاتھ واپس آ گئے تب ہم بھوکے تو نہیں مریں گے۔“

بھورے کے جواب سے سلطانہ کو اطمینان ہو گیا۔ پچھلے چند مہینوں کے دوران سلطانہ نے اپنا ایک چھوٹا موٹا جاسوسی کا نظام بھی قائم کر لیا تھا۔ اس کے گروہ کے دو نوجوان اردگرد کے علاقوں میں بہت دور دور تک پھرتے رہتے تھے اور ہر بات کی سن گن لیتے رہتے تھے۔ وہ ہر طرح کی خبریں لاتے تھے اور چھوٹے سے چھوٹے واقعے کی رپورٹ سلطانہ کو دیتے تھے۔ وہ بہت تیز طرار لڑکے تھے۔ طرح طرح کے بہروپ بھی دھار لیتے تھے اور کئی زبانیں بھی بولنا

جانتے تھے۔ان کی وجہ سے سلطانہ اپنے اردگرد کے تمام دیہات' قصبوں اور شہر کے حالات سے باخبر رہتا تھا۔انہی کی فراہم کردہ معلومات کی روشنی میں کسی بھی آبادی پر دھاوا بولنے کی تیاریاں کی جاتی تھیں۔بارشوں کا موسم ختم ہوا تو سلطانہ کو اپنے ذرائع سے اطلاع ملی کہ مراد آباد میں تیرتھ سنگھ اپنی بیٹی کی شادی کی تیاریاں کر رہا تھا۔شادی کی تیاریوں کی تفصیلات سن کر سلطانہ حیران رہ گیا۔

اطلاعات سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس شادی میں بہت بڑے بڑے لوگوں سمیت ہزاروں افراد شرکت کریں گے اور اس پر لاکھوں کے اخراجات ہوں گے۔سلطانہ کو معلوم تھا کہ ایک ڈی ایس پی کی تنخواہ چار سو روپے مہینہ ہوتی تھی' جو ٹھاٹ باٹ سے رہنے میں ہی خرچ ہو جاتی تھی۔کسی گاؤں' دیہات میں سودے سلف کی دکان چلانے والے بنئے کے پاس ڈی ایس پی سے زیادہ دولت ہوتی تھی اور وہ اپنے بستر کے گدوں میں بھی سونا چھپا کر رکھتا تھا۔

اگر ایک ڈی ایس پی کنجوسی سے گزر بسر کرتا تو بیٹی کو چند تولے سونا دے کر اور دو چار سو باراتیوں کو کھانا کھلا کر رخصت کر سکتا تھا' لیکن تیرتھ سنگھ کے بارے میں تو پتا چلا کہ مراد آباد کے کئی سنار اس کی بیٹی کے لئے ہیروں جڑے زیورات تیار کر رہے تھے۔دلی اور لکھنؤ سے اس کے جہیز کے لئے خاص طور پر زرق برق ملبوسات تیار ہو کر آرہے تھے۔

بیسیوں قسم کے کھانوں کی تیاریاں ہو رہی تھیں اور ان کے لئے کئی شہروں سے مشہور باورچی بلائے جا رہے تھے۔مہمانوں کی فہرست بھی بہت لمبی تھی اور اس میں خاص لوگوں کی تعداد کافی تھی۔مراد آباد' بجنور اور بریلی کے تمام ڈی ایس پی اور اے ایس پی شادی میں آرہے تھے۔کچھ ایس پی بھی آنے والے تھے۔صرف یہی نہیں' انگریز آئی جی ایش ڈاؤن صاحب اور کمشنر وندھم صاحب کی آمد بھی متوقع تھی۔

سلطانہ نے اس موضوع پر بات کرنے کے لئے اپنے سب ساتھیوں کو اکٹھا کیا ہوا تھا۔ٹھنڈائی کا دور چل رہا تھا۔سلطانہ نے ساری باتیں ساتھیوں کو بتائیں اور آخر میں اپنی حیرت کا اظہار کئے بغیر نہ رہ سکا۔"اس کمینے کی تنخواہ صرف چار سو روپے مہینہ ہے۔اتنے پیسے تو ہم ہر پندرہ دن بعد اپنے راشن کے سلسلے میں بنئے کو بھجواتے ہیں۔وہ اس تنخواہ پر ملازم ہوتے ہوئے یہ سب کچھ کس طرح کر رہا ہے؟"

"یہ اندازہ لگانا کون سا مشکل ہے......" بھورے منہ بنا کر تیرتھ سنگھ کو ایک موٹی سی گالی

دیتے ہوئے بولا۔"ظاہر ہے یہ سب رشوت کی کمائی سے ہو رہا ہے۔"

"اور سنا ہے...... تیرتھ سنگھ رشوت بھی چھوٹی موٹی نہیں لیتا۔لمبے چکروں میں رہتا ہے۔اسے تو سیاسی رشوتیں بھی ملتی ہیں اور ڈھکے چھپے طریقوں سے' رشتے داروں کے ناموں پر کئی طرح کے کاروبار بھی کر رہا ہے۔اسے ڈی ایس پی کا عہدہ کیا ملا ہے' یوں سمجھو راجدھانی مل گئی ہے۔وہ کسی چھوٹے موٹے راجا سے کم تھوڑا ہی ہے۔" نگینشر بولا۔

"وہ تو سرکاری بنگلے میں بھی نہیں رہتا۔اچھی خاصی حویلی میں رہتا ہے۔" سرجو نے بتایا۔

"کیا انگریز سرکار کو یہ سب کچھ نظر نہیں آتا؟" صادق غصیلے سے لہجے میں بولا۔"انگریز آئی جی اور کمشنر خود شادی میں آرہے ہیں۔کیا انہیں کبھی خیال نہیں آتا کہ چار سو روپے مہینہ تنخواہ پانے والا راجاؤں کی طرح کیسے رہتا ہے اور اپنا ہر کام ٹھاکروں یا نوابوں کی طرح کیسے کرتا ہے؟"

"ارے...... ان کو نظر تو سب کچھ آتا ہے......" سلطانہ زہریلی سی ہنسی کے ساتھ بولا۔"مگر جدھر سے چاہتے ہیں' آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ویسے بھی تو وہ ہم ہندوستانیوں کی بے ایمانیاں روکنے کے لئے بڑے جتن کرتے ہیں۔ایک ایک کام کے لئے دس دس آدمی بٹھا دیتے ہیں کہ شاید ان میں سے کوئی تو بے ایمانی کو روکے گا' مگر جس آدمی سے انہیں اپنا کوئی مطلب ہوتا ہے' اسے سب کچھ کرنے کی چھٹی دے دیتے ہیں اور اس کی طرف سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔کہنے کو تیرتھ رام صرف چار سو روپے مہینہ کا ڈی ایس پی ہے مگر لگتا کچھ ایسا ہے کہ یہ ان کا کوئی خاص آدمی ہے۔تبھی تو وہ اتنے دھڑلے سے سب کچھ کرتا ہے۔اپنی حیثیت کو چھپانے کے لئے بھی کوئی جتن نہیں کرتا۔"

"ہمیں اس کے ٹھاٹ باٹ پر زیادہ حیران نہیں ہونا چاہئے۔آخر وہ رائے بہادر بھی تو ہے۔" پریتم شاید اپنے خیال میں دور کی کوڑی لایا۔

"رائے بہادر ہونا کون سی بڑی بات ہے۔" سلطانہ حقارت آمیز انداز میں سر جھٹک کر بولا۔"میرا کتا بھی رائے بہادر ہے...... اور تم لوگوں کو پتا ہی ہے کہ میں نے یہ خطاب اسے کس بات پر دیا تھا...... صرف اس بات پر کہ وہ ایک میل تک دم ہلاتا ہوا میرے پیچھے پیچھے آگیا تھا۔انگریزوں کے پیچھے بھی کوئی دو چار میل دور تک دم ہلاتا ہو چلا جائے تو وہ اسے رائے بہادر بنا دیتے ہیں...... مگر اس خطاب کے ساتھ وہ کسی کو دولت کی بوریاں بھر کر نہیں دیتے۔"

"چلو...... یہ سب اپنی جگہ ٹھیک سہی...... لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ ہم ان سب باتوں میں کیوں دماغ کھپا رہے ہیں؟" پریتم الجھن سے بولا۔

"کمال ہے بھئی......" سلطانہ نے مخمور سے انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ "اگر تمہاری سمجھ میں کچھ نہیں آیا تو تم بڑے بھولے بادشاہ ہو۔"

حقیقت یہ تھی کہ کسی کی بھی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔ سبھی سوالیہ نظروں سے سلطانہ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ سلطانہ نے باری باری سب کے چہروں کی طرف دیکھا' پھر گویا ان کی کیفیت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بولا۔ "اوہو...... یہاں تو سب ہی بھولے بادشاہ ہیں۔ چلو خیر میں خود ہی بتا دیتا ہوں۔"

اس نے ایک لمحے توقف کیا پھر سنجیدگی سے بولا۔ "تم سب لوگوں کو پتا ہے کہ اتنی لوٹ مار کے بعد بھی ہماری مالی حالت کچھ زیادہ اچھی نہیں ہے۔ بس گزر بسر تو مزے سے ہو رہی ہے...... تھوڑی تھوڑی سی جمع پونجی بھی سب کے پاس موجود ہے' لیکن صرف اس کے لئے تو ہم سب جان ہتھیلی پر لئے نہیں پھرتے۔"

اس موقع پر اس کے کسی ساتھی نے یہ نہیں کہا کہ اس کی ایک بڑی وجہ اس کی سخاوت اور دریا دلی بھی ہے۔ وہ لوگ جو کچھ لوٹتے ہیں اس میں سے آدھی سے زیادہ تو سلطانہ وہیں غریبوں میں لٹا آتا تھا۔ اس کے ساتھی اب اس کے اس انداز کے عادی ہو گئے تھے۔ وہ اب یہ دیکھتے ہی نہیں تھے کہ کہیں دھاوا بولنے کے بعد کتنا مال ان کے ہاتھ آیا ہے۔ وہ صرف یہ دیکھتے تھے کہ ڈیرے پر پہنچ کر حصے بخرے ہونے کے بعد انہیں کیا ملا ہے۔

بھورے نے البتہ اتنا ضرور کہا۔ "ہماری وارداتیں دیکھو تو پورے ہندوستان میں سلطانہ ڈاکو کے نام کی دہشت پھیل گئی ہے' لیکن ہمارے پلے اتنا بھی نہیں ہے کہ اگر ہم میں سے کوئی گروہ سے الگ ہو کر کسی دوردراز علاقے میں جا کر شرافت اور گمنامی کی زندگی گزارنا چاہے تو کوئی چھوٹا موٹا گھر لے کر اور شادی بیاہ کر کے آرام سے بیٹھ جائے۔ اگر آج کوئی گروہ چھوڑ کر جائے تو دو چار مہینے بعد ہی اسے محنت مزدوری شروع کرنی پڑے گی۔"

"اور مجھے تو شاید سب سے پہلے شروع کرنی پڑے گی۔" سلطانہ مسکراتے ہوئے بولا۔

یہ حقیقت تھی کہ اس کے پاس اپنے تمام ساتھیوں سے کم اثاثہ تھا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "اسی لئے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اب ہمیں ایک بہت بڑا ڈاکا ڈالنا چاہئے۔ ایسا

ڈاکا جس میں ایک ہی جگہ سے ڈھیر سارا مال ہاتھ آ سکے۔ اس مقصد کے لئے سب سے اچھی جگہ تیرتھ سنگھ کا گھر ہے۔ ہم اس رات دھاوا بولیں گے جس رات اس کی بیٹی کی شادی ہو رہی ہو گی اور سب مہمان جمع ہوں گے۔ تیرتھ سنگھ سمیت ہم جتنے لوگوں کو بھی لوٹ سکے' لوٹ لیں گے۔"

اس کی بات سن کر اس کے پرانے ساتھی ذرا سوچ میں پڑ گئے اور نئے ساتھیوں کے چہروں پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔

سلطانہ نے سلسلہ کلام جاری رکھا۔ "ہمارے قبیلے میں جس نے کسی پولیس والے کو نہ لوٹا ہو' اسے ڈاکو مانا ہی نہیں جاتا اور میں کیونکہ 'سلطانہ ڈاکو' ہوں اس لئے میں کسی چھوٹے موٹے پولیس والے کو تو نہیں لوٹ سکتا۔ میرے لوٹنے کے لئے کم از کم تیرتھ سنگھ جیسا پولیس والا تو ہونا چاہئے۔ اس کا عہدہ تو زیادہ بڑا نہیں...... لیکن وہ اسامی بہت بڑی ہے۔"

بھورے' گجندرا اور صادق نے پُرخیال انداز میں سر ہلایا۔ سلطانہ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد بولا۔ "کوئی پولیس کا ریکارڈ دیکھے تو شاید یہ سمجھے کہ ہم پورے روہیل کھنڈ کو لوٹ کر کھا گئے ہیں۔ ہماری ہر ڈکیتی کے سلسلے میں مال اسباب کی لمبی لمبی فہرستیں بنی ہوں گی اور لکھا ہو گا کہ سلطانہ اور اس کے گروہ نے یہ لوٹ لیا...... وہ لوٹ لیا...... لوگ اپنی گمشدہ اور جوئے میں ہاری ہوئی چیزیں بھی' لوٹے گئے مال کی فہرست میں لکھوا دیتے ہیں۔ پھر پولیس کو یہ اندازہ بھی نہیں کہ سلطانہ کتنا مال وہیں کا وہیں لٹا آتا ہے اور نہ ہی پولیس کو یہ معلوم ہے کہ ہم راشن' اسلحہ...... ہر چیز دگنے دام پر خریدتے ہیں۔ ہم اپنی ضرورت کی چیزیں لوٹ کر لانے کے بجائے دوسروں سے زیادہ مہنگے داموں خرید کر لاتے ہیں تاکہ لوگ خوشی خوشی ہمیں وہ چیزیں دیتے رہیں۔ ویسے بھی میں سلطانہ ڈاکو ہوں' کوئی بنیا نہیں ہوں جو دوسروں کو کچھ دینے کے معاملے میں کنجوسی کروں۔ اپنی اصل حالت تو ہم خود ہی جانتے ہیں۔ اب کوئی بڑا ہاتھ مارنا ہمارے لئے بہت ضروری ہو گیا ہے۔ ڈاکے تو روز روز نہیں ڈالے جا سکتے' لیکن خرچے روز چلتے رہتے ہیں۔ ہم تیس آدمی ہیں اور بتیس گھوڑے ہیں۔ جمع پونجی رکھنا تو بعد کی بات ہے' پہلے تو اتنی جانوں کا پیٹ بھرنا اور گولا بارود کا انتظام کرنا ہی مذاق نہیں۔"

سب سے پہلے بھورے نے سلطانہ کے خیال کی تائید کی۔ وہ خاصے پُرجوش لہجے میں بولا۔ "تم ٹھیک کہہ رہے ہو سلطانہ! اگر ہم نے تیرتھ سنگھ کو عین اس کی بیٹی کی شادی کے دن لوٹ لیا تو اس کا ایک نہیں' کئی فائدے ہوں گے۔ ایک تو بہت سا مال ہاتھ لگنے کی امید ہے۔

شاید اتنا مال اس سے پہلے کسی ڈاکے میں ہمارے ہاتھ نہ لگا ہو۔ دوسرے اس ڈاکے سے پورے ہندوستان میں ہماری دھاک بیٹھ جائے گی۔ تیسرے یہ تیرتھ سنگھ کے منہ پر ٹھیک ٹھاک طمانچہ ہو گا۔"

"تم میرے دل کی بات سمجھ گئے ہو۔ میں یہی سب کچھ کہنے والا تھا۔" سلطانہ نے مسکراتے ہوئے بھورے کی طرف دیکھا۔ پھر اس کی نظر ایک نئے لڑکے پر پڑی جس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"بچے! تم چاہو تو ابھی گروہ چھوڑ کر جا سکتے ہو۔" سلطانہ نے نرمی سے اسے مخاطب کیا۔ "جا کر ابھی کچھ عرصہ اور اپنی ماتا پتا کی گود میں کھیلو...... پنگھوڑے میں جھولا جھولو۔"

وہ لڑکا کھسیانا سا ہو گیا اور اس نے اپنے چہرے پر مسکراہٹ لانے کی کوشش کی۔ اس کی اور سلطانہ کی عمر میں دو تین سال کا ہی فرق ہوگا' لیکن سلطانہ نے اس طرح اسے مخاطب کیا تھا جیسے وہ اس کے سامنے دودھ پیتا بچہ ہو۔

سلطانہ کا یہ کہنا اس جیسے دوسرے دو تین نئے لڑکوں کے لئے بھی مؤثر ثابت ہوا' جن کے چہروں سے گھبراہٹ جھلک رہی تھی۔ ان کے تاثرات میں بھی تبدیلی آ گئی۔

لڑکا بولا۔ "ایسی کوئی بات نہیں ہے سردار...... آپ کو چھوڑ کر جانے کا تو اب ہم سوچ بھی نہیں سکتے۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا نا کہ مارے جائیں گے۔"

"ہاں ...... مارے بے شک جانا...... لیکن کوشش کرنا کہ پکڑے نہ جاؤ...... پکڑے جانے سے مارے جانا اچھا ہے۔" سلطانہ بولا۔

ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ اصل موضوع پر آتے ہوئے بولا۔ "شادی والے دن تیرتھ سنگھ یہ دکھانا چاہ رہا ہے کہ وہ کتنا بڑا آدمی ہے اور اس روز سلطانہ یہ دکھانے کی کوشش کرے گا کہ وہ کتنا بڑا ڈاکو ہے۔"

اس رات یہ طے ہو گیا کہ وہ تیرتھ سنگھ کی بیٹی کی شادی کے موقع پر ڈاکا ڈالیں گے اور اب صرف اسی واردات کی تیاری کریں گے۔ انہیں واردات کا طریقہ طے کرنا تھا۔ سلطانہ کو اندازہ تھا کہ شادی کے موقع پر پولیس کی بھاری نفری تعینات ہوگی' کیونکہ کئی بڑے بڑے گورے صاحب بھی آ رہے تھے' اس لئے بھی حفاظتی انتظامات زیادہ ہونے تھے۔

سلطانہ کو معلوم تھا کہ رکاوٹیں اور خطرات بہت زیادہ ہوں گے اور سرسری انداز میں سوچنے

کی صورت میں اس منصوبے پر عملدرآمد تقریباً ناممکن نظر آتا تھا' مگر سلطانہ نے اب اس کا ارادہ کر لیا تھا کہ کوئی طاقت اسے اس سے باز رہنے پر مجبور نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے اپنے دو نوجوانوں کو مکمل طور پر صرف اس تقریب کے بارے میں جاسوسی کرنے پر مامور کر دیا۔ جس حد تک بھی ممکن ہوتا' انہیں ہر چھوٹی سے چھوٹی بات معلوم کرنی تھی۔

تیرتھ سنگھ کا حویلی نما مکان ایک کالونی کے سرے پر تھا۔ اس کے سامنے ایک بہت بڑا میدان خالی پڑا تھا۔ سلطانہ کو پتا چلا کہ تیرتھ سنگھ شادی کی تقریب کے لئے اس میدان کو استعمال کرے گا۔ اس مقصد کے لئے رولرز کے ذریعے میدان کو ہموار کیا جا رہا تھا۔ سڑک بنانے والے یہ انجن میدان کو ہموار بنا کر جاتے تو سقے آ کر پانی کی مشکوں سے چھڑکاؤ کرتے۔ میدان بہت بڑا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کی زمین پکی سڑک جیسی بنائی جا رہی تھی۔

سلطانہ کو معلوم ہوا تھا کہ اس میدان میں کئی بہت بڑے بڑے شامیانے لگائے جائیں گے' جن میں مقام و مرتبے کے حساب سے مہمانوں کو تقسیم کر دیا جائے گا۔ سب سے بڑا اور نہایت شاہانہ قسم کا شامیانہ دولہا دلہن اور انتہائی اہم مہمانوں کے لئے مخصوص ہوگا۔ میدان کے اردگرد کئی مکانات مہمانوں کے قیام کیلئے بھی خالی کرائے جائیں گے۔

میدان کے دوسری طرف سو ڈیڑھ سو کچے پکے مکانوں پر مشتمل ایک بستی تھی۔ اس میں ہورا قبیلے کے لوگ آباد تھے۔ اس قبیلے کے جو لوگ اس بستی میں رہ رہے تھے' ان کی حیثیت بھی کسی حد تک قیدیوں جیسی ہی تھی' لیکن ان پر کوئی خاص سختی نہیں تھی۔ ان کی بستی کے گرد خاردار تاروں کا جنگلا تھا اور انہیں بھی باہر جانے کے لئے پاس لینا پڑتا تھا' لیکن نجیب آباد کے قلعے میں رہنے والوں کے مقابلے میں یہ لوگ زیادہ آزاد تھے۔

انہیں معمولی درجے کے چور اچکے شمار کیا جاتا تھا۔ ان کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ کسی عورت کی انگلی میں اگر سونے کی تنگ انگوٹھی ہوتی اور عورت خود بھی اسے آسانی سے نہ اتار سکتی' اسے کوئی ہورا اتار سکتا تھا...... اور وہ بھی اس طرح کہ عورت کو پتا بھی نہ چلتا۔

اس طرح کے کاموں میں ہورا لوگ بے شک ماہر تھے' لیکن کوئی ہتھیار استعمال کرنا انہیں نہیں آتا تھا۔ چاقو یا خنجر تک استعمال نہیں کر سکتے تھے۔ درحقیقت وہ ہتھیاروں سے دور بھاگتے تھے۔ اس بستی میں رہنے والوں کا خرچ ایک طرح سے انگریز سرکار ہی اٹھا رہی تھی تا کہ وہ لوگ چوری چکاری سے باز رہیں۔ سرکار نے ہر کنبے کو تھوڑی سی زمین دی ہوئی تھی جس پر وہ کاشت

کاری کرتے تھے۔

سرکاری افسران سے بیگار لینے کے لئے اکثر انہیں بلا لیتے تھے۔ شادی بیاہ اور ایسے دوسرے موقعوں پر وہ مختلف کاموں کے لئے انہیں بلا لیتے تھے۔ کئی کئی دن ان سے پُرمشقت کام لیتے تھے اور کوئی معاوضہ دیئے بغیر رخصت کر دیتے تھے۔ بعض بارسوخ بنئے بھی ایسا ہی کرتے تھے البتہ وہ بڑی میٹھی زبان میں انہیں معاوضہ دینے کا وعدہ کرتے تھے‘ لیکن معاوضہ اگر ایک آنہ روز طے ہوتا تھا تو کام کرانے کے بعد دو پیسے روز کے حساب سے دیتے تھے اور ان کے کاموں میں سو نقص نکال دیتے تھے۔

تیرتھ سنگھ نے بھی سرکاری ملازموں والی روایت برقرار رکھی تھی۔ اس بستی میں سے پچاس آدمی اس میدان میں کام پر لگے ہوئے تھے‘ جہاں شادی ہونا تھی۔ انہوں نے جھاڑیاں صاف کی تھیں۔ پتھر ہٹائے تھے۔ شامیانوں کے بانس گاڑنے کے لئے بہت سے گڑھے کھودے تھے۔ وہ لوگ روزانہ اس قسم کے کاموں کے سلسلے میں میدان میں آتے تھے۔ شام کو جب وہ واپس جانے لگتے تو تیرتھ سنگھ کے آدمی ان کی تلاشی لیتے کہ وہ کوئی ہتھوڑا‘ پھاوڑا یا رسی وغیرہ چرا کر تو نہیں لے جا رہے ہیں۔

میدان کی تیاری جب آخری مراحل میں تھی تو سلطانہ خود بھی ایک بار اس کا جائزہ لینے گیا۔ وہ بھیس بدل کر گیا تھا۔ اپنی گھنی اور بارعب مونچھیں اس نے تراش کر ہلکی کر لی تھیں۔ چمکیلی کڑھائی والی ایک سفید اچکن اور چوڑی دار پاجامہ پہنا تھا۔ پیروں میں سلیم شاہی جوتی تھی۔ سر پر سفید ململ کی دوپلی ٹوپی تھی۔ وہ مکمل طور پر ایک لکھنوی نوجوان دکھائی دیتا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس کی جسمانی ساخت میں لکھنؤ والوں جیسی نزاکت نظر نہیں آ رہی تھی‘ لیکن اس طرف کسی کا دھیان جانا مشکل تھا۔

وہ گھوڑے کو حسب عادت اندھا دھند دوڑانے کے بجائے‘ نہایت پُرسکون انداز میں دلکی چلاتا ہوا وہاں سے گزرا اور خاصا چکر کاٹ کر میدان کے قریب سے ہی‘ لیکن دوسرے راستے سے واپس ہوا۔ اس دوران بہت سے لوگوں نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا‘ لیکن ان کی آنکھوں میں معمولی سے تجسس کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ان میں سے کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ان کے سامنے سلطانہ ڈاکو گزر رہا تھا۔

وہاں سے آنے اور جانے کے دوران سلطانہ کی عقابی نظروں نے پورے میدان اور اس

کے گرد و پیش کا مکمل جائزہ لے لیا۔ اسے معلوم تھا کہ تیرتھ سنگھ اس وقت اپنے دفتر میں تھا اور اس کے شاید وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ سلطانہ اس کے گھر کے عین سامنے سے گزر سکتا تھا۔

میدان کے گرد خاردار تاریں لگائی گئی تھیں‘ صرف اس طرف نہیں لگائی گئی تھیں جدھر ہیوروں کی بستی تھی‘ کیونکہ اس طرف پہلے ہی خاردار تاروں کا جنگلا موجود تھا۔ میدان میں بڑے بڑے شامیانے نصب کئے جا رہے تھے۔ پیٹرومیکس لیمپ لٹکانے کے لئے لکڑی کے کھمبے گاڑ دیئے گئے تھے۔ اندر جانے اور باہر آنے کے لئے ایک ہی طرف دو طرفہ رستہ رکھا جا رہا تھا۔ اس کا رخ تیرتھ سنگھ کی حویلی کی طرف تھا۔

جس حد تک ممکن تھا سلطانہ صورتحال کا جائزہ لے کر ڈیرے پر واپس آ گیا۔ اس کا اندازہ تھا کہ شادی میں بارات سمیت کم از کم دو ہزار مہمان ہوں گے اور میدان کے اردگرد حفاظت کے لئے سیکڑوں پولیس والے تعینات ہوں گے۔ اس سلسلے میں صلاح مشورے کے لئے اس رات اس نے ایک پھر سب ساتھیوں کو اکٹھا کیا۔ سب سے زیادہ غور طلب سوال یہ تھا کہ اس میدان میں داخل کیسے ہوا جائے جہاں تقریب ہونا تھی۔

اگر وہ براہ راست تقریب پر دھاوا بولتے اور اچانک حملہ آور ہو جاتے تو بہت زیادہ خونریزی کا خطرہ تھا‘ جس میں اس کے اپنے بہت سے ساتھیوں کی جانیں جا سکتی تھیں اور یہ سلطانہ کو منظور نہیں تھا۔

”کیوں نہ ہم بھی اچھے اچھے قیمتی کپڑے پہن کر‘ بڑے لوگوں کے روپ دھار کر دوسرے مہمانوں کے ساتھ اندر پہنچ جائیں؟“ صادق نے تجویز پیش کی۔ ”ہتھیار ہم اپنے کپڑوں میں چھپا کر لے جا سکتے ہیں...... یا پھر کانٹے دار تاروں کے پاس باہر کہیں چھپے ہوئے ہمارے کچھ ساتھی‘ ایک خاص وقت پر ہمارے لئے اندر پھینک دیں؟“

سلطانہ نے چند لمحے اس تجویز پر غور کیا‘ پھر غور سے سب کا جائزہ لیا۔ وہ اپنے بارے میں کسی خوش فہمی کا شکار نہیں تھا‘ لیکن وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ لوگ خواہ کتنے بھی قیمتی اور اچھے کپڑے پہن لیتے‘ لیکن دو آدمیوں کے سوا کوئی بھی شریف‘ معزز یا بڑا آدمی دکھائی نہیں دے سکتا تھا۔ ان میں سے ایک تو خود سلطانہ تھا اور دوسرا بھورے۔ باقی سب اچھے سے اچھے لباس میں بھی‘ اگر ڈاکو نہیں تو کم از کم مشکوک تو ضرور دکھائی دیتے۔

تاہم یہ بات اس نے اپنے ساتھیوں سے نہیں کہی۔ شاید اس سے ان کی دل شکنی ہوتی۔

اس نے کوئی اور وجہ بتا کر اس تجویز کو رد کر دیا۔ انہوں نے اس امکان پر بھی غور کیا کہ وہ میدان میں کام کرنے والے لوگوں میں سے کچھ کو لالچ دے کر وہاں سے غائب کر دیں اور ان کی جگہ خود ان کے گھروں میں رہنے لگیں۔ سلطانہ کے ساتھیوں اور میدان میں کام کرنے والوں میں کچھ زیادہ فرق نظر نہیں آتا تھا۔ وہ آسانی سے ان کی جگہ لے سکتے تھے' لیکن آثار بتاتے تھے کہ انہیں صرف شادی سے پہلے کے کاموں کے لئے رکھا گیا تھا اور شادی والے دن انہیں میدان کے اندر آنے کی اجازت نہیں ہوگی۔

وہ لوگ پورا ایک ہفتہ اس مسئلے پر غور کرتے رہے' لیکن کوئی حل سامنے نہیں آیا۔ بہت سی تجاویز زیر غور آئیں' لیکن کوئی بھی دل کو نہیں لگی۔ شادی کا دن قریب آ رہا تھا اور سلطانہ کا اضطراب بڑھ رہا تھا۔ کام جتنا مشکل نظر آ رہا تھا' اتنا ہی اس کا عزم مضبوط ہو رہا تھا کہ اسے یہ ضرور کرنا ہے۔

پھر ایک روز اس کے جاسوس ایک ایسی خبر لائے کہ سلطانہ کے دل میں امید کا چراغ روشن ہو گیا اور اس کا ذہن فوراً ہی ایک منصوبے کا تانا بانا بننے لگا۔ اس کے لڑکوں نے بتایا کہ شادی میں کھانا کھلانے کے لئے دلی کے ایک بڑے ہوٹل کے پچیس بیروں کی خدمات حاصل کی گئی تھیں' جنہیں شادی سے ایک روز پہلے ٹرین کے ذریعے مراد آباد پہنچنا تھا۔

اس خبر کے ساتھ مزید کچھ ایسی باتیں سلطانہ کو معلوم ہوتی چلی گئیں' جنہوں نے اس کیلئے منصوبہ بنانا کچھ آسان کر دیا۔ مراد آباد کے ریلوے سٹیشن سے اس مضافاتی کالونی کا فاصلہ خاصا تھا' جہاں تیرتھ سنگھ کی حویلی تھی' لیکن بیروں کو لانے کے لئے کوئی گاڑی وغیرہ نہیں بھیجی جا رہی تھی' انہیں خود ہی کوئی بندوبست کر کے تیرتھ سنگھ کی حویلی تک پہنچنا تھا۔

دراصل تیرتھ سنگھ مراد آباد میں ایسا مشہور آدمی تھا اور چھوٹے موٹے' عام سے لوگوں پر تو اس کا ایسا رعب تھا کہ بیرے ٹرین سے اترنے کے بعد جن یکوں میں چاہتے بیٹھ جاتے اور ان سے کہتے کہ انہیں تیرتھ سنگھ کی حویلی پہنچا دیا جائے' تو یکے والے چوں چرا کئے بغیر پہنچا دیتے اور کوئی پیسہ پائی نہ لیتے۔ یہ خبر تو جاسوسی پر مامور نوجوان لائے تھے' پھر گجندر نے بتایا کہ وہ اس ہوٹل کے بیروں کو ایک مرتبہ دیکھ چکا تھا اور اسے معلوم تھا کہ وہ کیسی وردی میں ہوتے تھے۔ وہ سفید شیروانی اور سفید پاجامے میں ہوتے تھے۔ سر پہ سیاہ پگڑی اور شیروانی کے اوپر سرخ رنگ کا پٹکا ہوتا تھا' جس کا دو بالشت لمبا سرا دائیں طرف لٹکتا رہتا تھا۔

اس وردی کی تفصیل سن کر سلطانہ کے ذہن میں سب سے پہلا خیال یہ آیا کہ اس میں ایک رائفل بڑے آرام سے چھپائی جا سکتی تھی اور ریلوے سٹیشن پر چونکہ بیروں کو لینے کوئی نہیں جا رہا تھا' اس لئے وہ غائب بھی ہو سکتے تھے اور ان کی جگہ دوسرے بیرے تیرتھ سنگھ کے ہاں پہنچ سکتے تھے۔ سلطانہ جوں جوں اس منصوبے پر غور کرتا گیا' اس کے خدوخال اس کے ذہن میں واضح ہوتے چلے گئے اور وہ زیادہ پُر امید ہوتا گیا۔

ایک نکتے پر سلطانہ کو ذرا تشویش تھی۔ اسے اور اس کے ساتھیوں کو بڑے لوگوں کی اعلیٰ درجے کی تقریبات میں کھانا پیش کرنے کا قطعی کوئی سلیقہ نہیں تھا۔ اس ضمن میں ان سے کوئی غلطی ہو سکتی تھی' جو شروع میں ہی کام بگاڑ سکتی تھی' لیکن اس کی یہ تشویش اس وقت دور ہو گئی' جب جاسوس لڑکوں میں سے ایک نے بتایا کہ ان بیروں کی مدد کے لئے مراد آباد کے ایک اچھے ہوٹل کے پچاس مقامی بیروں کو بھی آنا تھا۔ انہیں ایک طرح سے دلی والے بیروں کی ماتحتی میں کام کرنا تھا' لیکن سلطانہ نے فیصلہ کیا کہ وہ لوگ انہیں ماتحت بنانے کے بجائے انہی سے سارا کام لے لیں گے اور انہی کو دیکھ دیکھ کر خود بھی کام کرتے رہیں گے۔

منصوبے کی تفصیلات طے ہوتی رہیں اور سلطانہ کا اعتماد بڑھتا رہا۔ ساتھیوں کے ساتھ صلاح مشورے سے سلطانہ کو بہت مدد ملی۔ ڈیوٹیاں تقسیم ہو گئیں۔ سب نے اپنے اپنے حصے کا کام اچھی طرح سمجھ لیا۔



دلی سے آنے والی میل ٹرین مراد آباد کے ریلوے سٹیشن پر آ کر رکی تو پلیٹ فارم پر کچھ زیادہ افراد موجود نہیں تھے۔ تاہم جتنے بھی تھے' ان میں سلطانہ کے چار ساتھی بھورے' صادق' سرجو اور نگیشر بھی شامل تھے' تاہم وہ باقی لوگوں سے ذرا ہٹ کر کھڑے تھے۔

ان کے کندھوں پر رائفلیں لٹکی ہوئی تھیں اور کمر کے گرد گولیوں کی پیٹیاں بھی بندھی ہوئی تھیں۔ اپنے لباس اور وضع قطع سے وہ کسی نواب یا ٹھاکر کے ذاتی محافظ دکھائی دے رہے تھے۔

انہوں نے جب ٹرین کے ایک کمپارٹمنٹ سے قطار کی سی صورت میں بہت سے آدمی اترتے دیکھے تو وہ فوراً سمجھ گئے کہ وہی ان کے مطلوبہ لوگ ہیں۔ فی الحال وہ عام لباس میں ہی تھے۔

وہ اتر کر پلیٹ فارم پر ایک جگہ جمع ہو گئے اور ایک آدمی ان کی گنتی کرنے لگا۔ وہ ان کا سربراہ معلوم ہوتا تھا۔ اپنی لمبی اور گھنی داڑھی کی وجہ سے وہ کافی حد تک بھورے سے مشابہ دکھائی

دے رہا تھا۔ انہوں نے اپنے ٹرنک فرش پر رکھ لئے تھے۔ پھر وہ آپس میں باتیں کرنے لگے۔ غالباً وہ سٹیشن کی حدود سے باہر جا کر یکے کرائے پر لینے کا ارادہ کر رہے تھے۔

اسی لمحے بھورے اپنے تینوں ساتھیوں سمیت آگے بڑھا اور ان کے قریب پہنچ کر حتیٰ الامکان مہذبانہ لہجے میں بولا۔ ”بھائی صاحب! سراج الدین آپ ہی ہیں نا......؟“ اس نے اس شخص کو مخاطب کیا تھا‘ جو باقی چوبیس افراد کا سربراہ معلوم ہوتا تھا۔

اس شخص نے ذرا چونک کر بھورے کی طرف دیکھا۔ وہ شاید بالکل توقع نہیں کر رہا تھا کہ مراد آباد کے ریلوے سٹیشن پر صبح منہ اندھیرے کوئی اس کے نام سے مخاطب کرنے والا بھی موجود ہوگا۔

”جی ہاں...... میں ہی سراج الدین ہوں۔“ اس نے شاید غیر ارادی طور پر سینے پر ہاتھ رکھ کر ذرا جھکتے ہوئے کہا۔ بھورے کی شخصیت خاصی بارعب تھی اور اس وقت وہ ملیشیا کی شلوار قمیض‘ فوجیوں جیسی لال ٹوپی اور رائفل وغیرہ کے ساتھ اور بھی زیادہ بارعب لگ رہا تھا۔

”آپ لوگ دلی کے اوبرائے ہوٹل سے ہمارے مالک تیرتھ سنگھ جی کی بیٹی کی شادی میں کھانے کے انتظام میں ہاتھ بٹانے کے لئے آئے ہیں نا؟“ بھورے نے مزید تصدیق چاہی۔ اس نے یہ مکالمے بولنے کی کافی مشق بھی کی تھی۔

”جی...... جی......“ سراج الدین نے تیزی سے سر ہلایا۔ ”لیکن آپ......؟“ اس نے سوالیہ انداز میں چاروں کو دیکھتے ہوئے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”ہمیں مالک نے آپ کو لانے کے لئے بھیجا ہے...... تشریف لائیے...... باہر گاڑی کھڑی ہے۔“ بھورے نے باہر کی طرف اشارہ کیا۔

”مگر...... ہمیں تو بتایا گیا تھا کہ کوئی ہمیں لینے نہیں آئے گا۔“ سراج الدین الجھن زدہ لہجے میں ذرا اٹک اٹک کر بولا۔

”جی ہاں...... پہلے تو یہی طے ہوا تھا۔“ بھورے نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”لیکن رات مالک کو خیال آیا کہ یہ کچھ اچھا نہیں لگ رہا۔ اب آپ چاہے شادی میں بیروں کے طور پر کام کرنے آئے ہیں‘ لیکن آپ کی حیثیت مہمانوں والی بھی تو ہے نا...... اور پھر آپ کافی دور سے...... دوسرے شہر سے آ رہے ہیں اس لئے یہ اچھا معلوم نہیں ہوتا کہ کوئی آپ کو لینے سٹیشن پر بھی نہ جائے...... بس...... پھر رات ہی انہوں نے ہمیں حکم دے دیا۔ ہماری ڈیوٹی لگا دی۔“

پھر اس نے دونوں ہاتھ پھیلا کر کندھے اچکائے۔ ”آپ کو تو ایسی باتوں کا تجربہ ہوگا بڑے لوگوں کی بڑی باتیں۔“

”جی ہاں...... جی ہاں......“ سراج الدین نے تائید میں سر ہلایا۔ تمام بیرے اب اس بات پر خوش اور مطمئن نظر آ رہے تھے کہ کوئی انہیں لینے آ گیا تھا۔ بھورے اور اس کے تینوں ساتھی باہر کی طرف روانہ ہوئے تو تمام بیرے بھی اپنے اپنے ٹرنک اٹھا کر ان کے پیچھے چل دیئے۔

وہ سب باہر آئے تو چند سیڑھیاں اتر کر انہیں کچھ فاصلہ پیدل طے کرنا پڑا۔ ریلوے سٹیشن سے کچھ دور درختوں کی آڑ میں ایک لاری کھڑی ہوئی تھی۔ بیرے جب لاری کے دو دروازوں سے اندر پہنچے تو انہیں یہ دیکھ کر ذرا عجیب سا تو لگا مگر زیادہ حیرت نہیں ہوئی کہ دونوں دروازوں کے پاس‘ اندر دو دو رائفل بردار اور کھڑے تھے۔

ایک آدمی اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے برابر بیٹھا تھا۔ اس کے کندھے پر بھی رائفل نظر آ رہی تھی اور وہ ڈرائیور کے کچھ زیادہ ہی قریب ہو کر بیٹھا تھا۔ بیرے بے چارے سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ڈرائیور کے قریب بیٹھا آدمی‘ جس کی وہ صرف پشت دیکھ پا رہے تھے‘ اس وقت کا سب سے بڑا ڈاکو سلطانہ تھا‘ جس کا نام سن کر دولت والے لوگ کانپنے لگتے تھے۔ انہیں یہ بھی معلوم نہیں تھا اور نہ ہی وہ دیکھ سکتے تھے کہ سلطانہ کے ہاتھ میں اس وقت ایک خوفناک خنجر تھا‘ جو اس نے ڈرائیور کی پسلیوں کے نیچے لگایا ہوا تھا۔

بیرے یہ بھی نہیں سوچ سکتے تھے کہ کالے اور سفید رنگ کی یہ لاری مراد آباد سے قریبی قصبوں کے لئے چلتی تھی اور اس وقت شہر سے باہر کی ایک سڑک پر چند مسافر اس کے انتظار میں کھڑے تھے۔ انہیں نہیں معلوم تھا کہ آج انہیں دگنا انتظار کرنا پڑے گا۔ اس کے بعد اس کمپنی کی دوسری لاری میں انہیں جگہ ملے گی۔

سلطانہ اور اس کے ساتھیوں نے چند گھنٹے پہلے یہ لاری اس کے اڈے سے اغوا کی تھی اور چونکہ ان میں سے کسی کو بھی بسا کوئی اور گاڑی چلانی نہیں آتی تھی‘ اس لئے انہیں خنجر کی نوک پر ڈرائیور کو بھی ساتھ رکھنا پڑا تھا۔

بیروں نے سکون کی سانس لیتے ہوئے نشستیں سنبھال لیں۔ وہ شاید دل ہی دل میں اس بات پر خوش بھی تھے کہ انہیں خاصے اہتمام سے لے جایا جا رہا تھا۔ بیروں کے بیٹھتے ہی بس کے

دونوں دروازے بند ہوگئے اور وہ ہلکی سی کھڑکھڑاہٹ کے ساتھ آگے روانہ ہوگئی۔ بس ڈرائیور کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ اسے بس سمیت اغوا کرنے والے لوگ کون تھے' ریلوے سٹیشن سے اس کی بس میں سوار ہونے والے کون تھے اور اب انہیں کہاں لے جایا جارہا تھا۔ وہ تو بس اپنے برابر بیٹھے آدمی سے سرگوشیوں میں ملنے والی ہدایات پر عمل کر رہا تھا۔ اس آدمی کے خنجر کی نوک اس کے پہلو میں چبھ رہی تھی۔

جب بس کو چلتے ہوئے آدھے گھنٹے سے زیادہ وقت گزر گیا اور کسی آبادی کے آثار نظر آنے کے بجائے مرادآباد کی آبادی کے آثار معدوم ہوئے بھی خاصی دیر گزر گئی تو سراج الدین نے ذرا کسمسانا شروع کیا۔ وہ سال ڈیڑھ سال پہلے بھی ایک بار مرادآباد آچکا تھا۔ اسے کچھ یوں لگ رہا تھا کہ وہ مرادآباد جانے کے بجائے اس سے کہیں دور جا رہے تھے...... اور اب تو بس کسی پکی سڑک پر چلنے کے بجائے کچے راستوں پر دھول اڑاتی جارہی تھی۔

اب دن کا اجالا بھی پھیل چکا تھا اور اردگرد کا منظر صاف دکھائی دینے لگا تھا۔ دور دور تک کسی آبادی کے آثار نظر آنے کے بجائے جنگلات کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ تاہم دوسرے بیروں نے شاید اس طرف توجہ نہیں دی تھی۔ وہ آرام سے پھیل کر بیٹھے ہوئے تھے اور اونچی آوازوں میں ایک دوسرے سے گپ شپ کر رہے تھے۔

آخرکار بس کچے راستے سے بھی ذرا نشیب میں اتر گئی اور ایک ٹیڑھی میڑھی ناہموار پگڈنڈی کے ذریعے جنگل میں داخل ہوگئی۔ اس کی رفتار بہت کم ہوگئی اور وہ ہچکولے کھاتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔ کہیں کہیں دائیں بائیں کھڑکیوں کے شیشوں اور کبھی چھت سے بعض درختوں کی شاخیں ٹکرا رہی تھیں۔

اب سراج الدین کی تشویش صاف ظاہر ہونے لگی تھی۔ وہ اپنی سیٹ پر سیدھا ہو کر' آگے کو کھسک کر بیٹھ گیا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اگلی سیٹ کا پشتہ تھام لیا تھا اور کسی خوفزدہ پرندے کی طرح دائیں بائیں سر گھما کر کھڑکیوں سے باہر دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر اس نے بس میں چاروں طرف نظر دوڑائی۔ کونے کھدروں میں اور سیٹوں کے پیچھے آٹھ بندوق بردار مستعد کھڑے تھے اور ان سب پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ سراج الدین کے زیادہ مضطرب ہونے کے بعد وہ سب سرخ سرخ سی آنکھوں سے اسی کو گھورنے لگے تھے۔

انہیں گویا سراج الدین کا یوں بے چین نظر آنا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ ان کی پیشانیوں پر

شکنیں ابھر آئی تھیں' جو ان کی ناگواری کی نشاندہی کر رہی تھیں۔ ادھر اگلی سیٹ پر جو شخص ڈرائیور کے کندھے سے کندھا جوڑے بیٹھا تھا' اس نے ایک بار بھی مڑ کر ان لوگوں کی طرف دیکھنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ سراج الدین کو اب یہ سب کچھ بہت پُراسرار لگ رہا تھا۔ اس کے جسم میں خوف کی ایک سرد سی لہر دوڑ گئی۔ وہ پوچھنا چاہتا تھا کہ انہیں کہاں لے جایا جا رہا ہے؟ لیکن وہ یہ سوال بھی زبان پر لانے کی جرأت نہ کر سکا۔

بس اس پگڈنڈی پر ڈیڑھ دو میل کا فاصلہ طے کر چکی تو آگے راستہ اتنا تنگ ہوگیا کہ بس کا اس پر چلنا ممکن نہ رہا۔ تب بس رک گئی اور رائفل برداروں نے اپنی رائفلیں سیدھی کر لیں۔ بھورے نے سب لوگوں کو بس سے اترنے کا حکم دیا۔ ڈرائیور نے بس کا انجن بند کیا تو سلطانہ نے چابی ڈیش بورڈ سے نکال کر اپنی جیب میں ڈال لی۔

اب تمام بیرے اپنی خوش گپیاں بھول چکے تھے اور یوں لگ رہا تھا' جیسے انہیں سانپ سونگھ گیا ہو۔ اب ان لوگوں نے سلطانہ کی شکل بھی دیکھ لی تھی اور نہ جانے کیوں وہ کچھ اور خوفزدہ ہو گئے تھے۔ رائفل برداروں کے گھیرے میں مزید کچھ فاصلہ انہوں نے پیدل طے کیا' پھر وہ ایک کھلی جگہ میں پہنچ گئے جہاں ایک بڑا سا خیمہ لگا ہوا تھا۔

"یہ آپ ہمیں کہاں لے آئے بھائی صاحب!؟" سراج نے آخر لرزاں سی آواز میں پوچھ ہی لیا۔

"فی الحال آپ اسے ہی تیرتھ سنگھ کی حویلی سمجھیں۔" بھورے نے خیمے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔



"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں حضور......" بیروں کا سربراہ سراج الدین نہایت شائستگی سے بولا۔ یہ ایک شریف آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اپنے آپ کو بے خوف ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا' لیکن خوف اس کے لہجے اور حرکات وسکنات سے عیاں تھا۔

اسی لمحے ایک اور بیرا بول اٹھا۔ "اور یہ آپ خیمے کو تیرتھ سنگھ کی حویلی کیوں کہہ رہے ہیں؟ آپ ہمیں یہاں جنگل میں کیوں لے آئے ہیں؟"

بھورے نے اپنے آپ پر ضبط کرتے ہوئے بڑی مشکل سے شائستہ انداز میں "آپ جناب" کے القاب سے بات شروع کی تھی' لیکن وہ اپنی شائستگی چند لمحوں سے زیادہ برقرار نہیں رکھ سکا۔ اپنے مخصوص اکھڑ لہجے میں بولا۔ "ابے......اگر میں نے خیمے کو تیرتھ سنگھ کی حویلی کہہ دیا تو اس سے تیرتھ سنگھ کی بے عزتی ہوگئی کیا؟ اور تجھے اس خبیث، رشوت خور کی عزت کی بہت فکر ہے کیا؟"

اس نے بیرے کی طرف کچھ ایسی نظروں سے دیکھا کہ وہ یکدم گڑبڑا گیا۔ ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "ناراض نہ ہوں صاحب جی...... میں نے تو بس ویسے ہی پوچھ لیا تھا...... کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اور دل گھبرا رہا تھا۔"

"اپنے دل سے کہہ دے، اسے گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں تم لوگوں کو بس دو راتیں یہاں گزارنی ہیں، کوئی تکلیف نہیں ہوگی، چار آدمی تمہاری خدمت اور دیکھ بھال کے لئے موجود ہوں گے۔ کھانے پینے کا سامان بھی موجود ہے۔ کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔ بس وہ لوگ صرف اس وقت تھوڑی سی بدتمیزی کریں گے' جب کوئی بھاگنے کی کوشش کرے گا یعنی وہ اسے گولی مار دیں گے۔ اس لئے میرا دوستوں اور بھائیوں والا مشورہ یہی ہے کہ کوئی بھاگنے کی کوشش نہ کرے۔ ہمارے آدمی پوری کوشش کریں گے کہ تم لوگوں کو کوئی تکلیف نہ ہو، بس تھوڑی سی تکلیف یہ ہوگی

کہ تم سب کے یہ ٹرنک ہم لے جائیں گے۔ پرسوں صبح تم سب کہیں بھی جانے کیلئے آزاد ہو گے...... اور ہو سکتا ہے تم لوگوں کے یہ ٹرنک بھی تمہیں مل جائیں' لیکن یہ وعدہ نہیں ہے۔"

بھورے نے ٹھہر ٹھہر کر یہ سب کچھ کہا۔

گویا انہیں ذہن نشین کرانا چاہ رہا ہو۔

اس دوران چار آدمی خیمے سے نکل کر اس کے چاروں کونوں پر کھڑے ہو چکے تھے۔

بھورے نے ان سے کہا۔ "لو بھئی...... اپنے مہمانوں کو سنبھال لو۔"

ان چاروں کے حلیوں سے اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ وہ بھی ڈاکو تھے۔ ان کے ہاتھوں میں بھی بندوقیں تھیں۔ انہوں نے تمام بیروں اور بس ڈرائیور کو خیمے میں چلنے کا اشارہ کیا۔ ان لوگوں نے مزید کوئی بات نہیں کی اور خاموشی سے خیمے میں چلے گئے۔ شاید انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ اب مزید سوالات سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

سلطانہ کے مزید ساتھی بھی وہیں قریب ہی جنگل میں موجود تھے۔ وہ اپنے اور دوسرے ساتھیوں کے گھوڑے سنبھالے کھڑے تھے' لیکن یہ سب لوگ اس وقت اپنے ڈیرے سے بہت دور تھے۔ انہوں نے یرغمالیوں کو رکھنے کے لئے اپنے ڈیرے سے بہت دور اور مراد آباد کے قریب جگہ تلاش کی تھی تاکہ ان کے اپنے ٹھکانے کے بارے میں کوئی کسی کو سراغ نہ دے سکے۔ انہوں نے بس بھی وہیں چھوڑ دی' کیونکہ اسے اغواء ہوئے کافی دیر ہوگئی تھی اور اب اس کے پکڑے جانے کا خطرہ تھا۔ اس لئے انہوں نے اسے مزید استعمال کرنے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔

وہ جنگل میں وہاں اکٹھے ہوئے جہاں ان کے باقی ساتھی اور گھوڑے موجود تھے۔ وہاں سے وہ گھوڑوں پر بیٹھ کر بیروں کے ٹرنک اپنے ساتھ لے کر روانہ ہوگئے۔ سلطانہ کے ایک ساتھی نے ہبورا قبیلے کے ایک آدمی کے تعاون سے تیرتھ سنگھ کی حویلی سے کچھ ہی دور گھوڑے کھڑے کرنے کے لئے ایک جگہ حاصل کر لی تھی۔ یہ ایک چھوٹا سا باغ تھا جس کے گرد احاطہ بھی موجود تھا۔

سلطانہ نے یہ جگہ حاصل کرنے کے لئے خاصی رقم خرچ کی تھی۔ یہاں وہ گھوڑے بھی کھڑے کر سکتے تھے اور بوقت ضرورت کچھ دیر قیام بھی کر سکتے تھے۔ ہبورا قبیلے کے کچھ لوگ یہاں کام کر رہے تھے' لیکن ان کی نگرانی نہیں ہو رہی تھی اور فی الحال دو تین دن کیلئے کام بھی بند تھا۔ سلطانہ کو اپنے منصوبے کی کامیاب تکمیل کیلئے تیرتھ سنگھ کے حویلی کے آس پاس ہی کہیں ایک

عارضی ٹھکانے کی اشد ضرورت تھی' جہاں وہ لوگ اپنے گھوڑے کھڑے کرنا اور بہروپ بدلنا چاہتے تھے۔

جنگل سے وہ سیدھے وہیں پہنچے۔ وہاں صاف ستھرے ہونے کے بعد انہوں نے بیروں کی وردیاں اور پگڑیاں وغیرہ پہن لیں' جس سے ان کی شخصیتیں بالکل ہی بدلی ہوئی نظر آنے لگیں۔ اپنی رائفلوں کو انہوں نے فاضل گولیوں سمیت شیروانیوں کے نیچے چھپالیا تھا۔

ہیورا قبیلے کا جو آدمی خطیر معاوضے کی وجہ سے ان کا ساتھ دے رہا تھا، اس دوران ان کے لئے پانچ یکے لے کر آن پہنچا کیونکہ ان لوگوں کو تیرتھ سنگھ کی حویلی پہنچ کر یہی ظاہر کرنا تھا کہ وہ ریلوے اسٹیشن سے یکوں میں بیٹھ کر سیدھے وہاں آرہے ہیں۔

ان لوگوں کے یکّے جب تیرتھ سنگھ کی حویلی کے سامنے پہنچ کر رکے تو سلطانہ کے دل کی دھڑکنیں کچھ تیز تھیں۔ اُسے اندیشہ تھا کہ وہاں پہنچتے ہی اس کا سامنا تیرتھ سنگھ سے نہ ہو جائے۔ اس کا خیال تو یہی تھا کہ اس کے پہچانے جانے کے بعد اب تو اس کا سراپا ہی بدل چکا تھا اور پھر بیرے کی وردی میں ہونے کی وجہ سے وہ بالکل ہی مختلف لگ رہا تھا۔ اس کے باوجود کم از کم اس وقت تک احتیاط کرنا چاہتا تھا جب تک اس کے منصوبے پر عملدرآمد کا اصل مرحلہ شروع نہ ہو جاتا۔ تیرتھ سنگھ جیسے گھاگ پولیس افسر کے سامنے احتیاط ہی بہتر تھی۔

اس کی خوش قسمتی تھی کہ حویلی کے سامنے اسے تیرتھ سنگھ کہیں دور دور تک بھی دکھائی نہیں دیا' تاہم وہاں خوب چہل پہل تھی۔ طویل و عریض میدان میں کئی بڑے بڑے شامیانے لگ چکے تھے جنہیں خوبصورتی سے سجایا گیا تھا۔ سرخ رنگ کا ایک آراستہ و پیراستہ اور چمکتا دمکتا شامیانہ الگ ہی نظر آرہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی اندازہ ہوتا تھا کہ شادی کی رسم اس کے اندر انجام دی جانی تھی۔

بیسیوں ملازمین وہاں مختلف کام کر رہے تھے اور مستعدی سے اِدھر اُدھر آتے جاتے دکھائی دے رہے تھے۔ لگتا تھا کہ آس پاس کے کچھ مکان بھی مہمانوں کے قیام کیلئے خالی کرائے گئے تھے اور ان میں مہمان پہنچ چکے تھے۔ ان مکانوں کی بھی شادی والے خاص انداز میں آرائش کی گئی تھی۔

سلطانہ اور اس کے ساتھیوں کی طرف تو کچھ دیر تک صحیح معنوں میں کسی نے توجہ ہی نہیں دی' پھر ایک ملازم ان کی طرف آیا جو اپنے انداز و اطوار سے تمام ملازموں میں زیادہ اہم معلوم

ہوتا تھا۔ اس نے پیتل کی کمانی والی عینک ناک پر ٹکائی ہوئی تھی جس کے شیشے موٹے موٹے تھے۔

''میرا نام رگھورام ہے۔'' اس نے سرسری نظر سے سب کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''میں تیرتھ سنگھ جی کا منشی ہوں۔ تم لوگ دلّی کے اوبرائے ہوٹل سے آئے ہو نا؟''

''جی ہاں...... ہمیں مہمانوں کو کھانا کھلانے کے سلسلے میں بلایا گیا ہے۔'' بھورے نے حتی' الامکان شائستگی سے کہا۔

''تم لوگوں کو تو دن چڑھے یہاں پہنچ جانا چاہئے تھا، بڑی دیر کر دی تم نے......؟'' رگھورام نے پیشانی پر بل ڈالتے ہوئے کہا۔ وہ تیرتھ سنگھ کا خاصا منہ چڑھا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اس نے ان لوگوں کے پاس آنے کے بعد پرنام کرنے کی بھی زحمت نہیں کی تھی۔

''ہمیں اسٹیشن پہنچ کر پتا چلا کہ ہماری سیٹیں دوسری ریل گاڑی میں رکھی گئی ہیں، اس میں نہیں تھیں جس میں ہم سمجھ رہے تھے، اس لئے ہمارے منیجر کی طرف سے آپ کو ہمارے پہنچنے کا ٹائم بتانے میں ذرا غلطی ہوگئی، ہم دوسری ریل گاڑی سے آئے ہیں۔'' بھورے نے اطمینان سے جواب دیا۔ اس وقت وہی ان کا سربراہ معلوم ہو رہا تھا اور وہی ساری بات چیت کر رہا تھا۔ سلطانہ ذرا پیچھے ہو کر کھڑا تھا۔ وہ فی الحال اپنے آپ کو غیر نمایاں رکھنا چاہتا تھا۔

رگھورام شاید بھورے کی وضاحت سے مطمئن ہو گیا تھا۔ وہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ٹھیک ہے...... میں تمہیں اس مکان میں بھجوا دیتا ہوں جہاں تمہارے ٹھہرنے کا بندوبست کیا گیا ہے۔ کھانا بھی وہیں مل جائے گا۔ تم لوگ کچھ دیر آرام کرو۔ شام تک مراد آباد کے وہ بیرے بھی پہنچ جائیں گے جنہیں تمہارے ساتھ کام کرنا ہے۔ تم لوگ مل جل کر ساری جگہ دیکھ لینا۔ کھانے کا سارا انتظام دیکھ لینا۔ کہاں کہاں، کون کون سے مہمان ہوں گے، وہ میں تمہیں سمجھا دوں گا۔ پھر تم لوگ طے کر لینا کہ اپنا اپنا کام کس طرح کرو گے۔ ٹھیک ہے؟''

''بالکل ٹھیک......'' بھورے نے سعادت مندی سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ اس کے ساتھ باقی سب نے بھی اثبات میں سر ہلایا۔

یکّے انہیں وہاں پہنچانے کے بعد رخصت ہو چکے تھے۔ رگھورام نے آواز دے کر ایک ملازم کو بلایا، اسے ہدایات دیں اور ان لوگوں کو اس کے ساتھ بھیج دیا۔ وہ اپنے اپنے ٹرنک اٹھائے اس کے پیچھے چل دیئے۔

ملازم نے انہیں ایک مکان کی بالائی منزل پر پہنچا دیا۔ نچلی منزل پر کچھ اور لوگ مقیم تھے۔ اس لئے انہیں وہاں محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔ اس کے باوجود ملازم کے جاتے ہی سلطانہ مٹھیاں بھینچ کر باز و فضاء میں بلند کرتے ہوئے فاتحانہ لیکن نیچی آواز میں کہے بغیر نہ رہ سکا۔

''بھئی واہ......مزا آ گیا۔ ہم اس وقت تیرتھ سنگھ کے مہمان ہیں...... وہی تیرتھ سنگھ جو پورے صوبے میں ہمیں ڈھونڈتا پھرتا ہے۔''

اس کے سب ساتھی اس کی بات پر ہنس دیئے۔ انہوں نے اطمینان سے وہاں وقت گزارا، کھانا بھی کھایا، آرام بھی کیا۔ ایک طویل عرصے کے بعد انہیں گھر کا آرام نصیب ہوا تھا۔ تازہ دم ہونے کے بعد شام کو وہ گپ شپ کر رہے تھے جب ملازم پیغام لایا کہ مقامی بیرے بھی آ گئے تھے، اب نہیں ان کے ساتھ مل کر انتظامات کا جائزہ لے لینا چاہئے۔ وہ خوشی خوشی اٹھ کر ملازم کے ساتھ چل دیئے۔

شام کا اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ حویلی کے در و دیوار پر چراغ روشن کر دیئے گئے تھے، جگہ جگہ بجلی کے قمقمے بھی لٹکائے گئے تھے۔ حویلی میں سے ڈھولک کی تھاپ پر عورتوں کے گانے کی آوازیں بھی آنے لگی تھیں۔ چاروں طرف چہل پہل تھی۔ شادی کیا تھی، میلے کا سماں تھا۔ بارات آنے میں ابھی ایک دن باقی تھا لیکن اس وقت بھی ایسا لگ رہا تھا جیسے شادی کی تقریب شروع ہو چکی ہے۔ میدان کے ایک حصے کو کچن کے طور پر استعمال کیا جا رہا تھا جہاں بڑے بڑے عارضی چولہے بنائے گئے تھے۔ وہاں اس وقت بھی کئی دیگیں چڑھی ہوئی تھیں اور فضا میں کھانوں کی خوشبوئیں پھیلی ہوئی تھیں۔ تیرتھ سنگھ انہیں اس وقت بھی وہاں کہیں نظر نہیں آیا۔ شاید اسے خود آ کر انتظامات کا جائزہ لینے کی زحمت کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

انہوں نے پورے علاقے اور تمام خیموں کا اچھی طرح جائزہ لے لیا۔ بجائے اس کے کہ وہ مقامی بیروں کی رہنمائی کرتے، بھورے اور سلطانہ نے غیر محسوس طور پر ہر بات انہیں سے اگلواتے ہوئے سارا کام سمجھ لیا۔ زیادہ گفتگو بھی وہی دونوں کرتے رہے' کیونکہ وہ کافی حد تک شائستہ اور مہذبانہ انداز میں گفتگو کرنے پر بھی قادر تھے اور چند الفاظ انگریزی کے بھی بول لیتے تھے۔

اپنے باقی ساتھیوں کو انہوں نے زیادہ تر خاموش رہنے اور کم سے کم الفاظ کے ذریعے کام چلانے کی ہدایت کی تھی' تاکہ ان کے لہجے کا اکھڑ پن ظاہر نہ ہو۔ کام کچھ زیادہ مشکل نہیں تھا۔ وہ

انہوں نے جلد ہی سمجھ لیا اور انہیں یہ بھی اندازہ ہو گیا کہ دلی جیسے بڑے شہر کے بڑے ہوٹل سے بیرے صرف اس لئے بلائے گئے تھے کہ مہمان انتظامات سے متاثر ہو سکیں۔ ورنہ ان کی کوئی ایسی خاص ضرورت نہیں تھی' لیکن ہر چیز سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ تیرتھ سنگھ ہر پہلو سے اپنے مہمانوں کو مرعوب کرنا چاہتا تھا۔ انہیں بتانا چاہتا تھا کہ وہ محض ایک ڈی ایس پی نہیں بلکہ اپنی جگہ ایک چھوٹا موٹا نواب یا ٹھاکر بھی تھا۔

اس رات تک وہاں جتنے مہمان پہنچ چکے تھے، انہیں سلطانہ اور اس کے ساتھیوں نے مقامی بیروں کے ساتھ مل کر کھانا کھلایا۔ یوں انہیں اس کام کی کچھ مشق بھی ہو گئی اور وہ زیادہ پُر اعتماد ہو گئے۔ اس رات کھانا کھلانے کے دوران ان کا سامنا تیرتھ سنگھ سے بھی ہوا۔

تیرتھ سنگھ کے اپنے خاندان، قریبی عزیزوں اور کچھ خاص دوستوں کے لئے کھانے کا انتظام حویلی میں ہی کیا گیا تھا۔ جن لوگوں نے وہاں کھانا کھلانے کا انتظام سنبھالا، ان میں چند مقامی بیروں کے علاوہ سلطانہ، بھورے، صادق اور نکیشر شامل تھے۔

تیرتھ سنگھ کو سلطانہ نے جب آخری بار دیکھا تھا' اس وقت وہ متناسب اور مضبوط جسم کا آدمی تھا۔ اب وہ اچھا خاصا بھاری بھرکم بلکہ تھل تھل کرتا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی داڑھی میں بہت سے پپوٹے بھاری ہو گئے تھے۔ وہ بہت بدل چکا تھا، اس کے باوجود سلطانہ کو اسے پہچاننے میں زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔

اسے اندیشہ محسوس ہوا کہ جس طرح اس نے بہت سی تبدیلیوں کے باوجود تیرتھ سنگھ کو پہچان لیا تھا' اسی طرح وہ بھی اسے نہ پہچان لے۔ سلطانہ نے پوری کوشش کی کہ کم از کم اس کی نظریں تیرتھ سے نہ ملنے پائیں تاہم وہ جلد ہی اس سلسلے میں بے فکر ہو گیا۔ تیرتھ سنگھ کی توجہ اس کی طرف تھی ہی نہیں......ظاہر ہے وہ اس کی نظر میں محض بیرے تھے، اس کے عارضی خدمت گار......ان سے کام لینے اور نپٹنے کے لئے تو اس نے اپنے منشی کو چھوڑا ہوا تھا۔ وہ خود تو اپنے عزیزوں، رشتے داروں اور قریبی دوستوں کی خاطر مدارت اور ان سے ہنسی مذاق میں لگا ہوا تھا۔

سلطانہ اور اس کے ساتھی بھاگ بھاگ کر ہر ایک کے حکم کی تعمیل کرتے رہے، ہر ایک کی فرمائش پوری کرتے رہے اور اس دوران وہ ان سب لوگوں کو نظروں ہی نظروں میں تولتے بھی رہے۔ انہوں نے حویلی کے کونے کھدروں تک کا اچھی طرح جائزہ لے لیا اور اس کی ساخت ذہن نشین کر لی۔ تیرتھ سنگھ کے جتنے مہمان اس وقت حویلی میں موجود تھے، وہ سب ہی موٹی

اسامیاں معلوم ہوتے تھے۔

رات گئے فارغ ہونے کے بعد سلطانہ اور اس کے ساتھیوں کو آرام کے لئے چند گھنٹے میسر آ گئے۔ صبح اٹھتے ہی انہیں مہمانوں وغیرہ کو ناشتہ فراہم کرنے سے اپنے کام کا آغاز کرنا تھا۔ باورچیوں کو ان سے بھی پہلے اٹھ کر ناشتے کے لئے انواع و اقسام کی چیزیں تیار کرنا تھیں۔

سونے سے پہلے سلطانہ اور بھورے نے اپنے ساتھیوں سے سرگوشیوں میں ایک بار پھر تبادلۂ خیال کیا کہ آنے والی رات کے دوران وہ شادی میں شریک لوگوں اور میزبانوں میں سے زیادہ سے زیادہ افراد کو کم سے کم وقت میں کس طرح لوٹیں گے۔ اب وہ اپنا منصوبہ زیادہ بہتر انداز میں بنا سکتے تھے کیونکہ انہوں نے حویلی، میدان، خیموں اور آس پاس کے علاقے کا بہت اچھی طرح جائزہ لے لیا تھا۔

سلطانہ کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی تھی کہ اس روز بھی وہاں صرف تین چار پولیس والے تعینات تھے اور اسے پتا چلا تھا کہ دوسرے روز یعنی عین شادی والے دن بھی پولیس والے پانچ سات سے زیادہ نہیں ہوں گے۔ شاید تیرتھ سنگھ نے سوچا تھا کہ اس کا تو پورے شہر اور گرد و نواح میں بڑا دبدبہ تھا۔ اسے بھلا اپنی بیٹی کی شادی کے موقع پر کیا خطرہ ہو سکتا تھا۔ اس نے جو پولیس والے بلا رکھے تھے وہ بھی میدان کے پاس بیٹھے آنے جانے والے مہمانوں کو سلام، پرنام یا نمستے کر رہے تھے۔ تیرتھ سنگھ کے مہمانوں میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی سبھی شامل تھے تاہم مہمانوں میں کوئی آدمی ایسا دکھائی نہیں دے رہا تھا جسے نیچ ذات کا سمجھا جا سکتا۔ جن ذاتوں کو کمتر یا نیچ سمجھا جاتا تھا، ان کے کچھ لوگ صفائی ستھرائی اور کوڑا کرکٹ وغیرہ سمیٹنے پر ضرور مامور تھے۔



دوسرے روز شام ڈھلے بارات پہنچی تو اس کا زبردست استقبال ہوا۔ بیسیوں لڑکیاں رنگ برنگے اور زرق برق لباسوں میں اس کے استقبال کے لئے سڑک کے دونوں اطراف پھولوں کی پتیوں کی ٹوکریاں لئے کھڑی تھیں۔ دیر تک انہوں نے دولہا اور باراتیوں پر پتیاں نچھاور کیں۔ اس دوران باجا گاجا بھی ہوتا رہا اور آتش بازی بھی چلتی رہی۔ بہت دیر میں جا کر یہ ہنگامہ تھما۔

دولہا اور بارات کو سب سے بڑے، خصوصی شامیانے میں لے جایا گیا اور ان کی خاطر مدارت کا ابتدائی مرحلہ شروع ہو گیا۔ سلطانہ اور اس کے ساتھی وہاں اپنا کام کرنے کے ساتھ ساتھ سب کا جائزہ بھی لے رہے تھے۔ دولہا والے بھی خاصے خوشحال گھرانے کے لوگ معلوم

ہوتے تھے۔ دولہا کی پگڑی کے گرد قیمتی موتیوں اور جواہر کی لڑیاں لپٹی ہوئی تھیں۔ وہ گلے میں سونے کی کئی موٹی موٹی زنجیریں اور راکٹ پہنے ہوئے تھا۔ مہمانوں میں بھی بیشتر کے گلوں میں سونے کی وزنی زنجیریں اور انگلیوں میں قیمتی انگوٹھیاں نظر آ رہی تھیں۔ ان میں سے کئی کے تو ملبوسات بھی بہت قیمتی معلوم ہو رہے تھے۔

خود تیرتھ سنگھ بھی اس وقت زردوزی کے کام والی نئی چم چم کرتی قیمتی شیروانی میں تھا۔ اس کے پیروں میں جو سلیم شاہی جوتیاں تھیں اس کی قیمت بھی کچھ کم نہیں ہوگی۔ وہ سونے کی کئی موٹی موٹی چیزیں بھی پہنے ہوئے تھا۔ سلطانہ اور اس کے ساتھی چار سو روپے مہینہ تنخواہ پانے والے ڈی ایس پی کا رہن سہن، پہناوا اور شادی کے انتظامات دیکھ کر حیران تھے۔ اب ان کے دلوں میں یہ خواہش اور شدید ہو گئی تھی کہ وہ بھی تیرتھ سنگھ کو ایک مختلف قسم کی حیرت سے دوچار کریں گے۔

وہ خاموشی اور فرمانبرداری سے اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔ تقریب کے مختلف مراحل طے ہوتے رہے۔ شادی کی رسوم ادا ہو گئیں۔ پھیرے بھی ہو گئے۔ پھیروں کے لئے جو آگ روشن کی گئی تھی وہ صرف انگاروں کے ایک ڈھیر کی صورت میں باقی رہ گئی تھی۔ دولہا، دلہن کے ساتھ حویلی کے اندر جا کر جوتا چھپائی اور دوسری رسوم کے مرحلوں سے بھی گزر آیا تھا۔ تمام مرد اور عورتیں کھانے سے بھی فارغ ہو چکی تھیں۔

تب سلطانہ کو پتا چلا کہ ابھی ایک مرحلہ باقی تھا۔ اس نے حویلی کے طویل و عریض صحن کے وسط میں لکڑی کے تختوں سے بنا ہوا ایک اسٹیج نما چبوترا دیکھا تھا۔ اس کے چاروں طرف دور دور تک قالین بچھائے گئے تھے اور ان پر چاندنیاں بچھائی گئی تھیں۔ سیکڑوں گاؤ تکیے ان چاندنیوں پر پڑے ہوئے تھے۔ رفتہ رفتہ کچھ لوگ آ کر قالینوں پر گاؤ تکیوں کے سہارے بیٹھنے لگے۔

تھوڑی ہی دیر میں کافی لوگ وہاں جمع ہو گئے۔ تیرتھ سنگھ، اس کا سمدھی، بارات میں آئے ہوئے بہت سے لوگ اور کچھ دوسرے مہمان بھی ان میں شامل تھے۔ کچھ دیر بعد ایک جواں سال لڑکی اور چند سازندے حویلی کے ایک کمرے سے نکل کر صحن میں آئے اور مہمانوں کے درمیان سے گزر کر اسٹیج پر پہنچ گئے۔

اس لڑکی کو دیکھ کر ایک لمحے کے لئے تو گویا سلطانہ کا دل دھڑکنا بھول گیا۔ اس میں تپلی کی کافی مشابہت تھی وہ تپلی سے زیادہ خوبصورت تھی۔ اوپر سے اس کا لباس ایسا تھا، جس میں اس کا انگ انگ نمایاں تھا۔ صرف یہی نہیں، اس کی چال بھی قیامت تھی۔ اسٹیج تک جانے میں وہ ہر

قدم کے ساتھ گویا فتنے جگاتی گئی تھی۔

سازندوں نے اسٹیج پر بیٹھ کر اپنے ساز درست کئے۔ لڑکی اس دوران اچٹتی سی نظروں سے حاضرین کا جائزہ لیتے ہوئے دھیرے دھیرے مسکراتی رہی۔ اس کی مسکراہٹ بھی کچھ ایسی تھی کہ سلطانہ کو اپنا دل بے اختیار اس کی طرف کھنچتا ہوا محسوس ہوا۔ اس کے جو ساتھی وہاں موجود تھے، وہ بھی بیوقوفانہ سے انداز میں منہ کھولے ایک ٹک اسی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ غنیمت یہ تھا کہ کوئی ان کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ وقتی طور پر شاید وہ بھول ہی گئے تھے کہ وہ کس بہروپ میں وہاں کھڑے تھے اور کس کام کے لئے آئے ہوئے تھے۔

چند لمحوں بعد سازندوں نے ساز بجانا شروع کر دیئے اور لڑکی ان کی دھن پر رقص کرنے لگی۔ اس کا جسم شاخ گل کی طرح لچک رہا تھا اور حاضرین جو سارے کے سارے مرد ہی تھے دھیرے دھیرے سحر زدہ سے ہونے لگے۔ کچھ دیر بعد تیرتھ سنگھ کے اپنے ملازم اندر سے طشتریوں میں ولایتی شراب کی بوتلیں اور گلاس وغیرہ لے کر آنے لگے۔ انہوں نے جگہ جگہ طشتریاں مہمانوں کے درمیان رکھنا شروع کر دیں۔ شاید کسی مصلحت کے تحت یہ کام بیروں کے سپرد نہیں کیا گیا تھا حالانکہ ان میں سے کئی وہاں موجود تھے۔

سلطانہ اور اس کے چھ ساتھی خود اپنی منصوبہ بندی کے تحت وہاں موجود تھے۔ کسی نے انہیں بلایا نہیں تھا اور قسمت ان کا ساتھ دے رہی تھی۔ شاید اسی لئے ابھی تک کسی نے ان سے پوچھا نہیں تھا کہ وہ وہاں کیوں کھڑے تھے۔ انہوں نے اپنے منصوبے کا ایک اور مرحلہ بھی خاموشی سے مکمل کر لیا تھا۔ آج باہر موجود پولیس والوں کی تعداد دس ہو چکی تھی۔ سلطانہ کے ایک ساتھی نے انہیں جو کھانا فراہم کیا تھا اس میں بے ہوشی کی دوا ملا دی گئی تھی۔ سلطانہ کو اطلاع مل چکی تھی کہ جب کانسٹیبلوں پر غنودگی طاری ہونے لگی تو وہ خود ہی اپنی کرسیاں ایک شامیانے کی آڑ میں اندھیرے میں لے گئے تھے اور اب کرسیوں پر آڑے ٹیڑھے پڑے خراٹے لے رہے تھے۔

محفل میں جام گردش کرنے لگے تھے اور جلد ہی حاضرین سرور میں دکھائی دینے لگے تھے۔ کبھی کبھی کوئی بلند اور خمار زدہ آواز میں رقاصہ کو داد بھی دینے لگتا تھا۔ کچھ دیر اور گزری، کچھ اور شراب لوگوں کے معدوں میں پہنچی تو ان کا انداز رقاصہ پر قربان ہو جانے والا ہو گیا۔ ویسے رقاصہ اس قابل تھی بھی...... وہ صحیح معنوں میں ایک ساحرہ تھی۔ اس کا چہرہ، جسم، آواز سبھی کچھ بے مثال تھا۔

اسے رقص کرتے اور گاتے کافی دیر ہو گئی تھی‘ لیکن اس کے نرت بھاؤ وہی تھے۔ اس کے رقص یا آواز میں ذرا سی بھی تھکن کی جھلک نہیں تھی۔ جس طرح اس کی لمبی، سیاہ ریشمی زلفوں میں سجے ہوئے پھول تر و تازہ دکھائی دے رہے تھے اسی طرح وہ خود بھی ابھی تک بالکل تازہ دم تھی۔

سلطانہ اور اس کے ساتھی اب بھی اس کی آواز کی نغمگی اور حسن کے جلوؤں میں کھوئے ہوئے تھے‘ لیکن اب ان کی حالت پہلے جیسی نہیں تھی۔ انہیں اب یاد آ گیا تھا کہ وہ وہاں کس کام کے لئے آئے ہیں۔

محفل شباب پر تھی اور مہمان میزبان سب خوب مستی میں تھے۔ کسی کو پتا ہی نہیں چلا کے اس وقت تک حویلی کے اس حصے کے دروازے بھی بند کئے جا چکے تھے جہاں عورتیں موجود تھیں اور مین گیٹ بھی اندر سے بند کر دیا گیا تھا۔ سلطانہ اور اس کے ساتھی ایسی جگہیں سنبھال چکے تھے کہ تمام حاضرین چاروں طرف سے ان کے نرغے میں تھے۔

دلچسپ بات یہ تھی کہ تیرتھ سنگھ کے گھریلو ملازم بھی پوری طرح محفل رقص و سرود میں کھوئے ہوئے تھے‘ حالانکہ وہ پینے پلانے کے شغل میں شریک نہیں تھے۔ انہیں بھی پتا نہیں چلا کہ کب سلطانہ اور اس کے ساتھیوں کی شیروانیوں کے بٹن دھیرے دھیرے کھلے، کب ان کی پگڑیوں کے کچھ حصے نے ان کے آدھے آدھے چہرے ڈھانپ لئے اور کب ان کی رائفلیں شیروانیوں سے باہر آ گئیں۔

اچانک چند فائروں کے دھماکوں سے درودیوار لرز اٹھے۔ گو کہ یہ ہوائی فائر تھے‘ لیکن وہاں موجود کئی لوگوں کی چیخیں نکل گئیں۔ رقاصہ کا نغمہ بھی اچانک چیخ میں ڈھل گیا اور یوں لگا جیسے اس کے پیروں میں بندھے گھنگرو ٹوٹ کر بکھر گئے ہوں۔ عورتیں گو کہ حویلی کی اصل عمارت میں بند ہو کر رہ گئی تھیں لیکن اس طرف سے بھی کئی چیخیں سنائی دیں۔

جیسے ہی چیخوں کی آوازیں مدھم پڑیں شیر کی دھاڑ کی طرح سلطانہ کی آواز گونجی۔ ”کوئی اپنی جگہ سے نہ ہلے...... یہ سلطانہ ڈاکو کا حکم ہے۔“

سلطانہ کا نام سنتے ہی کچھ دبی دبی چیخیں اور ابھریں۔ سلطانہ نے اسی گرجدار آواز میں مزید کہا۔ ”تیرتھ سنگھ! تمہارے لئے خاص طور پر میرا حکم ہے...... کوئی بہادری دکھانا تو دور کی بات اپنی جگہ سے ہلنا بھی مت...... ورنہ میں تمہارا یہ بڑے ڈھول جیسا پیٹ پھاڑ کر تمہاری انتڑیاں اور اوجھڑی کتوں کو کھلا دوں گا۔“

تیرتھ سنگھ کی موٹی موٹی بارعب مونچھیں بچھو کی دم کی طرح اوپر کو اٹھی ہوئی تھیں، مگر اس لمحے کچھ ایسا لگا جیسے وہ نیچے کو ڈھلک گئی ہوں۔ چند سیکنڈ میں گویا اس کا نشہ ہرن ہو گیا اور چہرہ کچھ اتر سا گیا۔ خوف سے زیادہ شاید ذلت کے احساس نے اس کی حالت خراب کردی تھی۔ پورے مراد آباد، نجیب آباد، آس پاس کے علاقوں اور دلی تک کے لوگ اس کے مہمانوں میں شامل تھے اور ان میں سے زیادہ تر علاقوں میں اس کا رعب و دبدبہ تھا۔ مزید ستم ظریفی یہ تھی کہ وہ سلطانہ خود آ کر اسکی حویلی میں ڈاکا ڈال رہا تھا...... وہ بھی عین اس کی بیٹی کی شادی کے دن......!

سلطانہ اور اس کے تین ساتھیوں نے صحن کے چاروں کونوں پر کھڑے ہو کر تمام لوگوں کو بندوقوں کی زد پر لیا ہوا تھا، جبکہ باقی ساتھیوں نے لوٹ مار شروع کردی تھی۔ وہ نہایت تیزی سے مردوں کے جسموں پر موجود سونے، چاندی کی چیزیں اتروا رہے تھے اور ان کی جیبوں سے پیسے نکال رہے تھے۔ کچھ لوگوں سے تو ان کے قیمتی کپڑے بھی اتروا لئے گئے، وہ زیر جاموں میں کھڑے شرمندہ دکھائی دے رہے تھے۔

اپنے ساتھیوں کو یہ ہدایت سلطانہ ہی نے کی تھی کہ جن لوگوں کے کپڑے زیادہ قیمتی نظر آئیں وہ اتروا لئے جائیں۔ انہیں اپنے لئے ان کپڑوں کی ضرورت نہیں تھی۔ سلطانہ کا ارادہ تھا کہ جاتے وقت یہ لوگ یہ کپڑے غریبوں کی قریبی بستی میں پھینک جائیں گے۔ وہ چاہتا تھا کہ کچھ غریب بھی کم از کم ایک بار تو امیرانہ لباس پہننے کی حسرت پوری کرسکیں۔ شاید وہ لوگ ایسے لباس پہن کر گلی کوچوں اور بازاروں میں تو نہ نکلتے لیکن کم از کم اپنے گھروں میں پہن کر تو خوش ہو سکتے تھے۔ شاید ان کے لئے یہ احساس ہی خوشی کا باعث ہوتا کہ ان کے پاس ایسے لباس موجود ہیں اور کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ یہ لباس پہن کر باہر گھوم پھر بھی لیتے۔ لوگ ایسی چیزیں سرعام استعمال کرتے وقت فخر سے کہہ دیا کرتے تھے کہ وہ انہیں سلطانہ ڈاکو کی طرف سے ملی ہیں۔

سلطانہ کے کچھ ساتھی اندر بھی جا گھسے تھے اور عورتوں میں لوٹ مار کر رہے تھے۔ زیورات اور نقدی وغیرہ تھیلوں میں جمع کر رہے تھے۔ جہیز کے تمام زیورات اور بہترین کپڑے بھی انہوں نے تھیلوں میں ڈال لئے تھے۔ سلطانہ نے جو فائر کئے تھے وہ شامیانوں میں موجود اس کے ساتھیوں کیلئے سگنل کی طرح تھے۔ انہوں نے وہاں لوٹ مار شروع کردی تھی۔ سلطانہ کے شکار تین جگہ تقسیم ہو گئے تھے۔ اسی مناسبت سے سلطانہ نے اپنے ساتھیوں کو بھی تین ٹکڑیوں میں تقسیم کر دیا تھا تاکہ لوٹ مار کا کام تیزی سے ہو سکے اور اگر کسی قسم کی مزاحمت سے واسطہ پڑے تو وہ

آسانی سے اس سے نپٹ سکیں۔ زیادہ بڑے ہجوم میں ان کے گھر جانے کا اندیشہ نہ رہے۔ اس کی یہ حکمت عملی کامیاب جا رہی تھی۔

سلطانہ خاص طور پر تیرتھ سنگھ پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ لگتا یہی تھا کہ تیرتھ سنگھ کا کسی قسم کا مزاحمت کرنے یا بہادری دکھانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ یقیناً اپنے آپ کو بے بس محسوس کر رہا تھا۔ سلطانہ کی دہشت اتنی تھی کہ اس کا نام سن کر ہی تیرتھ سنگھ کے آدمی اور اس کے تمام مہمان بھیگی بلی بن گئے تھے۔ تیرتھ سنگھ کو یقیناً اندازہ تھا کہ کسی معجزے کے تحت اگر وہاں موجود سب لوگوں میں جرأت پیدا ہو بھی جاتی اور وہ ڈاکوؤں کو قابو میں کرنے کی کوشش کرتے تو ان کی یہ کوشش انتہائی احمقانہ ثابت ہوتی۔

صحن کے چاروں کونوں پر کھڑے ہوئے چار مسلح ڈاکو ہی صحن کو لاشوں سے پاٹ دینے کے لئے کافی تھے۔ لوگوں کے ہجوم پر اگر چار اطراف سے فائرنگ ہو تو لاشیں بے حساب گرتی ہیں۔ اس بات کا تیرتھ سنگھ کو اچھی طرح اندازہ تھا اور ان ڈاکوؤں کے آدھے آدھے چہرے گو کہ ان کی اپنی ہی پگڑیوں سے چھپ چکے تھے، لیکن ان کی صرف آنکھوں سے ہی ان کی سفاکی کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ ان آنکھوں میں خون کی پیاس تھی اور یہ لوگ اپنے انجام سے گویا بالکل بے پروا تھے۔ وہ جان ہتھیلی پر رکھ کر پھرنے والے لوگ تھے۔

تاہم تیرتھ سنگھ کئی بار آنکھوں میں امید کی ایک ہلکی سی رمق لئے مین گیٹ کی طرف دیکھ چکا تھا۔ گو کہ اس وقت مین گیٹ اندر سے بند تھا۔ لیکن شاید اسے کوئی مدھم سا امکان نظر آ رہا تھا کہ کچھ لوگ گیٹ توڑ کر یا دیوار پھلانگ کر ان کی مدد کو آ جائیں۔

سلطانہ نے گویا اس کے خیالات پڑھتے ہوئے دور ہی سے قہقہہ لگا کر اونچی آواز میں کہا۔

''دروازے کی طرف امید بھری نظروں سے دیکھنا بیکار ہے تیرتھ سنگھ! میرے سپاہی اس وقت دنیا سے بے خبر پڑے میٹھے میٹھے سپنے دیکھ رہے ہیں اور باقی رہے تیرے مہمان...... تو باہر ان کی بھی حجامت بن رہی ہے......!''

یہ سن کر تیرتھ سنگھ کے چہرے پر مایوسی بڑھ گئی۔ اسٹیج پر سازندے اپنے ساز چھوڑ کر چوہوں کی طرح سکڑے سمٹے بیٹھے تھے۔ رقاصہ پر اس ساری صورتحال کا عجیب ہی اثر ہوا تھا۔ وہ گویا اپنی جگہ بُت بن کر رہ گئی تھی اور ایک ٹک صرف سلطانہ کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔ سلطانہ نے بھی اس کے انہماک کو محسوس کر لیا تھا اور وہ اس پر حیران تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ

رقاصہ اس کی طرف اس طرح کیوں دیکھ رہی تھی جیسے اس پر جادو کر دیا گیا ہو۔ اسے اپنے بارے میں کوئی خوش فہمی نہیں تھی۔ وہ نہیں سمجھتا تھا کہ اس کی شخصیت میں کوئی ایسی بات تھی کہ اس رقاصہ جیسی کوئی حسین اور پُرکشش عورت یوں سحر زدہ ہو کر اس کی طرف دیکھ سکتی جبکہ اس وقت تو اس کا آدھا چہرہ بھی پگڑی کے کپڑے میں چھپا ہوا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو یہی سمجھایا کہ رقاصہ شاید اس سے دہشت زدہ تھی۔

چند منٹوں کے اندر اندر وہاں لوٹ مار کی کارروائی مکمل ہوگئی۔ اندر کے کمروں سے بھی سلطانہ کے ساتھی تھیلے اٹھائے نکل آئے۔ وہ لوگ سب مہمانوں کو بندوقوں کی زد پر ہی رکھتے ہوئے الٹے قدموں گیٹ تک پہنچے اور اسے کھول کر ایک ایک کر کے نکل گئے۔ آخری آدمی نے باہر نکلتے ہی گیٹ کا بولٹ باہر سے چڑھا دیا اور سب لوگ اندر بند ہوگئے۔

باہر آ کر ڈاکوؤں نے شامیانوں میں لوٹ مار میں اپنے ساتھیوں کا ہاتھ بٹایا۔ سلطانہ نے دیکھا کہ اس کے ایک ساتھی نے دولہا کی پگڑی اور اس کے گلے میں پڑی ہوئی قیمتی موتیوں کی مالائیں بھی اتروالی تھیں لیکن وہ اس سے سنبھل نہیں رہی تھیں۔ دولہا اس کے سامنے خوفزدہ کھڑا تھا۔ اس وقت دلہن بھی وہیں موجود تھی۔ وہ تو خوف کے مارے باقاعدہ رو رہی تھی۔ اس کے دوپٹے کا پلو دولہا کی کمر میں بندھے ہوئے کپڑے میں اڑسا ہوا تھا۔ سلطانہ کا ساتھی اس کے زیورات بھی اتروا چکا تھا حتیٰ کہ اس کی ناک میں نتھ اور ماتھے پر جھومر بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ رونے کی وجہ سے اس کی آنکھوں کا کاجل پھیل چکا تھا اور خوف سے پھٹی پھٹی آنکھوں کے ساتھ اس وقت وہ اچھی خاصی ڈراؤنی لگ رہی تھی۔

سلطانہ نے دولہا کی پگڑی اپنے ساتھی سے لے لی کیونکہ اس کے پاس اور بھی کافی سامان تھا۔ پگڑی بہت خوبصورت تھی۔ اس پر بھی قیمتی موتیوں کی مالائیں لپٹی ہوئی تھیں۔ سلطانہ نے غیر ارادی طور پر اپنی پگڑی اتاری اور اس کی جگہ دولہا کی پگڑی پہن لی۔ دولہا کی موتیوں کی مالائیں بھی اس نے اپنے ساتھی سے لے کر اپنے گلے میں پہن لیں۔

شامیانوں میں بھی لوٹ مار کا عمل مکمل ہو چکا تھا۔ سلطانہ نے ایک خاص آواز نکال کر اپنے ساتھیوں کو اشارہ دیا کہ اب انہیں وہاں سے نکل لینا چاہئے۔ سلطانہ کے اندازے کے مطابق ان کی توقع سے زیادہ مال ان کے ہاتھ آ چکا تھا۔ اس کے خیال میں یہ ان کی اب تک کی سب سے اچھی واردات تھی۔

ان کا منصوبہ یہ تھا کہ واردات کے بعد وہ سب مختلف سمتوں میں بکھر جائیں گے تاکہ ان کا پیچھا کرنا آسان نہ رہے۔ کچھ دیر بعد وہ اس باغ میں جمع ہوں گے جہاں ان کے گھوڑے موجود تھے، گھوڑوں پر سوار ہو کر وہ تیزی سے اپنے علاقے کی طرف روانہ ہو جائیں گے۔ صبح منہ اندھیرے ان کے دو ساتھی بھی یرغمالیوں کو چھوڑ کر اسی طرف روانہ ہو جائیں گے جو قریبی جنگل میں موجود تھے۔ صرف سلطانہ کا گھوڑا قریبی بستی کے پیچھے بندھا ہوا تھا۔

انہوں نے سب مہمانوں کو ایک ہی شامیانے میں جمع کر لیا تھا۔ رخصت ہونے سے پہلے سلطانہ نے ان سب کو خبردار کیا۔ ”اگر آدھے گھنٹے تک کسی نے شامیانے سے باہر آنے کی کوشش کی تو وہ زندہ نہیں بچے گا۔ آدھے گھنٹے تک ہمارے آدمی باہر موجود رہیں گے۔“

ان کا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا' لیکن مہمان جتنے خوفزدہ آ رہے تھے اس سے یہی لگ رہا تھا کہ وہ سلطانہ کی ہدایت پر عمل کریں گے۔ سلطانہ اور اس کے ساتھی الٹے قدموں خیمے سے باہر آئے۔ سلطانہ نے خیمے کا پردہ گرا دیا اور وہ سب اِدھر اُدھر غائب ہوگئے۔ سلطانہ کے پاس دولہا کی پگڑی اور مالاؤں کے سوا کوئی مال غنیمت نہیں تھا۔

اس نے اپنی رائفل کندھے پر لٹکائی اور اطمینان سے یوں ٹہلتا ہوا حویلی کے سامنے والی سڑک پر روانہ ہوگیا' جیسے وہ بھی وہاں مہمان آیا ہو اور تقریب ختم ہونے پر رخصت ہو رہا ہو۔ اس نے دیکھا آس پاس کے مکان بھی سکوت اور اندھیرے میں ڈوبے ہوئے تھے جیسے وہاں کوئی رہتا ہی نہ ہو۔ یہ سلطانہ کے نام کی دہشت تھی۔ وہ گردوپیش کا جائزہ لیتے ہوئے مسکرا دیا۔

وہ حویلی کے کونے پر پہنچا ہی تھا کہ اس طرف کی گلی سے اچانک ایک شخص نمودار ہوا۔ سلطانہ کا ہاتھ فوراً اپنی رائفل پر گیا' لیکن وہ اسے ہاتھ میں لیتے لیتے رک گیا۔ گلی سے نمودار ہونے والا شخص انگریز تھا وہ بے ضرر معلوم ہوتا تھا۔ وہ نیلے رنگ کے سوٹ میں تھا اور ذرا نشے میں معلوم ہوتا تھا۔ اس کی چال میں ہلکی سی لڑکھڑاہٹ تھی۔

وہ ادھیڑ عمر اور چھریرے بدن کا تھا۔ اس کے سر پر ہیٹ نہیں تھا اور اس کے چھدرے بال ذرا بے ترتیب تھے۔ وہ خاصا وجیہ تھا اور چہرہ بتاتا تھا کہ جوانی میں زیادہ وجیہ رہا ہوگا۔ وہ سلطانہ سے ٹکراتے ٹکراتے بچا تھا۔

ابھی سلطانہ فیصلہ نہیں کر سکا تھا کہ اس کے ساتھ کیا سلوک کرے مگر انگریز اسی لمحے دونوں ہاتھ اٹھاتے ہوئے معذرت خواہانہ لہجے میں بولا۔ ”معاف کرنا جنٹلمین...... ہم میرج میں آنے

میں تھوڑا لیٹ ہوگیا...... ہمارا گاڑی خراب ہوگیا تھا اور ہم راستہ بھول گیا تھا......ویری سوری......''

سلطانہ نے آہستگی سے اپنا ہاتھ رائفل سے ہٹالیا اور مسکرا دیا۔ انگریز بے ضرر معلوم ہوتا تھا۔ اس کے لہجے میں بھی ہلکا سا خمار تھا۔ اس نے سلطانہ سے مصافحے کے لئے بھی ہاتھ بڑھا دیا۔

''کوئی بات نہیں......کوئی بات نہیں......'' سلطانہ نے اس سے مصافحہ کرتے ہوئے نرمی سے کہا۔ جواباً اخلاق کا مظاہرہ کرنے کے لئے وہ مسکرا بھی دیا۔

''میں فریڈی ینگ ہوں......ڈی ایس پی فریڈی ینگ......'' انگریز نے خمار زدہ لہجے میں اپنا تعارف کرایا۔

ڈی ایس پی......؟ سلطانہ کے ذہن میں چھنا کا سا ہوا' لیکن اس کے انداز و تاثرات میں ذرا سا بھی فرق نہ آیا۔

فریڈی ینگ منتظر سی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شاید وہ توقع کر رہا تھا کہ اس سے ہاتھ ملانے والا قد آور اور مضبوط نوجوان بھی اس سے اپنا تعارف کرائے گا۔ جب سلطانہ نے اپنا نام نہیں بتایا تو فریڈی ینگ اس کی پگڑی اور مالاؤں کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔

''اچھا......تم گروم......میرا مطلب ہے تم دولہا ہے......؟''

''جی......جی صاحب......؟'' سلطانہ نے اثبات میں سر ہلایا اور سچ مچ تھوڑا سا شرما گیا۔

''اوکے......اوکے......'' فریڈی ینگ جوش و خروش سے اس کا مضبوط اور کھردرا ہاتھ دباتے ہوئے بولا۔ ''تم کو شادی کا بہت بہت مبارکباد جنٹلمین......''

پھر اس نے سلطانہ کے کندھے پر لٹکی ہوئی رائفل کی طرف آنکھیں سکیڑ کر دیکھا اور الجھن زدہ سے لہجے میں بولا۔ ''تم نے شادی والا دن بھی اپنا گن اٹھایا ہوا ہے؟''

''وہ......اصل میں صاحب جی......ہمیں خبر ملی تھی کہ شادی آج سلطانہ ڈاکو لوٹ مار کرنے ادھر آئے، اس لئے میں نے سوچا گن ساتھ لے چلوں تو اچھا ہے۔''

''سلطانہ ڈاکو......!'' فریڈی ینگ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ہاں......ہم نے اس کا بہت نام سنا ہے......اس کا ریکارڈ بھی پڑھا ہے......بہت بڑا ڈاکو ہے۔ تم نے اچھا کیا، گن ساتھ لایا......لیکن تم اکیلا سلطانہ ڈاکو کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا......مگر......ہاں......سلطان......

اکیلا بہت لوگوں کا بہت کچھ بگاڑ سکتا ہے......''

''یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں صاحب جی......!'' سلطان مسکراتے ہوئے بولا۔ پھر اس نے دور شامیانوں کی طرف اشارہ کیا۔ ''آپ ادھر چل کر بیٹھیں......میں ایک چھوٹا سا کام کر کے آتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے......ٹھیک ہے جنٹلمین......تم سے مل کر بہت خوشی ہوا۔'' فریڈی ینگ نے اس کا کندھا تھپتھپایا اور آگے بڑھ گیا۔

سلطانہ چھلاوے کی طرح وہ گلی عبور کر گیا جس میں سے فریڈی ینگ برآمد ہوا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ مختلف جگہوں پر بند کئے گئے لوگ اب دہشت کے اثر سے باہر آنے والے ہوں گے اور وہ جلد ہی ادھر اُدھر سے نکل آئیں گے۔ سلطانہ حویلی کی پشت پر جا پہنچا۔ وہ اس طرف سے اپنے فرار کے لئے ایک راستہ منتخب کر چکا تھا۔ اسے ادھر سے اپنے گھوڑے تک پہنچنا تھا۔

اس میں تھوڑا سا گھماؤ پھراؤ ضرور تھا' لیکن یہ سب ان کی حکمت عملی کا حصہ تھا۔ ان کے غائب ہونے کے بعد اگر عام لوگ یا پولیس یہ اندازہ لگانے کی کوشش کرتی کہ وہ کس طرف گئے ہیں تو کسی کی کچھ سمجھ میں نہ آتا۔

سلطانہ حویلی کے عقب میں پہنچا تو وہاں ایک اور حیرت اس کی منتظر تھی۔ اس نے وہاں رقاصہ کو اپنے سازندوں سمیت دیوار کے قریب کھڑے دیکھا۔ دیوار میں چھوٹا سا ایک عقبی دروازہ موجود تھا اور وہ لوگ شاید اسی لمحے اس دروازے سے باہر آئے تھے۔ سازندے حیران پریشان سے چاروں طرف دیکھ رہے تھے۔

''تم نے باہر آنے کی بہت جلدی کی......'' سلطانہ نے رائفل کندھے سے اتارتے ہوئے پورے غصے سے کہا۔ ''ادھر میرے آدمیوں نے تو پچھلا گیٹ بھی باہر سے بند کر دیا تھا۔ تمہیں یہ دروازہ کیسے کھلا مل گیا؟''

''اس دروازے کا کسی کو پتا ہی نہیں ہے۔'' رقاصہ نے جواب دیا۔ ''اندر سے بھی اور باہر سے بھی......یہ تو نظر ہی مشکل سے آتا ہے......لیکن میں اس حویلی سے بہت اچھی طرح واقف ہوں کیونکہ میں خوشی کے کئی موقعوں پر یہاں آ چکی ہوں اور ٹھہر بھی چکی ہوں۔''

وہ ذرا بھی خوفزدہ معلوم نہیں ہوتی تھی اور مسکرا کر بات کر رہی تھی۔ اس کی مسکراہٹ بھی دلکش تھی۔

"پھر بھی...... تمہارا اتنی جلدی باہر آنے کا مقصد کیا تھا؟" سلطانہ نے شک زدہ لہجے میں پوچھا۔

"صرف تمہیں ایک نظر دیکھنا......" رقاصہ نے بے باکی اور بے ساختگی سے جواب دیا۔ "میں چاہتی تھی کہ تمہارے یہاں سے جانے سے پہلے ایک بار تمہیں اور دیکھ لوں۔"

رقاصہ کے اس جواب نے سلطانہ کو حیران پریشان کر دیا۔ اس لمحے کے لئے وہ دم بخود اس کی طرف دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس کے جواب میں کیا کہے۔

رقاصہ ایک گہری سانس لے کر ایک لمحے کے لئے آنکھیں بند کر کے کھولنے کے بعد بولی۔ "بھگوان کی بڑی کرپا ہے کہ اس نے میری یہ آشا پوری کر دی۔"

پھر وہ ذرا بدلے ہوئے لہجے میں بولی۔ "پتا نہیں تم مجھ پر کیا شک کر رہے ہو اور کیا سمجھ رہے ہو۔ اگر تم سمجھ رہے ہو کہ میں نے لوگوں کو حویلی میں سے نکلنے کا راستہ دکھانے کی کوشش کی تھی...... تو تمہارا خیال غلط ہے۔ حویلی میں سے صرف میں اور میرے یہ تینوں استاد نکلے ہیں۔"

اس نے سازندوں کی طرف اشارہ کیا۔ "اور باہر آتے ہی میں نے اس دروازے کی کنڈی بند کر دی تھی۔"

اس نے دروازے کی طرف اشارہ کیا تو سلطانہ نے دیکھا۔ واقعی دروازے کی کنڈی باہر سے بند تھی۔ رقاصہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "اندر تو کسی کو پتا بھی نہیں ہے کہ ہم لوگ نکل آئے ہیں۔"

"ٹھیک ہے......" سلطانہ ہاتھ اٹھا کر بولا۔ "مجھے تمہاری بات کا اعتبار آ گیا لیکن مجھے تم سے بہت ساری باتیں کرنی ہیں اور یہ کوئی باتیں کرنے کی جگہ نہیں ہے اور نہ ہی یہ باتیں کرنے کا موقع ہے۔"

اس کے دل نے اچانک ہی ایک فیصلہ کر لیا تھا۔ اس نے رقاصہ کی کلائی مضبوطی سے پکڑی اور اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ سازندوں سے اس نے سخت لہجے میں کہا۔ "تم میں سے کئی ہمارے پیچھے آنے کی کوشش نہ کرے۔"

دوسرے ہی لمحے وہ رقاصہ کو اپنے ساتھ لئے وہاں سے دوڑ پڑا......



سازندے ہکا بکا وہیں کھڑے رہ گئے اور سلطانہ رقاصہ کو ساتھ لئے ایک تاریک راستے کی طرف دوڑتا چلا گیا۔ بہت تیز دوڑنے والے مرد بھی اس معاملے میں سلطانہ کا مقابلہ نہیں کر پاتے تھے مگر رقاصہ، سلطانہ کے ساتھ ساتھ دوڑ رہی تھی۔ گو کہ اس کی کلائی، سلطانہ کے ہاتھ میں تھی لیکن وہ اس کے ساتھ گھسٹ نہیں رہی تھی اور نہ ہی سلطانہ کو اسے اپنے ساتھ کھینچنے یا ایک لمحے کے لئے بھی اپنی رفتار کم کرنے کی ضرورت پڑی تھی۔ وہ بھی گویا سلطانہ ہی کی طرح ہوا کے دوش پر اڑی چلی جا رہی تھی۔ سلطانہ اس بات پر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

دو تین منٹ میں ہی وہ آبادی سے دور نکل آئے۔ پھر سلطانہ ایک جگہ رک گیا۔ سامنے ہی ایک چھوٹے سے میدان میں ایک درخت سے ایک گھوڑا بندھا کھڑا تھا۔ سلطانہ کے ایک ساتھی نے منصوبے کے مطابق گھوڑا وہاں پہنچا دیا تھا۔ سلطانہ نے گھوڑا درخت سے کھولا اور چھلانگ لگا کر اس پر سوار ہو گیا۔ یہ اس کا مخصوص انداز تھا۔ وہ رکاب میں پاؤں پھنسا کر گھوڑے پر سوار نہیں ہوتا تھا بلکہ گھوڑے سے ایک قدم کے فاصلے پر کھڑے ہو کر چھلانگ لگاتا تھا اور گھوڑے کی پشت پر پہنچ جاتا تھا۔ اس کے ساتھیوں میں سے کئی نے اس کے انداز کی نقل کرنے کی کوشش کی تھی لیکن کامیاب نہیں ہو سکے تھے۔ سلطانہ کی اس قسم کی صلاحیتوں کی وجہ سے اس کے ساتھی اسے چھلاوہ بھی کہتے تھے۔

گھوڑے پر سوار ہونے کے بعد سلطانہ نے ہاتھ بڑھایا۔ رقاصہ نے اس کا ہاتھ تھاما اور رکاب میں ذرا سا پاؤں پھنساتے ہوئے پلک جھپکتے میں یوں گھوڑے پر سوار ہو گئی جیسے اس کا جسم پرندوں کی طرح سبک ہو۔ وہ سلطانہ کے پیچھے بیٹھی تھی اور اس نے دونوں بازو سلطانہ کے گرد حمائل کرتے ہوئے اسے مضبوطی سے پکڑ لیا تھا۔ اس کے گداز وجود کی قربت نے سلطانہ کے وجود میں شرارے سے بھر دیے۔ اس نے زور سے اپنا سر جھٹکا اور رقاصہ کی موجودگی کی طرف

سے اپنا دھیان ہٹانے کی کوشش کرتے ہوئے گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ تاروں بھرے آسمان تلے رات کے سناٹے اور ملگجے اندھیرے میں گھوڑا چند لمحے بعد ہی ہوا سے باتیں کرنے لگا۔

چند ہی لمحوں میں وہ اس باغ تک پہنچ گیا جہاں اس کے ساتھیوں کے گھوڑے موجود تھے۔ وہ سب بھی کسی نہ کسی طرح وہاں پہنچ گئے تھے اور باغ میں داخل ہونے ہی والے تھے۔ سلطانہ کے گھوڑے پر رقاصہ کو دیکھ کر بھورے اندر جاتے جاتے رک گیا اور حیرت سے بولا۔ ”اسے کیوں اٹھا لائے ہو؟“

اس کی حیرت بجا تھی۔ انہوں نے آج تک ڈکیتی کی بیسیوں وارداتیں کی تھی اور ان کے دوران کتنی ہی حسین عورتیں ان کی نظر سے گزری تھیں لیکن سلطانہ سمیت ان میں سے کسی نے بھی کسی کو اٹھا کر لے جانے کی کوشش کی تھی اور نہ ہی ایسی کسی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ ان میں سے کسی نے کبھی کسی عورت کے ساتھ دست درازی بھی نہیں کی تھی۔ یہ تربیت سلطانہ نے ہی اپنے ساتھیوں کو دی تھی اور ان کے لیے گویا ایک قسم کا اصول مقرر کر دیا تھا کہ ڈاکا ڈالتے وقت انہیں صرف مال و زر سے ہی مطلب ہونا چاہیے۔ کسی اور چیز سے نہیں۔ کسی عورت کی طرف انہیں آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھنا ہے۔ خاص طور پر گھریلو اور شریف عورت کی طرف...... لیکن آج کچھ یوں لگ رہا تھا جیسے سلطانہ نے اپنا ہی بنایا ہوا اصول توڑ دیا ہو۔

سلطانہ ایک لمحے کے لئے گڑبڑا گیا اور فوری طور پر کوئی جواب نہ دے سکا۔ سچی بات تو یہ تھی کہ اسے خود بھی صحیح طور پر معلوم نہیں تھا کہ وہ رقاصہ کو کیوں ساتھ لے آیا تھا۔ شاید لاشعور میں موجود کوئی بے عنوان خواہش اس پر غالب آ گئی تھی۔ اس کی مشکل رقاصہ نے ہی آسان کر دی۔ سلطانہ کے بجائے وہ بول اٹھی۔ ”سلطانہ مجھے اٹھا کر نہیں لایا۔ میں خود اس کے ساتھ آئی ہوں۔“

اس کا یہ جواب بھورے سمیت شاید سلطانہ کے سب ساتھیوں کے لئے حیران کن تھا۔ وہ سب خاموش رہے تو سلطانہ بے تابی سے ہاتھ ہلاتے ہوئے بولا۔ ”یہ باتیں بعد میں ہوتی رہیں گی۔ ہمیں جلدی یہاں سے روانہ ہو جانا چاہیے۔“

اس کے ساتھیوں کو شاید احساس ہوا کہ سلطانہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ وہ جلدی سے باغ میں گئے اور اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار ہو کر باہر آ گئے۔ ایک چھوٹے سے فوجی دستے کی طرح وہ اکٹھے تیزی سے اس جنگل کی طرف روانہ ہو گئے جہاں انہوں نے یرغمالیوں کو رکھنے کے لئے عارضی طور پر خیمہ لگایا تھا۔ سلطانہ سب سے آگے تھا۔

وہ ابھی مراد آباد کی حدود سے نکلے نہیں تھے جب انہیں تاروں کی نہایت مدھم روشنی میں بہت دور ایک عمارت کا ہیولا سا نظر آیا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے دھندلے افق پر کسی نے سیاہ رنگ سے کوئی تصویر بنا دی ہو۔ سلطانہ نے گھوڑے کی رفتار کم کی پھر اسے روک لیا۔ اس کے ساتھی بھی رکتے رکتے اس کے اردگرد جمع ہو گئے۔

”کیا تم بتا سکتے ہو، یہ جو پرچھائیں سی نظر آ رہی ہے...... یہ کیا چیز ہو؟“ سلطانہ نے پوچھا۔

”یہ مراد آباد جیل ہے۔“ بھورے نے جواب دیا۔ ”بالکل ٹھیک پہچانا تم نے......!“ سلطانہ نے داد دینے کے انداز میں کہا۔ اس کے سارے ساتھیوں میں شاید صرف بھورے اور گجندر ایسے نوجوان تھے جو پورے روہیل کھنڈ کے چپے چپے سے واقف تھے۔ باقی لوگ بھی جگہوں اور راستوں سے کافی واقف تھے لیکن بھورے اور گجندر کا تو بہرحال جواب نہیں تھا۔

”اب ہمارے پاس اتنے گرنیڈ موجود ہیں کہ ہم چاہیں تو پوری جیل کو اُڑا دیں۔ اسے ملبے کا ڈھیر بنا دیں...... اور میرا دل چاہتا ہے کہ میں واقعی ایسا کر گزروں۔“ سلطانہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ ”لیکن میں صرف ان قیدیوں کے بارے میں سوچ کر رک جاتا ہوں جو اس میں بند ہیں۔ ان میں سے نہ جانے کتنے بے گناہ ہوں گے اور کتنے ہی ایسے ہوں گے جو اپنے گناہ، جرم یا دوش سے زیادہ سزا کاٹ چکے ہوں گے مگر ابھی ان کی رہائی نہ جانے کتنی دور ہو گی۔“

پھر اس نے گویا اپنے سینے میں بھڑکتی آگ کی تپش کم کرنے کے لیے گہری سانس لی اور گھٹی گھٹی سی آواز میں بولا۔ ”مجھے اس عمارت سے...... اور اس جیسی ساری عمارتوں سے سخت نفرت ہے۔ مجھے تھانے کچہریوں سے بھی سخت نفرت ہے۔ میرا بس چلے تو میں ان سب عمارتوں پر بلڈوزر پھروا دوں۔ انہیں بالکل چپٹا کر دوں...... زمین کے برابر کر دوں۔ یہ مجرموں اور دوشیوں کو سزا دینے، انہیں ٹھیک کرنے یا ان کے ساتھ انصاف کرنے کی جگہیں نہیں ہیں۔ یہ تو انہیں اور بھی بڑے اور پکے مجرم بنانے کے کارخانے ہیں۔ یہاں دن رات انسانوں پر ظلم ہوتا ہے اور ان کی چیخیں بھی پتھر کی ان دیواروں کے اندر ہی گھٹ کر رہ جاتی ہیں۔ کوئی بھی انہیں سن نہیں پاتا۔ یہ جگہیں مجھے زمین کے سینے پر ناسور کی طرح لگتی ہیں۔“

”ہم سب بھی یہی کچھ سوچتے ہیں اور یہی محسوس کرتے ہیں۔“ بھورے دھیمے لہجے میں بولا۔

سلطانہ نے گھوڑا آگے بڑھا دیا۔ اس کے ساتھی ایک بار پھر اس کے پیچھے چل پڑے۔ نہ۔ بے کے مطابق وہ اس وقت دوسرے راستے سے واپس جا رہے تھے۔ وہ آئے کسی اور راستے تھے۔ ہر واردات کے سلسلے میں ان کا یہی طریقہ ہوتا تھا۔ وہ آتے کسی اور راستے سے تھے، جاتے کسی اور راستے سے تھے۔ اس وقت انہیں جیل سے تقریباً ایک فرلانگ کے فاصلے پر بہتی ہوئی نہر کے قریب سے گزرنا تھا اور پھر نہر کا پل عبور کرنا تھا۔ وہ ابھی نہر کے قریب پہنچے ہی تھے کہ انہوں نے جیل کی طرف سے دو متحرک سایوں کو ملگجے اندھیرے میں حرکت کرتے دیکھا۔ ان کے آگے دو بتیاں بھی حرکت کر رہی تھیں۔

سلطانہ نے ساتھیوں کو رکنے کا اشارہ کیا اور وہ سب نہر کے کنارے قطار در قطار موجود درختوں کی اوٹ میں ہو گئے۔ کچھ دیر میں ان کی تیز نگاہوں نے دیکھ لیا کہ وہ دراصل دو سائیکل سوار تھے جن کے کندھوں پر بندوقیں لٹکی ہوئی تھیں اور وہ شاید آپس میں باتیں کرتے دھیرے دھیرے سائیکل چلاتے کسی قریبی بستی کی طرف جا رہے تھے۔ سلطانہ کے ساتھیوں کو حیرت تھی کہ سلطانہ وہاں کیوں رک گیا تھا اور ملگجے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ان دونوں سائیکل سواروں کی طرف دیکھ رہا تھا۔

جب وہ سائیکل سوار نہر کے ساتھ ساتھ پگڈنڈی پر ان لوگوں کے کافی قریب آ گئے تو ان کے خدوخال واضح ہو گئے۔ وہ دو باوردی سپاہی تھے جن کے کندھوں پر توڑے دار بندوقیں لٹکی ہوئی تھیں اور وہ ایک دوسرے سے باتیں کرنے میں مگن تھے۔ سلطانہ کے ساتھیوں کو اس وقت مزید حیرت ہوئی جب سلطانہ نے انہیں اشارہ کیا کہ وہ آگے بڑھ کر ان دونوں سائیکل سواروں کو گھیرے میں لے لیں جو شاید جیل کے محافظوں میں سے تھے۔ وہ شاید جیل میں ڈیوٹی دے کر گھر واپس جا رہے تھے۔ بہرحال سلطانہ کے ساتھیوں نے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ سلطانہ خود سب سے پہل درختوں کی اوٹ سے نکل چکا تھا۔ اس کے ساتھیوں نے اس کی تقلید کی۔

گھوڑوں کی ہنہناہٹ اور کچی، مگر سخت زمین پر ان کی ٹاپوں کی مدھم آوازوں سے سائیکل سوار بری طرح چونکے۔ اس سے پہلے شاید گردوپیش کی طرف ان کی بالکل توجہ ہی نہیں تھی۔ شاید اس طرح اس حصے میں سفر کرنا ان کا روز کا معمول تھا۔ اچانک ہی انہوں نے اپنے آپ کو پچیس گھوڑوں کے گھیرے میں پایا تو وہ بدحواسی میں سائیکلوں سے گر پڑے۔ ان کی بندوقیں بھی زمین پر گر گئیں اور ان کے حواس نے اس حد تک بھی ان کا ساتھ نہیں دیا کہ وہ انہیں اٹھانے کی

کوشش ہی کر لیتے۔ وہ درندوں میں گھرے ہوئے شکار کی طرح وحشت زدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہے تھے جیسے فرار کا راستہ تلاش کر رہے ہوں لیکن پچیس گھڑسواروں کے درمیان بھلا فرار کا راستہ کہاں مل سکتا تھا۔

''اسے کہتے ہیں انسان کا نصیب......!'' سلطانہ گہری سانس لے کر بولا۔ ''کسی کو پتا نہیں ہوتا کہ وہ زندگی کے راستے پر کب، کس سے ٹکرا جائے۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ کس سے کن حالات میں ملاقات ہو جائے۔ تھوڑی دیر پہلے تک میں نے بھی نہیں سوچا تھا کہ اس علاقے میں ...... اس وقت کس سے میرا سامنا ہو جائے گا۔ میں یہ تو سوچ سکتا تھا کہ پولیس سے ہمارا سامنا ہو سکتا ہے۔ پولیس مقابلہ بھی ہو سکتا ہے لیکن یہ نہیں سوچ سکتا تھا کہ اس راستے پر وہ پرانے دوست پولیس والے مل جائیں گے۔''

کہنے کو تو سلطانہ نے لفظ ''دوست'' استعمال کیا تھا لیکن اسے ادا کرتے وقت اس کے لہجے میں زہر سمٹ آیا تھا۔ اس کے ساتھی حیرت سے کبھی اس کی طرف دیکھ رہے تھے اور کبھی ان دو پولیس والوں کی طرف، جو خوفزدہ ہونے کے ساتھ ساتھ اب حیران اور پریشان بھی تھے۔ سلطانہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''میں نے جب انہیں دور سے دیکھا تو مجھے ان کی صورت ذرا بھی نظر نہیں آ رہی تھی لیکن پتہ نہیں کیوں میرے دل نے گواہی دی کہ یہ میرے پرانے دوست ہیں۔ اسی لیے میں رک گیا۔ ورنہ ہم یہاں سے گزرتے چلے جاتے۔ انہیں ہمارے بارے میں پتا بھی نہ چلتا۔''

سلطانہ کی بات سن کر دونوں سپاہی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر خاص طور پر سلطانہ کی طرف دیکھنے لگے تھے لیکن ان کے لیے اس ملگجے اندھیرے میں صحیح طور پر دیکھنا شاید ممکن نہیں تھا جبکہ ڈاکوؤں کو اتنی معمولی روشنی میں کچھ دور تک کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ اس کے باوجود صادق نے چوکور ڈبے جیسی ایک فلیش لائٹ آن کر لی جو اس کے پاس موجود تھی۔ اسے وہ لوگ 'بیٹری' کہتے تھے۔ صادق نے شاید اس لئے دونوں سپاہیوں کے چہروں پر روشنی ڈالی کہ سب ساتھی اچھی طرح انہیں دیکھ لیں۔ وہ چہرے ان سب کے لیے اجنبی تھے۔ وہ دونوں بھاری جسامت کے کرخت صورت سے کانسٹیبل تھے لیکن اس وقت ان کے چہروں کی کرختگی خوف اور دہشت میں چھپ گئی تھی۔

''تم لوگوں کو پتا نہیں ہوگا کہ یہ دونوں کون ہیں ......تم انہیں نہیں پہچان سکتے۔'' سلطانہ

نے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کیا۔ ”کیونکہ تمہیں کبھی ان سے واسطہ نہیں پڑا۔“

”کون ہیں یہ......؟“ آخر پریتم بے تابی سے بول اٹھا۔ سلطانہ کے پیچھے بیٹھی ہوئی رقاصہ بھی پہلو سے جھانک کر یہ تماشا دیکھ رہی تھی۔ شاید اس کی سمجھ میں بھی کچھ نہیں آرہا تھا۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد سلطانہ پہلے سے ذرا اونچی آواز میں بولا۔ ”کئی سال پہلے...... جب میں ایک کم عمر......اور آج سے کہیں زیادہ ناسمجھ لڑکا تھا، اس وقت ایک چھوٹے سے جرم کی وجہ سے مجھے سات سال قید کی سزا سنا دی گئی تھی۔ میں مراد آباد جیل میں وہ سزا کاٹنے آیا تھا۔ یہ دونوں جیل کے اندر گارڈ تھے اور شاید آج بھی گارڈ ہی ہوں گے اور اپنی ڈیوٹی دے کر گھر جا رہے ہوں گے۔ انہوں نے بھی نہیں سوچا ہوگا......اور میں نے بھی نہیں سوچا تھا کہ یہاں ہم ایک دوسرے سے ٹکرا جائیں گے۔ زندگی میں اس طرح کی باتیں ذرا کم ہی ہوتی ہیں۔ ان دونوں کے مجھ پر بڑے احسان ہیں۔ میں تو سوچتا ہی رہتا تھا کہ کب اور کس طرح جا کر ان کے احسانوں کا بدلہ اتاروں۔ آج قسمت نے خود ہی اس کا موقع دے دیا۔“

فلیش لائٹ کے سامنے اب دونوں سپاہیوں کی آنکھیں کچھ اور پھیلی ہوئی دکھائی دینے لگی تھیں،۔ شاید اب انہیں کچھ یاد آنے لگا تھا اور بات کچھ کچھ ان کی سمجھ میں آنے لگی تھی۔

”کیا احسان ہیں ان کے تم پر......؟“ گجندر سنگھ نے کچھ اکھڑے لہجے میں پوچھا۔ وہ کچھ مضطرب معلوم ہوتا تھا۔ شاید وہ اتنی دیر وہاں رکنا نہیں چاہتا تھا۔

”یہ دونوں روزانہ کبھی مجھے اوندھا لٹا کر میرے کولہوں پر موٹی بید کے ڈنڈے اتنی مرتبہ مارتے تھے کہ میرے کولہوں کی کھال ادھڑ جاتی تھی۔ کسی روز یہ مجھے چت لٹا کر میرے پیروں کے تلوؤں پر وہی ڈنڈا برساتے تھے۔ مجھے جو تکلیف ہوتی تھی نہ تو اسے بیان کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ ہیں......اور مجھے جتنی ذلت کا احساس ہوتا تھا وہ بھی میں اپنی زبان سے نہیں بتا سکتا۔“ سلطانہ نے ایک بار پھر یوں گہری سانس لی جیسے اپنے اندر ابلتے ہوئے نفرت کے زہر کو قابو میں رکھنے کی کوشش کر رہا ہو۔

اب دونوں سپاہیوں کے چہروں پر موت کی دہشت ابھر آئی تھی۔ شاید وہ سلطانہ کو پہچان بھی گئے تھے۔ سلطانہ نے اپنی رائفل کی نال سے ایک سپاہی کی ٹھوڑی اوپر کرتے ہوئے بہت ہی نرم اور مہذبانہ لہجے میں کہا۔ ”کیوں لالہ جی...... میں اپنے جرم کی سزا تو کاٹ رہا تھا نا......؟ بلکہ جرم سے کہیں زیادہ لمبی سزا کاٹ رہا تھا...... کاٹ رہا تھا نا......؟“

سپاہی نے اثبات میں سر ہلانے کی کوشش کی۔ اس کے پورے چہرے پر پسینے کے موٹے موٹے قطرے چمک رہے تھے۔ سلطانہ نے رائفل کی نال اس کی ٹھوڑی کے نیچے کچھ اور سختی سے چھوتے ہوئے گرج کر پوچھا۔ ”تو پھر تم دونوں روزانہ مجھے کیوں اس بری طرح مارتے تھے......ذلیل کرتے تھے؟“

سپاہی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کے چہرے کے عضلات پھڑکتے نظر آرہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ سر سے پاؤں تک کانپ رہا تھا۔ سلطانہ نے گھوڑے کا رخ تھوڑا سا گھماتے ہوئے اچانک رائفل کی نال اس سپاہی کی ٹھوڑی سے ہٹا کر دوسرے سپاہی کے گلے پر رکھتے ہوئے پہلے سے بھی زیادہ گرجدار آواز میں کہا۔ ”چلو......تم ہی بتا دو۔ کیوں کرتے تھے تم وہ سب کچھ؟ اور مجھے پورا شواش ہے کہ تم آج تک کسی نہ کسی بے بس اور مجبور قیدی کے ساتھ وہی کچھ کرتے آرہے ہو گے جو میرے ساتھ کرتے تھے۔ انسان پر ظلم کرنا بہت سے انسانوں کی عادت بن جاتی ہے۔ انہیں اس وقت تک روٹی ہضم نہیں ہوتی جب تک وہ درد اور تکلیف سے تڑپتے ہوئے انسانوں کی چیخیں نہ سن لیں۔“

اس سپاہی نے بھی کوئی جواب نہ دیا تو سلطانہ نے اس کے گلے سے رائفل کی نال ہٹالی اور اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھ کر بدلے ہوئے لہجے میں بڑے ٹھہراؤ سے بولا۔ ”میں تمہیں بتاتا ہوں، یہ......اور ان جیسے دوسرے بے شمار لوگ اپنے جیسے انسانوں کے ساتھ اتنا ظلم، اتنا تشدد بلکہ بہت سی جگہوں پر اس سے بھی کہیں زیادہ ظلم کیوں کرتے ہیں۔ صرف مال کے لئے...... اکثر جگہوں پر سب سے بڑی وجہ یہی ہوتی ہے۔ زیادہ تر چیزوں کو گھما پھرا کر دیکھو تو ان کے پیچھے مسئلہ مال کا نکلے گا۔ مال بہت بڑا فساد ہے۔ بہت بڑا فتنہ ہے۔ لوگوں کے دلوں میں مال کی بڑی محبت ہے۔ اس کی وجہ سے وہ دوسروں کے ساتھ پتا نہیں کیا کچھ کرتے ہیں۔ اس لئے میرا دل چاہتا ہے میں زیادہ مال والوں سے ان کا سارا فالتو مال چھین لوں۔ مجھے مال سے محبت نہیں ہے۔ میں تو صرف اس لیے لوگوں کی تجوریوں اور بوریوں میں سے برا ہوا مال چھیننا چاہتا ہوں کہ اس دنیا میں سارے فساد کی جڑ یہی ہے۔ انسان کے پاس اتنا مال ہونا چاہیے کہ وہ پیٹ بھر کے روٹی کھاتا رہے۔ اس کے تن پر کپڑا اور سر پر مکان کی چھت رہے۔ اس سے زیادہ کسی کے پاس ہونا ہی نہیں چاہیے۔“

وہ خاموش ہوا تو سرجو نے سپاہیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ذرا مضطرب لہجے میں

پوچھا۔"اب ان کا کرنا کیا ہے۔گولی ماردیں......؟"

"نہیں ......نہیں ......گولی سے تو ان کی تکلیف ایک دو منٹ میں ختم ہو جائے گی۔" سلطانہ نے نفی میں سر ہلایا۔"ابھی ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے اور میں ان خبیثوں کو اٹھا کر بھی نہیں لے جانا چاہتا...... ورنہ میں انہیں بہت لمبی سزا دیتا جس میں یہ روز جیتے اور روز مرتے۔"

پھر اس نے اپنے ساتھیوں کو خاموشی سے چند اشارے کیے۔وہ اس کا مطلب سمجھ گئے۔ اس کا ایک ساتھی گھوڑے سے اترا اور اس نے دونوں سپاہیوں کی سائیکلیں ایک ایک ہاتھ میں اٹھا لیں۔وہ کچھ فاصلہ طے کر کے دونوں سائیکلیں نہر میں پھینک آیا۔ایک اور ساتھی نے گھوڑے سے اتر کر سپاہیوں کی دونوں توڑے دار بندوقیں اسی طرح نہر میں پھینک دیں۔وہ لوگ توڑے دار بندوقیں استعمال نہیں کرتے تھے۔ان کا ہدف چاہے قریب ہوتا یا دور...... وہ رائفلیں ہی استعمال کرتے تھے اور انہوں نے اپنے ڈیرے پر رائفلوں اور دستی بموں کے انبار جمع کر لیے تھے۔

جب سائیکلیں اور رائفلیں نہر میں پھینکی جا چکیں تو ڈاکوؤں نے دونوں سپاہیوں کو راستہ دیا اور سلطانہ نے انہیں حکم دے دیا۔"جاؤ...... بھاگ جاؤ۔"

ایک لمحے کے لئے تو شاید انہیں یقین ہی نہیں آیا کہ انہیں بھاگ جانے کے لئے کہا جا رہا تھا۔پھر شاید انہیں اندازہ ہو گیا کہ اس حکم کا مقصد انہیں فرار کا موقع دینا ہر گز نہیں تھا۔وہ بھاگنے کے بجائے ہاتھ جوڑ کر معافیاں اور رحم کی بھیک مانگنے لگے۔انہوں نے گھوڑے پر بیٹھے ہوئے سلطانہ کا پاؤں پکڑنے کی بھی کوشش کی لیکن سلطانہ نے رکاب سمیت پاؤں پیچھے کر لیا اور غصے کے عالم میں ذرا جھک کر ایک سپاہی کے جبڑے پر رائفل کا بٹ رسید کرتے ہوئے گرج کر کہا۔

"میں نے کہا ہے...... بھاگو۔"

اس کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی کہ سپاہیوں کو اندازہ ہو گیا، اس حکم پر عمل کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔وہ پلٹے اور شاید زندگی کی امید پر انہوں نے حتی الامکان تیزی سے بھاگنے کی کوشش کی لیکن وہ بھلا ان ڈاکوؤں کے گھوڑوں کی رفتار کا مقابلہ کہاں کر سکتے تھے؟ وہ چند قدم بھی آگے نہیں جانے پائے تھے کہ پچیس گھوڑے آندھی طوفان کی طرح ان کی طرف بڑھے۔ دوسرے ہی لمحے وہ دونوں اوندھے گرے اور گھوڑے انہیں اپنے سموں تلے روندتے ہوئے

دوڑتے چلے گئے۔

تھوڑی ہی دور جا کر تمام گھوڑے گھوم گئے اور واپس دوڑ پڑے۔سپاہی گھوڑوں کے سموں تلے کچلے جانے کے بعد یقیناً شدید تکلیف میں تھے لیکن مرے نہیں تھے۔وہ اس وقت اٹھنے کی کوشش کر رہے تھے جب گھوڑے دوبارہ انہیں روندتے ہوئے گزر گئے۔سپاہیوں کے حلق سے چیخ نکلنے کی آواز بھی سنائی نہیں دی تھی۔اس بار گھوڑے انہیں روندتے ہوئے گزرے تو وہ گویا زمین سے چپک کر ہی رہ گئے۔لیکن تیسری بار جب گھوڑے انہیں چلنے کے لئے پلٹے تو ان کے جسموں میں تھوڑی سی حرکت دکھائی دی۔وہ ان جانوروں کی طرح اٹھنے کی کوشش کر رہے تھے جن کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ چکی ہو۔

اس بار گھوڑے انہیں کچل کر گزر گئے تو وہ زمین پر ساکت ہی رہ گئے لیکن گھوڑے اب بھی نہیں رکے۔وہ دائرے میں گھوم کر ایک بار پھر واپس آئے اور آگے پیچھے تمام گھوڑے ایک بار پھر سپاہیوں کے ساکت جسموں پر سے گزر گئے۔گھڑسوار گویا کوئی کھیل کھیل رہے تھے۔انہوں نے اب بھی یہ سلسلہ نہیں روکا۔انہوں نے دو تین مرتبہ اور سپاہیوں کو روندا تو ان کی لاشیں پچکی ہوئی مسخ شدہ سی نظر آنے لگیں۔

تب سلطانہ کے اشارے پر گھڑسوار رکے اور لاشوں کے قریب آئے۔انہوں نے لاشوں کے گرد گھیرا ڈال لیا۔زمین ان کے خون سے سرخ ہونے لگی تھی اور ان میں زندگی کی کوئی رمق دکھائی نہیں دے رہی تھی۔سلطانہ نے طمانیت سے سر ہلایا اور وہ ایک بار پھر اپنے راستے پر روانہ ہو گئے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا یا پھر انہوں نے راستے میں کوئی نہایت ہی معمولی سا کام نمٹایا تھا۔

"تم سوچ رہی ہو گی کہ میں بہت ظالم ہوں؟" راستے میں سلطانہ نے اپنے پیچھے بیٹھی ہوئی رقاصہ کو مخاطب کیا۔

"ہر گز نہیں۔" رقاصہ نے اطمینان سے جواب دیا۔اس کے لہجے کے اطمینان کو محسوس کرتے ہوئے سلطانہ نے گردن گھما کر اس کی طرف دیکھنے کی کوشش کی۔اسے یہ دیکھ کر قدرے حیرت ہوئی کہ وہ مسکرا رہی تھی۔اس کا خیال تھا کہ جو کچھ ہوا تھا اسے دیکھ کر رقاصہ کا دل بہت خراب ہوا ہو گا اور اسکے چہرے پر بدمزگی کے آثار ہوں گے۔وہ بدستور اسے مضبوطی سے پکڑے گھوڑے پر جمی بیٹھی تھی اور اس کے سیاہ ریشمی بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔کچھ دیر سے سلطانہ گویا اس کی قربت کے احساس کو بھولے ہوئے تھا لیکن اب ایک بار پھر اس کے وجود میں لہریں سی

دوڑنے لگیں۔

انہیں اس جگہ تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی جہاں جنگل میں ان کا وہ خیمہ لگا ہوا تھا جس میں یرغمالی بیرے موجود تھے۔ سلطانہ کے چار ساتھی جو وہاں نگرانی پر مامور تھے۔ اس وقت بھی مستعدی سے اپنے فرائض انجام دے رہے تھے۔ یرغمالی اس وقت آرام سے سو رہے تھے۔ سلطانہ نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا۔ ''انہیں جگاؤ...... اور ان کی آنکھوں پر پٹیاں باندھ کر سڑک تک چھوڑ آؤ۔''

''اور بس کا کیا کرنا ہے؟'' نگیشر نے پوچھا۔

''اسے وہیں کھڑی رہنے دو۔ ڈرائیور آزاد ہوگا تو شاید دو چار دن میں پولیس کی مدد سے اسے تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائے۔'' سلطانہ نے بے پروائی سے کہا۔ ''صرف دو آدمی ان لوگوں کو سڑک تک چھوڑنے جائیں گے۔ باقی سب لوگ ڈیرے کی طرف روانہ ہو جاؤ۔ بعد میں دونوں آدمی بھی ڈیرے پر پہنچ جائیں گے۔ بھورے...... تم دیکھ لینا، کون سے دو آدمی اس کام کے لیے ٹھیک رہیں گے۔''

''اور تمہارا کیا ارادہ ہے؟'' بھورے نے دریافت کیا۔

''میں رات یہیں گزاروں گا۔'' سلطانہ نے خیمے کی طرف اشارہ کیا۔

بھورے نے اس کا مطلب سمجھتے ہوئے ایک نظر رقاصہ کی طرف دیکھا اور ایک لمحے خاموش رہنے کے بعد بولا۔ ''یرغمالی رہا ہو کر جا چکے ہوں گے۔ کہیں پولیس ان کی مدد سے اس عارضی ٹھکانے تک نہ پہنچ جائے۔ لاری بھی یہاں سے قریب ہی کھڑی ہے۔''

''تم اس کی فکر نہ کرو۔'' سلطانہ نے بے پروائی سے کہا۔ ''میں ہندوستان کی پولیس کو جانتا ہوں۔ بے شک وہ انگریزوں کی ماتحتی میں کام کرتی ہے لیکن اس سے کوئی زیادہ فرق نہیں پڑتا۔ پولیس اس جگہ تک دو تین دن سے پہلے نہیں پہنچے گی اور تب تک انہیں یہاں ہمارے گھوڑوں کے سموں کے نشان بھی مشکل سے ہی ملیں گے۔''

بھورے نے دھیرے سے اثبات میں گردن ہلائی اور پیچھے ہٹ گیا۔ یرغمالیوں کی آنکھوں پر پٹیاں باندھ دی گئی تھیں۔ گروہ کے دو نئے آدمی انہیں بھیڑوں کے ریوڑ کی طرح ہانکتے ہوئے سڑک تک پہنچانے کے لئے روانہ ہوگئے تھے۔ ان کے ٹرنک ان کے ہاتھوں میں پکڑا دیئے گئے تھے۔ وہ اپنی اس حالت کے باوجود خوش نظر آ رہے تھے۔ شاید یہ جان بچ جانے کی خوشی تھی۔ وہ

غالباً کچھ دیر پہلے تک اپنی جان خطرے میں ہی محسوس کر رہے تھے۔ سلطانہ کے باقی تمام ساتھی خیمے سے کچھ فالتو سامان سمیٹنے کے بعد بھورے سمیت وہاں سے ڈیرے کی طرف روانہ ہوگئے۔

تب سلطانہ اور رقاصہ بڑے سے خیمے میں داخل ہوئے۔ رقاصہ نے یوں اندر سے اس کا جائزہ لیا جیسے کوئی اپنے نئے مکان میں رہائش اختیار کرنے آیا ہو اور دیکھ رہا ہو کہ وہاں سب چیزیں ٹھیک ٹھاک ہیں یا نہیں؟ چند لمحے بعد وہ گہری سانس لے کر سلطانہ کی طرف مڑی اور مسکراتے ہوئے بولی۔ ''اچھا...... تو یہ ہے تمہارا ٹھکانہ؟''

''تم سے کس نے کہا کہ یہ میرا ٹھکانہ ہے؟'' سلطانہ نے الٹا اس سے سوال کر دیا۔

''اچھا...... اگر یہ تمہارا ٹھکانا نہیں ہے تو پھر تمہارا ٹھکانہ کہاں ہے؟'' رقاصہ نے ایک اور سوال کر ڈالا۔

''تم کیوں پوچھ رہی ہو؟ تاکہ پولیس کو مخبری کر سکو؟'' سلطانہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

رقاصہ کے تاثرات بدل گئے۔ سلطانہ کے سوال نے گویا اسے گہرا صدمہ پہنچایا تھا۔ وہ مجروح سی آواز میں بولی۔ ''تم مجھ سے ایسی امید رکھتے ہو کہ میں تمہاری مخبری کروں گی؟''

''میں کون سا غلط سوچ رہا ہوں؟ تم میری مخبری نہیں کر سکتیں؟'' سلطانہ نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''میری بھگوان سے پرارتھنا ہے کہ جس دن میں تمہاری مخبری کروں، اس دن مجھے موت آ جائے۔'' رقاصہ عجیب سے لہجے میں بولی۔ ''میں تم سے ملنے کی آرزو دل میں لے کر جی رہی تھی۔ تمہاری مخبری کرنے کی تمنا لے کر نہیں۔''

سلطانہ کو جھٹکا سا لگا۔ اس عورت کے دھیمے لہجے میں سچ کی اتنی زیادہ طاقت تھی کہ سلطانہ ہل کر رہ گیا۔ فوری طور پر اس سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد رقاصہ بولی۔ ''ویسے بھی میں تمہارے ہی قبیلے کی ہوں۔ کیا ایک بھنتو دوسرے بھنتو کی مخبری کر سکتا ہے؟''

اس انکشاف نے سلطانہ کو اور بھی زیادہ حیرت زدہ کر دیا کہ رقاصہ کا تعلق بھی اسی کے قبیلے سے تھا۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بدلے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''مجھے معاف کر دو۔ میں نے تمہاری نیت پر شک کیا۔''

رقاصہ اپنے مخصوص من موہنے انداز میں مسکرا دی۔ اس کے دل کو جو دکھ پہنچا تھا۔ اس کا اثر گویا فوراً ہی دور ہوگیا۔ وہ سلطانہ کے قریب آتے ہوئے بولی۔ ''معاف کیا...... تمہیں کیا پتا، تم

سے ملنے کی کتنی تمنا تھی۔ میں تمہارے قصے سنتی تھی اور اپنے دل میں تمہارا ایک بت سا بنالیا تھا۔ جب کوئی اور کام نہیں ہوتا تھا تو میں خیالوں ہی خیالوں میں اس بت کو اپنے پیار کی مالائیں پہناتی رہتی تھی۔“

”اچھا......؟“ سلطانہ نے ایک معصوم سی حیرت اور بے یقینی سے کہا۔ ”کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے؟“ ایک ڈاکو سے بھلا کوئی کیسے پیار کر سکتا ہے؟“

”ڈاکو تو تم امیروں کے لئے ہونا......غریبوں کے لئے تو نہیں ہو ...... اور میں غریب ہوں۔“ رقاصہ بولی۔

”تم اتنی حسین ہو...... امیر لوگوں کی محفلوں میں ناچتی ہو......تم غریب کیسے ہو سکتی ہو؟“ سلطانہ حیرت سے بولا۔

”یہ بات مشکل سے تمہاری سمجھ میں آئے گی یا پھر شاید مشکل سے تمہیں اس بات کا یقین آئے گا۔“ رقاصہ بولی۔ ”میں امیروں سے بھی صرف اپنے ناچ کے پیسے لیتی ہوں اور ان سے اپنے خاندان کے علاوہ چار خاندان پالتی ہوں۔ وہ خاندان ان لوگوں کے ہیں جو میرے ساتھ ساز بجاتے ہیں۔ تیرتھ سنگھ جیسے لوگ، جو حاکموں میں شامل ہیں وہ تو مجھے ناچنے کے پیسے بھی نہیں دیتے۔ بس محفل میں بیٹھے ہوئے لوگ جو میرے اوپر نچھاور کردیتے ہیں وہی پیسے ہمارے ہوتے ہیں۔ ان میں سے بھی بعض اوقات دوسرے لوگ کچھ نہ کچھ لے لیتے ہیں۔ ایسی محفلوں کے بلاوے بھی روز روز تو آتے نہیں......کبھی کبھار ہی آتے ہیں اور پھر میرے غریب ہونے کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ میں کسی امیر آدمی کی رکھیل نہیں ہوں۔ ابھی تک میں نے یہ حیثیت اختیار نہیں کی ......اور جب تک حالات بہت زیادہ مجبور نہیں کردیتے، اس وقت تک میں رکھیل بنوں گی بھی نہیں۔ میں اسی طرح آزاد زندگی گزارتی رہوں گی اور جو دل چاہے گا وہ کروں گی۔“

سلطانہ نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد اس نے سلطانہ کے چہرے کا بغور جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا میں تمہیں اچھی نہیں لگی؟“

”اچھی لگنے کا تو کچھ مت پوچھو۔ تمہارا کیا خیال ہے۔ میں تمہیں یونہی اپنے ساتھ لے آیا ہوں؟ دل پر قابو نہیں رہا، اسی لئے تو ایسا کیا...... ورنہ اس سے پہلے سلطانہ نے کبھی اپنے کام کے بیچ میں کسی عورت کی طرف ایسی ویسی نیت سے دیکھا تک نہیں۔“ سلطانہ نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں جواب دیا۔

”لگتا ہے ہمارا ملن آسمانوں پر لکھا تھا۔“ رقاصہ نے اس کے سینے پر سر ٹکا دیا۔ ”کتنی عجیب بات ہے کہ میں نے خیالوں ہی خیالوں میں تمہاری جو تصویر بنا رکھی تھی تم بالکل ویسے ہی ہو۔“ اس کا لہجہ خوابناک ہوگیا۔

”میں نے ابھی تک تمہارا نام نہیں پوچھا۔“ سلطانہ اس کے بالوں سے کھیلتے ہوئے بولا۔

”چنبیلی۔“ اس نے گویا نیند کے سے عالم میں جواب دیا۔

”واہ...... میرا پہلے ہی خیال تھا کہ تمہارا نام یہ ہونا چاہیے کیونکہ مجھے تمہارے وجود سے چنبیلی جیسی خوشبو آرہی تھی۔“ سلطانہ کے لہجے پر بھی گویا چنبیلی کے لہجے کا اثر غالب آنے لگا۔

ایک یادگار رات کے بعد جب وہ دن چڑھے بیدار ہوئے تو انہیں کچھ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ جنم جنم سے ایک بندھن میں بندھے ہوئے ہیں۔ سلطانہ اٹھ کر تیار ہوتے ہوئے بولا۔ ”تم سے جدا ہونے کو جی نہیں چاہ رہا......لیکن مجھے بہرحال جانا ہے۔ میں تمہیں تمہارے گھر کے پاس چھوڑ دوں گا۔ تمہارا گھر کہاں ہے؟“

چنبیلی اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے بولی۔ ”میں تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتی۔“

”نہیں ......“ سلطانہ نے دل پر جبر کا بھاری پتھر رکھتے ہوئے جواب دیا۔ ”ہم سب ساتھیوں کے درمیان معاہدہ ہے کہ ڈیرے پر کسی کے ساتھ کوئی عورت نہیں رہے گی۔ اس میں بڑے مسئلے ہیں۔ ہمارے کئی ساتھی اپنی بیویوں کو چھوڑ کر ڈیرے پر رہ رہے ہیں۔ ان میں سے کئی ایسے ہیں جن کی شادیوں کو دو چار مہینے بھی نہیں گزرے تھے۔“

چنبیلی کے چہرے پر آسودگی اور نکھار میں کچھ کمی آگئی۔ وہ ذرا بجھ سی گئی۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولی۔ ”آرزو تو میری یہی تھی کہ میری زندگی تمہارے ساتھ گزرتی۔“

”دل تو میرا بھی یہی چاہ رہا ہے......اور میں بتا نہیں سکتا کہ اس وقت میرے دل کا کیا حال ہے۔“ سلطانہ پیار بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”لیکن کیا کروں، میں خود اپنے ہی بنائے ہوئے اصول نہیں توڑ سکتا۔ سچی بات یہ ہے کہ مجھے اپنی آج کی رات پر بھی اپنے ساتھیوں سے شرمندگی ہے......لیکن مجھے امید ہے کہ وہ مجھے معاف کردیں گے۔“

چنبیلی نے ایک ٹھنڈی سانس لی پھر جیسے اسے کچھ خیال آیا اور وہ ذرا پُرامید سے لہجے میں بولی۔ ”چلو......تمہاری، یہ مجبوری اپنی جگہ سہی لیکن تم ایک کام تو کر سکتے ہو...... ہفتے دس دن میں جب بھی تمہیں موقع ملے، جب بھی حالات اجازت دیں، تم ایک رات کے لئے میرے گھر آجایا

کرو۔"

"بستی والے تمہارا جینا دوبھر نہیں کر دیں گے؟" سلطانہ نے پوچھا۔

چنبیلی ہنسنے لگی۔ پھر بولی "تم شاید بھول رہے ہو کہ میں ایک ناچنے والی ہوں۔ بستی والوں کو تو شاید اس بات پر حیرانی ہوتی ہوگی کہ کوئی میرے گھر آتا جاتا کیوں نہیں؟ ویسے بھی میرا گھر بستی سے ذرا ہٹ کر، الگ تھلگ سا ہے۔ میں بستی والوں سے اور بستی والے مجھ سے ذرا کم ہی ناتا رکھتے ہیں۔ ویسے بھی سب اپنے ہی قبیلے کے لوگ ہیں۔ بہت اچھے ہیں۔ کبھی کسی نے مجھے تنگ نہیں کیا۔ اپنے کام سے کام رکھنے والے لوگ ہیں۔"

سلطانہ سوچ میں پڑ گیا۔ چنبیلی کے گھر آمدورفت رکھنے کے خیال سے اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہوئی جا رہی تھیں۔ چنبیلی نے اسے سوچ میں دیکھ کر گویا اس کی تشویش کم کرنے کے لیے کہا۔ "شاید تم سوچ رہے ہو کہ بات پھیل جائے گی۔ سلطانہ چنبیلی کے گھر آتا جاتا ہے۔ کسی روز گھیرا ڈال کر تمہیں پکڑ لیا جائے گا یا مار دیا جائے گا؟"

سلطانہ نے اثبات میں سر ہلایا تو چنبیلی بولی۔ "تم رات کے اندھیرے میں آیا کرنا ......اور بھیس بدل کر آیا کرنا۔ اوّل تو امید ہے کہ کوئی تمہیں دیکھ ہی نہیں سکے گا اور اگر دیکھ بھی تے تو تم اپنا حلیہ کچھ ایسا بنا کر آیا کرنا کہ دیکھنے والا تمہیں کوئی معزز اور خوشحال تاجر یا ساہوکار سمجھے۔ لوگ یہی سمجھیں گے کہ چلو، چنبیلی کسی کی رکھیل بن ہی گئی۔ ہم جیسی عورتوں کے بارے میں یہ جان کر کسی کو حیرانی نہیں ہوتی۔"

سلطانہ نے ایک لمحے سوچا پھر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "بات تو تم ٹھیک کہہ رہی ہو......ٹھیک ہے۔ میں آ جایا کروں گا......لیکن یہ بات مجھے اپنے ساتھیوں سے چھپانی پڑے گی۔ میں کہہ دیا کروں گا کہ میں اپنے بیٹے سے ملنے جا رہا ہوں۔ سچ مچ بیٹے سے بھی مل آیا کروں گا۔ وہاں سے واپسی پر تمہاری طرف آ جایا کروں گا۔"

سلطانہ اسے اپنے بیشتر حالات سے آگاہ کر چکا تھا۔ اس لیے چنبیلی کو اس کی اس بات پر حیرت نہیں ہوئی کہ اس کا ایک بیٹا بھی تھا۔ سلطانہ نے اپنے ڈیرے کے بارے میں البتہ چنبیلی کو اشارہ تک نہیں دیا تھا کہ وہ کس طرف یا کس علاقے میں تھا۔ اس نے اسے بس اتنا ہی بتایا تھا کہ وہ اور اس کے ساتھی جنگلوں میں رہتے تھے اور ٹھکانے بدلتے رہتے تھے۔ بہرحال ان کے درمیان ملنے ملانے کا ایک طریقہ کار طے پا گیا۔ چنبیلی یوں خوش نظر آنے لگی جیسے اس کی سب

سے بڑی خواہش پوری ہو گئی ہو۔ سلطانہ کو اس کی خوشی پر حیرت تھی۔

خیمے میں ابھی کھانے پینے کا کچھ سامان موجود تھا۔ انہوں نے اس سے پیٹ بھرا اور روانہ ہونے کے لیے خیمے سے باہر آ گئے۔ ابھی سلطانہ اپنے گھوڑے پر کاٹھی کس رہا تھا کہ اسے گھوڑوں کی مدھم ٹاپیں سنائی دیں۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ کچی زمین کی وجہ سے ٹاپوں کی آواز مدھم تھی لیکن گھڑسوار دور نہیں تھا۔ وہ رائفل کندھے سے اتارتے ہوئے تیزی سے گھوما اور یہ دیکھ کر گہری سانس لے کر رہ گیا کہ بھورے اپنے گھوڑے پر سوار درختوں کے عقب سے نکل کر خیمے کی طرف چلا آ رہا تھا۔

چند لمحے بعد مختلف سمتوں سے سلطانہ کے دوسرے پانچ قریبی ساتھی صادق، سرجو، نگینشر، گجندر اور پریتم بھی گھوڑوں پر سوار آتے دکھائی دیئے۔ ان کے چہروں سے تھکن عیاں تھی۔ سلطانہ ان سب کو وہاں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس کے خیال میں تو وہ سب باقی لوگوں کے ساتھ ڈیرے کی طرف روانہ ہو چکے تھے۔ سلطانہ نے انہیں جاتے دیکھا بھی تھا۔ وہ سب قریب آ کر سلطانہ اور چنبیلی کے اردگرد رک گئے۔

"تم لوگ گئے نہیں تھے؟" سلطانہ نے حیرت سے دریافت کیا۔

بھورے نے نفی میں سر ہلا کر کہا......نہیں؟"

"لیکن کیوں؟" سلطانہ نے جاننا چاہا۔

"ہم تھوڑی دور جا کر واپس آ گئے۔" بھورے نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔ "ہم نے آپس میں صلاح مشورہ کیا۔ ہمارا دل نہیں مانا کہ تمہیں اس عورت کے ساتھ اکیلا یہاں چھوڑ کر جائیں۔ ہمیں خطرہ محسوس ہو رہا تھا کہ یرغمالیوں کو چھوڑنے کی وجہ سے پولیس یا کوئی اور اس جگہ تک پہنچ نہ جائے اور تم اندر بے خبری میں پھنس نہ جاؤ۔ اس لیے ہم نے طے کیا کہ ہم یہیں آس پاس رہ کر پہرہ دیں گے۔ باقی ساتھیوں کو ہم نے ڈیرے کی طرف روانہ کر دیا تھا۔"

سلطانہ کا سر جھک گیا۔ اس کے انداز میں ممنونیت بھی تھی اور شرمندگی بھی۔ اس کے ساتھیوں کی یہ وفاداری اس کی امیدوں اور توقعات سے بڑھ کر تھی۔ انہوں نے بھوکے پیاسے، آدھی رات سے لے کر دن چڑھے تک جنگل ہی میں موجود رہ کر اس کی حفاظت کی تھی اور اسے اس بات کا پتا بھی نہیں تھا۔

سلطان نے چنبیلی کی طرف دیکھ کر جذبات سے مرتعش لہجے میں کہا۔ "دیکھا تم نے......؟

یہ ہیں میرے ساتھی......! یہ میرے لیے اور میں ان کے لیے جان دے سکتا ہوں۔''

چنبیلی خمارزدہ سے انداز میں مسکرائی اور بولی۔'' سلطانہ کے ساتھیوں کو ایسا ہی ہونا چاہیے ورنہ پھر سلطانہ کو سلطانہ......اور اس کے ساتھیوں کو سلطانہ کے ساتھی کون کہے گا؟''

'' بالکل ٹھیک کہا تم نے۔'' سلطانہ بولا اور گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ اس کا ہاتھ تھام کر چنبیلی بھی گھوڑے پر سوار ہوئی اور سلطانہ کے پیچھے بیٹھ گئی۔ سلطانہ نے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کیا۔

'' پہلے چنبیلی کو اس کے گھر کے آس پاس کہیں چھوڑنا ہے۔ دن کا وقت ہے۔ ہمیں ایک دوسرے سے ذرا دور رہتے ہوئے اور لوگوں کی نظروں سے بچتے ہوئے، ایسے راستوں سے سفر کرنا ہے جن پر لوگوں کا آنا جانا کم ہو اور یہ کہنے کی تو ضرورت نہیں کہ چاروں طرف اچھی طرح نظر رکھنا۔ مراد آباد میں آج اچھی خاصی ہلچل ہوگی۔''

جس وقت سلطانہ جنگل میں کھڑا یہ بات کر رہا تھا، مراد آباد میں ہلچل تو کافی حد تک ختم ہو چکی تھی لیکن انگریز کمشنر ونڈہم کے دفتر میں ایک اہم میٹنگ جاری تھی۔ انگریز آئی جی ایس ڈاؤن بھی وہاں موجود تھا۔ ڈی ایس پی فریڈی ینگ کو خاص طور پر اس میٹنگ میں بلایا گیا تھا۔ ونڈہم اور ایش ڈاؤن کے چہروں پر غصے اور ناگواری کے تاثرات تھے۔ کچھ ہندوستانی پولیس آفیسرز بھی وہاں موجود تھے۔

'' سلطانہ کا حوصلہ بہت بڑھتا جا رہا ہے۔'' کمشنر ونڈہم غصے سے کہہ رہا تھا۔'' ایسا لگتا ہے پورے روہیل کھنڈ پر اس کی حکومت ہے اور ہم انگریز تو بس یہاں اس کی سرگرمیوں کا تماشا دیکھنے کے لیے آئے ہوئے ہیں۔ اگر یہی حال رہا تو شاید پورے ہندوستان پر رفتہ رفتہ اسی کی حکومت ہو جائے گی اور ہم انگریزوں کو ہندوستان سے اپنا بستر بوریا گول کرنا پڑے گا۔'' یہ کہتے ہوئے اس کے چہرے کی تمتماہٹ بڑھ گئی تھی۔

سب لوگ خاموش رہے۔ ہندوستانی پولیس افسروں کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد ونڈہم نے سلسلۂ کلام جوڑا۔'' انگریزوں کی حکومت میں اس قسم کی لاقانونیت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ جو کچھ سلطانہ کرتا پھر رہا ہے اور اس کے باوجود جس طرح بچا ہوا ہے اس پر ہمارے سر شرم سے جھک گئے ہیں۔ سلطانہ کے اس طرح دندناتے پھرنے کی خبریں تاجِ برطانیہ تک پہنچنے لگی ہیں۔ اس نے حکومت کے اندر ایک حکومت قائم کر لی ہے......اور یہ ہم برداشت نہیں کر سکتے۔ ہم نے بڑے بڑے باغیوں کے سر کچلے ہیں......اور سلطانہ بھی ایک قسم کا

باغی ہے......قانون اور تاجِ برطانیہ کا باغی۔ اب ہمیں اس کے بارے میں بہت سنجیدگی سے کوئی لائحہ عمل بنانا ہوگا۔''

آئی جی ایش ڈاؤن نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔'' سلطانہ کی سرکوبی کی ذمے داری ہم نے تیرتھ سنگھ کو سونپی ہوئی تھی جو ایک جہاندیدہ، تجربہ کار اور انگریز انتظامیہ کا پسندیدہ پولیس افسر ہے۔''

ونڈہم نے ایش ڈاؤن کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔'' اور کیا ستم ظریفی ہے کہ جس جہاندیدہ، تجربہ کار اور انگریزوں کے پسندیدہ پولیس افسر کو سلطانہ کی سرکوبی کی ذمے داری سونپی گئی تھی وہ اسی کو لوٹ کر چلا گیا......اور وہ بھی عین اس کی بیٹی کی شادی کے دن جب اس کے ہاں سیکڑوں مہمان موجود تھے۔ وہ ان مہمانوں کو بھی لوٹ کر لے گیا۔ تیرتھ سنگھ کے لئے اس سے زیادہ شرم کی بات کیا ہوگی؟ بلکہ تیرتھ سنگھ ہی کیا......یہ تو ہم سب کے لیے شرم کی بات ہے۔''

کمشنر ونڈہم خاموش ہو گیا۔ طویل و عریض اور آراستہ و پیراستہ دفتری کمرے میں گہرا سکوت چھا گیا۔ چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد کمشنر نے اپنے لہجے میں ذرا ٹھہراؤ لاتے ہوئے کہا۔

'' چنانچہ آج صبح میں نے آئی جی مسٹر ایش ڈاؤن سے مشورہ کرنے کے بعد سب سے پہلا کام تو یہ کیا ہے کہ تیرتھ سنگھ کو سلطانہ اور اس کے گروہ کے خاتمے کی فہم سے بالکل الگ کر دیا ہے۔ اس معاملے سے اس کا اب کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ ایک طویل عرصے سے یہ کیس اس کے پاس ہے لیکن وہ اس میں ذرا سی بھی کامیابی حاصل نہیں کر سکا۔ سلطانہ تو کیا وہ اس کے کسی ساتھی کو بھی گرفتار یا ہلاک نہیں کر سکا حالانکہ ہمارا خیال یہی تھا کہ سلطانہ اور اس کے گروہ کی سرکوبی کے لیے وہ موزوں آدمی ہے۔ ایک تو وہ تجربہ کار ہندوستانی پولیس افسر ہے۔ سارے علاقے سے بہت اچھی طرح واقف ہے اور اسے ڈاکوؤں سے نپٹنے کا تجربہ بھی ہے لیکن سلطانہ کے معاملے میں اس نے ہمیں بہت مایوس کیا۔''

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد ونڈہم نے سلسلۂ کلام جوڑا۔'' ان حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے اور آئی جی صاحب نے باہمی مشورے سے آج ایک اہم فیصلہ کیا ہے......اور وہ یہ کہ سلطانہ ڈاکو کا معاملہ ہم ڈی ایس پی مسٹر فریڈی شنگ کے سپرد کر رہے ہیں۔ ان کا نام تو بے شک ینگ ہے لیکن یہ اتنے ینگ نہیں ہیں۔ بہت تجربہ کار اور پرانے پولیس افسر ہیں۔ برطانوی پولیس میں بھی خدمات انجام دے چکے ہیں لیکن انڈیا سے ذاتی دلچسپی کی بناء پر بہت سال پہلے

یہاں آ گئے تھے۔ حال ہی میں یہ دلّی سے تبادلہ ہو کر یہاں آئے ہیں۔"

ونڈہم نے ڈی ایس پی فریڈی ینگ کی طرف اشارہ کیا تو اس نے ایک لمحے کے لیے گردن کو ہلکا سا خم دیا۔ ونڈہم نے انگریزی میں بات کرتے کرتے اچانک ہندوستانی پولیس افسروں کو اردو میں مخاطب کیا۔"مجھے امید ہے کہ آپ لوگ بھی مسٹر فریڈی ینگ سے واقف ہوں گے۔"

"جی سر!" ایک ہندوستانی ڈی ایس پی نے انگریزی میں جواب دیا۔"ہم نے ان کی بڑی شہرت سنی ہے۔" ونڈہم سر ہلاتے ہوئے بولا۔"انڈیا میں گو کہ انہوں نے اپنی ملازمت کا زیادہ عرصہ دلّی میں گزارا ہے لیکن یہ اس علاقے سے بھی اچھی طرح واقف ہیں۔ یہ ذرا غیر روایتی قسم کے پولیس افسر ہیں۔ یہ صرف اپنی ذاتی دلچسپی کی وجہ سے ہندوستان کے بارے میں اتنا کچھ جانتے ہیں جتنا شاید خود ہندوستانی بھی نہیں جانتے ہوں گے۔ پولیس افسر سے زیادہ یہ مجرموں کے ماہر نفسیات ہیں لیکن خطرناک صورت حال کے لیے ان میں وہ بہادری بھی موجود ہے جو ایک پولیس آفیسر کے لیے ضروری ہوتی ہے۔"

فریڈی ینگ نے اپنی اس تعریف پر شاید انکساری کے لیے سر جھکا لیا۔ ونڈہم نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔"دلچسپ بات یہ ہے کہ تیرتھ سنگھ کی بیٹی کی شادی میں یہ بھی مدعو تھے لیکن اسی رات انہیں ایک سفر پر جانا پڑ گیا۔ یہ بہت تاخیر سے شادی میں پہنچے۔ سلطانہ کے ساتھی اس وقت لوٹ مار کر کے فرار ہو چکے تھے اور سلطانہ اس وقت رخصت ہو رہا تھا۔ مسٹر ینگ سے اس کا سامنا بھی ہوا لیکن مسٹر ینگ اسے پہچانتے نہیں تھے اور اس وقت اس کا حلیہ بھی کسی حد تک دولہا جیسا تھا اس لیے یہ دھوکا کھا گئے لیکن ان کی اعلیٰ ظرفی یہ ہے کہ انہوں نے اس بات کا اعتراف بھی کر لیا حالانکہ اس واقعے کا کوئی چشم دید گواہ نہیں تھا۔



کمشنر نے ڈی ایس پی فریڈی ینگ کے بارے میں بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔"میں نے بہت غور و خوض کے بعد سلطانہ اور اس کے گروہ کا قلع قمع کرنے کے لئے مسٹر ینگ کو منتخب کیا ہے۔ سلطانہ ایک غیر معمولی ڈاکو ہے اور مسٹر ینگ ایک غیر معمولی پولیس آفیسر ہیں۔ جس طرح سلطانہ ہندوستان کی تاریخ کے تمام ڈاکوؤں سے بالکل مختلف ہے اسی طرح مسٹر ینگ بھی روایتی پولیس والوں سے بہت مختلف ہیں۔ آئی جی صاحب نے اس کام کے لئے مسٹر ینگ کا نام تجویز کیا تھا...... اور چونکہ میں بھی ذاتی طور پر مسٹر ینگ سے واقف ہوں، اس لئے میں نے فوراً اس تجویز سے اتفاق کر لیا...... بلکہ مجھے اپنے آپ پر حیرت ہوئی کہ مجھے یہ خیال پہلے کیوں نہیں آیا......!"

"شاید اس لئے کہ پہلے سلطانہ کی جرأت اتنی نہیں بڑھی تھی جتنی اب بڑھ گئی ہے۔" انگریز آئی جی مسٹر ایش ڈاؤن نے محتاط انداز میں اظہار خیال کیا۔

"ہاں...... ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے۔" کمشنر نے اس کی تائید میں سر ہلایا۔"مجھے اندازہ ہوا کہ ہندوستانی پولیس کے روایتی طور طریقے اس سلسلے میں کامیاب نہیں ہوں گے۔ صرف ایسے ہی کسی پولیس آفیسر سے امید رکھی جا سکتی ہے جو روایتی طور طریقوں سے ہٹ کر کام کرتا ہو۔ مجھے امید ہے آئی جی صاحب مسٹر ینگ کو وہ تمام وسائل اور مدد فراہم کریں گے جس کی انہیں ضرورت محسوس ہو۔"

"ضرور...... ضرور......" ایش ڈاؤن فوراً بولا۔"میں تو خود جلد از جلد سلطانہ کو قانون کے شکنجے میں...... یا پھر مُردہ دیکھنا چاہتا ہوں۔ وہ میرے محکمے کے لئے بڑی بدنامی کا باعث بن رہا ہے۔ میں حیران ہوں کہ نہایت غریبانہ ماحول میں پرورش پانے والے اس اَن پڑھ اور جاہل آدمی نے اتنے کم عرصے میں کس طرح اتنی طاقت پکڑ لی ہے۔ وہ واقعی ایک نہایت غیر روایتی

ڈاکو ہے۔ ڈاکو تو چند سکوں کے لئے انسان کو بے دریغ قتل کر دیتے ہیں۔ وہ دولت لٹاتا پھرتا ہے، خود جان ہتھیلی پر رکھ کر دولت لوٹتا ہے اور پھر اسے غریبوں میں بانٹ دیتا ہے۔ وہ جتنی تیزی سے غریبوں میں مقبول ہو رہا ہے، مجھے تو ڈر ہے وہ کہیں ڈاکو کے بجائے لیڈر نہ بن جائے اور آس پاس کے کسی سرحدی علاقے میں اپنی جلاوطن حکومت نہ قائم کر لے۔''

ایک ہندوستانی ڈی ایس پی ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ''سر! سلطانہ کو پکڑنے میں ہمارے محکمے کی ناکامی کی ایک بڑی وجہ بھی غریبوں میں اس کی مقبولیت ہے۔ غریب لوگ تو اسے ڈاکو کے بجائے دیوتا کا درجہ دینے لگے ہیں۔ جسے سلطانہ سے کبھی کچھ نہیں ملا اور جس نے کبھی سلطانہ کو دیکھا تک نہیں وہ بھی اس کا پرستار اور خیر خواہ ہے۔ تیرتھ سنگھ نے کئی لوگوں کو اس کے بارے میں اپنا مخبر بنانے کی کوشش کی لیکن پتا چلا کہ وہ پولیس کے لئے مخبری کرنے کے بجائے سلطانہ کے لئے پولیس کے بارے میں مخبری کرنے لگے۔ وہ جس گاؤں، قصبے یا بستی میں ڈاکا ڈالنے جاتا ہے وہاں کے سب غریب گویا پہلے ہی سے اس کے مخبر ہوتے ہیں۔ بہت سے لوگ اس کے لئے ہاتھ اٹھا اٹھا کر دعائیں کرتے ہیں اور جو لوگ دعاؤں پر یقین رکھتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ غریبوں کی دعائیں ہی اسے اب تک پولیس سے بچائے ہوئے ہیں۔''

پچھلی نشست پر بیٹھا ہوا ایک ہندوستانی پولیس انسپکٹر ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔ ''دوسری طرف دولت مندوں پر اس کی دہشت کا یہ عالم ہے کہ وہ اس کے ہاتھوں لٹنے کے بعد بھی اس کے بارے میں زبان کھولتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ سرمایہ داروں کو وہ ذرا سی بات پر گولی مارتے ہوئے دریغ نہیں کرتا۔''

کمرے میں ایک لمحے کے لئے سکوت چھا گیا۔ ونڈہم پُر خیال نظروں سے فریڈی ینگ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ینگ نے پہلی بار زبان کھولی۔ ''سر...... مجھے ابھی سلطانہ کا پورا ریکارڈ پڑھنے اور اس کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل کرنے کی مہلت نہیں ملی۔ میں نے صرف تیرتھ سنگھ کی تیار کردہ چند رپورٹیں پڑھی ہیں۔ میرے نکتہ نظر سے تو وہ صرف خانہ پری والی رپورٹیں تھیں۔ میں عملی طور پر کوششیں شروع کرنے سے پہلے سلطانہ کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات اور اس کے ماضی کی ہر بات معلوم کرنے کی کوشش کروں گا۔ میں چاہوں گا کہ حرکت میں آنے سے پہلے میرے ذہن میں سلطانہ کی ایک مکمل تصویر موجود ہو۔ خاص خاص کاموں کے سلسلے میں میرا یہی طریقہ کار ہے۔ روزمرہ کی عام ڈیوٹی کی بات اور ہے۔''

''مسٹر ینگ! آپ جس طرح مناسب سمجھیں، اس طرح کام کریں۔ ہماری طرف سے آپ کو مکمل اختیارات حاصل ہیں، آپ سے روز روز کسی قسم کی پوچھ گچھ یا جواب طلبی نہیں کی جائے گی۔'' کمشنر ونڈہم نے گویا اسے اطمینان دلایا۔

''اب تک مجھے جو معلومات حاصل ہوئی ہیں۔ ان سے کچھ ایسا لگتا ہے جیسے سلطانہ کوئی ڈاکو نہیں بلکہ سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف بغاوت کی ایک علامت ہے۔'' ینگ نے قدرے فلسفیانہ لہجے میں کہا۔ ''وہ اپنی جگہ ایک دلچسپ کردار بھی ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ اس کی نفسیات کو سمجھتے ہوئے آگے بڑھنے کی ابتداء کروں۔ میری درخواست ہے کہ اگر کام میں کچھ دیر لگ جائے تو صبر و تحمل کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیئے گا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اگر ہم نے اس معاملے میں اندھا دھند آگے بڑھنے کی کوشش کی تو سلطانہ مزید مضبوط اور اس کا گروہ پہلے سے زیادہ طاقتور نہ ہو جائے۔''

''ہم صبر و تحمل سے نتائج کا انتظار کریں گے مسٹر ینگ!'' کمشنر نے کہا۔ ''اور دعا کریں گے کہ آپ اس معاملے میں ناکام نہ ہوں۔ ہمیں یہ کیس کسی اور کے سپرد نہ کرنا پڑے۔''

''اگر خدانخواستہ مسٹر ینگ بھی ناکام ہو گئے تو مجھے خود میدان میں نکلنا پڑے گا۔'' آئی جی ایش ڈاؤن نے کہا۔ ''اور اگر میں بھی ناکام ہو گیا تو میں استعفیٰ دے دوں گا۔''

''مجھے امید ہے کہ اس کی نوبت نہیں آئے گی۔'' ینگ نے اعتماد سے کہا۔ ''میں اس مہم کے لئے بیس ایسے ماتحتوں پر مشتمل ایک خصوصی ٹیم بنانا چاہوں گا جو صرف سلطانہ ڈاکو اور اس کے گروہ کی گرفتاری یا خاتمے کے لئے کام کرے گی۔ وہ معمول کی کسی قسم کی ڈیوٹی انجام نہیں دے گی۔ میں اس ٹیم میں چن چن کر ایسے پولیس والوں کو شامل کروں گا جن کی شہرت اچھی ہو، جن کے بارے میں یہ یقین پایا جاتا ہو کہ وہ کبھی بک نہیں سکتے۔ اس کے ساتھ ساتھ انہیں ایسے ڈاکوؤں کی تلاش اور ان سے مقابلے کا کچھ نہ کچھ تجربہ ہو جو ہندوستان کے لامتناہی جنگلوں اور خاص طور پر ترائی کے علاقے کے عجیب و غریب جنگلوں میں ٹھکانے بنا لیتے ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ ایک اچھی خاصی فوج بھی ان جنگلوں میں انہیں تلاش نہیں کر سکتی اور اگر مقابلے کی نوبت آ جائے تو یہ ڈاکو جو ان جنگلوں کے بھیدی ہیں اور جان ہتھیلی پر لئے پھر رہے ہیں، تعداد میں بہت کم ہونے کے باوجود ایک اچھی خاصی فوج کو شکست دے سکتے ہیں یا پھر انہیں بہت زیادہ جانی نقصان پہنچا کر...... خود جانیں بچا کر فرار ہو سکتے ہیں۔''

کمشنر ونڈہم نے ینگ کی تائید میں سر ہلایا اور آئی جی نے کہا۔ ”آپ کے اندازے بالکل درست ہیں مسٹر ینگ! یہ ڈاکو ایک طرح کے چھاپہ مار گوریلے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ جاہل اور ان پڑھ ہونے کے باوجود شاطرانہ انداز میں منصوبہ بندی بھی کر سکتے ہیں۔ اب یہی دیکھ لیں کہ تیرتھ سنگھ کی بیٹی کی شادی کے موقع پر لوٹ مار کے لئے انہوں نے کس طرح منصوبہ بنالیا اور کتنے اطمینان سے اس پر عمل بھی کرلیا۔ ان کا اپنا مخبری کا نظام بھی موجود ہے اور ہر جگہ ان کے کچھ نہ کچھ ہمدرد یا مددگار بھی موجود ہیں۔“

”جی ہاں......“ فریڈی ینگ نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”میں انہی سب حقائق کو مدنظر رکھتے ہوئے کوئی حکمت عملی بنانا چاہتا ہوں۔“

”تمہارا جو دل چاہے کرو......لیکن کوشش کرو کہ جلد از جلد مجھے اور مسٹر ایلش ڈاؤن کو سلطانہ اور اس کے گروہ کے گرفتار یا ہلاک ہونے کی خوشخبری سناؤ۔ سچی بات یہ ہے کہ یہ پوری انگریزی سرکار کے لئے خوشخبری ہوگی۔ مجھے یقین ہے کہ اس کے بعد تمہیں ڈی آئی جی کے عہدے پر ترقی دے دی جائے گی۔“ کمشنر ونڈہم نے کہا۔

”عجیب بات ہے کہ مجھے پولیس کے محکمے میں ترقی کی کوئی خواہش نہیں۔“ ینگ مسکراتے ہوئے بولا۔ ”اس بات پر شاید کوئی یقین نہ کرے۔ ہمارے محکمے میں لوگ ذرا سی ترقی کے لیے مرے جاتے ہیں۔“

”میں تمہاری بات پر یقین کرسکتا ہوں۔“ آئی جی نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”کیونکہ میں تمہیں کافی حد تک جانتا ہوں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ تم پولیس کے محکمے میں نوکری کے لیے پیدا ہی نہیں ہوئے تھے۔ معلوم نہیں کیسے اس طرف آگئے۔“

”آپ ٹھیک سمجھے ہیں۔“ ینگ بولا۔ ”میں جب ایک نوعمر لڑکا تھا تو سوچا کرتا تھا کہ کسی طرح شاعر، فلسفی یا پھر ماہر آثار قدیمہ بن جاؤں۔ میں شاعری پڑھتا بہت تھا لیکن جب میں نے خود شاعری کرنے کی کوشش کی تو کوئی خاص چیز نہیں کہہ سکا۔ پھر میں نے فلسفہ لکھنے کی کوشش کی لیکن میرا کوئی فلسفہ لوگوں کی سمجھ میں نہ آیا۔ میں نے ماہر آثار قدیمہ بننے کی کوشش کی تو پتا چلا کہ یہ بھی بہت مشکل کام ہے۔ اس دوران ضرورت آن پڑی کہ میرا کوئی ذریعۂ روزگار بھی ہو۔ پولیس میں نوکریاں نکلیں۔ میں نے درخواست دی اور منتخب ہوگیا۔ یوں ایک ذریعۂ معاش پیدا ہوگیا۔ اب میں فالتو وقت میں اپنے باقی شوق پورے کرنے کی اپنی سی کوشش کرتا رہتا ہوں۔“

”بہت خوب......تمہارے بارے میں مزید جان کر خوشی ہوئی۔“ ونڈہم نے وال کلاک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اب میں میٹنگ برخاست کرتا ہوں۔ تم براہ راست آئی جی صاحب سے رابطہ رکھتے ہوئے اپنا کام شروع کردو۔“

”یس سر......“ فریڈی ینگ اور دیگر پولیس افسروں نے اٹھ کر کمشنر اور آئی جی کو سلیوٹ کیے۔ ایلش ڈاؤن بھی اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ وہ باقی لوگوں کے بعد لیکن ینگ کے ساتھ ہی کمرے سے نکلا۔ دونوں اکٹھے باہر آئے تو برآمدے میں کھڑے اردلی نے دونوں کو سلیوٹ کیا۔ وہ کوئی نیچ ذات کا ہندو معلوم ہوتا تھا۔ ینگ نے اس کے سلیوٹ کا جواب دینے کے علاوہ دونوں ہاتھ جوڑ کر اسے پرنام بھی کیا۔

ونڈہم اس کا انداز دیکھ کر مسکرا دیا اور کچھ آگے جانے کے بعد بولا۔ ”انگریز افسر تمہارے ان طور طریقوں کو پسند نہیں کرتے کہ تم ہندوستانیوں کے ساتھ انہی کے سے انداز میں ملتے جلتے ہو اور نیچ ذات ہندوؤں تک کے سامنے انکساری کا اظہار کرتے ہو۔ شاید تم بھول جاتے ہو کہ تمہارا تعلق ایک برتر قوم اور حکمران طبقے سے ہے۔ اس کے علاوہ تم کوئی معمولی کلرک یا کانسٹیبل نہیں، ڈی ایس پی ہو۔“

پھر ایلش ڈاؤن صفائی پیش کرنے کے سے انداز میں بولا۔ ”یہ میں اپنے نہیں، کچھ دوسرے ساتھی افسروں کے خیالات بیان کر رہا ہوں۔ وہ کہتے ہیں ہمیں ان نیچ ذات ہندوؤں سے باچھیں کھلا کر ملنے کی کیا ضرورت ہے جن سے خود اونچی ذات کے ہندو بھی ہاتھ نہیں ملاتے۔“

”سر! آپ کو تو معلوم ہے یہ سب جہالت کی باتیں ہیں۔ طبقوں اور ذاتوں کی یہ تقسیم خود انسانوں نے پیدا کر رکھی ہے۔ کچھ چالاک انسانوں کو، گزرے ہوئے زمانوں میں اچھے حالات میسر آگئے تو انہوں نے ہر اچھے منصب، مقام اور سماجی رتبے پر قبضہ کرلیا اور حالات کے چنگل میں پھنسے ہوئے کمزور لوگوں کو سہارا دینے کے بجائے مزید ذلت کی طرف دھکیل دیا۔“ ینگ ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولا۔ ”ویسے بھی سر......ہم نے ہندوستانیوں کے ملک پر تو قبضہ جمالیا ہے لیکن اگر ہم ان کے دلوں پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں ان کے ساتھ کسی اور طرح کا برتاؤ کرنا ہوگا۔“

”میں خود تمہارے خیالات کا حامی ہوں اور ایک بڑے عہدے پر فائز ہونے کے باوجود

زیادہ تر ہندوستانیوں سے تمہاری ہی طرح ملتا ہوں لیکن بعض چھوٹے افسر ہمارے نظریات سے اتفاق نہیں کرتے۔'' ایش ڈاؤن بولا۔

''سر! وہ اصل میں صرف عہدے کے لحاظ سے ہی نہیں، ذہنی طور پر بھی چھوٹے ہوتے ہیں۔'' ینگ نے مسکراتے ہوئے کہا۔'' مجھے خطرہ محسوس ہوتا ہے کہ ایسے ہی لوگوں کی وجہ سے انگریزوں کو کبھی ہندوستان سے نکلنا پڑے گا۔''

''خدا وہ دن نہ لائے۔'' ایش ڈاؤن جلدی سے بولا۔'' یہ بہت خوبصورت...... بہت رنگا رنگ...... بہت بڑا اور بہت دولت مند ملک ہے۔ اسی کی وجہ سے ہم دنیا کے دوسرے کئی ملکوں پر بھی حکومت کر رہے ہیں۔ اگر یہ ہمارے ہاتھ سے نکل گیا تو پھر باقی ملک بھی نکل جائیں گے۔''

اس دوران ایش ڈاؤن اپنی سرکاری جیپ تک پہنچ چکا تھا۔ ینگ کی گاڑی کچھ دور کھڑی تھی۔ ایش ڈاؤن کے ڈرائیور نے مستعدی سے اسے سلیوٹ کیا اور اس کے لئے جیپ کا دروازہ کھولا۔ ایش ڈاؤن نے شاید کچھ سوچ کر ینگ کو مخاطب کیا۔'' میں جمخانہ کلب جا رہا ہوں۔ میں نے اپنی بیٹی الزبتھ کو وہاں کھانے پر بلایا ہوا ہے۔ میں چاہتا ہوں تم بھی میرے ساتھ کھانے پر وہاں چلو۔ اس دوران ہم سلطانہ کے بارے میں غیر رسمی انداز میں کچھ بات چیت کر لیں گے۔ باضابطہ طور پر تو دفتر میں بات چیت ہوتی ہی رہے گی۔''

''آپ کی صاحبزادی ایک بن بلائے مہمان کی وجہ سے بور تو نہیں ہوں گی؟'' ینگ نے محتاط لہجے میں پوچھا۔

''بھئی تم بن بلائے کہاں سے ہو گئے؟ میں تمہیں بلا رہا ہوں نا...... اور الزبتھ کسی مہمان کے آنے سے بور نہیں ہو گی، وہ تو مہمان نہ آنے کی وجہ سے بور ہوتی رہتی ہے۔ زیادہ بور ہوتی ہے تو انگلینڈ چلی جاتی ہے حالانکہ اسے انگلینڈ سے زیادہ انڈیا پسند ہے لیکن یہاں چونکہ ہمارا کوئی خاص حلقۂ احباب نہیں ہے۔ میں انڈیا میں میل ملاقات اور سماجی تعلقات رکھنے کے سلسلے میں بہت محتاط رہتا ہوں اس لئے وہ بے چاری کبھی کبھی تنہائی محسوس کرنے لگتی ہے۔'' ایش ڈاؤن نے کچھ اس طرح بتایا جیسے وہ ینگ کو ایک ماتحت سے زیادہ دوست کا درجہ دے رہا ہو۔ ینگ کو دلی سے آئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا اور ایش ڈاؤن سے اس کی چند رسمی اور دفتری قسم کی ملاقاتیں ہی ہوئی تھیں لیکن اس نے محسوس کیا تھا کہ ایش ڈاؤن اسے پسند کرنے لگا تھا ورنہ وہ ایک کم آمیز آدمی تھا، لوگوں میں بہت کم گھلتا ملتا تھا اور خاص طور پر اپنے ماتحتوں سے تو ایک مخصوص فاصلہ

رکھنے کا قائل معلوم ہوتا تھا۔ اس نے اپنے ہم رتبہ اور ہم پلہ انگریزوں میں بھی کوئی خاص حلقۂ احباب نہیں بنایا تھا۔

''اس صورت میں تو مجھے آپ کے ساتھ چلنے میں بے حد خوشی ہو گی۔ اس عزت افزائی کے لئے میں آپ کا شکر گزار ہوں۔'' ینگ نے مہذبانہ اور شائستہ لہجے میں کہا۔

''اتنی زیادہ رسمی باتیں کرنے کی ضرورت نہیں۔'' ایش ڈاؤن نے مسکراتے ہوئے کہا اور اس کے کندھے پر ہولے سے تھپکی دے کر اسے جیپ میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ینگ نے اپنی گاڑی وہیں چھوڑ دی اور آئی جی کے ساتھ جمخانہ کلب روانہ ہو گیا۔

جمخانہ پہنچ کر ایش ڈاؤن نے ہال میں داخل ہونے کے بعد جس میز کا رخ کیا اس پر ''ریزروڈ'' کی تختی لگی ہوئی تھی اور وہاں سنہرے بالوں والی ایک خوبصورت اور نازک اندام لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ قریب پہنچ کر ینگ نے دیکھا اس کی آنکھیں نیلم جیسی تھیں، شفاف اور گہری نیلی۔ اس کا سراپا پریوں کی طرح نازک تھا، آدھے سر پر اس کا سبز اسکارف لپٹا ہوا تھا۔ اس نے کھڑے ہو کر ایک دلفریب مسکراہٹ کے ساتھ ان کا استقبال کیا۔

ایش ڈاؤن نے اسے اور ینگ کو ایک دوسرے سے متعارف کرایا تو وہ مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولی۔'' میں بہت جگہ آپ کا تذکرہ سن چکی ہوں۔''

''حیرت ہے......!'' ینگ نے اس کا ہاتھ تھام کر مسکراتے ہوئے کہا۔ اس کا ہاتھ کسی پھول کی طرح سبک اور ملائم تھا۔'' میں اتنا مشہور آدمی تو نہیں ہوں۔''

''کم از کم پولیس ڈپارٹمنٹ میں تو مشہور ہیں...... اور میں بہر حال ایک پولیس آفیسر کی بیٹی ہوں۔'' الزبتھ بدستور دل آویز انداز میں مسکراتے ہوئے بولی۔'' میں نے سنا ہے کہ آپ اپنے غیر روایتی طور طریقوں اور فلسفیانہ انداز فکر کی وجہ سے اکثر اپنے افسروں کے زیر عتاب رہتے ہیں اور وہ آئے دن آپ کا تبادلہ کرتے رہتے ہیں۔''

''جی ہاں......'' ینگ بے پروائی سے ہنسا۔'' لیکن جب میں استعفیٰ دیتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ پولیس ڈپارٹمنٹ کی جان چھوڑ دوں تو کوئی مجھے جانے بھی نہیں دیتا۔ ہر بار میرا استعفیٰ نامنظور ہو جاتا ہے۔''

''دراصل میرے ڈیڈی جیسے بڑے اور پڑھے لکھے افسروں کو آپ کی قدر و قیمت کا اندازہ ہو گا۔'' الزبتھ مسکرا کے باپ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

وہ بیٹھ چکے اور ڈرنکس آ چکیں تب بھی ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ ینگ کو پتا چلا کہ الزبتھ کی ماں اسے پانچ سال کی چھوڑ کر ایک نامعلوم بیماری میں مبتلا ہو کر مرگئی تھی۔ ایش ڈاؤن نے اس کے بعد شادی نہیں کی تھی۔

"......لیکن میں یہ ہرگز نہیں کہہ سکتا کہ بیوی کے انتقال کے بعد میں نے ماں بن کر الزبتھ کو پالا ہے۔" ایش ڈاؤن مسکراتے ہوئے بولا۔ "میری تو ملازمت ہی کچھ ایسی رہی...... تبادلے ہوتے رہے...... پھر انڈیا اور انگلینڈ کے درمیان اتنے چکر لگتے رہے کہ مجھے پتا ہی نہیں چلا، الزبتھ کب بڑی ہوگئی۔ یہ بے چاری پانچ سال کی عمر سے اپنے سارے کام...... اپنی زندگی کے سارے فیصلے خود کرتی چلی آرہی ہے۔ بچپن ہی سے یہ صحیح معنوں میں ایک ایسی لڑکی چلی آرہی ہے جو کسی کی مدد کی محتاج نہیں ہے۔"

"بہت خوب......!" ینگ نے ستائشی انداز میں سر ہلایا۔ "ورنہ میں نے تو یہی دیکھا ہے کہ آپ کے طبقے کی بچیاں بہت بڑی ہونے تک بھی ناز اٹھوانے اور انگلی پکڑ کر چلنے کی عادی رہتی ہیں یا پھر وہ بالکل ہی بے مہار ہو جاتی ہیں کسی کو خاطر میں ہی نہیں لاتیں حتیٰ کہ والدین کو بھی نہیں......اعتدال کی راہ پر چلنے والی تو ان میں کوئی کم ہی نظر آتی ہے۔"

"کھانے کا سلسلہ شروع ہوا تو اصل موضوع پر بھی بات ہونے لگی یعنی سلطانہ ڈاکو کا ذکر چھڑ گیا۔

الزبتھ کھانا چھوڑ کر، چھری کانٹا پلیٹ میں رکھ کر پرجوش انداز میں ہاتھ ملتے ہوئے خوابناک سے لہجے میں بولی۔ "مجھے تو اس شخص سے ملنے کا بہت شوق ہے۔"

ینگ نے قدرے حیرت سے الزبتھ کی طرف دیکھا۔ ایش ڈاؤن اس کی حیرت پر مسکرا دیا۔ شاید وہ اس معاملے میں اپنی بیٹی کے خیالات سے آگاہ تھا۔ الزبتھ گویا اپنی ہی دھن میں بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "مجھے انگلینڈ سے زیادہ انڈیا اس لئے پسند ہے کہ یہاں کی بہت سی چیزوں میں بڑی پراسراریت اور افسانویت ہے۔ اس کے علاوہ چونکہ ہمارا تعلق یہاں کے حکمران طبقے سے ہے اس لئے ہر جگہ ہمیں یہاں ایک خصوصی اہمیت اور احترام ملتا ہے۔ ہر کوئی ہمیں سر آنکھوں پر بٹھاتا ہے اس لئے بھی یہاں رہنے میں مزا آتا ہے۔ اندر سے تو ہر انسان چاہتا ہے نا کہ اسے زیادہ سے زیادہ اہمیت دی جائے اس کا زیادہ سے زیادہ احترام کیا جائے۔"

وہ ایک لمحے کے لئے خاموش ہوئی۔ ینگ نے اس کی گفتگو میں دخل نہیں دیا اور خاموشی

سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اسے دل ہی دل میں اعتراف کرنا پڑا تھا کہ اس نوجوانی میں ہی الزبتھ کی گفتگو اور خیالات میں بے پناہ پختگی تھی۔ اس کے نظریات کچھ بھی سہی لیکن وہ عامیانہ اور سطحی نہیں تھے۔

وہ سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے بولی۔ "سلطانہ بھی یہاں کا ایک پراسرار اور افسانوی کردار ہے۔ کتنے کم عرصے میں وہ آندھی طوفان کی طرح اتنے بڑے ملک کے افق پر چھا گیا ہے۔ یہاں انگریز بھی ہیں اور ہندوستانی بھی...... پولیس بھی ہے اور فوج بھی...... سی آئی ڈی کا محکمہ بھی ہے اور خفیہ پولیس بھی...... لیکن کسی کو نہیں معلوم کہ سلطانہ اور اس کے ساتھی کہاں رہتے ہیں۔ اتنا بڑا گروہ کس طرح زندگی گزارتا ہے اور کس طرح اپنی تمام ضروریات پوری کرتا ہے ......اور پھر سب سے بڑی افسانوی بات یہ ہے کہ وہ اپنی لوٹی ہوئی دولت کا زیادہ حصہ غریبوں میں بانٹ دیتا ہے۔ اس سے کچھ ایسا لگتا ہے کہ اسے دولت کے لالچ نے ڈاکو نہیں بنایا۔ میرا دل چاہتا ہے اس سے ملوں...... بہت ساری باتیں کروں...... اس سے سب کچھ پوچھوں...... اس کے دل اور ذہن میں جھانکنے کی کوشش کروں۔ مجھے تو اس کے تصور میں ایک عجب قسم کی رومانیت بھی محسوس ہوتی ہے۔"

ایش ڈاؤن نے کھانا کھاتے کھاتے مسکرا کر ینگ کی طرف دیکھا اور کہا۔ "تم میری بیٹی کی باتیں سن کر حیران نہ ہونا...... اس کا سوچنے کا انداز بھی کافی حد تک تمہاری طرح ایک افسانہ نگار اور فلسفی کا سا ہے۔ یہ سچ مچ کہانیاں لکھتی بھی ہے۔ لڑکپن سے ہی کچھ نہ کچھ لکھتی چلی آرہی ہے۔ اس کی کچھ کہانیاں انگلینڈ کے بعض رسالوں میں چھپی بھی ہیں۔"

"اس لحاظ سے تو یہ خود بھی ایک افسانوی شخصیت ہیں۔" ینگ مسکراتے ہوئے بولا۔

الزبتھ نے ینگ کی طرف دیکھتے ہوئے اچانک گہری سنجیدگی سے پوچھا۔ "مسٹر ینگ! اگر آپ کا سلطانہ سے سامنا ہوا تو کیا آپ اسے ہلاک کر دیں گے؟"

ینگ نے ایک لمحے توقف کیا اور پھر وہ بھی نہایت سنجیدہ اور ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولا۔ "پہلی بات تو یہ کہ میں اس خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہوں کہ سلطانہ کو ہلاک کرنا بہت آسان ہوگا۔ بات صرف اتنی سی نہیں ہوگی کہ میرا اس سے سامنا ہو اور میں اسے گولی مار دوں۔ اگر یہ اتنا ہی آسان کام ہوتا تو شاید اب تک کوئی کر چکا ہوتا۔ اس کے علاوہ فی الحال میرا ایسا کوئی ارادہ بھی نہیں ہے۔ میں اسے زندہ گرفتار کرنا چاہتا ہوں۔ یہ اسے ہلاک کرنے سے زیادہ مشکل کام ہے

لیکن فی الحال میرے دماغ میں یہی خیال اٹکا ہوا ہے۔ تاہم اس قسم کے معاملات میں کچھ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ حالات کیا رخ اختیار کریں اور کب کیا ہو جائے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ میرے خیالات اور ارادے دھرے کے دھرے رہ جائیں اور کچھ سے کچھ ہو جائے......"

اس نے ایک لمحے کے لئے گویا کچھ سوچا پھر مسکراتے ہوئے بولا۔ "یہ بھی ممکن ہے کہ ہمارا آمنا سامنا ہو تو میں سلطانہ کے ہاتھوں مارا جاؤں۔"

"خدا نہ کرے کہ ایسا ہو۔" الزبتھ فوراً بول اٹھی۔ اس کے دعائیہ لہجے میں کسی ایسے جذبے کی شدت تھی جسے ینگ کوئی نام تو نہ دے سکا لیکن اس پر حیران ہوئے بغیر بھی نہ رہ سکا۔ وہ الزبتھ کے لئے اجنبی تھا۔ آج یہ ان کی پہلی ملاقات تھی۔ اسے بھلا اس قدر خلوص اور بے ساختگی سے اس کے لئے دعا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ دوسری طرف وہ سلطانہ کے لئے بھی فکرمند تھی۔ وہ واقعی ایک عجیب لڑکی تھی۔ عجیب ہونے کے ساتھ ساتھ بے پناہ خوبصورت اور پرکشش بھی......"

ینگ کے دل میں ایک بھولا بسرا سا درد ابھر آیا لیکن اس نے فوراً اس طرف بھٹکتے ہوئے خیالات کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کی۔ وہ اس وقت اپنی توجہ موجودہ لمحات پر رکھنا چاہتا تھا۔ یادوں کے صحرا میں بھٹکنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے یادوں سے خوف آتا تھا۔

"میں آپ کے پرخلوص دعائیہ الفاظ کے لئے آپ کا شکر گزار ہوں۔" اس نے سنجیدگی اور شائستگی سے کہا۔ "لیکن یہ معاملہ بہرحال ایسا ہے کہ اس میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔"

"پھر بھی...... آپ مجھ سے وعدہ کریں کہ آپ ہر حال میں سلطانہ کو زندہ گرفتار کرنے کی کوشش کریں گے۔" الزبتھ نے اصرار کیا۔ اس کے لہجے میں ضد کے ساتھ ساتھ ایک قسم کا مان بھی تھا جیسے ینگ اس کی فرمائش پوری کرنے سے انکار نہیں کر سکتا۔

"آپ کو مجھ سے یہ وعدہ لینے کی ضرورت نہیں۔" ینگ ملائمت سے بولا۔ "کیونکہ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ میرا تو اپنا یہی ارادہ ہے۔"

"اپنے ارادے پر قائم رہیے گا۔" الزبتھ بولی۔ "سلطانہ سے کم از کم ایک بار ملنے کی میری خواہش ضرور پوری کر دیجئے گا۔"

"میں اپنی سی پوری کوشش کروں گا۔" ینگ نے صدق دل سے کہا۔

ایلش ڈاؤن اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "تم اس لڑکی کی باتوں سے پریشان نہ ہونا

اس کے دماغ میں عجیب عجیب خیالات آتے رہتے ہیں اور کبھی کبھی یہ اسی طرح کسی چیز کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ آج کل یہ ڈاکو اس کے خیالات کا مرکز ہے۔ کچھ دنوں بعد یہ کسی اور کردار کے پیچھے لگ جائے گی۔"

الزبتھ نے یوں شکوہ آمیز سی نظروں سے باپ کی طرف دیکھا جیسے کہنا چاہ رہی ہو۔ "ڈیڈی! یہ آپ میرے بارے میں غلط بیانی کر رہے ہیں۔ میں ایسی تو نہیں ہوں۔"

اس شام ینگ اپنے گھر پہنچا تو اس کے ذہن پر صرف سلطانہ ڈاکو ہی نہیں بلکہ الزبتھ بھی سوار تھی۔ الزبتھ کے بارے میں سوچتے وقت اس کے ذہن میں کسی قسم کے رومانوی خیالات تھے اور نہ ہی اس کے دل میں گدگدی سی ہو رہی تھی۔ اپنے دل اور ذہن میں عشق اور رومانس کا خانہ تو اس نے عرصے پہلے بند کر دیا تھا۔ الزبتھ تو کیا، وہ اب کسی بھی لڑکی یا عورت کی طرف دیکھ کر اس زاویئے سے نہیں سوچ سکتا تھا۔ اس کے دل میں ایک ناکام محبت کی قبر موجود تھی جس پر بکھرے ہوئے یادوں کے پھول ابھی مرجھائے نہیں تھے۔ اس قبر اور ان پھولوں کے ہوتے ہوئے اس کے دل میں شاید رومانویت کو محسوس کرنے کی صلاحیت ہی نہیں رہی تھی۔ کوئی چہرہ خواہ اسے کتنا ہی اچھا لگتا۔ کسی کے خدوخال خواہ اپنی دلکشی کا کتنا ہی احساس دلاتے لیکن اس کے محسوسات کی دنیا میں کوئی نقرئی گھنٹی نہیں بجتی تھی۔

اسے اپنی اور الزبتھ کی عمروں میں فرق کا بھی احساس تھا۔ وہ شاید بیس بائیس سال کی تھی جبکہ ینگ کی عمر پچاس کے قریب تھی۔ اسے صرف الزبتھ کی شخصیت کی انفرادیت اور اس کی سوچوں کی پختگی نے متاثر کیا تھا۔ اس کی سوچیں اس کا ذہن بیس بائیس سال کی لڑکی والا ہرگز نہیں تھا۔ بہرحال اس نے الزبتھ کے خیال کو ذہن سے جھٹکا اور اپنی سوچوں کو صرف سلطانہ پر مرتکز کرنے کی کوشش کی۔

سلطانہ کے بارے میں پولیس کے محکمے میں جتنی بھی فائلیں موجود تھیں اور جتنی بھی رپورٹیں مرتب ہوئی تھیں وہ سب اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ اسے اپنے دوسرے تمام وسائل سے بھی سلطانہ کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات جمع کرنا تھیں۔ سلطانہ کے بارے میں جتنا بھی زیادہ جاننا ممکن تھا وہ جاننے کے بعد ہی اسے کوئی عملی قدم اٹھانا تھا اور اس دوران محکمے میں سے اپنے لئے بیس بہترین ساتھی بھی منتخب کرنا تھے۔

رات گئے تک وہ تمام فائلوں کا مطالعہ کرتا رہا۔ زیادہ تر اندراجات روایتی، رسمی اور دفتری

تھے۔ کاغذات کا انبار بہت بڑا تھا لیکن ان سے حاصل ہونے والی معلومات بہت کم تھیں۔ تاہم ایک خاکہ ضرور اس کے سامنے آگیا جس میں وہ اپنے تخیل کی مدد سے رنگ بھر سکتا تھا۔ کئی گھنٹوں کے مطالعے کے بعد وہ کسی حد تک مطمئن ہو کر سو گیا۔



سلطانہ نے گاہے گاہے رات کے اندھیرے میں رقاصہ چنبیلی سے ملنے جانا شروع کر دیا تھا۔ اس سے اس کی زندگی میں ایک عجیب سی آسودگی، ولولہ اور تازگی سی آگئی تھی۔ اس نے چنبیلی کو روپیہ پیسہ، زیور، موتی دینے کی کوشش کی۔ اس نے کوئی چیز قبول نہیں کی۔ سلطانہ نے زیادہ اصرار کیا تو وہ ناراض ہو گئی۔ سلطانہ کو اسے منانا پڑا۔ وہ بڑی مشکل سے مانی۔ اس کے بعد سلطانہ نے یہ کوشش ترک کر دی۔

لگتا یہی تھا کہ وہ سلطانہ کے عشق میں گرفتار تھی۔ سلطانہ کو لیکن یہ سوچنا ہی عجیب لگتا تھا اور اس پر اسے بے پناہ حیرت ہوتی تھی۔ اس کے خیال میں تو اس میں ایسی کوئی بات تھی ہی نہیں کہ کوئی نہایت حسین تو کیا، عام سی عورت بھی اس کے عشق میں گرفتار ہو سکتی۔ زندگی میں صرف ایک ہی عورت نے اسے محبت کا احساس دلایا تھا اور وہ تھی پتلی...... لیکن وہ تو اس کی بیوی تھی۔ ان جیسے لوگوں میں یہی تصور تھا کہ بیوی کو تو بہر حال شوہر سے محبت کرنا ہی ہوتی تھی۔ پتلی کے سوا اسے زندگی میں کسی عورت سے واسطہ نہیں پڑا تھا لیکن اب چنبیلی نے اس کی زندگی میں آکر اس کے محسوسات کی دنیا ہی بدل دی تھی۔ وہ پہلے کے مقابلے میں زیادہ خوش مزاج ہو گیا تھا۔

ہفتے میں ایک بار وہ ایک مخصوص وقت اور ایک مخصوص جگہ پر اپنے مخبروں سے ملاقات کے لئے جاتا تھا۔ ان ملاقاتوں میں صرف بھورے اس کے ساتھ ہوتا تھا۔ وہ مخبروں سے اس لئے ایک علیحدہ جگہ پر ملاقات کرتا تھا کہ وہ ان کے ڈیرے کو نہ دیکھ سکیں اور نہ ہی انہیں اس کے محل وقوع کا اندازہ ہو سکے۔ اس کے کئی مخبر اس کے لئے مختلف جگہوں کی خبریں لاتے تھے۔ کوئی اسے پولیس کے محکمے میں ہونے والی کارروائیوں کی خبر دیتا تھا۔ کوئی گلی کوچوں میں ہونے والی خاص خاص باتوں کی خبر لاتا تھا۔ کوئی کسی ایسے بڑے ''شکار'' کے بارے میں آگاہ کرتا تھا جو سلطانہ اور اس کے ساتھیوں کی نظر سے اوجھل ہوتا تھا۔ یہ سب مخبر صرف وہ خبریں لاتے تھے جن کا تعلق سلطانہ کی ذات یا اس کے گروہ سے ہوتا تھا۔ حتیٰ کہ اسے یہ خبریں بھی مل جاتی تھیں کہ اس کے گروہ کی کسی واردات کے بعد پولیس نے کیا کارروائی کی یا پولیس کے محکمے میں آئندہ کے

لئے اس کے بارے میں کیا منصوبے بن رہے ہیں۔ سلطانہ ان تمام مخبروں کو معقول معاوضہ دیتا تھا۔

اس بار وہ حسب معمول اپنے مخبروں سے ملاقات کرنے پہنچا تو ایک مخبر مُرلی جو کمشنر کے دفتر میں چپڑاسی تھا خبر لایا۔ ''سلطانہ...... مائی باپ...... دلّی سے ایک انگریز ڈی ایس پی فریڈی ینگ تبادلہ ہو کر آیا ہے، اس کے ذمے یہ کام لگایا گیا ہے کہ وہ تمہیں اور تمہارے گروہ کو ختم کرے یا پھر زندہ گرفتار کرے۔''

''اور اس نے یہ ذمے داری اپنے سر لے لی؟'' سلطانہ نے تصدیق چاہی۔

''ہاں...... مائی باپ...... صرف یہی نہیں بلکہ اس نے اس کام کے لئے بیس پولیس والوں کا ایک ٹولہ بھی بنانا شروع کر دیا ہے۔ بہت چھان پھٹک کر وہ ایک ایک پولیس والے کو الگ الگ تھانوں، دفتروں اور چوکیوں سے نکال کر لا رہا ہے۔ وہ اپنے مطلب کے آدمی جمع کر رہا ہے۔''

''کچھ پتا چلا ہے...... وہ خود کیسا آدمی ہے؟'' سلطانہ نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔

''سنا ہے، بہت ہی الگ قسم کا پولیس والا ہے۔ بہت سے پولیس افسر اس سے بیزار رہتے ہیں لیکن محکمہ اسے جانے بھی نہیں دیتا۔ وہ خود کئی بار استعفیٰ دینے کی کوشش کر چکا ہے۔''

سلطانہ نے پرخیال انداز میں سر ہلایا۔ پھر چند لمحے کی خاموشی کے بعد بھورے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''کیا خیال ہے...... گورے صاحب کے سواگت کے لئے کچھ ہلہ گلہ تو ہونا چاہیے۔ اسے پتا تو چلے کہ اس کے آنے سے سلطانہ کتنا ڈر گیا ہے۔''

بھورے نے اس کا مطلب سمجھتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا اور شاید کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ''ہاں...... اس سلسلے میں کچھ کرنا پڑے گا۔ آرام سے بیٹھ کر کچھ سوچتے ہیں۔ فی الحال تم دوسری خبریں لے لو۔''

''اور تیرتھ سنگھ کا کیا بنا؟'' سلطانہ نے دوبارہ مُرلی کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے پوچھا۔

''وہ بے چارہ تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا۔'' مُرلی ہنس کر بولا۔ ''سنا ہے وہ اب دفتر آتا ہے تو بس حاضری لگا کر کسی نہ کسی کام کے بہانے ادھر ادھر ہو جاتا ہے۔ پوری کوشش کرتا ہے کہ اسکا سامنا کم سے کم لوگوں سے ہو۔ وہ شاید اب بس کسی نہ کسی طرح اپنی نوکری کے بچے کھچے دن پورے کرنے کی کوشش کرے گا۔ میرا خیال ہے اب اس کے ریٹائر ہونے میں زیادہ

دن باقی نہیں ہیں۔''

''بھگوان نے چاہا تو فریڈی ینگ صاحب بھی اسی طرح لوگوں سے منہ چھپاتے پھریں گے۔'' سلطانہ نے بڑے اعتماد سے کہا۔



وہ تقریباً آدھی رات کا وقت تھا۔ نجیب آباد قلعے کا زیادہ تر حصہ تاریکی اور سکوت میں ڈوبا ہوا تھا۔ قلعے کا مین گیٹ رات کا اندھیرا گہرا ہوتے ہی بند کیا جا چکا تھا۔ باہر صرف دو سپاہی بندوقیں لئے کھڑے پہرہ دے رہے تھے۔ گیٹ کے آس پاس ذرا اونچائی پر دیوار میں بنے ہوئے سوراخوں میں مشعلیں پھنسا دی گئی تھیں جو اس وقت روشن تھیں۔ ان کی وجہ سے سامنے کے حصے میں کچھ دور تک تھوڑی بہت روشنی پھیلی ہوئی تھی۔

اچانک سپاہیوں کی نظر کچھ دور سے آتے ہوئے ہیولوں پر پڑی اور وہ ذرا مستعد ہو کر کھڑے ہو گئے لیکن جب ہیولے ذرا قریب آئے تو وہ دوبارہ کچھ بے پروا سے ہو گئے اور آپس میں گپ شپ کرنے لگے۔ انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ وہ دراصل ایک ہلکی پھلکی قسم کی بیل گاڑی تھی لیکن اسے بیل کے بجائے ایک بدحال سا آدمی کھینچ رہا تھا اور تقریباً اسی جیسے حلیے کا ایک اور آدمی گاڑی کو پیچھے سے دھکا لگا رہا تھا۔ سپاہیوں کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ پھیری لگا کر کچھ چیزیں بیچنے والے ایسے غریب سے آدمی تھے جنہیں اپنی گاڑی میں جوتنے کے لئے بیل یا گدھا بھی میسر نہیں تھا۔ وہ خود ہی اپنی گاڑی کھینچ رہے تھے۔ ان کے آدھے چہرے ان کی پگڑیوں ہی کے کچھ حصے سے ڈھکے ہوئے تھے۔ دن بھر باہر پھرنے والے لوگ عموماً اپنے چہرے دھول مٹی اور دھوپ سے بچانے کے لئے اسی طرح چھپا لیتے ہیں۔ اس لئے ان کے اس انداز نے سپاہیوں کو شک میں مبتلا نہیں کیا۔

دونوں آدمی گاڑی کو کھینچتے اور دھکیلتے ہوئے کافی قریب آ گئے۔ گاڑی کسی قسم کے سامان سے بھری ہوئی لگتی تھی لیکن وہ سامان کپڑے سے ڈھکا ہوا تھا۔ گاڑی کھینچنے والے آدمی نے گاڑی کو کھڑا کیا اور اسے وہیں چھوڑ کر ہاتھ میں کچھ لئے سپاہیوں کے قریب آیا اور عاجزی سے بولا۔

''آم خرید لو صاحب جی...... آم ...... بہت سستا دے دیں گے...... آج تو بہت ہی کم سودا بکا ہے۔ صبح سے خجل خوار ہو رہے ہیں۔''

اس نے آم ایک سپاہی کے چہرے کے بالکل قریب کر دیا۔ وہ آم کیا، ایک بڑی سی کچی

کیری تھی۔ سپاہی اس وقت شاید آپس میں کوئی دلچسپ بات کر رہے تھے جس میں خلل پڑ گیا تھا۔ ایک سپاہی نے نفرت سے گاڑی والے کا ہاتھ جھٹک کر اپنے چہرے سے دور کر دیا۔ کچا آم گاڑی والے کے ہاتھ سے چھوٹ کر کچھ دور گر گیا۔ وہ یوں اسے اٹھانے کے لئے پلٹ کر جھکا جیسے اس کی کوئی بہت قیمتی چیز اس کے ہاتھ سے گر گئی ہو۔

جیسے ہی وہ جھکا دوسرے سپاہی نے اس کی پیٹھ پر لات رسید کی۔ اس نے بمشکل اپنے آپ کو اوندھے منہ گرنے سے بچایا اور پلٹ کر دیکھا۔ اس کے دیکھنے کا انداز ایک غریب مجبور اور کمزور آدمی ہی کا تھا۔ دونوں سپاہی گویا اس کی حالت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے قہقہے لگانے لگے۔ پھر ایک سپاہی کو گویا کچھ خیال آیا اور وہ گاڑی کے قریب آتے ہوئے بولا۔ ''ابے او مردود ...... اس گاڑی میں کیا صرف کچے آم ہی بھرے ہوئے ہیں؟''

دوسرا سپاہی بھی اس کے ساتھ ہی گاڑی کے قریب آ گیا تھا۔ انہوں نے ایک جھٹکے سے گاڑی پر پڑا ہوا کپڑا ہٹایا اور دوسرے ہی لمحے ان پر چودہ طبق روشن ہو گئے۔ گاڑی میں سکڑ سمٹ کر لیٹے ہوئے دو آدمی چیتے کی طرح اُچھل کر ان پر ٹوٹ پڑے تھے۔ ایک ہی ہلے میں انہوں نے ان کے ہاتھوں سے بندوقیں چھین لیں اور انہیں نال کی طرف سے پکڑتے ہوئے ان کے دستے ہتھوڑے کی طرح ان کے سروں پر رسید کئے۔ دونوں سپاہی ذرا سی بھی آواز نکالے بغیر زمین پر ڈھیر ہو گئے۔ جس طاقت سے بندوقوں کے دستے ان کے سروں پر رسید کئے گئے تھے امکان یہی تھا کہ ان کی کھوپڑیاں ٹوٹ چکی ہوں گی۔

گاڑی میں سے اُچھل کر سپاہیوں پر حملہ آور ہونے والے دو آدمی سلطانہ اور بھورے تھے۔ انہوں نے بے حس و حرکت پڑے سپاہیوں کو گھسیٹ کر دیوار کے قریب ایسی جگہ ڈال دیا جہاں روشنی بالکل ہی کم تھی۔ انہیں معلوم تھا کہ قلعے کا دروازہ اندر سے بند ہوتا ہے۔ انہوں نے اسے کھلوانے کی کوشش نہیں کی۔ سلطانہ نے بیل گاڑی میں سے رسی کا لچھا نکالا جس کے ایک سرے پر پھندا سا بنا ہوا تھا۔ اس نے رسی ایک خاص انداز میں ہوا میں اُچھالی۔ قلعے کی دیوار پر کنگری سی بنی ہوئی تھی۔ رسی کا پھندا کنگری کے ایک نوکیلے حصے میں پھنس گیا۔

سب سے پہلے سلطانہ اس رسی کے سہارے دیوار پر چڑھا۔ اس دوران ایک طرف سے ان کے تین دوسرے قریبی ساتھی بھی وہاں آن پہنچے۔ انہیں الو کی آواز کے ذریعے سگنل مل چکا تھا کہ راستہ صاف ہو گیا ہے۔ سب باری باری رسی کے سہارے اوپر چڑھ گئے۔ اس دوران وہ

دیوار میں اٹکی ہوئی مشعلیں بھی اپنے ساتھ ہی اوپر لے گئے تھے۔ اوپر مزید مشعلیں بھی موجود تھیں۔

قلعے کی دیوار تقریباً چار فٹ موٹی تھی۔ وہ اس پر دوڑتے ہوئے ادھر ادھر بکھر گئے۔ وہ چونکہ قلعے کے چپے چپے سے اور ہر چیز کی بناوٹ سے اچھی طرح واقف تھے اس لئے انہیں معلوم تھا کہ کہاں کہاں آسانی سے آگ لگ سکتی تھی۔ ان میں سے جن چیزوں پر وہ مشعلیں پھینک سکتے تھے انہوں نے پھینک دیں۔ ان کے پاس تیر کمانیں بھی موجود تھیں۔ ان تیروں پر مٹی کے تیل میں بھیگے ہوئے کپڑے لپٹے ہوئے تھے۔ انہوں نے ان تیروں کو مشعلوں سے آگ لگائی اور نشانہ لگا کر مختلف چیزوں پر مارا۔ ان میں کمروں کی ایک قطار کے آگے لکڑی اور گھاس پھونس کا بنا ہوا ایک شیڈ بھی شامل تھا۔

وہ ان جگہوں پر آگ لگانے کی کوشش کر رہے تھے جہاں قلعے کا انتظام چلانے والے لوگ موجود تھے۔ ان لوگوں کے ٹھکانے ان کا نشانہ نہیں تھے جو قلعے میں قیدیوں کی سی زندگی گزار رہے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ آتشزدگی میں جانی نقصان بہرحال نہیں ہوگا۔ آگ کا غلغلہ بلند ہونے کے بعد لوگ اپنی جانیں بچا سکتے تھے۔ جب کئی جگہوں پر آگ بھڑکتی دکھائی دینے لگی تو سلطانہ نے اپنی کمر کے گرد لپٹی ہوئی تھیلیوں میں سے دو دستی بم نکال کر یکے بعد دیگرے اسلحہ خانے پر پھینکے۔ اسے معلوم تھا کہ اسلحہ خانے میں دھماکے ہونے سے سب سے زیادہ تباہی پھیلے گی جس کی دہشت بھی زیادہ ہوگی۔

ان کا اصل مقصد بھی دہشت پھیلانا ہی تھا۔ اسلحہ خانے میں ہونے والے دھماکوں نے ان کا مقصد پورا کر دیا۔ نیند میں ڈوبے ہوئے لوگ ہڑبڑا کر اٹھے اور باہر آئے تو انہوں نے مختلف جگہوں پر آگ لگی ہوئی دیکھی۔ اس کے بعد تو گویا ایک چھوٹی موٹی سی قیامت برپا ہوگئی۔ ہر طرف بھگدڑ اور افراتفری نظر آنے لگی۔ آگ بجھانے کی کوششیں ہونے لگیں۔ چاروں طرف سے چیخ و پکار سنائی دینے لگی۔

تب سلطانہ نے اپنی جیب سے چاندی کی ایک ڈبیا نکالی۔ ایسی ڈبیا میں خوشحال لوگ عام طور پر پان، چھالیہ رکھتے تھے لیکن سلطانہ کی اس ڈبیا میں مختصر سا ایک خط تھا۔ اس نے ڈبیا دور ایک ایسی جگہ پھینک دی جہاں آسانی سے کسی کو مل جائے۔ پھر اس نے اپنے ساتھیوں کو ایک مخصوص آواز کے ذریعے واپسی کا سگنل دیا اور وہ لوگ جس طرح دیوار پر چڑھے تھے اسی طرح

اتر کر واپس روانہ ہوگئے۔ انہیں اندازہ تھا کہ وہ اپنے پیچھے جو ہنگامہ چھوڑ کر جا رہے تھے وہ صبح تک بھی ختم نہیں ہوگا۔



ڈی ایس پی فریڈی ینگ کو اپنے مطلب کے بیس ماتحت مل گئے تھے۔ ان میں سرفہرست ایک پولیس آفیسر جاوید ملک تھا جو حال ہی میں دلّی سے آیا تھا اور نجیب آباد میں تعینات ہوا تھا۔ وہ فریڈی ینگ کا ماتحت نہیں بلکہ عہدے کے لحاظ سے اسی کے مساوی تھا یعنی وہ بھی ڈی ایس پی تھا۔ اس کا اصل تعلق حیدر آباد دکن سے تھا لیکن اس کی اب تک کی ملازمت کا زیادہ عرصہ دلّی میں گزرا تھا۔ اب کسی وجہ سے اس نے اپنا تبادلہ نجیب آباد کرایا تھا اور درحقیقت اسے ڈی ایس پی کے عہدے پر ترقی بھی اسی وجہ سے ملی تھی کیونکہ نجیب آباد آنے کے لئے ذرا بھی اونچے عہدے کا کوئی آفیسر مشکل سے ہی تیار ہوتا تھا۔ جن کا تبادلہ نجیب آباد ہو جاتا تھا وہ بھی اسے رکوانے کے لئے بھاگ دوڑ کرتے تھے۔ نجیب آباد کے حالات ہی ایسے تھے۔

جاوید ملک دلّی میں انسپکٹر تھا۔ اس نے خود نجیب آباد میں ڈیوٹی دینے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ فریڈی ینگ نے اس کے ریکارڈ کا اچھی طرح جائزہ لیا۔ اس نے دلّی شہر اور اس کے مضافات میں وارداتیں کرنے والے کئی ایسے ڈاکوؤں کو ہلاک کیا تھا یا زندہ گرفتار کیا تھا جنہیں خاصا خطرناک سمجھا جاتا تھا۔ اس کی عمر بھی زیادہ نہیں تھی۔ وہ تقریباً چالیس کا تھا اور اس سے بھی کم کا نظر آتا تھا۔ ینگ نے دل ہی دل میں اسے اپنے دست راست کا درجہ دے دیا تھا۔

وہ دونوں گو کہ ہم منصب تھے لیکن ینگ کو چونکہ خاص طور پر سلطانہ ڈاکو کی سرکوبی کی مہم سونپی گئی تھی اور وہی اس سلسلے میں سربراہ تھا اس لئے جاوید ملک نے اس حقیقت کو سمجھ لیا تھا کہ اخلاقاً اس کی حیثیت ینگ کے ماتحت کی ہوگی۔ اس نے نجیب آباد آکر سرکاری بنگلے میں رہائش اختیار کر لی تھی۔ ینگ بھی نجیب آباد منتقل ہو چکا تھا۔ اس نے اپنی ٹیم کے لئے جن پولیس والوں کا انتخاب کیا تھا ان میں سے زیادہ تر نجیب آباد میں ہی ڈیوٹی دے رہے تھے۔ جن کا تعلق مراد آباد سے تھا انہیں بھی نجیب آباد منتقل کر دیا گیا تھا۔

ینگ کی ٹیم مکمل ہوئے ابھی ایک ہی دن گزرا تھا۔ طے یہ پایا تھا کہ اب پورے صوبے میں کسی بھی مقام پر ہونے والی کوئی بھی ایسی واردات جس کے بارے میں پتا چلے گا کہ وہ سلطانہ کے گروہ نے کی ہے اس کی اطلاع براہ راست ینگ کو دی جائے۔ وہی اپنی ٹیم سمیت اس سلسلے

میں تمام تفتیش اور کارروائی کرے گا۔ سلطانہ کا پچھلا اور آئندہ کا تمام ریکارڈ بھی اسی کی تحویل میں ہوگا۔

اس روز وہ ابھی سو کر بھی نہیں اٹھا تھا کہ جاوید ملک اس کے ہاں آن پہنچا۔ اس کے اصرار پر ملازم نے جا کر ینگ کو جگایا۔ ینگ نے جب صبح سویرے جاوید ملک کے آنے کی خبر سنی تو اسے اندازہ ہوگیا کہ کوئی خاص بات ہوگی۔ وہ چہرے پر پانی کے چھپکے مار کر نشست گاہ میں پہنچا جہاں جاوید اس کا منتظر تھا۔ وہ وردی میں تھا۔

اس نے اٹھ کر ینگ کو سلیوٹ کیا اور بولا۔ ”سر...... آپ جلدی سے ناشتہ کرلیں ہمیں نجیب آباد فورٹ چلنا ہوگا۔ رات وہاں زبردست آگ لگی ہے اور اسلحہ خانہ بھی دھماکوں کے ساتھ تباہ ہوگیا ہے۔ آگ ایک ساتھ کئی جگہوں پر لگی تھی۔ قلعے والوں کا خیال ہے کہ یہ سب کچھ اتفاقاً یا حادثاتی طور پر نہیں ہوا بلکہ قلعے پر ایک طرح کا شب خون مارا گیا ہے۔ میں نے ابھی جا کر قلعے کا جائزہ نہیں لیا لیکن بغیر دیکھے ہی مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ یہ سلطانہ ڈاکو اور اس کے ساتھیوں کی حرکت ہے سر......!“



فریڈی ینگ نے اثبات میں سر ہلایا۔ جاوید ملک جو خبر لے کر آیا تھا اسے سن کر اس کی رہی سہی غنودگی بھی کافور ہوگئی تھی۔ وہ پُرخیال لہجے میں بولا۔ ”کیا قلعے میں لوٹ مار بھی ہوئی ہے؟“

جاوید ملک نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”مجھ تک جو رپورٹ پہنچی ہے اس میں لوٹ مار کا تو کوئی ذکر نہیں تھا ویسے بھی قلعے میں رہنے والوں کے پاس مال متاع نہیں ہوتا، یہ بات یقیناً سلطانہ کو بھی بہت اچھی طرح معلوم ہوگی۔ ایسا لگتا ہے جیسے اسکا مقصد بھی لوٹ مار نہیں تھا۔ وہاں بس زیادہ سے زیادہ تباہی پھیلانے کی کوشش کی گئی ہے۔“

”کوئی جانی نقصان بھی نہیں ہوا؟“ ینگ نے دریافت کیا۔

”نہیں......سر......“ جاوید ملک نے جواب دیا۔

”میرا خیال ہے تم بھی سمجھ ہی چکے ہو کہ یہ دراصل سلطانہ نے مجھے اور میری پولیس پارٹی کو پیغام دیا ہے کہ وہ ہماری آمد سے ذرا بھی خوفزدہ نہیں ہے۔ اس نے یہ دکھانے میں پہل کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہم دونوں فریقوں میں سے کون کیا کرسکتا ہے، اس میں شک نہیں کہ وہ ایک بہت ہی بے خوف مجرم ہے۔“ ینگ نے ٹھہرے لہجے میں کہا۔

”میں نے بھی یہی رائے قائم کی تھی سر...... نجیب آباد قلعے پر اس کے شب خون مارنے کی کوئی تک نہیں تھی۔ قلعے سے فرار ہونے کے بعد اس نے گزشتہ کئی سالوں کے دوران قلعے کا رخ نہیں کیا تھا۔ اسے یقیناً خبر مل گئی ہوگی کہ اس کے گروہ کی سرکوبی کے لئے ہم نے آکر نجیب آباد میں ڈیرے ڈالے ہیں۔ چنانچہ اس نے نجیب آباد ہی میں یہ واردات کر کے گویا ہمارا استقبال کیا ہے۔“ جاوید ملک بولا۔

ینگ پُرخیال انداز میں سر ہلانے لگا، گویا اس کی بات کی تائید کر رہا ہو، پھر وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ ”میں وردی پہن لوں، اس دوران ملازم چائے بنا لے گا، ہم ایک ایک کپ چائے پیتے

ہیں پھر قلعے کی طرف روانہ ہوتے ہیں۔"

کچھ دیر بعد وہ ینگ کی سرکاری جیپ میں قلعے کی طرف روانہ ہوئے۔ قلعے میں تباہی و بربادی کے بہت سے مناظر ان کے منتظر تھے۔ اس وقت بھی وہاں ملبہ سمیٹنے، بچی کھچی چیزوں کو سنبھالنے اور جل کر کوئلے یا کاٹھ کباڑ میں تبدیل ہو جانے والی چیزوں کو ٹھکانے لگانے کا کام جاری تھا۔ چند لوگ معمولی سے زخمی بھی ہوئے تھے۔ جن کی مرہم پٹی کر دی گئی تھی۔ ینگ نے قلعے میں ہونے والی تباہی کو دیکھ کر دل میں تاسف کی ایک لہر محسوس کی۔ قلعے کے موجودہ منتظم ایڈجوٹنٹ شیکھر نے ان کا استقبال کیا تھا۔

"یہ بات طے ہے کہ یہ سلطانہ ڈاکو اور اس کے ساتھیوں ہی کا کام ہے؟" ینگ نے ایک موہوم سی امید کے سہارے شیکھر سے پوچھا۔

"جی ہاں...... یہ بات تو اسی وقت طے ہوگئی تھی جب امدادی کارروائیاں کرنے کے دوران ہمیں چاندی کی ایک ڈبیا ملی۔" شیکھر ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ "سلطانہ خود اس بات کو یقینی بنا کر گیا ہے کہ ہمیں، آپ کو بلکہ شاید سارے ہندوستان کو معلوم ہو جائے کہ یہ اس کا "کارنامہ" ہے۔"

اس نے اپنی فوجی جیکٹ کی بڑی سی جیب سے چاندی کی ایک ڈبیا نکالی جو شاید آگ کی لپیٹ میں آجانے کی وجہ سے کافی حد تک سیاہ ہوگئی تھی۔ اس ڈبیا کو وہ ینگ کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "اس میں آپ کے نام ایک بے حد مختصر خط ہے۔"

ینگ نے ڈبیا اس کے ہاتھ سے لے لی اور بہت آہستگی سے اسے کھولا۔ اس میں ایک تہہ شدہ کاغذ تھا جو شاید تپش کی وجہ سے زرد ہوگیا تھا۔ ینگ نے نہایت احتیاط سے اسے کھولا۔ کاغذ پر موٹے قلم سے صرف اتنا لکھا ہوا تھا۔ "سلطانہ ڈاکو، مسٹر فریڈی ینگ کو نجیب آباد میں خوش آمدید کہتا ہے۔"

ینگ عجیب سے انداز میں مسکرایا۔ اس نے کاغذ تہہ کر کے واپس ڈبیا میں رکھا اور ڈبیا جیب میں رکھ لی۔ پھر ایک گہری سانس لے کر وہ بولا۔ "اس کا مطلب ہے سلطانہ کے گروہ میں کوئی نہ کوئی تھوڑا بہت پڑھا لکھا آدمی بھی شامل ہے ورنہ اطلاعات اور ریکارڈ سے تو کچھ ایسا ہی لگتا ہے جیسے سلطانہ سمیت وہ سب بالکل ان پڑھ اور جاہل ہیں۔"

"اس کا گروہ اب کافی بڑا ہو چکا ہے، کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اس میں کیسے کیسے لوگ شامل

ہو چکے ہوں لیکن یہ بات طے ہے کہ وہ سب کے سب نوجوان ہیں۔" جاوید ملک بولا۔

"تبھی تو وہ زیادہ نڈر ہیں۔ نوجوانی، عمر ہی ایسی ہے۔" ینگ مسکراتے ہوئے بولا۔ "وہ میری طرح صرف نام کے ینگ نہیں ہیں۔"

ینگ اور جاوید نے باتوں کے دوران قلعے کی تمام تباہ شدہ چیزوں کا جائزہ لیا اور واپس روانہ ہوگئے۔ وہ پولیس ہیڈکوارٹر پہنچے جو اب ینگ کی بھی تمام دفتری سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ اس نے اپنے ان اٹھارہ ساتھیوں اور ماتحتوں کی میٹنگ طلب کی جنہیں اس نے سلطانہ کے گروہ سے نمٹنے کے سلسلے میں جمع کیا تھا۔ ینگ اور جاوید ملک سمیت وہ کل بیس آدمی تھے۔ ان میں سے کسی کو بھی، کسی بھی وقت مراد آباد، بجنور، بریلی، نینی تال اور ترائی کے تمام علاقوں کے علاوہ دلّی تک بھی بھیجا جا سکتا تھا۔ ان تمام علاقوں کی پولیس کے لئے ہدایات جاری کر دی گئی تھیں کہ وہ ان سے تعاون کریں اور بوقت ضرورت انہیں ہر قسم کی مدد فراہم کریں۔ سلطانہ اور اس کے گروہ کے خاتمے کے لئے اس سے پہلے اتنے وسیع پیمانے پر اور اتنے بھرپور انداز میں انتظامات نہیں کئے گئے تھے۔

میٹنگ کے دوران ینگ نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ "ہمیں سب سے پہلا ضروری کام یہ کرنا ہے کہ تمام علاقوں میں کام کے مخبر تلاش کرنے ہیں، مخبروں کے بغیر ہم سلطانہ کو تلاش نہیں کر سکتے اور نہ ہی اس کے گروہ کے گرد گھیرا ڈال سکتے ہیں، یہ مخبر پولیس کے روایتی مخبر نہیں ہونے چاہئیں۔ ہمیں نئے لوگ تلاش کرنے ہیں جن کی ترائی کے جنگلات کے اندر تک رسائی ہو اور ہمیں ایسے مخبروں کی بھی ضرورت ہے جو اردگرد کے سارے شہروں سے بھی خبریں لا سکتے ہوں۔"

ڈی ایس پی جاوید ملک نے یہ سن کر یوں اپنے ساتھی ہندوستانی پولیس افسروں کی طرف دیکھا جیسے ان سے مشورہ کر رہا ہو کہ کیا اس موقع پر اسے حقیقت حال بیان کر دینی چاہیے؟ شاید اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں ساتھی افسروں سے اثبات میں جواب مل گیا۔ اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور معذرت خواہانہ سے لہجے میں ینگ سے مخاطب ہوا۔ "سر! میں نہیں چاہتا کہ آپ اس معاملے میں اندھیرے میں رہیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں بالکل صحیح صورتحال دیانتداری سے آپ کے سامنے بیان کر دوں؟"

"میں صرف اسی معاملے میں نہیں بلکہ ہر معاملے میں یہی چاہوں گا کہ آپ بالکل حقیقی

صورت حال مکمل دیانتداری سے میرے سامنے بیان کردیں۔'' ینگ فوراً بولا۔'' جس کے علم میں جو کچھ بھی ہو، وہ بالکل سچ سچ مجھے بتا دے، سچائی خواہ کتنی بھی تلخ اور کتنی ہی مایوس کن ہو، میں اسے سننے کے لئے ہر وقت تیار رہتا ہوں۔ میرا گہرا مشاہدہ مجھے یہ بتاتا ہے کہ انگریز ہندوستان میں صرف ان معاملات میں ناکام ہوئے ہیں جن میں وہ صورت حال کی حقیقت اور سچائی تک نہیں پہنچ سکے۔ ان معاملات میں وہ حقیقت جاننے کے لئے دوسروں کے محتاج تھے...... اور دوسروں نے کسی مصلحت کے تحت...... یا پھر محض خوشامد کے ذریعے انہیں مطمئن رکھنے کے لئے حقائق سے مکمل طور پر آگاہ نہیں کیا۔ دراصل صورتحال کو انگریزوں سے چھپانے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ انگریزوں کے نادان دوست تھے یا پھر وہ شاید صحیح معنوں میں انگریزوں کے دوست ہی نہیں تھے۔''

''ہم ایسا نہیں کریں گے سر......'' جاوید گویا سب کی ترجمانی کرتے ہوئے بولا۔'' کامیابی یا ناکامی تو بعد کی بات ہے لیکن کم از کم ہم ہر بات دیانتداری سے آپ کو بتاتے ضرور رہیں گے۔''

اس نے ایک لمحے توقف کیا پھر بولا۔'' کم از کم سلطانہ ڈاکو کے معاملے میں مخبری کے محاذ پر ہماری پوزیشن بڑی مایوس کن ہے۔ پولیس کا محکمہ عام طور پر غریب طبقے کے افراد کو اپنا مخبر بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ لوگ پیسے کے لالچ میں یہ کام کرتے ہیں۔ سبزی فروش، دھوبی، نائی، کوچبان، ہوٹلوں کے بیرے...... اور اس طرح کے دوسرے طبقوں کے لوگوں میں ہمارے مخبر پائے جاتے ہیں کیونکہ ان کا ہر طرح کے لوگوں...... اور بہت سے گھروں میں بھی آنا جانا ہوتا ہے۔ کچھ امیر لوگ بھی ہمارے لئے مخبری کرتے ہیں لیکن ان کا مقصد معاوضہ حاصل کرنا نہیں بلکہ پولیس کیساتھ گہرے اور قریبی مراسم رکھنا ہوتا ہے۔ اسی چکر میں وہ پولیس ہی کے ذریعے بعض ایسے لوگوں سے بھی حساب برابر کرنے کی کوشش کرتے ہیں جن سے ان کی کاروباری اور سیاسی رقابت یا پھر کسی اور طرح کی دشمنی ہوتی ہے۔''

''قطع کلامی کی معافی چاہتا ہوں مسٹر جاوید ملک......'' ینگ نے نہایت نرمی اور شائستگی سے کہا۔'' انڈیا کے بارے میں میرا مطالعہ اور مشاہدہ بہت وسیع ہے۔ ایک طویل عرصے تک یہاں رہنے اور نوکری کرنے کے دوران یہ باتیں تو میں بھی جان چکا ہوں۔ تم مجھے کوئی نئی بات بتاؤ۔''

''میں اسی طرف آرہا ہوں سر......'' جاوید ملک نے بھی ملائمت سے کہا۔'' نئی بات یہ ہے کہ سلطانہ ڈاکو کے سلسلے میں ہمیں نئے مخبر تو کیا ملنے تھے، پرانے مخبر بھی کوئی خبر نہیں لا رہے۔ وہ اپنے آپ کو بالکل مجبور اور معذور ظاہر کردیتے ہیں۔ یہی کہتے ہیں کہ سلطانہ کے بارے میں انہیں کہیں سے کوئی خبر مل ہی نہیں رہی۔ ہمارا اندازہ یہی ہے کہ وہ جھوٹ بول رہے ہوتے ہیں لیکن ہم انہیں مار پیٹ کر بھی ان سے سچ نہیں اگلوا سکتے۔ اس طرح ہمیں ہر طبقے میں ہی مخبر ملنے بند ہو جائیں گے۔ نئے مخبر تلاش کرنے کی کوشش ہم پہلے کر چکے ہیں اور اس میں ہمیں ناکامی ہوئی ہے۔ سلطانہ کا نام سنتے ہی غریب طبقے کے لوگ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر سلطانہ کو ذرا سا شبہ بھی ہوگیا کہ فلاں نے اس کی مخبری کی تھی تو وہ...... یا اس کے ساتھی اس کے پورے خاندان کو ختم کردیں گے۔''

''میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ جھوٹ بول رہے ہوتے ہیں۔'' ینگ بولا۔

''جی ہاں...... ہمیں معلوم ہے۔'' جاوید ملک نے بلاتامل اعتراف کیا۔'' درحقیقت اس کے دلوں میں سلطانہ کے لئے ہمدردی ہوتی ہے۔ کسی غریب کو خواہ سلطانہ سے کوئی فائدہ پہنچا ہو یا نہیں پہنچا ہو، لیکن وہ اس کے لئے ہمدردانہ جذبات رکھتا ہے۔ البتہ امیر طبقہ جب سلطانہ کا نام سن کر کانوں کو ہاتھ لگاتا ہے تو اس کی وجہ واقعی یہی ہوتی ہے کہ وہ لوگ سلطانہ سے بہت زیادہ خوفزدہ رہتے ہیں، چاہے انہیں اس سے واسطہ پڑا ہو یا نہ پڑا ہو۔''

''اس کا مطلب ہے ہمیں سلطانہ اور اس کے گروہ تک کسی قسم کی مخبری کے بغیر ہی پہنچنا پڑے گا؟'' ینگ نے باری باری سب پولیس والوں کی طرف دیکھا۔

اس بار بھی ترجمانی کے فرائض جاوید ملک نے ہی انجام دیئے۔ وہ بولا۔'' نہیں سر...... ایسی بھی بات نہیں ہے۔ گو کہ اب تک سلطانہ کے سلسلے میں پولیس کی ناکامی کی بڑی وجہ یہی ہے کہ اس کے بارے میں اس کے آنے سے پہلے کوئی خبر ملتی ہے اور نہ ہی اس کے جانے کے بعد...... وہ آندھی، طوفان یا بگولے کی طرح اچانک نمودار ہو کر اپنا کام کر کے اس طرح غائب ہو جاتا ہے جیسے اس کا کہیں کوئی وجود ہی نہیں تھا...... لیکن بہرحال...... اب ایسا بھی نہیں ہے کہ ہمیں سلطانہ کے بارے میں بھی کوئی خبر ہی نہیں ملتی۔ جتنے اور جیسے بھی مخبر ہمیں میسر ہیں ہم انہی کی مدد سے اپنا کام کرنے کی کوشش کریں گے اور میں کامیابی کے بارے میں کافی پرامید ہوں کیونکہ اس سے پہلے پورے خلوص نیت، سنجیدگی اور جذبے کے ساتھ اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش ہی نہیں

کی گئی۔اب ہم ایک خصوصی ٹیم کی صورت میں جمع ہوئے ہیں تو ہمارے دلوں میں یہ تینوں چیزیں موجود ہیں اور پولیس ڈیپارٹمنٹ بھی ہماری مدد کے لئے ہر قدم اٹھانے کو تیار ہے۔اس لئے مجھے امید ہے کہ ہم ضرور کامیاب ہوں گے۔"

"مسٹر ملک...... میں تمہارا شکر گزار ہوں کہ تم نے اپنے الفاظ سے میرے دل میں امید کی شمع روشن کی ہے۔" ینگ مسکراتے ہوئے بولا۔"بعض اوقات کسی بڑے مسئلے سے نپٹنے کے لئے انسان کا اپنا عزم کافی نہیں ہوتا، اسے اس قسم کے سہاروں کی ضرورت ہوتی ہے۔"

ان پولیس آفیسرز کی میٹنگ اس کے بعد بھی کئی گھنٹے تک جاری رہی۔انہوں نے سلطانہ اور اس کے گروہ کی کارروائیوں کے پورے ریکارڈ پر تبادلۂ خیال کیا۔ریکارڈ سے قطع نظر، ان کے پاس اس سلسلے میں جو بھی معلومات موجود تھیں انہوں نے ایک دوسرے سے اس کا بھی تبادلہ کیا۔اسی دوران کھانا بھی کھایا گیا۔سہ پہر کے بعد جب گفت وشنید کا یہ سلسلہ ختم ہوا تو ینگ بے حد مطمئن تھا۔اس نے محسوس کیا کہ میٹنگ بے حد مفید رہی تھی۔

شام کو جب وہ اپنے سرکاری بنگلے پر پہنچا تو اس نے گیٹ تک پہنچنے سے پہلے ایک اور کار دوسری طرف سے آتی دیکھی۔وہ کھلے گیٹ سے اس کے بنگلے کے ڈرائیو وے میں داخل ہوگئی۔اس نے دیکھ لیا کہ گاڑی الزبتھ چلا رہی تھی اور وہ اکیلی ہی تھی۔اسے حیرت ہوئی کہ الزبتھ اکیلی مراد آباد سے نجیب آباد کیسے چلی آئی تھی اور اس کے گھر کیسے پہنچ گئی تھی؟ اس کی قیام گاہ کا تو ابھی صرف دو چار لوگوں کو ہی پتا تھا۔اسے یہاں آنے کی ضرورت بھی نہ جانے کیوں پیش آ گئی تھی؟

انہی سوالوں میں الجھا ہوا وہ بھی اندر پہنچا اور اس نے اپنی گاڑی الزبتھ کی گاڑی کے پیچھے ڈرائیو وے میں روک دی۔الزبتھ اس وقت گاڑی سے اتر رہی تھی۔وہ شکاریوں جیسی خاکی پتلون، ساٹن کی سی شرٹ اور لمبے بوٹوں میں تھی، سر پر سیاہ رنگ کا اسکارف رومال کی طرح بندھا ہوا تھا۔ینگ کو وہ اس وقت اس سے بھی زیادہ خوبصورت، پرکشش اور تروتازہ دکھائی دی جتنی پہلی ملاقات میں نظر آئی تھی۔

وہ اس کی گاڑی کی طرف گھوم گئی تھی۔اسے گاڑی سے اترتے دیکھ کر وہ اس کے قریب آ گئی۔اس کی چال میں وہی شاخ گل کی سی لچک اور اپسراؤں کی سی فتنہ خیزی تھی۔مصافحے کیلئے اپنا نرم و نازک ہاتھ بڑھاتے ہوئے وہ بولی۔"آپ بڑے اچھے وقت پر آئے مسٹر ینگ! ورنہ مجھے آپ کا انتظار کرنا پڑتا......اور انتظار کرنا بڑا مشکل کام ہے۔"

"خوش آمدید......" ینگ نے اس کا پھول سا ہاتھ تھامتے ہوئے متانت سے کہا۔"لیکن میں حیران ضرور ہوں کہ آپ مراد آباد سے اکیلی یہاں کیسے آ گئیں اور میرے گھر کیسے پہنچ گئیں؟ ابھی تو میرے گھر کا یہاں صحیح طور پر کسی کو پتا بھی نہیں ہے؟"

وہ اپنے مخصوص دلکش انداز میں دھیرے سے ہنس دی۔"نجیب آباد جیسے شہر میں ایک انگریز ڈی ایس پی کا سرکاری بنگلہ ڈھونڈنا کون سا مشکل کام ہے؟ اور ڈی ایس پی بھی وہ......جو سلطانہ ڈاکو اور اس کے گروہ کا خاتمہ کرنے کے لئے ایک خصوصی پولیس پارٹی کا سربراہ بن کر آیا ہو؟"

"کیا آپ نے یہی کہہ کر میرا ایڈریس تلاش کیا ہے؟" ینگ نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"ارے نہیں بھئی......اب میں اتنی بے وقوف بھی نہیں ہوں۔" وہ ایک بار پھر ہنس دی۔

"اس سڑک کے موڑ تک ایک کانسٹیبل جیپ میں میرے آگے آگے آیا تھا۔وہ ذرا دور سے آپ کا بنگلہ مجھے دکھا کر واپس روانہ ہوگیا اور میں نجیب آباد اکیلی نہیں آئی، ڈیڈی کے ساتھ آئی تھی۔وہ سرکاری گاڑی میں واپس مراد آباد چلے گئے ہیں۔"

"ارے!" ینگ چونکا۔"آئی جی صاحب آئے تھے اور چلے بھی گئے؟ مجھے پتا بھی نہیں چلا......وہ پولیس ہیڈ کوارٹر بھی نہیں آئے......!"

"یہ ان کا سرکاری دورہ نہیں تھا۔اب یہاں جو کچھ بھی ہوگا، سرکاری طور پر تو آپ ہی اس کو دیکھیں گے۔" الزبتھ بھی سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔"انہیں نجیب آباد کے قلعے پر حملے کی خبر ملی تو وہ ویسے ہی ذاتی دلچسپی کے تحت وہاں کا جائزہ لینے آ گئے تھے۔میں بھی اس دوران انہی کے ساتھ تھی۔انہیں جب پتا چلا کہ آپ باضابطہ طور پر قلعے کا معائنہ کر کے جا چکے ہیں تو وہ مطمئن ہوگئے۔جب وہ واپس جانے لگے تو میں نے ان کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔میں نے ان سے کہہ دیا کہ میں ایک دو دن بعد آ جاؤں گی۔مراد آباد حالانکہ نجیب آباد سے بڑا شہر ہے لیکن میں وہاں بور ہوتی ہوں، وہاں زیادہ تنہائی محسوس ہوتی ہے۔انگریزوں یا ہندوستانیوں میں سے کسی سے بھی میری دوستی نہیں۔"

"یہ لڑکی ایک یا دو دن نجیب آباد میں ہی رہے گی؟" ینگ نے حیرت سے دل ہی دل میں سوچا" مگر کہاں......؟ کیا میرے گھر میں......؟"

اسے یہ سوالات خاصے پریشان کن محسوس ہو رہے تھے اور وہ ان میں الجھا ہوا تھا جبکہ

الزبتھ نہایت اطمینان اور بےفکری سے اپنی بات جاری رکھے ہوئے تھی۔ ''کسی سے بات کرنے میں مزا نہیں آتا۔ مطالعے کے سوا کسی کام میں دل نہیں لگتا۔ آپ سے ملاقات ہونے سے پہلے میں سوچ رہی تھی کہ ایک بار پھر کچھ عرصہ انگلینڈ میں گزار آؤں۔''

اس دوران ینگ کا ہندوستانی ملازم باہر آ گیا تھا اور برآمدے میں کھڑا منتظر نظروں سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ینگ نے الزبتھ کو اندر چلنے کا اشارہ کیا۔ ڈرائنگ روم میں پہنچ کر الزبتھ نے جوتے اتار کر ایک طرف رکھے اور صوفے پر پاؤں اوپر رکھ کر آلتی پالتی مار کر یوں اطمینان اور بےتکلفی سے بیٹھ گئی جیسے وہ اس کا اپنا ہی گھر ہو۔

''کیا میں آپ کے لئے کھانا تیار کراؤں؟'' ینگ نے پوچھا۔

''کھانا میں ڈیڈی کے ساتھ یہاں کے جمخانہ کلب میں کھا چکی ہوں بس چائے پلوا دیں ...... یہ وقت تو کوئی ہلکی پھلکی ڈرنک لینے کا بھی نہیں۔'' وہ دلکشی سے مسکراتے ہوئے بولی۔ اس نے اپنا اسکارف اتار کر ایک طرف رکھ دیا اور اپنے ریشمی سنہرے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔

ینگ نے اپنے ملازم کو چائے لانے کا حکم دیا۔ چائے کے دوران ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ الزبتھ نے قلعے کے معائنے کے دوران جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا تھا وہ بتاتی رہی۔ چائے پی چکنے کے کئی منٹ بعد وہ باتوں کے دوران چونکتے ہوئے بولی۔ ''مسٹر ینگ! آپ کچھ زیادہ مہمان نواز نہیں ہیں۔ آپ نے مجھے اپنا گھر دیکھنے کی دعوت ہی نہیں دی؟''

''اوہ......'' ینگ معذرت خواہانہ انداز میں مسکرایا۔ ''اس طرف تو میرا ذہن گیا ہی نہیں تھا۔ دراصل یہ میرا گھر ہے بھی نہیں ...... یہ سرکاری قیام گاہیں تو مجھ جیسے لوگوں کے لئے سرائے کی طرح ہوتی ہیں۔ آج ہم کسی سرائے میں ہوتے ہیں کل کسی اور سرائے میں...... اور یہاں تو آئے ہوئے مجھے ویسے ہی صرف دو دن ہوئے ہیں۔ ابھی تو میرا پورا سامان بھی یہاں نہیں پہنچا۔''

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' الزبتھ بےپروائی سے بولی۔ ''آپ جہاں رہ رہے ہوں، بس وہی آپ کا گھر ہے۔ مجھے اپنا گھر دکھائیے نا......'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور اس نے ینگ کو بھی گویا اس کی نشست سے اٹھانے کے لئے اس کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ ینگ کو اس کا ہاتھ تھامنا پڑا۔ گو کہ وہ دل ہی دل میں کچھ ہچکچاہٹ محسوس کر رہا تھا۔

الزبتھ نے اس کا ہاتھ تھاما تو پھر چھوڑا نہیں۔ وہ اس کے ساتھ پورے گھر کا جائزہ لینے لگی۔ بنگلا زیادہ بڑا نہیں تھا لیکن اس میں کھلی جگہ خاصی تھی جس میں لان اور چند درخت بھی تھے۔ بیڈ روم صرف دو ہی تھے۔ ایک بیڈ روم میں تمام فرنیچر کے اوپر بہت سی کتابیں بےترتیبی سے رکھی ہوئی تھیں۔ ہر طرف کتابوں کے چھوٹے چھوٹے انبار نظر آ رہے تھے۔

''ارے...... ایک پولیس آفیسر کے پاس اتنی کتابیں......!'' الزبتھ نے حیرت اور بےیقینی سے کہا۔ شاید اسی حیرت کے باعث اس کے ہاتھ سے ینگ کا ہاتھ چھوٹ گیا۔ وہ کتابوں کے قریب جا جا کر جھک کر ان کے پشتے دیکھنے لگی۔

''زیادہ تر کتابیں انڈیا کے بارے میں ہیں۔'' چند لمحوں بعد الزبتھ نے تبصرہ کیا۔

''ہاں...... کیونکہ میری زندگی کا ایک بڑا حصہ یہاں گزر رہا ہے۔ مجھے اکثر یہ خیال آتا رہتا ہے کہ مجھے انڈیا کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننا چاہئے۔'' ینگ بولا۔

''ایک بڑے پولیس آفیسر کی بیٹی ہونے کی وجہ سے مجھے اکثر پولیس آفیسرز سے ملاقات کا اتفاق ہوتا رہتا ہے لیکن میں نے ان میں سے اِکا دُکا ہی کو مطالعے کا شوقین دیکھا ہے۔ وہ اگر اس دن کا اخبار ہی پڑھ لیتے ہیں تو سمجھتے ہیں، انہوں نے بہت مطالعہ کر لیا۔'' الزبتھ نے اپنی رائے بیان کی۔

''ہر شعبے میں ہر طرح کے لوگ موجود ہوتے ہیں ...... البتہ ہر جگہ ان کا تناسب مختلف ہو سکتا ہے۔'' ینگ نے محتاط سے لہجے میں کہا۔

''لیکن بعض لوگ اپنے شعبے میں نہ جانے کیوں کچھ عجیب سے لگتے ہیں۔'' الزبتھ بغور اس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر بولی۔ ''انہیں دیکھ کر احساس ہوتا ہے جیسے انہیں کہیں اور ہونا چاہیے تھا۔''

ینگ نے اس کے جواب میں صرف مسکرانے پر اکتفا کیا۔ وہ ڈرائنگ روم میں واپس آ گئے۔ بڑے سے کمرے کے ایک گوشے میں اونچے اسٹول پر بھونپو نما بڑے سے اسپیکر والا گراموفون رکھا ہوا تھا جس کے قریب توے جیسے بڑے بڑے سیاہ ریکارڈ بھی رکھے ہوئے تھے۔ الزبتھ نے ایک ایک ریکارڈ اٹھا کر ان کا جائزہ لیا پھر ایک ریکارڈ گراموفون میں لگا دیا۔ اس نے خود ہی لوہے کے ایک ہینڈل نما آلے سے گراموفون میں چابی بھری اور چند لمحے بعد کمرے میں والز کی دھن بکھرنے لگی۔

الزبتھ چند لمحے اپنی جگہ کھڑے کھڑے نہایت آہستگی سے تھرکتی اور زیرلب کچھ گنگناتی رہی۔ پھر اچانک ینگ کی طرف دیکھ کر دونوں بازو پھیلاتے ہوئے بولی۔ ”آیئے نا مسٹر ینگ ......تھوڑا سا ڈانس کرتے ہیں۔“

ینگ کا اس وقت ڈانس کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا اور وہ الزبتھ کی موجودگی کی وجہ سے خود کو کچھ مضطرب بھی محسوس کر رہا تھا لیکن اس کی چھوٹی چھوٹی فرمائشوں کو رد کرنا بھی اسے اچھا محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ وہ ہونٹوں پر ایک مصنوعی مسکراہٹ سجائے اٹھا اور اس کا ایک ہاتھ تھام کر ایک بازو اس کی کمر میں حمائل کر کے والز کی دھن پر کمرے میں ہلکورے لینے لگا۔ اس قربت میں اسے احساس ہوا کہ الزبتھ کے وجود کی حدت کہیں اس کے جذبوں کی دنیا میں پھیلے ہوئے برف زار کو پگھلا نہ دے۔

ریکارڈ ختم ہوا تو الزبتھ نے اسے پلٹ دیا اور ایک بار پھر موسیقی کی لہریں ابھرنے لگیں۔ رقص کا دوسرا راؤنڈ شروع ہو گیا۔ ینگ کا اعصابی تناؤ اور اضطراب دھیرے دھیرے کم ہو رہا تھا لیکن اس کے ذہن میں ایک کشمکش سی اب بھی جاری تھی۔ شاید اس کشمکش ہی کی وجہ سے آخر کار وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔ ”مس......کیا آج رات آپ یہیں قیام کریں گی؟“

”ظاہر ہے...... اور کیا میں باہر سڑک پر جا کر سوؤں گی؟“ الزبتھ حیرت سے آنکھیں پھیلاتے ہوئے بولی۔ اسے گویا ینگ سے اس قسم کے فضول سوال کی توقع نہیں تھی۔ کم از کم اس کے انداز سے یہی ظاہر ہو رہا تھا جیسے اس کی نظر میں یہ سوال انتہائی احمقانہ تھا۔

پھر جیسے کوئی بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ”میرے خیال میں آپ بہت زیادہ عرصہ انڈیا میں گزارنے اور انڈیا میں گہری دلچسپی رکھنے کی وجہ سے خود بھی تقریباً انڈین ہی ہو گئے تھے۔ آپ بھول ہی گئے ہیں کہ آپ انگریز ہیں۔ انگریزوں کے رسوم و رواج بھی شاید آپ بھولتے جا رہے ہیں۔ آپ کو یہ بات بہت عجیب لگ رہی ہو گی کہ آپ گھر میں اکیلے ہیں اور ایک جوان لڑکی کم از کم ایک رات کے لئے آپ کے گھر میں مہمان رہنے کے لئے آ گئی ہے۔“ اس کے ہونٹوں پر ایک شریری مسکراہٹ کھیلنے لگی تھی اور وہ گویا ینگ کی کیفیت سے محظوظ ہو رہی تھی۔

”نہیں......نہیں......ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔“ ینگ ذرا گڑبڑا کر بولا۔ اس کے انداز سے معمولی سی کھسیاہٹ بھی جھلک رہی تھی۔ پھر وہ شاید کچھ سنبھل کر گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”وہ

......دراصل آپ میرے بگ باس کی بیٹی ہیں......ایسی صورت حال میں انسان کو فکر سی لاحق ہو جاتی ہے کہ کوئی بات ان کے مزاج پر گراں نہ گزر جائے......انہیں بری نہ لگ جائے۔“

”اس کی فکر آپ کو نہیں مجھے ہونی چاہیے۔“ الزبتھ کے آتشیں سے ہونٹوں پر دلفریب مسکراہٹ لوٹ آئی۔

تب ینگ نے واقعی فکر اور تشویش کو ذہن سے جھٹک دیا۔ وہ الزبتھ کی قربت اور اس کے ساتھ رقص سے لطف اندوز ہونے لگا۔

رات کے سائے گہرے ہونے تک وہ رقص سے تھک چکے تھے۔ الزبتھ بڑی سی ایک آرام کرسی پر نیم دراز ہو گئی۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا اور وہ کچھ تیز تیز سانس لے رہی تھی جس کی وجہ سے اس کے خدوخال کی قیامت خیزی کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ وہ گہری نظروں سے ینگ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ینگ نے نظر چرا لی۔

چند لمحے کمرے میں عجیب سا سکوت طاری رہا۔ پھر الزبتھ کی پرسکون آواز ابھری۔

”کھانے کے بارے میں کیا سوچا ہے؟“

”جمخانہ کلب چلتے ہیں۔“ ینگ بولا۔ ”ویسے تو میرا خانساماں ہندوستانی اور انگریزی دونوں طرح کے کھانے بنا لیتا ہے لیکن ابھی میں نے اسے پوری طرح آزمایا نہیں ہے۔ میں بے نیاز آدمی ہوں۔ ہر طرح کے حالات میں گزارا کر لیتا ہوں اور ہر طرح کا کھانا کھا لیتا ہوں لیکن تمہیں شاید اس کا بنایا ہوا کھانا پسند نہ آئے۔“

”جمخانہ والی تجویز بالکل ٹھیک ہے۔“ الزبتھ ایک بار پھر جوش سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”بس میں ذرا فریش ہو لوں۔“

وہ واش روم چلی گئی۔ واپس آئی تو پہلے سے زیادہ تروتازہ لگ رہی تھی۔ وہ گاڑی میں جمخانہ کلب کی طرف روانہ ہوئے تو انہیں نجیب آباد کے بڑے بازار سے گزرنا پڑا۔ ینگ یہ دیکھ کر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا کہ رات ہو جانے کے باوجود بڑے بازار میں اتنا رش تھا کہ گاڑی کا گزرنا محال تھا۔ خریداروں اور دکانداروں کے علاوہ گھوم پھر کر چیزیں بیچنے والے بھی بے حساب نظر آ رہے تھے۔ شاید آس پاس کے چھوٹے موٹے دیہات اور بستیوں کے لوگ بھی خریداری کے لئے وہیں آتے تھے۔ ہر طرف ایک شور سا برپا تھا۔

ینگ کی گاڑی کی کھڑکیاں بڑی بڑی تھیں اور ان میں شیشے نہیں تھے۔ چیزیں بیچنے والوں

نے ہجوم کے درمیان رینگتی ہوئی کار میں ایک گورے صاحب اور ایک میم صاحب کو دیکھا تو انہیں موٹی اسامی سمجھتے ہوئے ان کے گرد جمع ہوگئے۔ گاڑی کا آگے بڑھنا ناممکن ہوگیا۔ چیزیں بیچنے والے دونوں طرف سے کھڑکیوں کے راستے ہاتھ اندر کر کے اپنی چیزیں ینگ اور الزبتھ کی خدمت میں پیش کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کوئی اپنی بری طرح کڑکڑاتی مرغی الزبتھ کی گود میں ڈال رہا تھا اور چیخ چیخ کر اس کی خوبیاں بتا رہا تھا۔ کوئی تربوز کا کٹا ہوا ٹکڑا ینگ کے منہ سے لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ کوئی گرم گرم بھٹا ینگ کو چکھانے کے لئے کوشاں تھا۔ کوئی عورت اپنے ہاتھ کی کڑھائی والی قمیض وہیں الزبتھ کو پہنانے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہی تھی۔ وہ سب اپنی اپنی بولیاں بول رہے تھے۔ گاڑی کے چاروں طرف ایک شور برپا تھا۔ ینگ اور الزبتھ تمام ہاتھوں کو گاڑی سے باہر دھکیلنے کی کوشش کر رہے تھے اور نرمی سے انگریزی اردو میں معذرت کر رہے تھے کہ انہیں اس وقت کسی چیز کی ضرورت نہیں تھی۔

گشت پر موجود سپاہیوں نے یہ منظر دیکھا تو دوڑ کر آئے۔ ینگ اس وقت وردی میں تھا اس لئے وہ کچھ بوکھلا گئے۔ انہوں نے تیزی سے اسے سلیوٹ کیا پھر اپنے اپنے موٹے بید کی مدد سے ہجوم کو پیچھے ہٹاتے ہوئے ان کی گاڑی کے لئے راستہ بنانے کی کوشش کرنے لگے۔ جلد ہی راستہ صاف ہوگیا اور ینگ نے کانسٹیبلوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے گاڑی آگے بڑھا دی۔

''اوہ میرے خدا......!'' الزبتھ گہری سانس لے کر بولی۔ ''انڈیا واقعی عجیب ملک ہے۔''

''عجیب بھی اور دلچسپ بھی۔'' ینگ مسکرا دیا۔

''کبھی کبھی تمہیں اس قسم کی صورت حال میں گھبراہٹ نہیں ہوتی جس سے ہم گزر کر آ رہے ہیں؟'' الزبتھ نے پیچھے بازار کی طرف اشارہ کیا۔

''نہیں......'' ینگ نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں بس یہ سوچتا ہوں تو میری ساری گھبراہٹ اور ناگواری دور ہو جاتی ہے کہ یہ کیسے سیدھے سادے، معصوم اور بے ضرر لوگ ہیں۔''

''اور انہی سیدھے سادے، معصوم اور بے ضرر لوگوں کے درمیان سے سلطانہ ڈاکو جیسے لوگ بھی جنم لیتے ہیں۔'' الزبتھ مسکرائی۔

''اس کی کوئی نہ کوئی وجہ ہوتی ہے۔'' ینگ بولا۔

''تم صرف وجہ نہ تلاش کرتے رہنا...... سلطانہ ڈاکو کو بھی تلاش کرنا۔'' الزبتھ ایک بار پھر شریر سے انداز میں مسکرائی۔ ''ڈیڈی نے تمہیں وجہ نہیں، سلطانہ کو تلاش کرنے کی ذمے داری

سونپی ہے۔''

''وجہ تلاش کرنے کی مجھے ضرورت نہیں...... وہ مجھے معلوم ہو چکی ہے...... بلکہ کوئی ایک وجہ نہیں، بہت سی وجوہ ہوتی ہیں جن کے باعث عام، سیدھے سادے اور معصوم سے لوگ سلطانہ ڈاکو بن جاتے ہیں۔'' ینگ بولا۔

اس دوران وہ بازار کے اختتام تک پہنچ چکے تھے جہاں کوئی خاص رونق نہیں تھی لیکن اس سے ذرا آگے ایک کھلی جگہ میں تھوڑے سے لوگ جمع تھے۔ سیٹی جیسی ایک مخصوص آواز، ڈھولک کی تھاپ اور کچھ دیگر نشانیوں کی مدد سے ینگ نے اندازہ لگا لیا کہ وہاں پتلیوں کا تماشا ہو رہا تھا۔ دور سے ہی یہ دیکھ کر ینگ بچوں کی طرح خوش ہوگیا۔

''پتلیوں کا تماشا ہو رہا ہے۔'' اس نے مسرت بھرے لہجے میں الزبتھ کو مطلع کیا۔

''آؤ...... ذرا دیکھتے ہیں۔''

اس نے گاڑی ایک طرف روک دی۔ الزبتھ نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ ینگ گاڑی سے اترتے ہوئے اسے بتانے لگا۔ ''پتلیوں کا تماشا بھی انڈیا کی نہایت دلچسپ چیزوں میں سے ایک ہے۔'' یوں سمجھو یہ بھی تھیٹر یا اوپیرا کی ایک غریبانہ شکل ہے۔ اس میں پتلیوں کی حرکات و سکنات اور رقص کے ذریعے چھوٹی چھوٹی کہانیاں بیان کی جاتی ہیں۔ محبت کی کہانیاں...... لوگ داستانیں...... ڈراؤنی کہانیاں...... سماجی طنز...... نہ جانے کیا کچھ یہ لوگ اپنے پتلی تماشے میں سمو دیتے ہیں۔ یہ سیدھے سادے، اَن پڑھ فنکار...... جو یہ فن کسی یونیورسٹی یا اکیڈمی سے نہیں اپنے باپ دادا سے سیکھ کر آتے ہیں۔''

''مجھے یہ سب کچھ مت بتاؤ۔ میں جانتی ہوں۔'' الزبتھ مسکراتے ہوئے بولی۔ ''تم شاید بھول گئے ہو کہ میں انڈیا میں نئی نہیں ہوں۔''

اس دوران وہ لوگ اس جگہ پہنچ چکے تھے جہاں تھوڑے سے تماشائی جمع تھے۔ لوگوں نے ایک گورے صاحب اور ''میم'' کو دیکھ کر راستہ چھوڑ دیا اور وہ اس جگہ کے عین قریب جا کھڑے ہوئے جہاں چارپائیاں کھڑی کر کے ان پر چادریں ڈال کر ایک چھوٹا کمرا سا بنا لیا گیا تھا جس کا اگلا حصہ کھلا تھا۔ یہ ایک طرح کا اسٹیج تھا جس پر پُتلیاں اپنا ڈراما پیش کر رہی تھیں۔ ان کی ڈوریاں ہلانے والے پچھلی چارپائی کی اوٹ میں ہوتے تھے، وہ نظر نہیں آتے تھے۔ سیٹی اور ڈھول بجانے والے، مختلف آوازیں نکالنے اور مکالمے بولنے والے بھی وہیں ہوتے تھے۔ اس

طرف اندھیرا تھا جبکہ اسٹیج پر لالٹینوں کی روشنی تھی۔ اس وقت پتلیوں کے ذریعے لیلیٰ مجنوں کی داستان کا کوئی حصہ پیش کیا جا رہا تھا۔

ینگ نے محسوس کیا کہ اس کے پہنچنے کے بعد دھیرے دھیرے وہ جوش وخروش کچھ ٹھنڈا پڑنے لگا تھا جو کھیل تماشے کی اس فضا میں پہلے موجود تھا۔ اسے گماں گزرا کہ شاید اس کی اور الزبتھ کی آمد نے ماحول پر کچھ اثر ڈالا تھا۔ صرف تماشائی ہی نہیں بلکہ تماشا پیش کرنے والے بھی شاید کچھ محتاط اور مؤدب سے ہو گئے تھے لیکن چند لمحے بعد اس کی یہ غلط فہمی یا شاید خوش فہمی دور ہو گئی۔

لیلیٰ مجنوں 'سٹیج' سے غائب ہو گئے۔ اس کی جگہ ایک اور کردار اسٹیج پر اتارا گیا۔ یہ ایک ایسا پتلا تھا جو پولیس کی وردی میں تھا اس کے سر پر ہیٹ بھی موجود تھا۔ ینگ ابھی صحیح طور پر اسے دیکھ بھی نہیں پایا تھا کہ الزبتھ نے معنی خیز سے انداز میں اس کا ہاتھ دبایا۔ ینگ نے اس کی طرف دیکھا تو الزبتھ نے سر کے اشارے سے اس کی توجہ پتلے کی طرف دلائی۔ اب ینگ نے ذرا غور سے دیکھا تو اسے احساس ہوا کہ اس میں اس کی اپنی مشابہت موجود تھی۔ درحقیقت وہ اس کا اپنا ہی پتلا تھا جو بندوق ہاتھوں میں لئے اِدھر اُدھر کچھ ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔ کبھی وہ کوئی کھٹکا سن کر اور کبھی شیر کی گرج سن کر مضحکہ خیز انداز میں اُچھل پڑتا۔ وہ ڈی ایس پی فریڈی ینگ تھا۔

پھر ایک اور کردار اسٹیج پر اتارا گیا۔ یہ کسی دراز قد، گبھرو جوان کا پتلا تھا جس کی موٹی موٹی مونچھیں تھیں اور سر پر ایک خوبصورت پگڑی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں ایک لاٹھی تھی۔ اس نے آتے ہی ایک لاٹھی 'ینگ' کے سر پر رسید کی۔ اس کا ہیٹ اتر کر دور جا گرا اور بندوق اس کے ہاتھوں سے گر گئی۔ وہ چکرا کر اِدھر اُدھر جھولنے لگا۔ جوان نے لاٹھی سے اس کے جسم کے مختلف حصوں پر چار چھ وار کئے۔ ہر وار پر وہ مضحکہ خیز انداز میں اُچھلتا اور لڑکھڑاتا رہا۔ اس دوران ینگ کی سمجھ میں آ گیا کہ پتلا سلطانہ ڈاکو کا تھا۔

ڈی ایس پی ینگ کا پتلا سلطانہ ڈاکو کے پتلے سے لاٹھیاں کھا رہا تھا اور ہاتھ جوڑ جوڑ کر معافیاں مانگ رہا تھا۔ آخر کار وہ اوندھے منہ گرا اور ساکت ہو گیا۔ تماشائی قہقہے لگا رہے تھے، تالیاں بجا رہے تھے اور کن انکھیوں سے اصل فریڈی ینگ کی طرف دیکھ بھی رہے تھے یعنی وہ اچھی طرح سمجھ رہے تھے کہ جو تمثیل ان کے سامنے پیش کی گئی تھی اس کا کم از کم ایک کردار حقیقی اور جیتے جاگتے روپ میں ان کے قریب ہی موجود تھا اور پتلی کا تماشا پیش کرنے والوں نے بھی یقیناً

اسے دیکھنے کے بعد ہی اپنے تماشے کا یہ حصہ وقت سے پہلے ہی پیش کر دیا تھا تاکہ وہ خود بھی دیکھ سکے۔ تماشا پیش کرنے والوں کو شاید اندیشہ تھا کہ ان کے اس آئٹم کی باری آنے سے پہلے ہی اصل ڈی ایس پی ینگ کہیں رخصت نہ ہو جائے۔

الزبتھ نے مسکراتے ہوئے ینگ کی طرف دیکھا۔ ینگ تحمل مزاجی سے سر ہلا کر رہ گیا۔ اس کی جگہ کوئی اور آفیسر ہوتا تو خجالت سے اس کا نہ جانے کیا حال ہوتا اور نہ جانے وہ کیا قدم اٹھاتا لیکن ینگ بالکل پُرسکون تھا۔ اندر ہی اندر وہ سخت حیرت زدہ ضرور تھا۔ وہ ان سیدھے سادے اور اَن پڑھ ہنرمندوں کی حس مزاح اور پھر ان لوگوں کے درمیان خبر پھیلنے کی رفتار پر حیران تھا۔ اسے یہاں آئے ابھی صرف دو ہی دن ہوئے تھے اور یہ خبر صرف یہاں کے شہریوں میں ہی نہیں پھیلی تھی بلکہ پتلی تماشا پیش کرنے والوں تک بھی پہنچ گئی تھی کہ اس طرح کے ایک انگریز ڈی ایس پی کو یہاں سلطانہ ڈاکو اور اس کے گروہ کا قلع قمع کرنے کے لئے بھیجا گیا تھا۔ صرف یہ خبر ہی ان تک نہیں پہنچی تھی بلکہ انہوں نے اس کا اور سلطانہ ڈاکو کا پتلا بھی تیار کر لیا تھا۔ ان دونوں کرداروں پر انہوں نے آئٹم بھی تیار کر لیا تھا اور اسے سڑکوں پر بھی لے آئے تھے۔ لوگ اس سے محظوظ بھی ہو رہے تھے۔ یہ سب کچھ واقعی فریڈی ینگ کے لئے بے پناہ حیرت کا باعث تھا۔

وہ پتلی والوں کو نہیں دیکھ پا رہا تھا لیکن اسے معلوم تھا کہ پتلی والے اسے ضرور دیکھ رہے ہوں گے۔ انہوں نے جب کوئی دوسری تمثیل شروع کی تو ینگ نے الزبتھ کا ہاتھ پکڑا اور وہ دونوں اس ہجوم سے نکل آئے۔ گاڑی میں بیٹھتے وقت الزبتھ بولی۔ ''اب تم ہندوستان کے سیدھے سادے، معصوم اور بے ضرر لوگوں کے بارے میں کیا کہو گے؟'' اس کا لہجہ قدرے طنزیہ تھا۔

''میں اب بھی انہیں سیدھے سادے، معصوم اور بے ضرر ہی کہوں گا۔'' ینگ اپنے موقف پر قائم تھا۔ ''یہ تو ان کے جذبات کا اظہار ہے نا...... جذبات کے اظہار کا حق تو بہرحال سب کو حاصل ہے...... اور میں نے انہیں کوڑھ مغز تو نہیں کہا تھا۔ ذہانت بہرحال ان میں موجود ہے...... اور وہ ضائع ہو رہی ہے۔''

الزبتھ اسے چھیڑنے کے سے انداز میں مسکراتے ہوئے بولی۔ ''تم ہندوستان اور ہندوستانیوں کی تعریف ہی کرتے رہو گے، خواہ وہ شارع عام پر تمہارا مذاق اُڑاتے رہیں۔''

''میں اس بات کے حق میں ہوں کہ ہر ایک کو اس کے جذبات کا اظہار کا حق حاصل ہونا

چاہیے، اگر ان کے جذبات یہ ہیں تو ٹھیک ہے...... انہیں اپنے دل کا غبار نکالنے دو۔ یہ ایک طرح سے ان کے دلوں میں چھپی ہوئی خواہشوں کی عکاسی بھی ہے۔ ابھی میں سلطانہ کے ہاتھوں مرا نہیں ہوں لیکن شاید وہ چاہتے یہی ہیں کہ میں اس کے ہاتھوں مارا جاؤں۔ پتلی والوں نے اپنی اس خواہش کو پتلیوں کے ذریعے پورا ہوتے دکھا دیا اور تماشائیوں نے خوب تالیاں بجا بجا کر اور قہقہے لگا کر انہیں داد دی۔ اس کا مطلب ہے یہ ان کے دل کی بھی آواز ہے۔ میں اس پر اپنی توہین محسوس کرنے کے بجائے حیران ہوں...... بہت زیادہ حیران ہوں...... ایک ڈاکو ان کا ہیرو ہے۔ ذرا سوچو...... یہ لوگ کس حال میں ہیں...... ان کا احساس محرومی کس حد تک بڑھا ہوا ہے کہ سلطانہ نے لوٹی ہوئی دولت سے اگر چند سو یا چند ہزار غریبوں کی مدد کر دی ہے تو وہ باقی لاکھوں غریبوں کا ہیرو بن گیا ہے۔ وہ ان سارے غریبوں کے مسائل تو حل نہیں کر سکتا۔ وہ ساری زندگی بھی لوٹ مار کر کے ان میں دولت بانٹتا رہے تب بھی وہ ان کی غربت دور کر سکتا ہے اور نہ ہی ان کے سارے مسائل حل کر سکتا ہے۔ اس کے باوجود انہوں نے اس کے روپ میں ایک نجات دہندہ تلاش کر لیا ہے۔ اس کا مطلب ہے غربت اور مسائل کے ستائے ہوئے لوگوں کو ہمیشہ ایک نجات دہندہ کی تلاش رہتی ہے خواہ وہ ڈاکو کے روپ میں ہی آئے۔''

الزبتھ ہنستے ہوئے بولی۔ ''بھئی تم بہت خوب آدمی ہو تم اپنی بے عزتی میں بھی ایک فلسفہ تلاش کر لیتے ہو۔''

ینگ اپنے مخصوص انداز میں تحمل اور خوش مزاجی سے مسکراتے ہوئے بولا۔ ''تم پتلی والوں کی ہمت اور جرأت پر بھی تو غور کرو۔ وہ ایک انگریز ڈی ایس پی کی موجودگی میں...... عین اس کے سامنے ایک ایسی تمثیل پیش کر رہے ہیں جس میں اس کا مضحکہ اور تمسخر اُڑایا جا رہا ہے۔ انہیں یہ اندازہ بھی ضرور ہوگا کہ میں انہیں گرفتار کر کے لے جا سکتا ہوں اور ان کے ساتھ بہت بُرا سلوک بھی ہو سکتا ہے لیکن انہوں نے اس کی پروا نہیں کی۔ گویا وہ اپنے جذبات کے اظہار کی قیمت ادا کرنے کے لئے تیار تھے اور کوئی خوف انہیں اس سے باز نہیں رکھ سکتا تھا...... لیکن اگر میں واقعی ان کے اندیشے کے مطابق عمل کروں، انہیں اٹھوا لوں اور ان کے ساتھ کوئی عبرت انگیز سلوک کروں تو اس سے مجھے کچھ حاصل نہیں ہوگا لیکن چونکہ میں ان کی حرکت پر خود بھی ہنس کر وہاں سے چلا آیا ہوں...... اس سے مجھے کچھ نہ کچھ فائدہ ضرور پہنچے گا۔''

''وہ کیسے؟'' الزبتھ نے تجسس سے پوچھا۔

''سلطانہ تو ان کی نظر میں اچھا آدمی ہے ہی...... اور ان کی ہمدردیاں اس کے ساتھ ہیں...... لیکن میرے اس رویے کی وجہ سے وہ کم از کم ایک لمحے کے لئے یہ سوچنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ شاید ڈی ایس پی فریڈی ینگ بھی کچھ نہ کچھ اچھا آدمی ضرور ہے۔ ہم انگریز اس خطے کے حکمران ہیں۔ اسی زعم میں ہم میں سے بہت سے لوگ ان کے ساتھ کوئی نہ کوئی ایسا سلوک کرتے رہتے ہیں جو ہمارے خلاف ان کے دلوں میں نفرت پیدا کرتا ہے اور جن لوگوں کو ان کے لیڈر بننے کا شوق ہے وہ اپنے اپنے مقصد کے لئے اس نفرت کو ہوا دیتے رہتے ہیں۔ میری ہمیشہ کوشش یہی رہی ہے کہ یہ لوگ کبھی کبھی یہ بھی سوچا کریں کہ انگریز اور طرح کے بھی ہوتے ہیں۔''

''چلو...... تم اکیلے اپنی سی کوشش کرتے رہو۔ شاید کبھی کسی کو پتا چل ہی جائے کہ سمندر میں ایک قطرہ میٹھے پانی کا بھی تھا۔'' الزبتھ ہنستے ہوئے بولی۔

''نہیں...... ایسی بات نہیں ہے۔'' ینگ بردباری سے بولا۔ ''اس انداز میں سوچنے والا میں اکیلا نہیں ہوں۔ بے شمار لوگوں کی سوچیں مجھ سے ملتی جلتی ہوں گی لیکن بظاہر شاید وہ کم نظر آتے ہوں گے مگر معاشرے پر بہر حال وہ بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔''

اس دوران وہ جم خانہ کلب پہنچ چکے تھے۔ ینگ نے طویل وعریض ڈرائیو وے میں گاڑی کھڑی کی اور وہ اندر پہنچ گئے۔ کلب کی بڑی سی لابی میں بار بھی موجود تھا جس کے بڑے سے کاؤنٹر کے سامنے رکھے ہوئے اسٹولوں پر لوگ بیٹھے تھے اور پینے پلانے کے شغل کے دوران باتیں کر رہے تھے۔ ینگ اور الزبتھ اندر ہال میں جانے کے لئے بار کے سامنے سے گزرنے لگے تو اسٹولوں پر بیٹھے ہوئے دو انگریز نوجوانوں نے بیک وقت گردنیں گھما کر ان کی طرف دیکھا۔ گلاس ان کے ہاتھوں میں تھے اور غالباً پینے پلانے کی وجہ سے ان کے چہرے تمتما رہے تھے۔

الزبتھ پر نظر پڑتے ہی ان میں سے ایک پُر اشتیاق انداز میں تقریباً چلّا اٹھا...... ''اے...... لو...... تم یہاں......؟''

پھر وہ دونوں ایک ساتھ اسٹولوں سے اتر کر اس کی طرف بڑھنے کی کوشش میں لڑکھڑا گئے لیکن فوراً ہی سنبھل گئے۔ وہ تیزی سے الزبتھ کی طرف بڑھے۔ الزبتھ اور ینگ کو رکنا پڑا۔ قریب آ کر دونوں نے بیک وقت مصافحے کے لئے الزبتھ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ الزبتھ نے باری باری ان سے ہاتھ تو ملا لیا لیکن اس کے چہرے پر سرد مہری تھی۔ دونوں نوجوانوں نے ینگ کو بالکل نظر

انداز کر دیا تھا جیسے وہ وہاں موجود ہی نہ ہو۔ دونوں باچھیں کھلائے ایک ٹک الزبتھ کی طرف دیکھے جا رہے تھے۔

"بہت اچھا ہوا تم سے ملاقات ہوگئی۔" ان میں سے ایک قدرے خمار زدہ لہجے میں بولا۔ "ہم یہاں بہت بور ہو رہے تھے، یہاں ہمارا کوئی جاننے والا ہی نہیں ہے۔"

"لیکن میں یہاں تمہاری بوریت دور کرنے نہیں آئی ہوں۔" الزبتھ نے قدرے ناگواری سے کہا۔ پھر اس نے ینگ کی طرف توجہ دلانے کے لئے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ان سے بھی ملو...... یہ میرے دوست فریڈی ینگ ہیں۔"

"ینگ......؟" ایک نوجوان نے استہزائیہ انداز میں دہرایا اور بے ڈھنگے پن سے ہنسنے لگا۔ پھر بولا۔ "یہ تو اچھے خاصے انکل ہیں اور اپنا نام انہوں نے ینگ رکھا ہوا ہے؟ اور وہاں ......تم انکلوں سے دوستی کب سے رکھنے لگیں؟"

الزبتھ کا چہرہ تمتما اٹھا۔ قہر آلود نظروں سے نوجوان کو گھورتے ہوئے اس نے اچھی خاصی بلند آواز میں اسے ڈانٹ دیا۔ "شٹ اپ...... اب مزید کوئی بکواس نہ کرنا اور نہ ہی مزید پینا...... تم نے جتنی پی ہے وہی تم سے ہضم نہیں ہو رہی، ایسا نہ ہو کہ مجھے کسی کو کہہ کر تمہیں اٹھوا کر باہر پھنکوانا پڑے۔"



دونوں نوجوانوں کی آنکھیں حیرت اور بے یقینی سے پھیل گئیں۔ پھر ان میں سے ایک، شکوہ آمیز لہجے میں بولا۔ "لز...... تم تو بالکل بدل گئی ہو......"

"میں بالکل نہیں بدلی...... لیکن چونکہ تمہارے حواس اس وقت صحیح طور پر کام نہیں کر رہے، اس لئے تمہیں یاد نہیں رہا کہ میں کیسی ہوں اور زبردستی اپنے ساتھ بے تکلف ہونے والوں کے ساتھ کیا سلوک کرتی ہوں۔ کیا اس سے پہلے تم دونوں کے ساتھ میری کوئی بے تکلفی رہی ہے؟"

دونوں میں سے کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔ ینگ اس دوران ایک طرف خاموش کھڑا رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے اس گفتگو میں مداخلت کرنی چاہیے یا نہیں۔ الزبتھ نے گویا خود ہی بات ختم کر دی اور ینگ کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھتی ہوئی بولی۔ "آئیے مسٹر ینگ...... اندر چلتے ہیں اس قسم کے فضول لوگوں سے بات چیت میں مزید وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔"

ینگ خاموشی سے اس کے ساتھ چل دیا۔ دونوں نوجوان وہیں کھڑے انہیں دیکھتے رہے۔ ان کے چہروں پر حیرت بھی تھی اور خجالت بھی...... اندر پہنچ کر وہ ایک میز پر بیٹھ چکے تو ینگ نے گہری سانس لے کر پوچھا۔ "یہ دونوں تھے کون؟"

"دور پار کے رشتے سے یہ میرے کزن ہیں۔" الزبتھ نے جواب دیا۔ اب وہ پُرسکون نظر آ رہی تھی۔ "امیر ماں باپ کی اولاد ہیں دونوں بھائی ہیں اور ان دونوں نے خود ہی نہ جانے کیوں یہ فرض کر لیا ہے کہ مجھے ان سے دوستی استوار کر کے بڑی خوشی ہوگی خاص طور پر یہاں پردیس میں......"

"کیا یہ یہیں نجیب آباد میں رہتے ہیں؟" ینگ نے سرسری سے لہجے میں پوچھا۔

"یہاں تو پہلی بار ہی نظر آئے ہیں۔ اس فیملی کی اصل رہائش تو دہلی میں ہے لیکن یہ لوگ عارضی طور پر دوسرے شہروں میں بھی جاتے رہتے ہیں۔ دراصل ان کے والد کی کئی کمپنیاں ہیں

انہیں ہندوستان میں مختلف کاموں کے ٹھیکے ملتے رہتے ہیں۔ میں نے سنا ہے حال ہی میں انہیں ان علاقوں میں کہیں کچھ نہریں وغیرہ بنانے کا ٹھیکہ ملا ہے شاید اس لئے یہ لڑکے یہاں نظر آرہے ہیں۔ ممکن ہے ان کی فیملی ان دنوں یہیں مقیم ہو۔ بہر حال...... مجھے ان لوگوں کے بارے میں کچھ بھی جاننے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اس قسم کے لڑکوں سے تو مجھے بات کرتے ہوئے بھی کوفت ہوتی ہے لیکن نہ جانے کیوں یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔"

"دراصل اس قسم کے نوجوانوں کا خیال یہی ہوتا ہے کہ کسی بھی لڑکی کو متاثر کرنے کے لئے صرف دولت اور جوانی کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ دونوں چیزیں ان کے پاس موجود ہیں اس لئے اب وہ باچھیں پھیلا کر جس لڑکی کی طرف بھی دیکھ لیں گے وہ ان کی جھولی میں آگرے گی۔ وہ اپنی شخصیت میں کوئی اور خوبی پیدا کرنے کی تو ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے۔ ان کی دولت اور جوانی کے باوجود جب کوئی لڑکی انہیں گھاس نہیں ڈالتی تو یہ بے چارے حیرت زدہ ہو جاتے ہیں۔ انہیں اپنی آنکھوں اور کانوں پر یقین نہیں آتا۔" دھیمے لہجے میں یہ سب کچھ کہتے وقت ینگ کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔

پھر وہ بے پروائی سے ہاتھ ہلا کر بولا۔ "خیر...... چھوڑو ان کے تذکرے کو، یہ کوئی اتنے اہم لوگ نہیں ہیں کہ ان کے بارے میں بات کرنے میں اتنا وقت ضائع کیا جائے۔ یہ بتاؤ...... کیا کھانے سے پہلے ایک دو ڈرنکس ہو جائیں؟"

"یقیناً ہونی چاہئیں۔" الزبتھ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

شمپین کے دو دو پیگ ختم کرنے کے بعد انہوں نے کھانا کھایا۔ اس دوران دنیا جہان کی باتیں ہوتی رہیں۔ کھانا ختم ہونے تک انہیں کچھ ایسا محسوس ہونے لگا تھا جیسے وہ برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ کلب میں لوگ کم ہی تھے اور جو تھے وہ سب انگریز ہی تھے۔ نجیب آباد کا جم خانہ کلب صرف انگریزوں کے لئے مخصوص تھا۔ ینگ اور الزبتھ جہاں بیٹھے تھے وہاں سے ہال کے بڑے دروازے کے علاوہ کلب میں داخل ہونے والا دروازہ بھی نظر آتا تھا اور بار کا کاؤنٹر بھی دکھائی دیتا تھا، اسی لئے انہیں الزبتھ کے دونوں کزن بھی دکھائی دے رہے تھے۔ وہ ابھی تک بار کے کاؤنٹر کے سامنے اسٹولوں پر ہی بیٹھے تھے اور ان کا پینے پلانے کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ گو کہ ان کی پینے پلانے کی رفتار کم ہی تھی لیکن وہ اس شغل میں کافی دیر سے مصروف تھے، اس لئے ینگ کو ان کے بارے میں تشویش تھی کہ وہ مزید کسی بدمزگی کا باعث نہ بنیں۔ وہ اس دوران

گردنیں گھما کر کئی بار کینہ توزسی نظروں سے ینگ اور الزبتھ کی طرف دیکھ چکے تھے لیکن الزبتھ کو گویا ان کی موجودگی کی ذرا بھی پروا نہیں تھی۔

ینگ کو خطرہ الزبتھ کے کزنوں کی طرف سے تھا لیکن خطرہ کسی اور طرف سے سامنے آگیا۔ چند لمحے پہلے اس نے باہر گھوڑوں کی ٹاپوں کی مدھم سی آوازیں سنی تھیں لیکن ان کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔ زرد پتھروں سے بنی ہوئی کلب کی عمارتوں کے گرد کافی بڑا احاطہ اور لان تھا۔ بعض لوگ وہاں بگھیوں میں بھی آتے تھے اور ان کی بگھیاں احاطے میں ہی کھڑی ہوتی تھیں۔ ینگ یہی سمجھا تھا کہ شاید باہر کوئی بگھی آئی ہے لیکن چند لمحے بعد کچھ شور سا سنائی دیا۔ پھر کلب کے دروازے پر باہر کی طرف کھڑا ہونے والا دربان کچھ اس طرح اندر لابی میں آن گرا جیسے کسی نے اسے اٹھا کر پھینک دیا ہو۔ وہ ایک دراز قد اور فوجی قسم کا ہندوستانی تھا جو خاکی وردی پہنے، اونچے طرے اور کلاہ والی پگڑی سر پر رکھے باہر مستعدی سے تن کر کھڑا رہتا تھا لیکن اس وقت وہ یوں دہشت زدہ دکھائی دے رہا تھا جیسے اس نے کسی بھوت کو دیکھ لیا ہو۔

وہ فرش پر جہاں آکر گرا تھا وہیں پڑا چاروں طرف گردن گھمانے کی کوشش کرتے ہوئے یوں لوگوں کی طرف دیکھ رہا تھا جیسے انہیں اپنی مدد کے لئے بلانا چاہ رہا ہو...... یا پھر شاید انہیں کسی خطرے سے خبردار کر رہا ہو۔ بار کے کاؤنٹر کے سامنے اور دیوار کے ساتھ لگے ہوئے صوفوں پر بیٹھے ہوئے لوگ بھی تشویش زدہ انداز میں اٹھ کھڑے ہوئے تھے حتیٰ کہ الزبتھ کے کزن بھی کاؤنٹر کا سہارا لے کر اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور ایسا لگ رہا تھا جیسے ان کا نشہ یکدم ہرن ہو گیا ہے۔ سب کی توجہ بیرونی دروازے کی طرف ہی تھی۔ ینگ کے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بج چکی تھی لیکن اب اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

دوسرے ہی لمحے اس نے بہت سے لوگوں کو درمانہ وار اندر آتے دیکھا۔ ان کے ہاتھوں میں رائفلیں اور چہرے پر وحشت تھی۔ وہ سب سانولے اور گندمی رنگت والے ہندوستانی تھے۔ جو شخص سب سے آگے تھا، وہ ان سب میں دراز قد اور سب سے زیادہ مضبوط جسم کا دکھائی دیتا تھا۔ موٹی موٹی مونچھوں کی وجہ سے اس کا چہرہ بارعب نظر آرہا تھا۔ اس کے نقوش جاذب نظر تھے۔ اندر آنے والوں میں اس کا رنگ سب سے صاف تھا۔ گیروے رنگ کی اس کی پگڑی کے نیچے سے اس کے لمبے گھنگریالے بالوں کی لٹیں جھولتی دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ ایک ہاتھ میں بے پروائی سے رائفل بلند کئے کچھ اس طرح شان سے اندر آرہا تھا جیسے کوئی بادشاہ یا سپہ سالار

اپنی مفتوحہ سرزمین پر قدم رکھ رہا ہو۔

بظاہر اس کے انداز میں بے پروائی تھی لیکن ینگ کے لئے اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ وہ اور اس کے تمام ساتھی شکار پر نکلے ہوئے درندوں کی طرح چوکنے تھے اور اندر آتے ہی وہ ایک ایک گوشے کا جائزہ لے چکے تھے۔ اس وقت انہوں نے اپنے چہرے چھپانے کی زحمت بھی نہیں کی تھی۔ ان کے چہروں پر ڈھاٹے نہیں تھے۔ سب سے آگے والا نوجوان ان کا سردار معلوم ہوتا تھا۔ اس پر نظر پڑتے ہی ینگ کے دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئی تھیں۔ اسے تیرتھ سنگھ کی بیٹی کی شادی کے موقع پر اس سے اپنی مختصر سی ملاقات یاد آگئی تھی جب وہ غلطی سے اسے دولہا سمجھ بیٹھا تھا اور بعد میں اسے پتا چلا تھا کہ وہ سلطانہ ڈاکو تھا۔ تب سے ہی وہ چہرہ اس کے ذہن میں نقش ہو کر رہ گیا تھا۔

ینگ غیر ارادی طور پر اٹھ کھڑا ہوا تھا اور ایک ٹک سلطانہ کی طرف دیکھنے لگا تھا۔

فی الحال سلطانہ اس کی موجودگی سے لاعلم تھا۔ اس کے اور سلطانہ کے درمیان خاصا فاصلہ تھا لیکن درمیانی دیوار شیشے کی تھی اور اس میں بڑا سا دروازہ بھی تھا جو اس وقت پورا کھلا تھا۔ کلب کی عمارت کی اندرونی ساخت کچھ ایسی تھی کہ ایک حصے سے دوسرے حصے کا بیشتر منظر آسانی سے دیکھا جا سکتا تھا۔ کلب میں موجود تمام افراد کو معلوم ہو چکا تھا کہ ڈاکو اندر گھس آئے ہیں۔ ڈانسنگ فلور پر رقص کرتے ہوئے جوڑے اپنی جگہ ساکت ہوگئے تھے اور ان میں سے کئی عورتوں کی چیخیں بھی نکل گئی تھیں۔ الزبتھ بھی اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور ینگ کے قریب ہوگئی تھی۔ اضطراری سے انداز میں اس نے ینگ کا بازو تھام لیا تھا اور سحرزدہ سی نظروں سے سلطانہ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ یقیناً سمجھ چکی تھی کہ وہ سلطانہ ڈاکو تھا لیکن اس کی آنکھوں میں خوف کے بجائے ایک والہانہ سا اشتیاق تھا۔

''کوئی اپنی جگہ سے نہ ہلے۔'' سلطانہ کی گرجدار آواز ہال میں گونجی۔ ساتھ ہی اس نے چھت کی طرف ایک فائر بھی کر دیا۔ ایک فانوس سے بہت سا شیشہ ٹوٹ کر نیچے آگرا اور فانوس بجھ گیا۔ ایک عورت کی ہلکی سی چیخ ابھری۔ کلب میں چونکہ سکوت چھا چکا تھا اس لئے اس کی چیخ ہلکی ہونے کے باوجود بلند محسوس ہوئی۔ ڈانسنگ فلور پر بیٹھے سازندوں کے ہاتھ اپنے اپنے ساز پر ساکت ہو چکے تھے۔

''آپ سب انگریز گورے صاحب ہیں۔'' سلطانہ کی آواز ایک بار پھر گونجی۔ ''بڑی عقل

والی قوم ہیں...... اتنی عقل آپ کو ضرور ہوگی کہ سلطانہ ڈاکو اور اس کے ساتھیوں سے کب الجھنا چاہئے اور کب نہیں...... اگر اس وقت کسی کے دل میں بہادری دکھانے کا خیال آرہا ہے تو اسے میرا دوستانہ مشورہ ہے کہ وہ اسے فوراً دل سے نکال دے۔''

وہ سب لوگ پورے کلب میں پھیل چکے تھے اور انہوں نے اس طرح مختلف جگہوں پر پوزیشن سنبھال لی تھی کہ تمام انگریز ان کے نرغے میں تھے۔ جب سلطانہ کو اندازہ ہوگیا کہ کسی کا مزاحمت کرنے کا ارادہ نہیں ہے تو اس نے کلب کا چکر لگانا شروع کیا۔ وہ سب کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کا مقصد یہ اندازہ کرنا تھا کہ کسی کے پاس ہتھیار تو موجود نہیں؟ اس کے علاوہ اسے یہ اندازہ بھی لگانا تھا کہ کس شخص سے کتنی نقدی ہاتھ لگ سکتی ہے اور کس عورت کے جسم پر کتنے زیورات موجود ہیں۔ اسے معلوم تھا کہ زیادہ زیورات ہاتھ نہیں آئیں گے کیونکہ انگریز عورتیں دولت مند اور خوشحال ہونے کے باوجود زیورات کم ہی پہنتی تھیں۔

سب کا جائزہ لیتے ہوئے وہ جب ینگ کے سامنے پہنچا تو ٹھٹک کر رہ گیا۔ حافظہ اس کا بھی غضب کا تھا۔ مسکراتے ہوئے اس نے اس طرح مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا کہ دوسرے ہاتھ میں موجود رائفل کی نال ینگ کے سینے کو چھو رہی تھیں۔

''اوہ...... ڈی ایس پی فریڈی ینگ صاحب......!'' وہ خوش دلی سے ہنسا۔ ''آپ کو تو مجھے زندہ یا مردہ گرفتار کرنے کی ذمے داری سونپی گئی ہے۔ میں نے سوچا ہمارے انگریز صاحبوں کو تو بہت سکھ، آرام سے رہنے کی عادت ہوتی ہے آپ کہاں جنگلوں، بیابانوں کی خاک چھانتے پھریں گے، اس لئے میں خود ہی آگیا۔ گرفتار کر لیجئے مجھے......''

ینگ نے اس مصافحے کے لئے بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا اور خاصی گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔ سلطانہ کی گرفت آہنی تھی۔ ینگ نہایت تحمل سے مسکراتے ہوئے بولا۔ ''کر لیں گے...... گرفتار بھی کر لیں گے...... ایسی بھی کیا جلدی ہے۔''

سلطانہ نے زوردار قہقہہ لگایا۔ در و دیوار گویا اس کے قہقہے کی گونج سے ایک لمحے کے لئے مرتعش سے ہوگئے۔

''آدمی آپ دل والے ہیں...... آپ جیسے آدمیوں کی میں قدر کرتا ہوں۔'' اس نے ینگ سے ہاتھ چھڑا کر اس کے کندھے پر تھپکی دی اور رائفل کی نال اس کے سینے سے ہٹالی۔ الزبتھ اس وقت بھی سحرزدہ سے انداز میں ایک ٹک اس کی طرف دیکھ رہی تھی مگر سلطانہ نے صرف ایک

لمحے کے لئے سرسری نظر سے اس کی طرف دیکھنے پر اکتفا کیا تھا۔

پھر اس نے چاروں طرف دیکھ کر خطاب کرنے کے سے انداز میں کہا۔ ''گورے صاحبو...... بات دراصل یہ ہے کہ آپ لوگوں نے اپنے ایسے بہت سے کلب بنا رکھے ہیں جہاں ہم جیسے گھٹیا ہندوستانیوں کو تو کیا اچھے بھلے عزت دار اور بڑے بڑے ہندوستانیوں کو بھی آنے کی اجازت نہیں لیکن ہم بھی انسان ہیں ہمارے سینے میں بھی دل ہے ہمارا بھی ایسی جگہوں پر آنے اور کھانے پینے، مزے کرنے کو دل چاہتا ہے۔ ہمیں پتا تھا، آپ لوگ کبھی ہماری دعوت نہیں کریں گے۔ اس لئے آج ہم نے خود ہی اپنی دعوت کر لی ہے۔ اگر آپ لوگوں کا ہمیں تنگ کرنے کا ارادہ نہ ہو تو ہم بھی آپ کے رنگ میں بھنگ نہیں ڈالیں گے۔ آپ جو کچھ بھی کر رہے تھے، کرتے رہیں۔ جو ناچ رہا تھا وہ ناچتا رہے، جو کھانا کھا رہا تھا وہ کھانا کھاتا رہے۔ جو پی رہا تھا وہ پیتا رہے...... اور جو ہمارا دل چاہے ہمیں بھی کرنے دے۔ اگر کسی نے ہمیں دھوکا دے کر ہمارے ساتھ کوئی چال چل کر ہمیں کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش کی تو پھر گورے صاحبوں کا یہ کلب گورے صاحبوں کا قبرستان بن جائے گا۔ بات سمجھ میں آ گئی نا......؟

اس نے سوالیہ انداز میں چاروں طرف دیکھا۔ کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔ سب اسی طرح ساکت رہے جیسے جادو کے زور سے انہیں پتھر کا بنا دیا گیا ہو۔ اس کے باوجود یہ واضح ہو گیا کہ وہ لوگ سلطانہ کا مطلب سمجھ گئے تھے اور اس کی ہدایات پر عمل کرنے کے لئے تیار تھے۔ یہ محسوس کرتے ہی سلطان نے بیروں کو اشارہ کرتے ہوئے گرج کر کہا۔ ''ابے...... کھڑے کھڑے کیا الوؤں کی طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے ہو......؟ کچھ ہماری بھی خاطر مدارت کرو...... ہم بھی مہمان ہیں تمہارے...... ہم جیسے مہمان کبھی کبھار ہی آتے ہیں۔ ہر وقت گوروں کی خدمت میں ہی جُتے رہتے ہو، کبھی ہم جیسے گھٹیا ہندوستانیوں کی بھی خاطر مدارت کر لیا کرو۔''

کلب کا اسٹاف ہندوستانی ہی تھا۔ ان میں زیادہ تر کرسچین تھے، صرف منیجر انگریز تھا۔ وہ سب لوگ پھرتی سے حرکت میں آ گئے۔ بیرے طشتریوں میں جام سجا کر پورے کلب میں گردش کرنے لگے۔ سلطانہ کے ساتھی قہقہے لگاتے ہوئے ایک ایک سانس میں جام خالی کرنے لگے۔ وہ ایک ہاتھ میں بدستور رائفل سنبھالے ہوئے تھے اور ایک ہاتھ سے جام اٹھا رہے تھے۔ خود سلطانہ نے بھی اسکاچ کا ایک جام خالی کیا لیکن اس نے بے صبری کا مظاہرہ نہیں کیا۔

اس نے باآواز بلند اپنے ساتھیوں کو بھی ہدایت کی۔ ''ابے گدھو...... ولایتی دیکھ کر مر

بھکوں کی طرح نہ ٹوٹ پڑنا...... اوقات میں رہ کر پینا...... پی پی کر گورے صاحبوں کے ہاتھوں مارے نہ جانا۔''

اس کے کئی ساتھیوں نے قہقہہ لگایا۔ لابی میں کھڑا ہوا بھورے وہیں سے بہ آواز بلند بولا۔

''سردار...... ٹھیک ہے ہم گدھے ہیں...... مگر اتنے بھی گدھے نہیں ہیں۔''

کلب میں موجود انگریز دوبارہ اپنی نشستوں پر بیٹھ چکے تھے۔ جن کے رقص کا سلسلہ ٹوٹ گیا تھا موسیقی شروع ہونے پر انہوں نے بھی وہ سلسلہ جوڑ لیا تھا۔ فضا میں ایک قسم کے تناؤ اور کشیدگی کا احساس ضرور موجود تھا لیکن بظاہر جیسے سب کچھ معمول پر آ گیا تھا۔ تاہم سلطانہ اور اس کے ساتھی اس ماحول میں قطعی اجنبی اور عجیب لگ رہے تھے۔ ینگ اور الزبتھ ابھی تک کندھے سے کندھا جوڑے کھڑے ہی ہوئے تھے۔ سلطانہ کی گویا اچانک ہی ان کی طرف توجہ گئی تو وہ جلدی سے بولا۔ ''ارے صاحب...... آپ بیٹھ جائیے نا...... اب آپ نے ہمیں مہمان بنا لیا ہے تو ہمارا آپ کا کوئی جھگڑا نہیں۔''

ینگ اور الزبتھ آہستگی سے اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے۔ الزبتھ اب بھی سحر زدہ نظروں سے سلطانہ کو دیکھے جا رہی تھی لیکن سلطانہ کو گویا اس بات کا احساس نہیں تھا۔ وہ اس وقت اسکاچ کا دوسرا جام تھامے ہوئے تھا اور بدستور کھڑا تھا۔ اس کے بائیں ہاتھ میں اب بھی رائفل تھی۔

ینگ دھیرے سے بولا۔ ''تم بھی بیٹھ جاؤ۔''

''نہیں صاحب......'' سلطانہ مسکرایا اور اس کے سفید ہموار دانت چمک اٹھے۔ ''اب ہم اتنے بھی اوقات بھولنے والے لوگ نہیں ہیں اور نہ ہی ہم کسی کی مہربانی سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ہم میں سے کوئی بھی یہاں نہیں بیٹھے گا۔ بس ہم جی بھر کے کھائیں پئیں گے پھر آپ سب مردوں، عورتوں کو تھوڑی سی تکلیف دیں گے...... اور وہ یہ کہ اپنی تمام اچھی اور قیمتی چیزیں، نقدی وغیرہ ہمارے حوالے کر دیں۔ اگر یہ کام آسانی سے اور اچھے طریقے سے ہو گیا تو بہت ہی اچھی بات ہے۔ ہم سب ہاتھ جوڑ کر آپ کو پرنام کریں گے اور چلے جائیں گے۔''

ینگ دھیمی آواز میں بولا۔ ''اگر تم ایک بات کا خیال رکھو تو تمہاری مہربانی ہو گی۔''

''کس بات کا......؟'' سلطانہ گھونٹ بھرتے ہوئے رک گیا۔

''یہاں موجود کسی عورت کیساتھ کوئی بدتمیزی نہیں ہونی چاہیے۔'' ینگ اس کی طرف دیکھتے ہوئے پلکیں جھپکائے بغیر بولا۔

سلطانہ نے ایک بار پھر اپنے مخصوص گونجیلے سے انداز میں ایک قہقہہ لگایا اور بولا۔ ''ینگ صاحب! ہماری ذات نیچ ہے کیونکہ اس میں ہماری مرضی نہیں چل سکتی تھی۔ بھگوان نے جس ذات میں چاہا ہمیں پیدا کر دیا لیکن ہمارا دل ...... ہمارا دماغ نیچ نہیں ہے۔ آپ کے پاس تو سلطانہ اور اس کے ساتھیوں کی اب تک کی ڈکیتیوں کا سارا ریکارڈ پہنچ گیا ہوگا۔ اسے غور سے دیکھنا...... اگر وہ رپورٹیں ایمانداری اور سچائی سے لکھی گئی ہوں گی تو ان میں کہیں آپ کو یہ پڑھنے کو نہیں ملا ہوگا کہ سلطانہ یا اس کے کسی ساتھی نے لوگوں کو لوٹتے وقت کسی عورت کو بری نظر سے دیکھا بھی ہو۔ ہمیں شاید کبھی کبھار کسی ایسی عورت کو چھونا پڑ گیا ہو جس نے اپنے زیور خود اتار کر ہمیں نہ دیئے ہوں لیکن اس وقت بھی ہماری نظر صرف اس کے زیوروں پر ہی رہی ہوگی اس کے وجود پر نہیں۔''

سلطانہ کی اونچی، پاٹ دار اور گونجیلی آواز موسیقی کی مدھم لہروں کے درمیان زیادہ تر لوگوں تک پہنچ گئی۔ وہاں موجود انگریزوں میں سے زیادہ تر اگر اردو بول نہیں سکتے تھے تب بھی کافی حد تک سمجھ ضرور لیتے تھے۔ سلطانہ کی بات سن کر وہ سب قدرے بے یقینی سے سلطانہ اور اس کے ساتھیوں کی طرف دیکھ رہے تھے کیونکہ اس وقت وہ اپنی حرکات وسکنات سے کافی حد تک جنگلی اور وحشی لگ رہے تھے۔ ان کا سراپا، ان کے انداز اور تاثرات دیکھ کر یہ امید رکھنا بہت مشکل نظر آتا تھا کہ ان لوگوں کی کچھ اخلاقیات بھی ہوں گی۔

پورے کلب میں اس وقت سب سے مطمئن اور بے پروا آدمی فریڈی ینگ دکھائی دے رہا تھا۔ اسے گویا اس وقت کسی بھی بات کی کوئی فکر نہیں تھی۔ وہ بڑے اطمینان سے سگار کے کش لے رہا تھا اور نیم وا آنکھوں سے سلطانہ کا جائزہ لے رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ سلطانہ کا ایک ایک نقش ذہن میں بٹھا لینا چاہتا ہو۔ اس دوران سلطانہ کے ساتھیوں نے کھانے کی چیزیں منگوانا شروع کر دی تھیں۔ سلطانہ نے بیروں کے انچارج کو روک کر ہدایت کی۔ ''میرے اور میرے ساتھیوں کے کھانے کے لئے سؤر کے گوشت کی کوئی چیز نہ لانا، ہم لوگ سؤر کا گوشت نہیں کھاتے ہیں۔''

بیروں کے انچارج نے سعادت مندی سے اثبات میں سر ہلا دیا اور کچن کی طرف چلا گیا۔ اس دوران الزبتھ ہچکچاہٹ آمیز انداز میں، ٹوٹی پھوٹی اردو میں سلطانہ سے مخاطب ہوئی۔

مسٹر سلطانہ...... میں تم سے اپنا تعارف کرا دوں۔''

سلطانہ نے بھنویں اُچکا کر اس کی طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے بولا۔ ''تعارف کی ضرورت نہیں ہے میم صاحب! مجھے تو آپ جان ہی چکی ہیں۔ میں بھی آپ کو جانتا ہوں۔ آپ آئی جی صاحب کی بیٹی الزبتھ ہیں۔''

الزبتھ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ پھر وہ سنبھل کر مسکراتے ہوئے بولی۔ ''مسٹر سلطانہ...... تمہاری سی آئی ڈی تو انگریزوں کا سی آئی ڈی سے زیادہ تیز ہے۔ تم کو تو ہر بات کا خبر رہتا ہے۔''

''خبر رکھنا پڑتا ہے میم صاحب......!'' سلطانہ بھی مسکراتے ہوئے بولا۔ ''ہم ہر وقت زندگی اور موت کی جنگ میں نکلے ہوئے ہوتے ہیں ذرا بے خبر ہوئے اور مارے گئے۔''

الزبتھ ایک لمحے کے توقف کے بعد بولی۔ '' آئی جی صاحب کا بیٹی ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ میں بھی تم کو گرفتار کرانا یا مروانا چاہتی ہوں۔ قانون کے ساتھ تمہارا جو جنگ چل رہا ہے وہ تم جانو اور قانون جانے...... میں تو بس تمہارا ایک بہت لمبا انٹرویو لینا چاہتی ہوں۔''

''انٹرویو......؟'' سلطانہ کی پیشانی پر شکنیں نمودار ہوگئیں۔ ''وہ کیا ہوتا ہے میم صاحب......؟''

''بھئی...... وہ...... میں تم سے بہت دیر تک بات چیت کرنا چاہتی ہوں...... تم سے ہر بات پوچھنا چاہتی ہوں...... تمہاری زندگی کی کہانی سننا چاہتی ہوں۔'' الزبتھ نے وضاحت کی۔

''ارے چھوڑیں میم صاحب...... اب باتوں کا سے گزر گیا۔'' میری زندگی کی کہانی اب تو میری موت ہی سنائے گی۔''

الزبتھ ایک بار پھر حیرت سے آنکھیں پھیلائے اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ اسے سلطانہ سے ایسی فلسفیانہ سی بات کی ہرگز توقع نہیں تھی۔ ایک لمحے بعد وہ گہری سانس لے کر بولی۔ ''بہرحال...... میں زندگی میں کبھی نہ کبھی تم سے ایک تفصیلی انٹرویو ضرور لوں گی۔ میں تمہاری زندگی کی کہانی ضرور سنوں گی۔ مجھے امید ہے کہ میری زندگی میں یہ موقع ضرور آئے گا۔

''شاید......'' سلطانہ نے پہلی بار بغور اس کی طرف دیکھتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

چند منٹ بعد سلطانہ اور اس کے ساتھیوں نے کھانے پینے کا سلسلہ ختم کر دیا اور میزوں سے صاف ستھرے میز پوش اٹھا کر ہاتھ منہ اچھی طرح صاف کر لئے پھر سلطانہ نے اعلان کرنے کے سے انداز میں کہا۔ ''جتنے بھی مرد اور عورتیں یہاں موجود ہیں ان میں سے جس کے پاس بھی

جتنی رقم ہے جس نے جو زیور پہنا ہوا ہے وہ سب نکال کر میزوں پر رکھ دے۔ آپ بڑے لوگ ہیں عزت دار لوگ ہیں، ہمارے حاکم ہیں، ہم نہیں چاہتے ہمیں آپ کی جیبوں میں، آپ کے کپڑوں میں ہاتھ ڈالنے پڑیں...... آپ کے ساتھ کھینچا تانی یا ہاتھا پائی کرنی پڑے...... کسی کو دو چار ہاتھ رسید کرنے پڑیں یا کسی کو گولی مارنی پڑے لیکن اگر ہمیں شک ہو گیا کہ کسی نے کوئی چیز چھپانے کی کوشش کی ہے تو پھر ہمیں ایسا کرنا ہی پڑے گا۔''

چند ہی لمحوں میں کئی میزوں پر چیزوں اور نقدی کی چھوٹی چھوٹی ڈھیریاں لگ گئیں۔ سلطانہ کے دو ساتھیوں نے وہ سب چیزیں دو تھیلوں میں ڈال لیں۔ ان میں سے ایک ینگ کی میز کے قریب آیا۔ ینگ کی جیب میں صرف بیس روپے اور چند سکے تھے اس نے وہ نکال کر میز پر رکھ دیئے تھے۔ الزبتھ کے پرس میں اس سے کہیں زیادہ رقم تھی۔ اس نے وہ نکال کر رکھ دی تھی۔ اس کے علاوہ وہ سونے کی ایک موٹی چین اور قیمتی گھڑی پہنے ہوئے تھی جس میں ننھے ننھے ہیرے جڑے تھے۔ اس نے وہ دونوں چیزیں اتار کر میز پر رکھ دی تھیں۔

ینگ کی بیلٹ میں، ہولسٹر میں سرکاری ریوالور بھی موجود تھا اور اسے اس بات پر حیرت تھی کہ سلطانہ نے آتے ہی اس سے ریوالور طلب نہیں کیا تھا۔ اب اس نے نقدی کے ساتھ ریوالور بھی نکال کر میز پر رکھ دیا تھا۔ سلطانہ ریوالور کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا دیا اور بولا۔ ''ڈی ایس پی صاحب! مجھے خوشی ہے کہ آپ نے اس ریوالور کو استعمال کرنے کی کوشش نہیں کی۔''

''مجھے معلوم ہے کہ اس کا نتیجہ خونریزی کی صورت میں نکلتا۔ شاید میرے ساتھ دوسرے بھی کئی بے قصور لوگ مارے جاتے۔ میرے سوا یہاں سب نہتے ہیں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تم نے جان بوجھ کر مجھ سے ریوالور نہیں لیا تھا۔ تم یہی دیکھنا چاہتے تھے کہ میں اسے استعمال کرتا ہوں یا نہیں...... تم بات چاہے کسی سے بھی کر رہے تھے لیکن حقیقت میں تمہاری نظر ایک لمحے کے لئے بھی مجھ پر سے نہیں ہٹی تھی۔'' ینگ نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا۔

سلطانہ نے خوش دلی سے ایک بلند آہنگ قہقہہ لگایا اور ینگ کا کندھا تھپک کر بولا۔ ''آدمی آپ سمجھدار ہیں ینگ صاحب! آپ کی طرف سے مجھے واقعی بہت ہوشیار رہنا پڑے گا۔''

''مجرم چاہے کتنا ہی ہوشیار رہے، جیت آخر ایک نہ ایک دن قانون ہی کی ہوتی ہے۔''

ینگ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اعتماد سے بولا۔

''خیر...... میرے اور آپ کے معاملے میں یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا۔'' سلطانہ نے

بے پروائی سے کہا۔ پھر وہ میز سے اس کی رقم اٹھا کر دیکھتے ہوئے بولا۔ ''صرف بیس روپے......؟ آپ تو کچھ غریب سے آدمی ہیں ڈی ایس پی صاحب! اتنے اچھے کلب میں اتنے پیسوں میں تو شاید دو آدمیوں کے پینے پلانے اور کھانے وغیرہ کا بل ادا کرنا بھی مشکل ہوتا ہوگا......؟

''ہمیں کسی بھی شہر میں جمخانہ کلب میں بل ادا نہیں کرنا پڑتا۔ ہم بل پر صرف دستخط کرتے ہیں، پیسے ہماری تنخواہ میں سے کٹ جاتے ہیں اور وہ بہت معمولی ہوتے ہیں کیونکہ ان کلبوں میں ہمارے لئے ہر چیز کی قیمت رعایتی ہوتی ہے۔'' ینگ نے قدرے تفصیل سے جواب دیا۔

''میری جیب میں بیس روپے ہونا بھی غنیمت ہے کیونکہ میں ایک دیانتدار پولیس آفیسر ہوں میں تیرتھ سنگھ نہیں ہوں۔''

سلطانہ مسکرایا۔ ''پھر تو مجھے آپ سے اور بھی زیادہ ہوشیار رہنا پڑے گا۔'' اس نے کہا اور ینگ کے ریوالور کا چیمبر کھول کر گولیاں نکال کر اپنے ساتھی کے تھیلے میں ڈال دیں۔ ریوالور اس نے ینگ کے سامنے واپس رکھ دیا۔ اس کے ساتھی نے الزبتھ کی چین اور رقم بھی تھیلے میں ڈال لی۔ چند لمحے بعد سب ڈاکو رائفلوں کا رخ کلب میں موجود لوگوں کی طرف ہی رکھتے ہوئے الٹے قدموں چلتے ہوئے یکے بعد دیگرے کلب سے نکل گئے۔ دروازہ انہوں نے باہر سے بولٹ چڑھا کر بند کر دیا۔

ان کے جاتے ہی کلب میں ہلچل شروع ہوئی، طرح طرح کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ کچھ لوگ ینگ کو ہدایات بھی دینے لگے کہ اسے فوراً ڈاکوؤں کا پیچھا کرنا چاہیے۔ اس نے اشارے سے انہیں تسلی دی۔ وہ ان سے یہ نہیں پوچھنا چاہتا تھا کہ ایک خالی ریوالور کے ساتھ وہ اکیلا پچیس ڈاکوؤں کا پیچھا کر کے کیا ان سب کی لاشیں گرانے یا انہیں گرفتار کرنے میں کامیاب ہو جائے گا؟ لوگوں کے ساتھ باتوں میں الجھنے کے بجائے اس نے الزبتھ کا ہاتھ پکڑا اور کلب کے عقبی دروازے کی طرف لپکا۔ اسے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ ڈاکوؤں نے پچھلے دروازے کو بھی نظر انداز نہیں کیا تھا۔ جاتے جاتے ان میں سے کوئی اسے بھی باہر سے بند کر گیا تھا۔ تاہم چند لمحوں بعد اس طرف سے آنے والے کسی مالی کی وجہ سے وہ دروازہ کھل گیا ورنہ وہ لوگ اسے توڑنے لگے تھے۔

ینگ اپنی گاڑی کی طرف لپکا۔ الزبتھ کا ہاتھ اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس زمانے میں چونکہ ایک دوسرے سے رابطے اور آمدورفت کے ذرائع زیادہ نہیں تھے، اس لئے ینگ کو

اندازہ تھا کہ وہ بہت جلدی اپنی خصوصی ٹیم کے بیس ساتھیوں کو اکٹھا کر کے ڈاکوؤں کے تعاقب میں روانہ نہیں کر سکتا، اور جب تک وہ روانہ ہوں گے تب تک ڈاکو نہ جانے کہاں پہنچ چکے ہوں گے۔ وہ تو آندھی طوفان کی رفتار سے آتے تھے اور بگولے کی طرح غائب ہو جاتے تھے۔ بہر حال...... کل سے اب تک اس علاقے میں یہ ان کی دوسری اور بڑی دلیرانہ واردات تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ پچھلی رات قلعے پر شب خون مارنے کے بعد زیادہ دور نہیں گئے تھے لیکن اب امکان یہی تھا کہ وہ جلد از جلد اس علاقے سے، زیادہ سے زیادہ دور نکل جائیں گے۔ تاہم اب ینگ کو کوئی نہ کوئی رسمی کارروائی تو کرنی ہی تھی۔

اس کا ارادہ تھا کہ وہ پولیس ہیڈ کوارٹر پہنچ کر جتنی بھی پولیس نفری جمع کر سکا اسے ڈاکوؤں کی تلاش میں روانہ کر دے گا۔ گو کہ اسے معلوم تھا اس کوشش کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا لیکن خانہ پری کے لئے یہ کارروائی ضروری تھی۔ الزبتھ پر اس واردات کا جیسے کوئی اثر ہی نہیں تھا اور نہ ہی اسے اپنی سونے کی کئی تولے وزنی چین، قیمتی گھڑی اور نقد رقم جانے کا کوئی افسوس تھا۔

وہ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے پُر جوش لہجے میں بولی۔ ''ینگ...... سلطانہ تو واقعی ایک افسانوی کردار ہے، اس پر کام کرنا چاہیے۔''

''ہم کام ہی تو کر رہے ہیں۔'' ینگ گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے بولا۔ ''سلطانہ اور اس کے ساتھیوں کو زندہ گرفتار کرنے یا ہلاک کرنے کا کام ہمارے سپرد کیا گیا ہے۔''

''میں اس کی نہیں...... تحقیقی کام کی بات کر رہی ہوں۔'' الزبتھ پُر جوش لہجے میں بولی۔

''میں تمہیں سچ بتا رہی ہوں وہ بڑا زبردست کردار ہے اس پر تحقیقی کام ہونا چاہیے، وہ کام تاریخ میں زندہ رہ جائے گا۔''

ینگ بہت ٹھنڈے دماغ کا اور بہت ہی تحمل مزاج آدمی تھا لیکن اس وقت وہ اپنی تحمل مزاجی برقرار نہ رکھ سکا۔ گاڑی کو گیٹ کی طرف گھماتے ہوئے وہ جل کر بولا۔ ''اس آدمی نے ہمیں مصیبت ڈالی ہوئی ہے۔ تمہیں اس پر تحقیقی کام کی سوجھ رہی ہے۔ کل رات قلعے پر شب خون مار کر اور آج جمخانہ کلب میں ڈاکا ڈال کر اسے نے گویا یکے بعد دیگرے ہم انگریزوں اور ہماری پولیس کے منہ پر دو طمانچے مارے ہیں۔ قلعے میں تباہی پھیلانے کا مقصد مال و دولت لوٹنا ہرگز نہیں تھا۔ اس نے وہاں سے کچھ نہیں لوٹا۔ اب کلب میں ڈاکا ڈالتے وقت بھی اسے اندازہ ہو گا کہ زیادہ مال اس کے ہاتھ نہیں آئے گا۔ ظاہر ہے کلب میں لوگ زیادہ مال و دولت تو ساتھ

لے کر نہیں آتے لیکن اسے معلوم تھا کہ یہاں زیادہ تر اونچے طبقے کے انگریز آتے ہیں جن میں مختلف محکموں کے بڑے عہدیدار بھی ہوتے ہیں۔ صرف اسی لئے اس نے خاص طور پر اتنی جلدی دوسری واردات کا خطرہ مول لیا۔ وہ صرف ہمارا تمسخر اُڑانا چاہتا تھا۔ وہ ایک خطرناک اور بے خوف ڈاکو ہے...... کسی ملک کا شہزادہ یا کسی رومانوی داستان کا ہیرو نہیں، جس پر تحقیقی کام کیا جائے۔''

''مجھے تم سے ایسی باتوں کی امید نہیں تھی ینگ......'' الزبتھ نے مجروح سی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ''میرا خیال تھا کہ تم ہر چیز کے بارے میں میرے دل کی بات کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہو۔''

''وہ تو میں سمجھ رہا ہوں۔'' ینگ یکدم نرم پڑتے ہوئے ملائمت سے بولا۔ ''لیکن یہ ایسی باتوں کا وقت نہیں۔''

''میرے دل میں جو بات آتی ہے میں اسے کہنے کے لئے مناسب وقت کا انتظار نہیں کرتی۔'' الزبتھ اپنا اسکارف درست کرتے ہوئے بولی۔ ''میرے خیال میں تو سلطانہ کسی ملک کے شہزادے یا کسی رومانوی داستان کے ہیرو سے کم نہیں اور تم دیکھ لینا...... وہ تاریخ کا حصہ بن جائے گا...... میری بات لکھ لو۔''

''ٹھیک ہے...... سمجھ لو یہ بات میں نے لکھ لی۔'' ینگ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''میرا مشورہ ہے تم جا کر اس سے شادی کر لو، تم بھی تاریخ کا حصہ بن جاؤ گی۔''

''نہیں...... شادی تو میں تم جیسے کسی پختہ عمر کے سنجیدہ اور تحمل مزاج انگریز سے کروں گی لیکن رومانی کشش مجھے سلطانہ میں محسوس ہوتی ہے۔'' الزبتھ بھی مسکراتے ہوئے بولی۔

''عجیب بات ہے......'' ینگ حیرت سے بولا۔ ''یعنی تم شادی اور عشق کے لئے الگ الگ آدمی کا انتخاب کرو گی؟''

''کروں گی نہیں...... شاید کر رکھا ہے۔'' الزبتھ دور اندھیرے میں دیکھتے ہوئے بولی۔

''شادی اور عشق یا رومانس میری نظر میں الگ الگ چیزیں ہیں۔ میں جس سے رومانس یا عشق کروں گی اس سے شادی نہیں کروں گی کیونکہ شادی کے بعد عشق یا رومانس دھیرے دھیرے مر جاتا ہے...... اور جس سے میں شادی کروں گی اس سے عشق یا رومانس نہیں کروں گی...... اور یہ بات میں دیانتداری کے ساتھ...... شادی سے پہلے ہی بتا دوں گی۔''

اس دوران وہ پولیس ہیڈ کوارٹر پہنچ چکے تھے۔ ینگ نے گاڑی کمپاؤنڈ میں روکی تو الزبتھ نے پوچھا۔ "تم اب کیا کرو گے؟"

"تم گاڑی لے کر گھر چلی جاؤ اور آرام سے سو جاؤ۔" ینگ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ "مجھے جلد از جلد پولیس کی جتنی بھی نفری میسر آسکی میں اس کے دو گروپ بنا کر ایک کو ڈی ایس پی جاوید ملک کی قیادت میں...... اور دوسرے کو خود اپنے ساتھ لے کر سلطانہ کے تعاقب میں نکلوں گا۔"

الزبتھ استہزائیہ سے انداز میں ہنس دی اور بولی۔ "تم اب اس کی گرد کو بھی نہیں پا سکو گے۔"

"مجھے معلوم ہے۔" ینگ نے اعتراف کیا۔ "لیکن ایک پولیس والے کو آخری دم تک اپنی سی کوشش کرنی ہوتی ہے...... اور ضابطے کی کارروائی بھی پوری کرنی ہوتی ہے۔ ہندوستان بہت ہی عجیب اور بہت ہی وسیع ملک ہے۔ یہاں ہر شہر، ہر بستی کے چاروں طرف فرار کے کتنے ہی راستے اور چھپنے کے لئے اَن گنت جگہیں ہیں۔ لامتناہی جنگل ہیں...... پہاڑ ہیں...... سلطانہ نے اس وسعت سے فائدہ اٹھانے اور ہر طرح کی جگہ کو اپنی پناہ گاہ بنانے کا ہنر سیکھ لیا ہے۔ ان لوگوں کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کس وقت کہاں ہوں گے۔"

وہ گاڑی سے اتر گیا اور الزبتھ ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھی لیکن وہ اکیلی ینگ کے گھر جا کر صبح تک قیام کرنے کے خیال سے خوش نظر نہیں آرہی تھی۔ وہ قدرے شکوہ آمیز سی نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر بولی۔ "اگر تم صبح سویرے تک واپس نہ آئے تو میں بہرحال مراد آباد چلی جاؤں گی۔"

"ٹھیک ہے...... میرا ملازم تمہیں وہاں چھوڑ آئے گا۔ مجھے جونہی وقت ملا، میں تم سے ملنے وہاں آؤں گا۔" ینگ نے گویا اس کا دل رکھنے کو کہا۔

الزبتھ نے تیزی سے گاڑی گھمائی اور روانہ ہو گئی۔ اس کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اس وقت بے حد کوفت محسوس کر رہی تھی۔ ینگ نے گہری سانس لی اور اپنے آفس کی طرف بڑھ گیا۔ اندر پہنچ کر اسے یہ دیکھ کر حیرت کے ساتھ ساتھ خوشی بھی ہوئی کہ جاوید ملک وہاں موجود تھا۔ وہ وردی میں تھا اور شاید چند لمحے پہلے ہی وہاں پہنچا تھا۔ اس کے چہرے پر تشویش کے آثار تھے۔

"سر...... میں نے ایک اُڑتی اُڑتی سی خبر سنی ہے...... کیا یہ ٹھیک ہے کہ سلطانہ نے اپنے گروہ کے ساتھ جمخانہ کلب پر یلغار کی تھی؟"

"ہاں...... تم نے ٹھیک سنا ہے۔" ینگ تھکے تھکے سے انداز میں ایک کرسی پر ڈھیر ہوتے ہوئے بولا۔ "پولیس کی جتنی بھی نفری دستیاب ہے اور ہماری اسپیشل ٹیم کے جن ساتھیوں کو چند منٹ کے اندر اندر بلایا جا سکتا ہے انہیں جمع کر کے دو پارٹیاں بناؤ۔ جمخانہ کلب سے گھوڑوں کے سموں کے نشانات سے اگر یقینی طور پر سمت کا اندازہ ہو گیا تو دونوں پارٹیاں ایک ہی سمت میں ڈاکوؤں کا تعاقب کریں گی۔ اگر سراغ غائب ہو گیا اور ہمیں اندازاً پیچھا کرنا پڑا تو ایک پارٹی میرے ساتھ ایک سمت میں جائے گی اور دوسری پارٹی تمہارے ساتھ دوسری سمت میں...... سمجھ گئے نا؟"

"یس سر!" جاوید ملک نے مستعدی سے سلیوٹ کیا اور کمرے سے نکل گیا۔

تھوڑی ہی دیر میں آٹھ آٹھ پولیس والوں پر مشتمل دو پارٹیاں بن گئیں۔ وہ سب گھوڑوں پر سوار تھے۔ پہلے وہ سب جمخانہ کلب پہنچے اور مشعلوں کی روشنی میں گھوڑوں کے سموں کے نشانات تلاش کئے گئے۔ کلب میں آنے والی بگھیوں کے رخصت ہونے کی وجہ سے نشانات کافی حد تک گڈمڈ ہو گئے تھے۔ پھر بھی انہیں اندازہ ہو گیا کہ ڈاکو کس سمت میں گئے تھے۔ وہ اس طرف چل پڑے لیکن اندھیرے میں مشعلوں کی روشنی میں نشانات تلاش کرتے ہوئے وہ زیادہ تیزی سے آگے نہیں بڑھ سکتے تھے۔ پہلے ہی کافی وقت ضائع ہو چکا تھا اور اب مزید ہو رہا تھا۔

قسمت بھی شاید ان کے ساتھ نہیں تھی۔ انہیں اندازہ ہوا کہ سلطانہ اور اس کا گروہ شاید مراد آباد کی طرف گیا تھا لیکن پھر ویرانے میں ایک چھوٹے سے قلعے کے کھنڈرات تک پہنچے تو وہاں کی زمین ریتیلی تھی اور شاید کچھ دیر پہلے وہاں تیز ہوا چلی تھی۔ ریت پر گھوڑوں کے سموں کے نشانات غائب ہو چکے تھے۔ اب یہ بات یقینی نہیں رہی تھی کہ ڈاکوؤں کا گروہ مراد آباد ہی کی طرف گیا ہو۔ وہاں سے وہ کسی بھی سمت میں جا سکتا تھا۔

کافی دیر تک اِدھر اُدھر ٹامک ٹوئیاں مارنے کے بعد آخر وہ لوگ دوبارہ دو ٹولیوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک ٹولی جاوید ملک کی قیادت میں اور دوسری ینگ کی قیادت میں دو مختلف سمتوں میں روانہ ہو گئی۔

✦ ...... ✦ ...... ✦

دوسرے روز ینگ بے نیل ومرام، تھکا ہارا گھر پہنچا۔ اس وقت دو پہر ہونے کو تھی۔ الزبتھ مراد آباد جا چکی تھی۔ گو کہ ینگ کی موجودگی میں وہ صرف چند گھنٹے ہی اس گھر میں مہمان رہی تھی لیکن اس کی عدم موجودگی میں ینگ کو گھر میں ایک عجیب سی ویرانی اور اُداسی کا احساس ہوا لیکن اس نے جلد ہی اس احساس کو ذہن سے جھٹک دیا۔ تھکن سے اس کا برا حال تھا۔ اس کی وردی اور چہرہ دھول میں اَٹا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ جانے والے پولیس آفیسر اور کانسٹیبل بھی اپنے گھروں کو جا چکے تھے۔ جاوید ملک اور اس کے ساتھ جانے والی پولیس پارٹی کا ابھی تک کچھ پتا نہیں تھا۔ ینگ کو تمام رات اور دن چڑھے تک ویرانوں اور بستیوں میں بھٹکنے کے باوجود سلطانہ کے گروہ کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے انہیں زمین نگل گئی تھی یا پھر شاید ینگ نے گزشتہ رات انہیں خواب میں دیکھا تھا۔

اس کا دل کہہ رہا تھا کہ جاوید ملک بھی اسی کی طرح ناکام و نامراد اور تھکا ہارا واپس آئے گا۔ فی الحال ینگ کو اس کی آمد کا بھی انتظار نہیں تھا۔ وہ غسل کر کے آرام دہ لباس پہن کر بستر پر ڈھیر ہو گیا۔ چند ہی لمحوں بعد وہ دنیا مافیہا سے بے خبر ہو گیا۔ چند گھنٹے کی نیند لے کر وہ شام ڈھلے اٹھا تو ملازم نے بتایا کہ جاوید ملک آیا تھا لیکن اس کے گہری نیند سونے کا سن کر واپس چلا گیا تھا۔ ینگ نے کھانا کھا کر دوسری صاف ستھری وردی پہنی اور پولیس ہیڈ کوارٹر جا پہنچا۔ خلاف توقع جاوید ملک کو اس نے وہاں موجود پایا۔ وہ بھی اسی طرح چند گھنٹے آرام کر کے، تازہ دم ہو کر دوبارہ وہاں آ گیا تھا۔

"میرا خیال ہے مجھے تم سے پوچھے بغیر ہی سمجھ جانا چاہئے کہ تم بھی میری ہی طرح ناکام و نامراد واپس آئے ہو۔" ینگ بولا۔

"جی...... سر...... لیکن میری خجل خواری میں شاید امید کی ایک کرن پنہاں ہے۔" جاوید ملک ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "مجھے ایک خبر ملی ہے جو شاید کچھ کارآمد ثابت ہو سکے۔"

"وہ کیا......؟" ینگ چونکا۔

"میری ایک بستی میں پولیس کے ایک مخبر سے ملاقات ہوئی۔ وہ ہماری طرف آنے ہی والا تھا۔ اس نے بتایا کہ مراد آباد کے نواح میں ایک رقاصہ رہتی ہے۔ چنبیلی اس کا نام ہے۔ وہ تیرتھ سنگھ کی بیٹی کی شادی کے موقع پر بھی ناچنے گانے کے لئے آئی ہوئی تھی اور وہاں سے شاید سلطانہ اسے اٹھا کر لے گیا تھا۔ وہ اپنے گھر پہنچ تو گئی تھی لیکن لگتا ہے کہ شاید اس کے بعد

سلطانہ کے ساتھ اس کے مراسم استوار ہو گئے ہیں، اب کبھی کبھار رات کے اندھیرے میں ایک گھڑ سوار اس سے ملنے آتا ہے۔ حلیے اور وضع قطع سے وہ کوئی خوشحال اور معزز تاجر لگتا ہے لیکن ہمارے مخبر کو شبہ ہے کہ شاید وہ سلطانہ ڈاکو ہے۔ ہمارا مخبر خود آج تک اس گھڑ سوار کو نہیں دیکھ سکا...... اور دیکھ بھی لیتا تو کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ سلطانہ کو پہچانتا نہیں ہے لیکن اسے کسی معتبر ذریعے سے یہ خبر ملی ہے۔"



جاوید ملک نے بلاشبہ یہ ایک اہم خبر سنائی تھی۔ ینگ چند لمحے پُرخیال نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔ ”تم نے ابھی اس سلسلے میں کوئی قدم تو نہیں اٹھایا؟“

”جی نہیں......“ جاوید نے نفی میں سر ہلایا۔ ”خبر ملتے ہی میں سب سے پہلے آپ کے پاس آیا ہوں۔“

”تمہارے خیال میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟“ ینگ نے اس سے رائے طلب کی۔

”چنبیلی کو اٹھا لیتے ہیں......“ جاوید بلا تامل بولا۔ ”وہ ضرور سلطانہ کے ٹھکانے سے واقف ہوگی۔ اس پر سختی کریں گے۔ وہ زبان کھول دے گی۔“

ینگ ہولے سے ہنس دیا اور متاسفانہ سے انداز میں سر ہلا کر بولا۔ ”تم نے وہی روایتی ہندوستانی پولیس افسروں والی بات کی ہے۔ تم لوگوں کے خیال میں مجرم سے تفتیش کرنے...... یا مجرم تک پہنچنے کا بس ایک ہی طریقہ ہوتا ہے...... اور وہ ہے تشدد......“

جاوید ملک کچھ کھسیاتا نظر آنے لگا اور ایک لمحے کے لیے گویا اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اسے کیا کہنا چاہیے۔ پھر وہ سنبھل کر بولا۔ ”آپ کے خیال میں ہمیں کیا کرنا چاہیے سر؟“

”مجھے یقین ہے کہ چنبیلی، سلطانہ کے ٹھکانے سے واقف نہیں ہوگی......“ ینگ بولا۔ ”سلطانہ بلاشبہ نوجوان ہے اور اسے ڈاکو بنے بھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا مگر وقت نے یقیناً اسے بہت تیزی سے نہ جانے کیا کچھ سکھا دیا ہے۔ وہ کچی گولیاں نہیں کھیلا...... عورت پر اس کا دل ضرور آ گیا ہوگا لیکن وہ اتنا کچا ہرگز نہیں ہے کہ اس نے اپنا ٹھکانا عورت کو دکھا دیا ہو یا اس کے بارے میں اسے بتا دیا ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر وہ عورت ہی اس سے ملنے جایا کرتی۔ وہ خود رات کے اندھیرے میں اس سے ملنے نہ آیا کرتا۔“

جاوید ملک نے کچھ سوچتے ہوئے دھیرے دھیرے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر اپنا سوال

دہرایا۔ ”تو پھر ہماری حکمت عملی کیا ہونی چاہیے؟“

”سب سے پہلے خود جا کر چنبیلی کے مکان کا محل وقوع اور اس کے اردگرد کا علاقہ دیکھو، پھر یہ طے کرو کہ کتنے آدمیوں کو رات کے وقت چھپ کے چنبیلی کے مکان کی نگرانی کرنی چاہیے۔ ان آدمیوں کی تعداد کم سے کم ہونی چاہیے۔ جتنے زیادہ لوگ ہوں گے اتنا ہی ان کے کسی کی نظر میں آنے کا امکان زیادہ ہوگا۔ یہ کام نہایت خاموشی اور احتیاط سے ہونا چاہیے۔ چنبیلی...... یا کسی اور کو شبہ نہیں ہونا چاہیے کہ اس کے مکان کی نگرانی ہو رہی ہے۔ نگرانی کرنے والوں کو اگر پہلی ہی بار اس شخص کو دیکھ کر یقین ہو جائے کہ وہ سلطانہ ڈاکو ہی ہے تو وہ فوراً ہی اس پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش بھی کر سکتے ہیں...... لیکن وہ اس قسم کے کاموں میں منجھے ہوئے آدمی ہونے چاہئیں۔“

”ٹھیک ہے...... میں سمجھ گیا سر......“ جاوید ملک نے سر ہلایا۔ ”سب کچھ اسی طرح ہوگا جیسے آپ چاہ رہے ہیں۔ میں چنبیلی کی نگرانی کی انتظامات مکمل کر کے آپ کو رپورٹ کرتا ہوں......“ اس نے ینگ کو سلیوٹ کیا اور کمرے سے نکل گیا۔



اس روز سلطانہ چنبیلی سے ملنے روانہ ہوا تو اس کا دل ایک عجیب سی خوشی سے سرشار تھا۔ بہت عرصے بعد اس نے یہ کیفیت محسوس کی تھی۔ اسے اپنا ذہن اور جسم بالکل ہلکا پھلکا محسوس ہو رہا تھا ورنہ وہ ہمیشہ خود کو ایک ایسے آدمی کی طرح محسوس کرتا تھا جو کسی بازی گر کی طرح مجمع کے سامنے، تنے ہوئے رسے پر چل کر دکھا رہا ہو۔ اس کے اعصاب ہمیشہ سارنگی کی تاروں کی طرح تنے رہتے تھے اور اس کا دل گویا اس کی کنپٹیوں میں دھڑکتا رہتا تھا۔ اس کی رگ و پے میں ایک بجلی سی دوڑتی رہتی تھی جو اسے دن رات کے بیشتر حصے میں متحرک رکھتی تھی۔

تاہم وہ اپنی اس کیفیت کا کسی کو احساس نہیں ہونے دیتا تھا اور بظاہر عام لوگوں، یا پھر اپنے دیگر ساتھیوں ہی کی طرح پُرسکون دکھائی دیتا تھا۔ آرام بھی کرتا تھا اور ساتھیوں سے ہنسی مذاق بھی کرتا دکھائی دیتا تھا۔ خطرناک صورت حال میں تو وہ اپنے ساتھیوں سے بھی زیادہ پُرسکون اور پُراعتماد دکھائی دیتا تھا لیکن اس کے اندر تقریباً ہر وقت ہی ایک بے عنوان اضطراب کا جوالاؤ سا بھڑکتا رہتا تھا اس سے وہ صرف خود ہی باخبر تھا مگر اس روز وہ چنبیلی سے ملنے روانہ ہوا تو اس کے اندر اضطراب کا یہ الاؤ سرد تھا۔ اس کی جگہ سلطانہ کی رگ و پے میں ایک عجیب سی ٹھنڈک، ایک عجیب سی سرشاری پھیلی ہوئی تھی۔ وہ بہت خوش تھا۔ آج کی ملاقات کے لئے اس

نے خوب اہتمام بھی کیا تھا۔ پگڑی سر پر جمانے سے پہلے لمبے بالوں میں خوشبودار تیل لگا کر کنگھی کی تھی۔ صاف ستھرے کپڑے پہنے تھے اوران پر خوشبو بھی لگائی تھی۔

عجیب بات یہ تھی کہ سلطانہ جب اپنے گھوڑے 'چیتک' پر بیٹھ کر روانہ ہو گیا تو اسے یوں لگا جیسے وہ بے زبان بھی اسی کی طرح خوش تھا۔ وہ آج جیسے اٹھلاتا ہوا چل رہا تھا۔ اس وقت کوئی سلطانہ کو دیکھتا تو یہی سمجھتا کہ کوئی معزز تاجر کسی کام سے کہیں جا رہا تھا۔ اس کا لباس قیمتی اور دیدہ زیب تھا۔ پیروں میں طلائی کام والی سلیم شاہی جوتیاں تھیں۔ یہ دوسری بات تھی کہ یہ چیزیں بھی ڈاکوؤں میں ہی لوٹی ہوئی تھیں۔ اس حلیے کے ساتھ اس کے کندھے پر لٹکی ہوئی رائفل ذرا عجیب لگ رہی تھی لیکن بہت زیادہ عجیب نہیں۔ کیونکہ سلطانہ ڈاکو ہی کی دہشت پھیلنے کے بعد اِکا دُکا معزز تاجر بھی سفر کے دوران مسلح نظر آنے لگے تھے یا پھر ان کے ساتھ ایک دو مسلح محافظ ہوتے تھے۔

وہ جب مراد آباد کے نواح میں پہنچا تو بادلوں کی اوٹ سے آدھا چاند کبھی جھانکنے لگتا تھا اور کبھی چھپ جاتا تھا۔ دھیمی خنک ہوا چل رہی تھی اور کہیں کہیں فضا میں رات کی رانی یا گیندے کی مہک بھی محسوس ہونے لگتی تھی۔ کھیتوں کی درمیانی پگڈنڈی سے گزرتا ہوا وہ اونچی فصلوں سے باہر آیا تو اس کی عقابی نظروں نے دور سے ہی ملگجے اندھیرے میں چنبیلی کا مکان دیکھ لیا اور محبوب سے ملاقات کے تصور سے اس کی دھڑکنیں کچھ تیز ہو گئیں۔

زرد پتھروں سے بنا ہوا وہ اچھا خاصا بڑا مکان مراد آباد کی ایک نواحی بستی سے بھی ذرا دور الگ تھلگ ہی نظر آتا تھا۔ اس کے عقب میں کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ ایک طرف کسی متروک آشرم کے کھنڈرات تھے اور دوسری طرف کھجور کے درختوں کا ایک جھنڈ۔ مکان کے عین سامنے ایک کنواں تھا جس پر لکڑی کے تختوں اور بلیوں سے ایک چھپر بنا ہوا تھا۔ کنویں کے گرد اینٹوں کا اونچا چبوترا تھا۔ یہ کنواں شاید اس مکان کے وجود میں آنے سے بھی پہلے کا بنا ہوا تھا لیکن اب اس پر چنبیلی ہی کا قبضہ تھا۔ یہ کنواں گویا اس کے مکان ہی کا ایک حصہ شمار ہوتا تھا اور اسی کے استعمال میں تھا۔ چنبیلی کا ملازم روزمرہ ضرورت کے لیے یہیں سے پانی بھرتا تھا۔

سلطانہ نے آشرم کی ایک ٹوٹی ہوئی دیوار کی آڑ میں گھوڑا روک کر گردوپیش کا جائزہ لیا۔ چاروں طرف سکوت چھایا ہوا تھا۔ صرف درختوں اور لہلہاتی فصلوں کے درمیان ہوا کی مدھم سی سرسراہٹ کے سوا کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ کھیتوں میں لہلہاتے پودوں کو دیکھ کر سلطانہ

کی نظروں کے سامنے چنبیلی کا رقص کرتا سراپا ابھر آیا۔ چنبیلی اپنے گھر میں سلطانہ کے قیام کے دوران کبھی کبھی گھنگھرو باندھ کر موسیقی کے بغیر اس کے سامنے رقص پیش کرتی تھی۔ سازوں کی سنگت نہ ہونے کے باوجود وہ رقص کچھ اس قسم کا ہوتا تھا کہ ایک عجیب سی سرشاری اور ترنگ سے سلطانہ خود کو دیوانہ ہوتا محسوس کرتا تھا۔ کہنے کو تو وہ بھارت ناٹیم، کتھاکلی یا اسی طرح کا کوئی اور رقص ہوتا تھا لیکن چنبیلی اس میں نہ جانے کون سا رنگ بھر دیتی تھی جو سلطانہ کے حواس پر چھا جاتا تھا۔

وہ سوچ رہا تھا کہ آج اس کے پاس رقص و نشاط کی گھڑیاں گزارنے کے بعد چنبیلی سے باتیں کرنے کے لیے بھی ایک بہت اچھا موضوع ہوگا۔ وہ اسے ڈی ایس پی ینگ کے بارے میں بتانا چاہتا تھا جسے سلطانہ اور اس کے گروہ کا قلع قمع کرنے کی ذمے داری سونپی گئی تھی۔ وہ چنبیلی کو بتانا چاہتا تھا کہ اس نے کس بے خوفی سے ینگ کا استقبال کیا تھا اور کتنے دلچسپ انداز میں اس کا سامنا کر لیا تھا۔ چنبیلی اس کی اس قسم کی باتیں سن کر بہت محظوظ ہوتی تھی اور ایسے قصوں سے گویا ان کی ملاقات کی خوشی دوبالا ہو جاتی تھی۔

سلطانہ اور اس کا گھوڑا، دونوں ہی گویا دم سادھے دیوار کی آڑ میں اندھیرے میں کھڑے تھے۔ اس دوران آدھا چاند تاریک بادلوں کی اوٹ میں چلا گیا۔ اندھیرا کچھ اور گہرا ہو گیا۔ سلطانہ کسی درندے کی طرح تاریکی میں بھی بہت دور تک دیکھ لیتا تھا اور ڈاکا ڈالنے، چنبیلی سے ملاقات کرنے یا کوئی اور خاص مہم سر کرنے کے لیے نکلتے وقت تو وہ گلفی دادا کے بتائے ہوئے خاص نسخے کے مطابق تیار کیا ہوا سرمہ بھی لگا لیتا تھا، اس لیے اندھیرے میں بھی تقریباً اتنی ہی دور تک دیکھ لیتا تھا جتنی دور تک روشنی میں دیکھ سکتا تھا۔

چھٹی یا ساتویں تاریخ کے چاند کو تاریک بادلوں کی اوٹ میں منہ چھپائے کئی سیکنڈ گزر گئے تب بھی سلطانہ دیوار کی اوٹ سے نہ نکلا۔ وہ یہاں تک تو ایک عجیب سی ترنگ اور سرشاری میں چلا آیا تھا لیکن اب جبکہ چنبیلی کا گھر زیادہ سے زیادہ سو قدم کے فاصلے پر رہ گیا تھا نہ جانے کیوں اس کا گھوڑے کو آگے بڑھانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اس کی درندوں جیسی کوئی نامعلوم حس اسے کسی خطرے کا احساس دلا رہی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس نہایت پُرسکون فضا اور خوبصورت محسوس کرنے والے ماحول میں کہیں کوئی اس کی گھات لگائے بیٹھا تھا۔ اس کا ہمیشہ کا اضطراب لوٹ آیا تھا اور اعصاب ایک بار پھر سارنگی کے تاروں کی طرح تن گئے تھے۔ وہ پلک

جھپکائے بغیر چاروں طرف دیکھتا رہا۔ اَن دیکھے، اَن جانے خطرے کا احساس برقرار رہا لیکن اس کی وجہ سلطانہ کی سمجھ میں نہ آئی۔ کہیں کوئی ذی روح نظر نہیں آ رہا تھا اور نہ ہی کوئی چیز حرکت کرتی دکھائی دے رہی تھی۔ آخر کار سلطانہ دیوار کی اوٹ سے نکل آیا۔ اب وہ یہاں تک آ گیا تھا تو چنبیلی سے ملے بغیر تو واپس نہیں جا سکتا تھا۔ رائفل اس نے کندھے سے اتار کر ہاتھ میں لے لی تھی اور اپنا ایک پاؤں چیتک کی پسلیوں پر خاص انداز میں رگڑا تھا۔ اس کا گھوڑا اس کے اشارے سمجھتا تھا۔ اس حرکت کا مطلب تھا کہ گھوڑے کو اب اس انداز میں چلنا تھا کہ اس کے سموں کی آواز کم سے کم ہو۔ گھوڑا سلطانہ کی مرضی کے مطابق چلنے لگا۔

وہ کنوئیں کے چبوترے کے قریب جا پہنچا۔ اسی دوران ادھورا چاند بادلوں کی اوٹ سے نکل آیا اور ماحول قدرے روشن ہو گیا۔ سلطانہ گھوڑے کا رخ مکان کے دروازے کی طرف موڑتے ہوئے رہ گیا۔ اس لمحے اس کی نامعلوم حس نے اسے بتا دیا کہ خطرہ کہاں تھا۔ اس نے رائفل کو ایک ہی ہاتھ میں تھامے رکھا لیکن صحیح طور پر، مضبوطی سے پکڑ لیا تا کہ ضرورت پڑنے پر فوراً استعمال کر سکے۔ ضرورت دوسرے ہی لمحے پڑ گئی۔ کنوئیں کے چبوترے کی اوٹ سے اچانک دو آدمی اچھل کر سامنے آئے۔

وہ عین اسی جگہ سے نکلے تھے جہاں سلطانہ کو خطرے کی موجودگی کا احساس ہوا تھا۔ چبوترہ زیادہ اونچا نہیں تھا۔ اگر وہ کھڑے ہوتے تو سلطانہ کو نظر آ جاتے۔ وہ چبوترے کی آڑ میں چھپ کر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں پستول تھے ان میں سے ایک چیخا۔ ”ہینڈز اَپ...... ہاتھ اوپر اٹھا لو سلطانہ......“

الفاظ ابھی اس کے منہ میں ہی تھے کہ سلطانہ کی رائفل گرجی اور وہ دونوں الٹ کر پیچھے جا گرے۔ اسی لمحے سلطانہ نے چنبیلی کے مکان کی آڑ سے دو سلاخیں سی نمودار ہوتے دیکھیں اور اسے فوراً ہی اندازہ ہو گیا کہ وہ رائفلوں کی نالیں تھیں۔ اس نے گھوڑے کی پسلیوں پر دونوں طرف سے اپنے پیروں سے ہلکی سی ضرب لگائی اور چیتک نے سچ مچ چیتے ہی کی طرح فضا میں اتنی اونچی چھلانگ لگائی جس کی توقع کوئی بھی کم از کم ایک گھوڑے سے نہیں کر سکتا تھا۔

اس اونچی چھلانگ نے ہی گھوڑے اور سلطانہ کو بچا لیا۔ گولیوں کی بوچھاڑ ہوئی مگر گولیاں گھوڑے کے نیچے سے گزر گئیں۔ اگر گھوڑے کو یہ چھلانگ لگانے میں ایک لمحے کی بھی تاخیر ہوئی ہوتی تو سلطانہ گھوڑے سمیت ڈھیر ہو چکا ہوتا۔ گھوڑا ایک ہی جست میں خاصا فاصلہ طے کر گیا تھا

اور کنوئیں سے دور نکل گیا تھا۔ سلطانہ اسے دوڑاتا ہی چلا گیا۔ اس نے فوری طور پر فیصلہ کیا تھا کہ رُکنا اور معرکہ آرائی کی کوشش کرنا ٹھیک نہیں تھا۔ اس نے جن دو آدمیوں کو نشانہ بنایا تھا ان کے بارے میں اسے کافی حد تک یقین تھا کہ وہ مر چکے ہوں گے۔

مکان کی اوٹ سے اس نے دو رائفلیں نمودار ہوتے دیکھی تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ کم از کم دو آدمی وہاں موجود تھے۔ کچھ بعید نہیں تھا کہ آس پاس کچھ اور لوگ بھی چھپے ہوئے ہوں۔ چنبیلی کے مکان کے پیچھے جو کھیت پھیلے ہوئے تھے ان میں کھڑی فصلیں خاصی اونچی تھیں۔ عین ممکن تھا کہ ان میں بھی آدمی چھپے بیٹھے ہوں۔ چبوترے کی اوٹ سے اچانک سامنے آنے والے دونوں آدمیوں میں سے ایک نے سلطانہ کا نام لے کر اسے للکارا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ اسے پہچانتا تھا۔

وہ لوگ یقیناً پولیس والے تھے اور اسے گرفتار کرنے یا پھر ہلاک کرنے کے لیے گھات لگا کر بیٹھے ہوئے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ سلطانہ کی تمام تر احتیاط کے باوجود پولیس تک یہ خبر پہنچ گئی تھی کہ وہ چنبیلی سے ملنے آتا تھا۔ ایک لمحے کے لیے اس کے دل میں یہ خیال بھی آیا کہ یہ سب چنبیلی ہی کا کیا دھرا تو نہیں تھا؟ سلطانہ نے بہت سے لوگوں سے سنا تھا کہ اس طرح کی عورتوں پر اعتبار نہیں کرنا چاہیے، وہ کسی کو بھی اپنی محبت کے جال میں پھنسا کر دھوکا دے سکتی ہیں۔

سلطانہ کو خیال آیا کہ شاید چنبیلی نے اسے شروع سے ہی ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت محبت کے جال میں پھنسایا ہو۔ شاید اس کا اصل مقصد اسے گرفتار کرانا ہی ہو۔ اب جب کہ وہ آنکھیں بند کر کے اس پر بھروسا کرنے لگا تھا تو اس نے اپنا وار کر دیا تھا۔ ایک امکان یہ بھی تھا کہ شاید شروع سے اس کا ایسا ارادہ نہ ہو لیکن حال ہی میں پولیس نے اسے ڈرا دھمکا کر یا کوئی لالچ دے کر اس بات پر آمادہ کر لیا ہو کہ وہ انہیں اپنے گھر کے سامنے گھات لگانے کا موقع دے دے۔

سلطانہ کا گھوڑا ہوا سے باتیں کر رہا تھا۔ چنبیلی کا مکان بہت پیچھے رہ گیا تھا اور سلطانہ کے خیالات کے گھوڑے اس سے بھی کہیں زیادہ تیزی سے دوڑ رہے تھے۔ مگر وہ چند لمحے سے زیادہ چنبیلی کے بارے میں بدگمانی میں مبتلا نہ رہ سکا۔ اسے اس کی بے غرض اور بے لوث محبت کے کچھ ایسے پہلو یاد آئے کہ اس کے بارے میں ایک لمحے پہلے تک کی بدگمانیوں پر وہ دل ہی دل میں شرمندہ ہو گیا۔ اس کی طرح تک گویا گواہی دینے لگی کہ چنبیلی اس کے لئے جان تو دے سکتی تھی لیکن کوئی ایسا کام نہیں کر سکتی تھی جس سے اسے معمولی سا بھی گزند پہنچنے کا اندیشہ ہوتا۔

اسے یہ بھی خیال آیا کہ چنبیلی اگر اس کے خلاف کسی سازش میں شریک ہوتی تو پولیس والے مکان کے باہر نہیں بلکہ مکان کے اندر اس کے لئے گھات لگائے بیٹھے ہوتے اور شاید ایسے لمحات کے دوران اس پر ہاتھ ڈالتے جب اسے قابو میں کرنا ...... یا پھر ہلاک کرنا بہت آسان ہوتا۔ چنبیلی کو یقیناً علم ہی نہیں تھا کہ اس کے مکان کے باہر کچھ لوگ چھپے ہوئے تھے۔ اس پر تو شاید فائرنگ کی آواز سن کر اندیشوں کے پہاڑ ٹوٹے ہوں گے اور ابھی تو اس کا نہ جانے کیا حال ہوگا۔

سلطانہ کئی بار مڑ کر دیکھ چکا تھا کہ کوئی اس کے تعاقب میں نہیں آ رہا تھا۔ جب اس نے محسوس کیا کہ وہ خطرے کی حدود سے بہت دور نکل آیا تھا تو اس نے گھوڑے کی رفتار کچھ کم کر لی۔ وہ بے چارہ بہت طویل سفر تیز رفتاری سے طے کر چکا تھا مگر اب بھی اپنے کسی انداز سے تھکن یا کمزوری کا احساس نہیں ہونے دے رہا تھا۔ جلد ہی سلطانہ جنگل میں داخل ہو گیا۔ جنگل ہی جنگل میں زیادہ سے زیادہ سفر کرنا اس کی مخصوص حکمت عملی تھی۔ اس طرح اس کے کسی کی نظر میں آنے کا امکان بھی بہت کم رہ جاتا تھا اور کسی کے لیے اس کا تعاقب کرنا تقریباً ناممکن ہو جاتا تھا۔ درندوں کی طرح سلطانہ اور اس کے ساتھیوں کے لیے بھی جنگلات گویا اپنا ہی گھر تھے۔ سلطانہ تیزی سے واپس اپنے ٹھکانے کی طرف رواں تھا لیکن اسے چنبیلی کے بارے میں سخت تشویش تھی۔ پھر اس نے دل ہی دل میں خود کو تسلی دینے کی کوشش کی کہ چنبیلی کوئی معمولی عورت نہیں تھی۔ وہ مشکل صورت حال کا سامنا بھی کر سکتی تھی۔



پولیس ہیڈ کوارٹر میں فریڈی ینگ اپنے کمرے میں موجود تھا۔ جاوید ملک اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھا تھا۔ دونوں ہی کے چہرے کچھ اترے ہوئے سے تھے اور کمرے کی فضا بوجھل تھی۔ دونوں ہی کچھ دیر سے خاموش تھے۔ آخر ینگ نے ہی یہ سکوت توڑا اور کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے بولا۔ "مجھے اعتراف ہے کہ میری حکمت عملی کچھ زیادہ کامیاب نہیں رہی اور ہمارے دو اے ایس آئی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے لیکن تمہیں یہ بھی ماننا چاہیے کہ انہوں نے میرے احکام پر پوری طرح عمل نہیں کیا۔ میں نے انہیں جو ہدایات دی تھیں انہوں نے ان کی اہمیت کو نہیں سمجھا۔"

جاوید ملک خاموش رہا۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد ینگ نے سلسلۂ کلام جوڑا۔

"میں نے ان سے کہا تھا کہ وہ چھپ کر ...... اور اپنی موجودگی کو صحیح معنوں میں خفیہ رکھتے ہوئے راتوں کو چنبیلی کے مکان کی نگرانی کریں گے۔ اگر وہ واقعی کسی رات وہاں کسی شخص کو آتے دیکھیں گے تو کم از کم پہلی مرتبہ وہ کوئی قدم نہیں اٹھائیں گے۔ اگر وہ آنے والے شخص کو پہچان بھی لیں گے کہ وہ واقعی سلطانہ ڈاکو ہے تب بھی وہ اپنے طور پر کچھ نہیں کریں گے۔ وہ صرف مجھے رپورٹ کریں گے اور تصدیق کریں گے کہ چنبیلی کے ہاں آنے والا واقعی سلطانہ ڈاکو ہے۔ اس کے بعد اس کی گرفتاری کی حکمت عملی میں خود تیار کروں گا۔ انہوں نے میری اس ہدایت پر عمل نہیں کیا اور سلطانہ کو پہچانتے ہی اس کے سامنے کود پڑے۔ وہ سلطانہ کو پہچانتے ضرور تھے لیکن "جانتے" نہیں تھے۔"

جاوید ملک نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلایا اور ہچکچاہٹ آمیز سے لہجے میں بولا۔ "ہم نے جن چار افسروں کو وہاں تعینات کیا تھا ان میں سے دو جو زندہ بچ گئے ہیں ان سے میری خاصی تفصیلی بات چیت ہوئی ہے۔ اس سے مجھے کچھ اندازہ ہوا ہے کہ مرنے والے پولیس افسروں نے آپ کی ہدایات کی خلاف ورزی کیوں کی......" وہ مضطربانہ انداز میں پہلو بدل کر خاموش ہو گیا۔ ینگ منتظر نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد جاوید بولا۔ "ایک تو زیادہ تر پولیس والوں میں کسی کارنامے کا کریڈٹ لینے کی خواہش زیادہ ہوتی ہے۔ شاید اس خواہش نے انہیں بے قرار کیا۔ انہوں نے سوچا ہو کہ پولیس والے اس وقت چار ہیں اور سلطانہ اکیلا ہے۔ شاید ان کا یہ کارنامہ تاریخی قرار پائے کہ انہوں نے سلطانہ کو زندہ گرفتار...... یا پھر ہلاک کیا تھا......؟"

"اور اس کوشش میں چار میں سے دو خود ہلاک ہو گئے......!" ینگ نے متاسفانہ سے انداز میں گہری سانس لی۔

"ایک اور احساس انہیں یہ بھی ہوا کہ سلطانہ کچھ چوکنا ہو گیا تھا۔ اسے وہاں کسی خطرے کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ کچھ بدک سا گیا تھا۔ انہوں نے سوچا، وہ پلٹ نہ جائے اور شاید پھر کبھی چنبیلی کے مکان کی طرف نہ آئے ...... چنانچہ آج ہی اپنی سی کوشش کر لی جائے۔"

"بہرحال ...... جو کچھ ہوا افسوسناک ہوا...... اور اب سلطانہ واقعی دوبارہ چنبیلی کے مکان کا رخ نہیں کرے گا......" ینگ نے کرسی کے پشتے سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ "اس کا ایک معمولی سا سراغ ملا تھا...... وہ بھی ہاتھ سے نکل گیا۔"

"لیکن......اب تو ہمیں چنبیلی کو گرفتار کر لینا چاہیے۔" جاوید ملک ہچکچاتے ہوئے بولا۔

"کس جرم میں......؟" ینگ نے دریافت کیا۔ "دو پولیس آفیسر اس کے گھر کے دروازے پر قتل ہوئے ہیں......" جاوید بولا۔

"انہیں اس نے تو قتل نہیں کرایا۔ وہ تو اس بات سے بھی بے خبر تھی کہ پولیس چھپ کر اس کے مکان کی نگرانی کرنے لگی ہے۔ وہ تو کسی عدالت میں الٹا، اعتراض اٹھا سکتی ہے کہ اس نے کوئی جرم نہیں کیا تو پولیس راتوں کو چھپ کر اس کے مکان کی نگرانی کیوں کر رہی تھی؟" ینگ بولا۔

"یہ جرم کیا کم ہے کہ وہ پولیس کو انتہائی مطلوب ایک مجرم کے ساتھ تعلقات استوار کیے ہوئے ہے اور وہ کبھی کبھی رات کے اندھیرے میں اس سے ملنے آتا ہے؟" جاوید ملک بولا۔

"وہ عدالت میں اس بات سے انکار کر سکتی ہے کہ وہ سلطانہ ڈاکو کی اصلیت سے واقف تھی۔ وہ کہہ سکتی ہے کہ وہ شخص ایک تاجر کی حیثیت سے اس کے پاس آتا تھا لیکن وہ کسی نجی وجہ کے تحت اپنی آمدورفت خفیہ رکھنا چاہتا تھا۔" ینگ بولا۔

"سر......آپ ایک معمولی سی عورت کے بارے میں قانون کی اتنی پرواہ کر رہے ہیں کہ وہ عدالت میں یہ کہہ سکتی ہے......وہ کہہ سکتی ہے......!" جاوید ملک حیرت سے بولا۔ "جبکہ آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ اگر وہ اس قسم کی باتیں کرے گی تو جھوٹ بول رہی ہوگی۔"

"دیکھو بھئی......اگر تم بات قانون کی کرو گے تو ایک دیانتدار انگریز اسی طرح سوچے گا۔ وہ کسی کی چمڑی ادھیڑ کر اس سے سچ نہیں بلوائے گا بلکہ دلیل اور ثبوت کے ذریعے اس کے جھوٹ کا پردہ چاک کرے گا۔ میں جس کیس کا انچارج ہوں گا اس میں تمہیں ہندوستانی پولیس کے روایتی طریقے استعمال نہیں کرنے دوں گا۔ خاص طور پر ایک عورت کے معاملے میں......خواہ وہ ایک معمولی رقاصہ ہی کیوں نہ ہو۔" ینگ کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

جاوید ملک کے چہرے پر پہلی بار ناگواری کے تاثرات نمایاں ہو گئے۔ شاید اب تاثرات کو چھپانے کا تکلف کرنا بھی اس کے لیے ممکن نہیں رہا تھا۔ شاید نکتہ نظر کا یہ اختلاف وہ الفاظ میں بھی واضح کر دیتا لیکن دو وجوہ کی بناء پر وہ ابھی اپنی قوت برداشت کو استعمال کرنے پر مجبور تھا۔ ایک تو ینگ انگریز تھا اس کا تعلق حکمران طبقے سے تھا ظاہر ہے اونچی سے اونچی سطح پر اس کا اثر رسوخ جاوید ملک سے کہیں زیادہ تھا۔ دوسرے وہ پولیس کی ملازمت میں جاوید ملک سے کہیں

زیادہ سینئر تھا۔

"لیکن......سر......" وہ بہرحال جرأت سے کام لیتے ہوئے بولا۔ "ہمیں کسی نہ کسی طرح چنبیلی سے تفتیش تو کرنی پڑے گی۔ ہمیں اپنی سی کوشش تو کرنی پڑے گی۔"

"ہاں......یہ تم ٹھیک کہہ رہے ہو......" ینگ نے اس کی تائید میں سر ہلایا۔ "اپنی سی کوشش ہمیں کرنی پڑے گی......اور وہ میں کر چکا ہوں......"

"آپ کوشش کر چکے ہیں......؟" حیرت سے جاوید ملک کی آنکھیں پھیل گئیں۔ شاید اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کی ٹیم کا سربراہ کوئی کوشش کر چکا تھا اور اسے اس کا پتا ہی نہیں تھا جبکہ اس کا زیادہ تر وقت بھی ینگ کے ساتھ ہی گزرتا تھا اور وہ ایک دوسرے کی سرگرمیوں سے اچھی طرح آگاہ رہتے تھے۔

جب ینگ مزید کچھ نہ بولا تو جاوید کو پوچھنا ہی پڑا۔ "کیا کر چکے ہیں آپ؟"

"میں چنبیلی سے ملا تھا۔" ینگ نے اطمینان سے بتایا۔

"آپ چنبیلی سے مل چکے ہیں......؟" جاوید ملک کی حیرت میں اضافہ ہو گیا۔

"ہاں......" ینگ نے یوں بے نیازی سے جواب دیا جیسے یہ کوئی خاص بات نہیں تھی۔

"آپ نے اسے حراست میں نہیں لیا؟" جاوید ملک کے سوال میں ایک بار پھر اس کی اپنی خواہش کا عکس جھلک آیا۔

"نہیں......میں نے کہا نا کہ اس کی کوئی ضرورت تھی اور نہ ہی کوئی فائدہ......" ینگ بولا۔ "ویسے بھی میں ایک انگریز سیاح کی حیثیت سے اس کے پاس گیا تھا......گلے میں کیمرا بھی لٹکایا ہوا تھا......میں نے اس سے کہا میں ہندوستان کے کلاسیکل رقص کی مختلف قسموں اور لوگوں کے سامنے رقص پیش کرنے کی قدیم روایت پر تحقیق کر رہا ہوں۔ اس سلسلے میں مجھے اپنے سفر کے دوران جس رقاصہ کے بارے میں بھی پتا چل رہا ہے میں اس سے مل رہا ہوں......"

جاوید ملک کچھ ایسی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو۔ "سر......ایک انگریز پولیس آفیسر کو بھلا ایک معمولی ہندوستانی رقاصہ کے پاس بہانے سے جانے کی کیا ضرورت تھی؟"

تاہم یہ کہنے کے بجائے اس نے گویا اپنے اصل جذبات پر ضبط کا بھاری پتھر رکھتے ہوئے ہموار لہجے میں کہا۔ "تو پھر اس نے کیا کہا؟ کیا اس نے رقص کے بارے میں آپ کی معلومات

میں کچھ اضافہ کیا؟"

"نہیں......" ینگ گہری سانس لے کر بولا۔ "اس نے رقص کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ اس کے بجائے اس نے افسردہ لہجے میں کہا۔ "ڈی ایس پی فریڈی ینگ صاحب...... میرے پاس آنے کے لیے آپ کو یہ سوانگ بھرنے کی کیا ضرورت تھی؟ سیدھی طرح بولیں کہ آپ کسی طرح مجھ سے سلطانہ کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ آپ اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ مجھے سلطانہ کے بارے میں اس کے سوا کچھ معلوم نہیں...... کہ وہ اندر سے ایک بہت اچھا انسان ہے...... اس کا دل سونے کا ہے...... اور وہ ایک شاندار مرد ہے، بس...... یہ بتا کر وہ چپ ہوگئی۔"

جاوید ملک استہزائیہ سے انداز میں ہنس دیا، گویا کہنا چاہ رہا ہو "سر...... آپ اپنے خیال میں بہت بڑا ڈراما تیار کر کے لے گئے تھے...... لیکن آپ کا ڈراما الٹ کر آپ کے منہ پر آن پڑا......!"

ینگ گویا اس کے جذبات اور تاثرات سے بے خبر چنبیلی سے اپنی ملاقات کے تصور سے محظوظ ہوتے ہوئے بولا۔ "وہ اَن پڑھ سی عورت ذہین ہے۔ اس نے صرف ایک بار مراد آباد میں سرِراہ کہیں مجھے وردی میں دیکھا تھا اور کسی سے میرا نام سنا تھا۔ اس کے بعد سے اب تک اس نے میری شکل اور نام یاد رکھا تھا۔ آخر کار مجھے اعتراف کرنا پڑا کہ اس نے مجھے صحیح پہچانا ہے۔ تب اس نے کہا۔ "ڈی ایس پی صاحب! دو پولیس آفیسر میرے دروازے پر مر گئے ہیں۔ آپ کے آدمی تفتیش کے لیے آئے تھے لیکن انہوں نے مجھے گرفتار نہیں کیا اور نہ ہی پوچھ گچھ کے نام پر میرا حشر خراب کرنے کے لیے مجھے تھانے لے کر گئے۔ کیا مجھ پر یہ مہربانی آپ کے حکم پر ہوئی ہے؟" وہ اس بات پر واقعی حیران تھی۔"

"آپ نے فخر سے کہا ہوگا کہ...... ہاں...... میری ہی وجہ سے تم بہت بڑے عذاب میں گرفتار ہونے سے بچ گئی ہو...... یہی کہا نا آپ نے......؟" جاوید ملک طنزیہ سے انداز میں کہے بغیر نہ رہ سکا۔

ینگ نے ذرا سخت نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولا۔ "اگر تم مجھے اتنا کم ظرف سمجھ رہے ہو تو تم غلطی پر ہو۔ میں نے اس سے کہا تھا اس بات کو جانے دو...... اگر تمہیں پہلے ہی سے معلوم ہے کہ میں کون ہوں تو میں اپنا اصل مقصد بھی بیان کر دیتا

ہوں...... تم سلطانہ سے میری ایک ملاقات کرادو......"

"آپ سلطانہ سے ملاقات کریں گے؟ جاوید ملک پر ایک بار پھر حیرت کا حملہ ہوا۔

"اس میں اتنا حیران ہونے کی کیا بات ہے؟" ینگ کو گویا اس کی حیرت پر حیرت تھی۔

"آپ اس ڈاکو سے ملاقات کریں گے جس نے دلی سے نینی تال تک طوفان برپا کیا ہوا ہے...... جو بیسیوں لوگوں کو قتل کر چکا ہے...... ہزاروں لوگوں کو لوٹ چکا ہے...... جو اس وقت پولیس کو ہندوستان کا سب سے زیادہ مطلوب آدمی ہے...... آپ اس سے ملیں گے؟" جاوید ملک کی حیرت برقرار تھی۔

"ہاں...... میں کم از کم ایک بار اس سے مل کر بات چیت ضرور کرنا چاہتا ہوں۔ ہو سکتا ہے ہماری سمجھ میں آجائے کہ وہ ایسا کیوں بنا......" ینگ بولا۔

"اس سے کیا فائدہ ہوگا؟" جاوید نے جاننا چاہا۔

"شاید ہم کچھ ایسی کوشش کر سکیں کہ آئندہ ہندوستان میں کوئی دوسرا سلطانہ ڈاکو پیدا نہ ہو۔" ینگ بولا۔

جاوید ملک چند لمحے خاموش رہا اور پُرخیال نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔ "چنبیلی نے آپ کی فرمائش کے جواب میں کیا کہا؟"

"پہلے تو وہ اس تصور سے ہی خوفزدہ ہوگئی کہ شاید میں اس کی مدد سے سلطانہ تک پہنچنا اور اسے ہلاک کرنا یا گرفتار کرنا چاہتا ہوں۔ بڑی مشکل سے اسے یقین آیا کہ میں واقعی صرف بات چیت کے لئے سلطانہ سے اکیلا ملنا چاہتا ہوں۔ جس طرح وہ چاہے گا اس طرح میں اس سے ملنے جاؤں گا۔ جہاں وہ بلائے گا، وہاں جاؤں گا۔ اس کی جو بھی شرط ہوگی مجھے منظور ہوگی۔" ینگ نے بتایا۔

"اور اگر اس نے دھوکے سے آپ کو بلا کر خدانخواستہ قتل کر دیا تو......؟" جاوید ملک بولا۔

"میں یہ خطرہ مول لینے کے لیے تیار ہوں......" ینگ نے اطمینان سے جواب دیا۔ "لیکن مسئلہ یہ ہے کہ فی الحال تو اس سے ملاقات کی نوبت ہی نہیں آسکتی۔ چنبیلی صرف بات چیت کے لئے سلطانہ سے میری ملاقات کرانے کے سلسلے میں ہر ممکن تعاون کے لئے تیار تو ہوگئی لیکن فی الحال وہ کچھ کرنے سے ہی معذور ہے کیونکہ سلطانہ کے ٹھکانے کا اسے قطعی کچھ پتا نہیں۔ حتیٰ کہ وہ اندازہ لگانے سے بھی قاصر ہے کہ سلطانہ کا ٹھکانہ کس علاقے میں ہو سکتا ہے۔ اسے یہ

بھی معلوم نہیں کہ اب سلطانہ کب اس سے رابطہ کرے گا...... اور کرے گا بھی یا نہیں؟ چنانچہ اس سلسلے میں وہ انتظار کرنے کے سوا کچھ نہیں کرسکتی۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمیں بھی انتظار کرنا پڑے گا۔"

"اگر اس دوران ہمارا سلطانہ یا اس کے گروہ سے سامنا ہو جاتا ہے تو ہم کیا کریں گے؟" جاوید نے جاننا چاہا۔

"قانون کے نمائندوں کی حیثیت سے ہم وہی کریں گے جو صورت حال کا تقاضا ہوگا......" ینگ بلا تامل بولا۔ "اگر ہم ان میں سے کسی کو زندہ گرفتار کرنے کی پوزیشن میں ہوں گے تو زندہ گرفتار کرنے کی کوشش کریں گے۔ ہلاک کرنا پڑا تو ہلاک کریں گے۔"

"اور اگر مرنا پڑا تو ہنسی خوشی مر بھی جائیں گے۔" جاوید ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ اس کا لہجہ قدرے طنزیہ تھا۔

"ظاہر ہے......" ینگ نے کندھے اچکاتے ہوئے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "یہ تو زندگی اور موت کی جنگ ہے...... ہمارے لیے بھی...... اور اُن کے لیے بھی...... جس کو جب مرنا ہوگا تو بس مرنا ہوگا...... چاہے وہ ہنسی خوشی مرے یا روتے پیٹتے مرے۔ اس سلسلے میں طنز وغیرہ سے صورت حال کو تبدیل کرنے میں کوئی مدد نہیں مل سکتی۔"



چنبیلی بہت اُداس تھی۔ اس کا دل بجھا ہوا تھا۔ مہینے سے اوپر ہو گیا تھا۔ سلطانہ کا کچھ پتا نہیں تھا اور نہ ہی اسکا کوئی پیغام آیا تھا۔ حالانکہ ایسا بھی نہیں تھا وہ کسی کھوہ یا کچھار میں منہ چھپا کر بیٹھ گیا ہو۔ چنبیلی کو اُڑتی اُڑتی خبریں ملتی رہتی تھیں کہ وہ ہر چار چھ دن بعد کہیں نہ کہیں ڈاکا ڈالتا تھا اور پولیس سے اس کی آنکھ مچولی بھی پہلے ہی کی طرح جاری تھی لیکن بس چنبیلی سے اس کا کوئی رابطہ نہیں ہوا تھا۔

ایسا لگتا تھا جیسے وہ اسے بھول ہی گیا تھا۔ اسی احساس نے چنبیلی کو اداس کر دیا تھا۔ اب ایسا بھی نہیں تھا کہ اس کے مکان کے سامنے پولیس سے سامنا ہونے کی وجہ سے سلطانہ اتنا ڈر گیا ہو کہ آئندہ اس نے کبھی ادھر کا رخ نہ کرنے کا عہد کر لیا ہو۔ چنبیلی کو معلوم تھا کہ وہ اس حد تک ڈرنے والا آدمی نہیں تھا البتہ اس واقعے کی وجہ سے وہ کھاتے پیتے اور خوشحال لوگ ضرور ڈر گئے تھے جن کے لیے چنبیلی کا نام شناسا تھا اور جو اسے مختلف موقعوں پر مجرے کے لیے بلاتے تھے۔

انہوں نے اسے بلانا چھوڑ دیا تھا۔ جب سے اس کی دروازے پر دو پولیس افسر قتل ہوئے تھے، دولت مندوں کے لئے وہ اچھوت ہو کر رہ گئی تھی۔ نہ جانے کس طرح دور دور تک یہ خبر پھیل گئی تھی کہ سلطانہ رات کے اندھیرے میں اس سے ملنے آیا کرتا تھا اور اسی کو پکڑنے کی کوشش میں وہ پولیس افسر مارے گئے تھے۔

ظاہر ہے اس کے بعد خوشحال طبقے کو یہ یقین ہو گیا تھا کہ وہ ایک خطرناک عورت تھی۔ کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ سلطانہ کی مخبر ہو۔ وہ جس گھر میں مجرا کرنے جاتی ہو، اس کی خوشحالی کے بارے میں سلطانہ کو آگاہ کرتی ہو اور واردات کے سلسلے میں اس کی راہنمائی کرتی ہو۔ اوپر سے پولیس نے چونکہ اس واقعے کے بعد ایک دن کے لیے بھی اسے نہیں پکڑا تھا اس لیے اس کے بارے میں یہ شبہ بھی پیدا ہو گیا تھا کہ شاید وہ پولیس کی بھی مخبر ہو اور دہرا کھیل کھیلتی ہو۔ اس امکان کے تحت اسے اور بھی زیادہ خطرناک فرض کر لیا گیا تھا۔ یوں آمدنی اور گزر اوقات کے ذریعے کے علاوہ ایک ایسی مصروفیت بھی ختم ہو گئی تھی جس سے زندگی میں کچھ ہلچل رہتی تھی۔

چنانچہ اب زندگی میں گویا کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ کوئی مصروفیت نہیں تھی۔ گھر کا کام کاج اور کھانا پکانا، چنبیلی کی ماں کے زمانے کا ایک پرانا وفادار ملازم کرتا تھا، اس لیے چنبیلی کے پاس یہ مصروفیت بھی نہیں تھی۔ چنانچہ اب وہ بس اس اچھے خاصے کشادہ گھر میں اداس اِدھر اُدھر پھرتی تھی۔ آہیں بھرتی تھی یا پھر اپنے چند پالتو پرندوں سے باتیں کرتی تھی۔ ان میں سے صرف ایک طوطا کبھی کبھار اس کی باتوں کے کچھ الٹے سیدھے جواب دے دیتا تھا ورنہ باقی سب پرندے مٹر مٹر اس کی طرف دیکھتے رہتے تھے یا پھر اپنی طرح طرح کی آوازوں میں بے معنی سا شور مچاتے رہتے تھے۔

اس روز بھی وہ اسی اداسی کے عالم میں صحن میں نیم کے درخت تلے پڑی ایک چارپائی پر نیم دراز تھی کہ باہر سے کسی پھیری والے نے آواز لگائی۔ "سبزی لے لو...... سبزی...... پورے ہندوستان میں اس سے سستی سبزی کوئی نہ بیچے گا...... سب سے سستی سبزی...... سبزی لے لو سبزی...... ایک دھڑی کے ساتھ ایک سیر مفت......"

چنبیلی اپنے ہی خیالوں میں گم تھی۔ شاید وہ سبزی والے کی آواز پر دھیان نہ دیتی لیکن ایک تو آواز بہت بلند تھی دوسرے چنبیلی کو اپنے مکان کے قریب اس قسم کی آواز کچھ عجب لگی۔ اس کا اکیلا مکان چونکہ آبادی سے ذرا ہٹ کر تھا، اس لیے گھوم پھر کر چیزیں بیچنے والے یہاں تک شاذ

و نادر ہی آتے تھے۔ سودا سلف لانا ملازم کی ذمے داری تھی۔ تاہم چنبیلی کو معلوم تھا کہ گھر میں کوئی سبزی موجود نہیں ہے۔ اس نے ملازم کو آواز دی کہ سبزی والے سے سبزی لے لے...... لیکن کوئی جواب نہ آیا۔

اس نے اٹھ کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ ملازم گھر میں نہیں تھا۔ شاید وہ اسے بتائے بغیر کہیں نکل گیا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ بتا کر گیا ہو لیکن وہ چونکہ صبح سے اپنے خیالوں میں کچھ زیادہ ہی گم تھی شاید اس لیے اس نے نہ سنا ہو۔ یہ سوچ کر وہ اٹھی اور چادر سے سر اور جسم کے بالائی حصے کو اچھی طرح ڈھانپ کر گھر سے نکلی۔ اسے یہ دیکھ کر قدرے حیرت ہوئی کہ سبزی والا گھوڑا گاڑی میں سبزی لادے ہوئے تھا۔ گھوڑا گاڑی بڑی تھی اور سبزی تھوڑی سی تھی۔ شاید زیادہ سبزی بک چکی تھی۔

شاید دھوپ کی وجہ سے سبزی فروش نے اپنی پگڑی کے کچھ حصے سے تھوڑا سا چہرہ بھی چھپایا ہوا تھا۔ چنبیلی بھی چادر سے آدھا چہرہ چھپائے آگے بڑھی۔ عام حالات میں چنبیلی کا حلیہ اور چال ڈھال دیکھ کر کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ ناچنے گانے والی عورت تھی۔ سبزی فروش اس کے گھر کے سامنے ہی گاڑی کی آڑ میں ذرا ترچھا کھڑا ہوا تھا۔ چنبیلی آگے بڑھی تو وہ اس کی طرف مڑا اور چنبیلی کا دل گویا دھڑکنا ہی بھول گیا۔ وہ سلطانہ تھا۔ اسے دیکھ کر سلطانہ نے اپنی پگڑی کا وہ حصہ ایک طرف کو کر لیا جس نے اس کا چہرہ چھپایا ہوا تھا۔ تاہم سلطانہ کا مکمل چہرہ دکھائی نہ دینے کے باوجود چنبیلی نے اسے پہچان لیا تھا۔

سلطانہ مسکرا دیا...... اور تب غیر ارادی طور پر چنبیلی بھی مسکرا دی۔ اس کی آنکھیں جو ایک لمحہ پہلے تک بجھی بجھی سی دکھائی دے رہی تھیں ان میں گویا ستارے جھلملا اٹھے۔ سلطانہ ذرا شریر سے لہجے میں بولا۔ ”دیکھ لو...... تمہاری خاطر ہم سبزی والے بھی بن گئے۔“

”کاش...... تم سچ مچ سبزی والے ہوتے...... پھر شاید تم مجھ سے شادی کر لیتے۔“ چنبیلی مصنوعی آہ بھر کر بولی۔

”اگر میں سچ مچ سبزی والا ہوتا تو تم آنکھ اٹھا کر بھی میری طرف نہ دیکھتیں۔“ سلطانہ مسکراتے ہوئے بولا۔

”تم نے تو پلٹ کر میری خبر ہی نہیں لی کہ اس رات کے بعد مجھ پر کیا گزری......“ چنبیلی نے اصل موضوع پر آتے ہوئے شکوہ کیا۔ ”اگر پولیس مجھے پکڑ کر لے جاتی تو......؟“

”تو پھر سلطانہ ضروری تمہاری مدد کو آتا......“ سلطانہ سنجیدہ ہوتے ہوئے بلا تامل بولا۔ ”تم پر کوئی بھی مشکل پڑتی تو سلطانہ اپنی جان پر کھیل کر بھی تمہاری مدد کو پہنچنے کی کوشش ضرور کرتا۔“

”اچھا...... خیر...... باتیں بنانا چھوڑو......“ چنبیلی بولی۔ ”یہ بتاؤ کیا تم آج یہیں ٹھہرو گے؟“

”نہیں...... فی الحال میں ٹھہرنے نہیں آیا ہوں......“ سلطانہ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولا۔ ”البتہ میں نے ایک دوسری جگہ کا بندوبست کر لیا ہے جہاں ہماری ملاقات ہوا کرے گی اور ہم وہاں ایک رات کے لئے ٹھہرا کریں گے۔ وہ جگہ یہاں سے سات آٹھ کوس دور ہے وہ ایک سادھو کا ڈیرہ ہے۔ تمہیں شاید یہ جان کر حیرت ہوگی کہ اب تم سنت اور سادھو بھی سلطانہ کے جاننے اور ماننے والوں میں شامل ہوتے جا رہے ہیں اور میرے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار ہیں۔ اس سادھو کو جب میرا پیغام ملے گا۔ وہ ایک دو دن کے لئے اپنا ڈیرہ چھوڑ کر چلا جایا کرے گا۔ وہ ایک کھلے میدان میں ایک بہت بڑے درخت کے نیچے بنے ہوئے بڑے سے جھونپڑے میں رہتا ہے جس میں ضرورت کی ہر چیز موجود ہوتی ہے۔ وہاں تک آنے میں تمہیں کافی فاصلہ کھلے، میدانی علاقے میں ہی طے کرنا پڑے گا۔ اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ تم ذرا بھی خیال رکھو گی تو تمہیں پتا چل جائے گا کہ کوئی تمہارا پیچھا تو نہیں کر رہا۔“

”میں وہاں آؤں گی کیسے......؟ پیدل......؟“ چنبیلی نے پوچھا۔

”کیوں...... کیا پیدل نہیں آ سکتیں؟ سات آٹھ کوس اتنا زیادہ فاصلہ تو نہیں......“ سلطانہ بولا۔

”میں تو ویسے ہی پوچھ رہی تھی۔ تمہاری خاطر سات آٹھ میل کا فاصلہ تو میں کانٹوں پر چل کر بھی طے کر سکتی ہوں۔“ چنبیلی بولی۔ ”لیکن...... میں اب ایسا سنگدل بھی نہیں کہ عشق میں تمہیں کانٹوں پر چلاؤں۔ میں تو مذاق کر رہا تھا۔ تمہیں پیدل بھی نہیں چلنا پڑے گا۔ تم نے بتایا تھا کہ تمہیں گھڑسواری آتی ہے لیکن تمہارے پاس گھوڑا نہیں ہے۔ یہ گھوڑا میں تمہارے لیے ہی لایا ہوں......“ سلطانہ نے گاڑی میں جتے ہوئے گھوڑے کی طرف اشارہ کیا۔ ”بے چارہ گاڑی کھینچنے والا گھوڑا نہیں ہے۔ بڑی اچھی نسل کا...... سواری کا گھوڑا ہے۔ یہ میں تمہارے لیے چھوڑ جاؤں گا۔ تھوڑی دور تک میں اس گاڑی کو خود کھینچ کر لے جاؤں گا اور اس کے اصل مالک کے حوالے کر دوں گا۔ میرا گھوڑا اس وقت اسی کے پاس ہے۔ وہاں سے میں واپس روانہ ہو جاؤں

گا۔

"لگتا ہے، ملاقاتوں کا نیا بندوبست کرنے کے لئے تمہیں کافی پاپڑ بیلنے پڑے ہیں؟" چنبیلی کے ہونٹوں پر ایک بار پھر شریری مسکراہٹ آ گئی۔

"ہاں...... سنا ہے عشق میں صدیوں سے لوگ یونہی پاپڑ بیلتے آئے ہیں......" سلطانہ ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولا۔ "اب تم مجھ سے اس سادھو کے ڈیرے تک پہنچنے کا راستہ سمجھ لو۔ بہت آسان راستہ ہے۔"

اس نے راستہ چنبیلی کو سمجھایا۔ جب سب کچھ اس کی سمجھ میں آ گیا تو سلطانہ بولا۔ "جب بھی میں تمہیں بلانا چاہوں گا اس روز دن چڑھے تک میرا کوئی نہ کوئی آدمی کسی نہ کسی بہروپ میں تمہیں صرف یہ پیغام دے جایا کرے گا کہ تمہیں وقت کے سلطان نے بلایا ہے۔ اس روز تم دوپہر کے دو تین بجے تک روانہ ہو جایا کرو۔ راستے میں کہیں بھی اگر تمہیں ذرا بھی شک ہو جائے کہ کوئی تمہارا پیچھا کر رہا ہے تو تم کسی اور طرف نکل جایا کرو اور کوئی چھوٹا موٹا کام کر کے واپس آ جایا کرو۔ سمجھ گئیں نا سب کچھ؟"

چنبیلی نے اثبات میں سر ہلایا تو سلطانہ نے ایک بار پھر چاروں طرف دیکھا۔ مطمئن ہو کر اس نے گھوڑے کو گاڑی سے الگ کیا اور چنبیلی کو اس کی لگام تھما دی۔

"کیا میں اُمید رکھوں کہ تمہارا آدمی پہلی بار اس نئی جگہ پر ملاقات کا پیغام لے کر جلدی آئے گا؟" چنبیلی نے پوچھا۔

"بہت بے تابی ہے؟" سلطانہ شریر انداز میں مسکرایا۔

"ہاں...... بے تابی بھی ہے اور تم سے کچھ ضروری باتیں بھی کرنی ہیں۔" چنبیلی بولی۔ پھر وہ سبزی اور گھوڑے کو گھر کے صحن میں لے گئی۔ اس کے گھر کا دروازہ بند ہو گیا۔ سلطانہ چند لمحے وہیں کھڑا پُرخیال انداز میں بند دروازے کو دیکھتا رہا۔ پھر سبزی کی گاڑی کو کھینچتا ہوا آگے چل دیا۔



نئے طریقہ کار کے مطابق چنبیلی سے سلطانہ کی ملاقاتیں شروع ہو گئی تھیں۔ ملنے کے لئے سادھو کا ڈیرہ ایک اچھی جگہ ثابت ہو رہا تھا۔ کم از کم فی الحال تو سلطانہ کو وہاں کوئی خطرہ محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ چنبیلی اس کا پیغام ملنے کے بعد مقررہ دن گھر سے نکلتی تھی اور گھوڑے پر سوار نہایت بے خوفی سے سادھو کے ڈیرے پر پہنچ جاتی تھی جہاں سلطانہ اس کا منتظر ہوتا تھا۔ سادھو اس دوران کسی بستی کے دورے یا آوارہ گردی پر نکل چکا ہوتا تھا۔ وہ بھی سلطانہ کے ہزاروں عقیدت مندوں میں سے ایک تھا اور اس کی خواہش ہوتی تھی کہ سلطانہ زیادہ سے زیادہ وقت اپنے من پسند انداز میں گزار سکے۔

پہلی ہی ملاقات میں چنبیلی نے سلطانہ کو بتا دیا تھا کہ انگریز ڈی ایس پی فریڈی ینگ اس کے پاس آیا تھا اور اس نے فرمائش کی تھی کہ سلطانہ سے اس کی صرف ایک ملاقات کرا دی جائے وہ اس سلسلے میں سلطانہ کی ہر شرط ماننے کے لیے تیار تھا۔ یہ سن کر سلطانہ پہلے تو حیران ہوا تھا۔ پھر اس کی پیشانی پر شکنیں ابھر آئی تھیں اور وہ سوچ میں پڑ گیا تھا۔

"وہ مجھ سے کیوں ملنا چاہتا ہے؟" سلطانہ نے سوال تو چنبیلی سے کیا تھا لیکن اس کا انداز خود کلامی کا سا تھا۔

"میں تو خیر کیا بتا سکتی ہوں......" اس کے بازوؤں میں سمٹی ہوئی چنبیلی نے اپنی مخصوص دلکش مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا تھا۔ "اسے شاید خود بھی صحیح طرح معلوم نہیں ہے کہ وہ کیوں تم سے ملنا چاہتا ہے۔"

سلطانہ ایک لمحے پُرخیال انداز میں خاموش رہا، پھر بولا۔ "میں اس بارے میں سوچوں گا۔ میں اس سے ڈرتا نہیں ہوں لیکن احتیاط بہرحال ضروری ہے۔ مجھے انگریزوں پر اعتبار نہیں ہے۔ زیادہ تر انگریز مکار ہوتے ہیں۔ ہو سکتا ہے اس نے مجھے دھوکے سے پکڑنے کی کوئی

ترکیب سوچی ہو۔"

"وہ تو سب کچھ تم پر چھوڑنے کے لیے تیار ہے۔" چنبیلی بولی۔ "وہ اس حد تک تم پر اعتبار کرنے کے لیے تیار ہے کہ اس نے کہا ہے کہ جگہ تم اپنی مرضی کی بتا دو۔ بے شک وہ کوئی کھلا میدان ہو جہاں تم دور سے اسے آتے ہوئے دیکھ سکو۔ وہ اکیلا آئے گا۔ اس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہوگا لیکن تم پر کوئی پابندی نہیں ہوگی تم جو ہتھیار چاہو اپنے ساتھ لا سکتے ہو۔ مجھے تو اس کی باتوں سے کچھ یوں لگا جیسے وہ اپنی جان تمہارے ہاتھوں میں دے رہا ہے۔ وہ تمہیں پورا موقع دے رہا ہے کہ تم چاہو تو اسے مار ڈالو۔"

"نہیں پگلی......!" سلطانہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ آدمی نظر کا اور دماغ کا بہت تیز ہے۔ مجھے اس نے بہت سرسری سا دیکھا ہے، پھر بھی سمجھ گیا ہے کہ میں اسے دھوکے سے نہیں ماروں گا۔ حالانکہ میں اسے اس طرح مار بھی دوں تو یہ کوئی بے انصافی نہیں ہوگی۔ اس کے آدمیوں نے بھی گھات لگا کر دھوکے سے مجھے مارنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔"

"اس بات کا بھی ذکر آیا تھا۔" چنبیلی بولی۔ "اس نے بتایا تھا کہ اس نے اپنے آدمیوں کو ایسا کوئی حکم نہیں دیا تھا۔ ان بے چاروں نے خود ہی زیادہ ہوشیار بننے اور موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تھی۔ ینگ نے تو انہیں پہلے صرف جاسوسی کرنے کا ہی حکم دیا تھا۔ وہ تو پہلے ٹھیک طرح سے جاننا چاہتا تھا کہ کبھی کبھار رات کو جو آدمی مجھ سے ملنے آتا ہے وہ واقعی سلطانہ ڈاکو ہے یا کوئی اور......"

"تم اس کی بڑی وکالت کر رہی ہو......!" سلطانہ شریری مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

"کیوں نہ کروں...... مجھ پر تو اس نے ایک طرح سے بہت بڑی مہربانی کی ہے۔ وہ چاہتا تو مجھے اٹھوا کر جیل یا پھر نہ جانے کہاں بھجوا دیتا۔ تمہیں پتا بھی نہ چلتا کہ چنبیلی کہاں گئی اور پھر میرا نہ جانے کیا حشر ہوتا۔" چنبیلی بولی۔

"اگر ایسا ہوتا تو پھر فریڈی ینگ یہاں سے لے کر نینی تال تک پولیس والوں کی لاشیں اٹھاتے اٹھاتے تھک جاتا۔" سلطانہ کے لہجے میں ہلکی سی غراہٹ آ گئی لیکن دوسرے ہی لمحے وہ ایک بار پھر خوش دلی سے مسکراتے ہوئے بولا۔ "کہیں ایسا تو نہیں کہ تمہارا اس پر دل آ گیا ہو؟"

"توبہ...... توبہ...... کیسی بے ہودہ باتیں کرنے لگے ہو تم۔" چنبیلی مصنوعی خفگی سے بولی۔

"اچھی خاصی عمر کا آدمی ہے وہ...... میں تو اس سے ساری بات چیت اس طرح کر رہی تھی جس طرح انسان گھر کے کسی بڑے بزرگ سے کرتا ہے۔"

"خیر...... اب وہ ایسا بزرگ بھی نہیں ہے۔ بڑا ٹھیک ٹھاک آدمی ہے...... اور پھر چمڑی بھی گوری ہے۔" سلطانہ کے لہجے میں شرارت برقرار رہی۔

"مجھے اچھی نہیں لگتی گوری چمڑی...... اور تم یہ اِدھر اُدھر کی باتیں چھوڑو...... یہ بتاؤ اگر ینگ مجھ سے جواب لینے آ گیا تو میں اس سے کیا کہوں؟" چنبیلی سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔

"اس سے کہنا ایسی جلدی بھی کیا ہے۔ میں سوچ کر جواب دوں گا۔" سلطانہ نے بھی سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے جواب دیا تھا۔

اس بات کو تین ماہ گزر گئے تھے لیکن سلطانہ کسی فیصلے پر نہیں پہنچ سکا تھا۔ چنانچہ یہ معاملہ بیچ میں ہی لٹکا ہوا تھا۔ تاہم سلطانہ اور ینگ دونوں ہی اپنے اپنے محاذ پر بدستور سرگرم تھے۔ سلطانہ اپنے گروہ کے ساتھ اسی طرح دیدہ دلیری سے ڈاکے مار رہا تھا اور ینگ اپنی پولیس پارٹی کے ساتھ اسے قابو کرنے میں یا پھر ہلاک کرنے کے لیے کوشاں تھا۔ اسے جتنے بھی مخبر میسر تھے۔ اس نے ان کے دلوں میں نیا جوش و جذبہ بھرنے اور انہیں زیادہ متحرک کرنے کی کوشش کی تھی۔

اس نے نینی تال سے لے کر ترائی کے پورے علاقے کی بستیوں، دیہات اور شہروں کے علاوہ جنگلات کے بھی نئے نقشے تیار کرائے تھے۔ اس نے ایک سرے سے دھیرے دھیرے جنگلات کو کھنگالنا بھی شروع کیا تھا لیکن یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اس سے اور اس کے دو تین انگریز ساتھیوں سے زیادہ خود ہندوستانی پولیس افسر اس کام سے گھبراتے تھے۔ ان عجیب و غریب جنگلات میں سلطانہ اور اس کے ساتھیوں کو تلاش کرنا ایسا ہی تھا جیسے بھوسے کے بہت بڑے ڈھیر میں سوئی تلاش کرنا...... اور پھر یہ بات بھی یقینی نہیں تھی کہ سلطانہ کسی جنگل میں ہی چھپا ہو۔ ینگ سوچتا تھا عین ممکن ہے ان لوگوں نے کوئی چھوٹی سی بستی آباد کر رکھی ہو جہاں وہ لوگ شرفاء کی طرح رہتے ہوں اور کسی کسی رات چپکے سے ڈاکے مارنے کے لیے نکلتے ہوں۔

چنانچہ وہ ایک سرے سے چھوٹی چھوٹی بستیوں اور گاؤں دیہات کو بھی خاموشی سے چیک کر رہا تھا جو بے ترتیبی سے ہزاروں مربع میل کے علاقے میں پھیلے ہوئے تھے۔ یہ کام وہ بہت احتیاط سے کر رہا تھا تاکہ سلطانہ خبردار نہ ہونے پائے اور اگر ان لوگوں نے ایسا ہی کوئی ٹھکانا بنا رکھا ہو تو وہ لوگ وہاں سے غائب نہ ہو جائیں۔ اس کی خاموشی اور احتیاط کی وجہ سے یہ کام بہت

آہستگی سے ہو رہا تھا اور فی الحال اسکا کوئی نتیجہ سامنے نہیں آیا تھا۔ وہ سلطانہ کے ہر ڈاکے کی خبر ملتے ہی مستعدی سے وہاں پہنچتا تھا اور تمام شواہد کا باریک بینی سے جائزہ لیتا تھا۔

فوری طور پر تو وہ اپنی پارٹی کے ساتھ سلطانہ کے گروہ کا پیچھا کرنے کی کوشش کرتا تھا لیکن کبھی ان کی گرد کو بھی نہیں پا سکا تھا۔ وہ آندھی طوفان کی طرح آتے تھے اور اپنا کام کر کے چھلاوے کی طرح غائب ہو جاتے تھے۔ ان کی وارداتوں کے انداز سے بھی ان کے مرکز کے بارے میں کوئی اشارہ نہیں ملتا تھا۔ کبھی وہ شمال میں کسی شہر یا قصبے میں ڈاکا ڈالتے اور کبھی خبر آتی کہ انہوں نے اس سے پچاس میل دور جنوب میں کسی بستی پر دھاوا بولا ہے۔ یوں ان کے بارے میں کبھی اندازہ نہیں ہو پاتا تھا کہ وہ کہاں سے آتے تھے اور کہاں غائب ہو جاتے تھے۔

ان کے بارے میں یہی گماں گزرتا تھا جیسے وہ جنات کا ٹولا ہوں۔ گاؤں دیہات کے زیادہ تر سادہ لوح لوگوں کا خیال یہی تھا کہ وہ لوگ پُر اسرار اور مافوق الفطرت صلاحیتوں کے بھی مالک تھے۔ بہت سے دولت مندوں اور خوشحال لوگوں کا یہ بھی خیال تھا کہ شاید دیوی دیوتا ان سے ناراض ہو گئے تھے اس لیے انہوں نے سلطانہ اور اس کے ٹولے کو انہیں سزا دینے کے لیے بھیجا تھا۔ اس خیال سے انہوں نے دان پُن، خیرات امداد بھی شروع کر دی تھی لیکن اس سے بھی لوگوں کے لٹنے کی رفتار میں کوئی کمی نہیں آئی تھی بلکہ جس طرح سلطانہ کے گروہ کی وارداتوں کا دائرہ پھیل رہا تھا۔ ینگ کو خطرہ محسوس ہو رہا تھا کہ کچھ عرصے بعد سلطانہ انگریز سرکار کا منہ چڑاتے ہوئے دلّی تک جا پہنچے گا اور راجدھانی کو بھی لوٹنا شروع کر دے گا۔ اس وقت تک شاید اس کا گروہ بھی بڑھتے بڑھتے ایک لشکر میں تبدیل ہو چکا ہوگا۔ ریکارڈ سے ینگ کو اندازہ ہوا تھا کہ شروع میں ان لوگوں کا گروہ شاید چھ سات آدمیوں پر مشتمل تھا لیکن بڑھتے بڑھتے اب ان کی تعداد شاید پچیس سے تیس کے درمیان ہو چکی تھی ...... اور وہ سب کے سب زبردست جنگجو بلکہ گوریلا جنگ کے ماہر تھے۔

بہرحال ینگ اپنی سی کوششوں میں مصروف تھا اور اگر کچھ فارغ وقت میسر آ جاتا تھا تو اس میں کچھ توجہ اپنے مشاغل کی طرف بھی دینے کی کوشش کرتا تھا۔ اس کے مشاغل بھی کسی حد تک عالمانہ سے ہی تھے۔ اس وقت بھی وہ اپنے ایک مشغلے کے سلسلے میں ایک قدیم مندر کے کھنڈرات میں آیا ہوا تھا اور چند دیواروں پر نقش و نگار کے سے انداز میں لکھی ہوئی کچھ عبارتیں اپنی ڈائری میں نہایت انہماک اور دلچسپی سے نقل کر رہا تھا۔

مندر بہت بڑا تھا لیکن اب اس کے محض کھنڈرات ہی رہ گئے تھے۔ یہاں کسی دیوی دیوتا کا بت نہیں تھا اور نہ ہی کوئی پوجا پاٹ کے لیے آتا تھا۔ کبھی شاید اس کے آس پاس کوئی آبادی رہی ہو لیکن اب دور دور تک ویرانہ ہی تھا اور تیز ہواؤں کے ساتھ خاک اڑتی تھی۔ ینگ گھوڑے پر وہاں آیا تھا جو اس وقت باہر کھڑا تھا۔ ینگ ایک پتھر پر بیٹھا کام میں مصروف تھا۔ چاروں طرف سکوت چھایا ہوا تھا لیکن چند لمحے بعد گھر گھراہٹ کی سی آواز سن کر ینگ چونک اٹھا۔ آواز لحہ بہ لحہ قریب آ رہی تھی۔

اس نے کھڑے ہو کر ایک ٹوٹی ہوئی دیوار کے عقب سے باہر دیکھا تو گہری سانس لے کر رہ گیا۔ ایک نیلی کار جس کی چھت کینوس کی تھی، کچے راستے پر دھول اُڑاتی ہچکولے کھاتی مندر کی طرف چلی آ رہی تھی۔ وہ الزبتھ کی کار تھی جسے پہچان کر اس نے گہری سانس لی تھی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس وقت اس علاقے میں الزبتھ آ سکتی تھی۔

مندر کے قریب پہنچ کر الزبتھ نے گھوڑے سے کچھ فاصلے پر گاڑی روکی اور انجن بند کر کے اُتر آئی۔ اس کے سنہرے، ریشمی بال ہوا میں لہرانے لگے۔ اس نے اپنے گلے میں بندھا ہوا اسکارف کھول کر سر پر باندھ لیا۔ نیلے اسکرٹ، لمبی گلابی جرابوں اور سیاہ جوتوں میں وہ بے حد اسمارٹ، تازہ دم اور خوبصورت لگ رہی تھی۔ ینگ کے دل کی دھڑکنیں کچھ تیز ہو گئیں لیکن اس کی وجہ یہ احساس نہیں تھا کہ ایک نہایت حسین اور نوجوان لڑکی اس ویران اور تنہائی میں اس سے ملنے آ پہنچی تھی۔

اس کا دل جذبات کی شدت سے نہیں، اندیشوں کی یورش سے دھڑکا تھا۔ پچھلے چند مہینوں میں اس کی طرف الزبتھ کا التفات بہت بڑھ گیا تھا اور اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ اسکی پیش قدمی کو کیونکر روکے۔ رکھائی اختیار کرنا بھی اس کے بس کی بات نہیں تھی کیونکہ وہ ایک طرح سے کچھ زیادہ ہی بداخلاقی محسوس ہوتی تھی اور بداخلاقی ینگ کی فطرت اور مزاج میں نہیں تھی لیکن اس میں الزبتھ کے التفات کا جواب التفات سے دینے کی بھی ہمت نہیں تھی۔

اس کی ایک وجہ تو یہی تھی کہ وہ اس کے افسر کی بیٹی تھی لیکن اس سے قطع نظر بھی، یہ ایک عجیب، بے جوڑ سا معاشقہ خود اس کے اپنے دل کو نہیں بھاتا تھا۔ اس کی جگہ اگر کوئی اور ہوتا تو شاید فخر کے احساس سے اس کا سینہ کچھ چوڑا ہو جاتا کہ اس عمر میں بھی ایک حسین، نوجوان اور پڑھی لکھی لڑکی اس تیزی سے اس کی طرف پیش قدمی کر رہی تھی اور اسے اپنی زندگی کا ساتھی

بنانے کی خواہش کا اظہار واضح طور پر کر چکی تھی۔ ینگ یہی سوچتا تھا کہ یہ بات جب اس کے باپ کے...... بلکہ کسی کے بھی علم میں آئے گی تو وہ یقیناً یہی سوچے گا کہ ینگ نے نہ جانے کس طرح بہلا پھسلا کر اور چکنی چپڑی باتیں کر کے اس راہ پر لگایا ہوگا۔ کون یقین کر سکتا تھا کہ وہ اب تک ایک دھیما سا گریزاں انداز اختیار کرتے ہوئے، بڑی مشکل سے اپنے اور اس کے درمیان ایک نادیدہ سا فاصلہ برقرار رکھے ہوئے تھا۔ الزبتھ نے اسے دیکھ کر پُرجوش انداز میں ہاتھ ہلا کر ''ہیلو'' کہا تو اس نے بھی دھیرے سے ہاتھ ہلا کر ہیلو کہا۔ الزبتھ پتھروں اور ملبے پر کسی کھلاڑی کی سی مہارت سے چڑھتی اترتی اندر آگئی اور حیرت سے اِدھر اُدھر مندر کے شکستہ در و دیوار کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ''خدا کی پناہ......! آپ اس ویرانے میں اس اجاڑ جگہ پر کیا کر رہے ہیں؟''

ینگ نے متانت سے مسکراتے ہوئے اپنی ڈائری آہستگی سے اس کے سامنے لہرائی پھر دیوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''ان دیواروں پر محبت کی ایک لافانی سی کہانی درج ہے۔ میں وہ اپنی ڈائری میں نقل کر رہا ہوں۔''

الزبتھ نے ذرا جھک کر آنکھیں سکیڑتے ہوئے دیوار پر درج عبارت کو دیکھا اور بولی۔

''یہ کون سی زبان ہے؟''

''سنسکرت۔'' ینگ نے جواب دیا۔

''آپ کو یہ زبان بھی آتی ہے؟'' الزبتھ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے آنکھیں پھیلائیں۔ ینگ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اُف خدایا......! آپ کو کیا کچھ آتا ہے؟'' الزبتھ کی حیرت برقرار رہی۔

''میں نے کبھی غور نہیں کیا کہ مجھے کیا کچھ آتا ہے۔'' ینگ مسکراتے ہوئے بولا۔

الزبتھ اپنے صاف ستھرے اسکرٹ کی پروا کیے بغیر ایک ٹوٹی ہوئی نیچی سی دیوار پر بیٹھ گئی اور گہری سانس لے کر بولی۔ ''اچھا...... تو آپ سنسکرت میں لکھی ہوئی...... انجانے لوگوں کی قدیم محبت کی کہانی کو اتنے پیار سے اپنی ڈائری میں نقل کرنے کے لیے اس ویرانے میں مٹی پھانک رہے ہیں لیکن اگر کوئی آپ کے آرام دہ گھر میں بیٹھ کر آپ کی مادری زبان میں آپ کو اپنی محبت کی کہانی سنانے کی کوشش کرتا ہے تو وہ آپ کی سمجھ میں ہی نہیں آتی اور آپ اس میں دلچسپی ہی نہیں لیتے۔''

ینگ ایک لمحے خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ الزبتھ بھی پلک جھپکائے بغیر اس کی

طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر مدھم، مگر کچھ شریر سی مسکراہٹ تھی۔ آخر ینگ ایک بوجھل سی سانس لے کر بولا۔ ''لز...... میری اچھی دوست...... دراصل بعض محبتیں محبتیں نہیں نادانیاں ہوتی ہیں مگر انسان کو اس حقیقت کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے۔ جب آپ کا کوئی دوست...... جس کی آپ دل سے قدر کرتے ہوں، ایسی نادانی کا شکار ہو رہا ہو تو اس کی نادانی کو ہوا دینے کے بجائے اسے اس دلدل میں گرنے سے بچانے کی کوشش کرنی چاہیے۔''

''اوہ...... خدایا......!'' ایک تیز سانس لے کر الزبتھ نے کچھ اس طرح دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا جیسے سر پیٹتے پیٹتے رک گئی ہو۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ سر اٹھا کر بوجھل لہجے میں بولی۔ ''اچھا...... ٹھیک ہے۔ اب کم از کم آج کے دن میں اس موضوع پر مزید کوئی بات کرنے سے میں اپنے آپ کو باز رکھنے کی کوشش کروں گی۔''

''یہ کی ہے تم نے کچھ عقل کی بات......'' ینگ مسکرایا۔ ''یونہی دھیرے دھیرے پوری طرح عقل آ ہی جائے گی۔'' پھر اس نے گویا موضوع تبدیل کرنے اور الزبتھ کا دھیان بٹانے کی کوشش کی۔ ''یہ بتاؤ، تم یہاں تک پہنچیں کیسے؟''

''میں پہلے آپ کے گھر گئی۔'' الزبتھ نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔ شاید اس نے خود بھی اپنے دل کی بات کی طرف سے اپنا دھیان ہٹانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ''آپ کے ملازم نے بتایا کہ آپ اس مندر میں ہوں گے۔ وہ بے چارہ تو یہاں تک میرے ساتھ آنے کو بھی تیار تھا لیکن میں نے جان بوجھ کر اسے ساتھ نہیں لیا۔ اس سے صرف راستہ سمجھ لیا اور غنیمت ہے کہ میں بھٹک کر کہیں اور نہیں پہنچ گئی۔''

پھر اس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور کافی حد تک خوشگوار لہجے میں بولی۔ ''کون سوچ سکتا ہے کہ ایک انگریز پولیس آفیسر اس وقت اس ویرانے میں ایک متروک مندر میں جھک مار رہا ہوگا......! ویسے اس میں شک نہیں کہ آپ کے شوق ہیں بڑے عجیب عجیب......!''

''ہاں...... کبھی کبھی میں خود بھی سوچتا ہوں کہ اگر میں پولیس آفیسر نہ ہوتا تو کیا ہوتا؟ شاید میں شاعر یا ادیب ہوتا...... شاید ماہر آثار قدیمہ ہوتا یا پھر شاید کوئی ریسرچ اسکالر ہوتا۔'' ینگ بولا۔

''آپ چاہے جو کچھ بھی ہوتے لیکن مجھے یقین ہے کہ آپ ایسے ہی سنگدل ہوتے جیسے

اب ہیں۔'' الزبتھ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔

''اس بات پر تم تو کیا...... شاید کوئی بھی یقین نہ کرے کہ ایک پولیس آفیسر اور حکمران طبقے کا فرد ہوتے ہوئے بھی میں کتنا نرم دل اور حساس ہوں۔ انسان اپنا سینہ چیر کر اپنا دل کسی کو نہیں دکھا سکتا۔'' ینگ مسکرایا۔

''میرا دل تو یہی چاہتا ہے کہ آپ جو کچھ کہیں، میں اس پر یقین کرلوں۔ کیونکہ آپ ایک سچے انسان ہیں اور آپ کو زندگی کے بڑے تجربے حاصل ہیں۔ میں تو ایک بے وقوف سی لڑکی ہوں...... لیکن کیا کروں۔ میرا دل تو اور بھی نہ جانے کیا کچھ کہتا رہتا ہے۔'' پھر وہ دونوں ہاتھ ہوا میں جھٹک کر اٹھتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھ کر بولی۔ ''اچھا...... خیر...... چھوڑیں ان باتوں کو...... یہ بتائیں آپ کو اس ویرانے میں ایک ٹوٹے پھوٹے مندر میں بیٹھ کر ایک لمحے کے لیے بھی خوف محسوس نہیں ہوا کہ اگر اتفاق سے سلطانہ ڈاکو ادھر نکل آئے تو کیا ہوگا؟ وہ تو آپ کو فوراً گولی مار دے گا۔ آپ کے پاس تو اس وقت پستول بھی نہیں ہے۔''

''اسی لیے تو وہ مجھے کوئی گولی نہیں مارے گا، کیونکہ میں اس وقت غیر مسلح ہوں۔'' ینگ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''وہ مجھے صرف اس وقت مارنے کی کوشش کرے گا جب ہم دونوں کے ہاتھوں میں بندوق ہوگی اور دونوں میں سے کسی ایک کی بقاء کا مسئلہ ہوگا۔''

پھر اسے گویا کچھ یاد آیا اور وہ بولا۔ ''اس وقت تو وہ مجھے اس لیے بھی ہلاک نہیں کرسکتا کہ میں ایک مندر میں بیٹھا ہوں۔ چاہے یہ ایک متروک مندر ہے...... محض ایک کھنڈر ہے...... لیکن وہ اس کے احترام میں بھی ہتھیار نہیں اٹھائے گا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ مسجد اور گرجا کا بھی احترام کرتا ہے۔ وہ عبادت گاہوں کے آس پاس کے علاقے میں کبھی لوٹ مار نہیں کرتا۔ گویا عبادت گاہوں کے آس پاس رہنے والوں کو اس کی طرف سے امان حاصل ہوتی ہے اور مزید دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ خود کبھی کسی بھی قسم کی کوئی عبادت نہیں کرتا۔ وہ ایک دلچسپ کردار ہے۔ اسے اور اس کے گروہ کو پکڑنے یا ہلاک کرنے کی ذمہ داری میرے سپرد کی گئی ہے لیکن میں اپنی ذمے داری پوری کرنے کی کوشش کے ساتھ ساتھ اس کردار پر ریسرچ بھی کررہا ہوں۔ اس کے بارے میں میں نے کئی ایسی باتیں نوٹ کی ہیں جو عام لوگ نہیں جانتے...... اور نہ ہی وہ مجھے کسی نے بتائی ہیں۔''

''اچھا...... اب آپ محبت کی یہ قدیم داستان اپنی ڈائری میں نقل کرنے کا کام مکمل کرلیں

تاکہ آپ کا گھر واپس جانے کا کوئی امکان پیدا ہوسکے۔'' الزبتھ بولی۔ ''بس...... اب تم آگئی ہو تو میں اس کام کو ادھورا چھوڑ دیتا ہوں۔ زندگی نے مہلت دی تو یہ پھر کبھی مکمل ہوجائے گا۔ آؤ...... گھر چلتے ہیں۔'' ینگ باہر کی طرف چل دیا۔

''سلطانہ کے سلسلے میں کامیابی کی کوئی امید نظر آرہی ہے یا نہیں؟'' الزبتھ نے اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے پوچھا۔ ''میں کسی بھی سلسلے میں اس وقت تک پرامید ہی رہتا ہوں جب تک وقت میری ہر امید کو چکنا چور نہ کردے۔ میں جلد مایوس ہونے والا آدمی نہیں ہوں۔'' ینگ نے جواب دیا۔

''ہاں...... آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میرا خیال ہے آپ مایوس ہونے والے نہیں، مایوس کرنے والے آدمی ہیں۔'' الزبتھ نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا اور ایک بار پھر قدرے شرارت سے مسکرادی۔

ینگ نے بھنویں اُچکا کر عجیب سی نظروں سے اس کی طرف دیکھا لیکن اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے مبہم سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ''خدا کا شکر ہے تم مسکرائیں تو سہی۔''

باہر آکر ینگ اپنے گھوڑے پر سوار ہوکر آگے آگے روانہ ہوا۔ الزبتھ اپنی گاڑی میں اس کے پیچھے آنے لگی۔



سلطانہ اس وقت اپنے ڈیرے سے کچھ دور اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ ایک میدان میں موجود تھا، جب اس کے دو ساتھی ایک نوجوان کی آنکھوں پر پٹی باندھے اسے وہاں لائے۔ پٹی کیا تھی، اس کا تقریباً پورا چہرہ ہی موٹے سیاہ کپڑے میں چھپا ہوا تھا۔ سلطانہ کے جو ساتھی اسے اپنے ہمراہ لائے تھے ان کے نام وکرم اور دلبر تھے۔ وہ نوجوان وکرم کے گھوڑے پر اس کے پیچھے بیٹھا تھا۔

وکرم نے اسے گھوڑے سے اتارتے ہوئے سلطانہ کو بتایا۔ ''سردار...... اس لڑکے کا نام سکھ دیو ہے۔ یہ بہت دنوں سے ہمارے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ یہ ہمارے گروہ میں شامل ہونا چاہتا ہے۔ ہم نے اس کے بارے میں تسلی کرلی ہے۔ لڑکا ٹھیک ہے۔ ہمارے خیال میں اسے گروہ میں شامل کرنے میں کوئی حرج نہیں۔''

یہ ایک طرح کی سفارش تھی۔ گروہ میں کسی کو شامل کرنے کے لئے گروہ کے کم از کم دو ایسے

آدمیوں کی سفارش ضروری ہوتی تھی جنہیں گروہ میں شامل ہوئے ایک سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہو۔ ان کے سفارش کرنے کا مطلب یہی ہوتا تھا کہ انہوں نے اس کے بارے میں اچھی طرح چھان بین کرلی ہے کہ وہ ڈاکو بننے اور گروہ میں شامل ہونے کے لیے ہر اعتبار سے موزوں ہے۔ وہ ڈرپوک، نکما، کمزوردل، ناتواں اور ارادے کا کچا تو نہیں ہے۔ اس کے بارے میں یہ اطمینان بھی کیا جاتا تھا کہ وہ فی الحال پولیس کا مخبر ہے اور نہ ہی آگے چل کر ثابت ہوسکتا ہے۔ گویا جب کسی کو گروہ میں شامل کرنے کے لئے لایا جاتا تھا تو اس کے بارے میں ابتدائی اور ضروری کام مکمل ہو چکا ہوتا تھا۔ سلطانہ کو اس کے بارے میں زیادہ جھنجھٹ میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ اسے بس امیدوار کو اپنے نظریے اور اپنے حساب کتاب سے دیکھنا ہوتا تھا۔

سلطانہ کا اشارہ پا کر وکرم نے نوجوان کے چہرے سے کپڑا ہٹایا تو سلطانہ کے وہ سب ساتھی زور زور سے ہنسنے لگے جو وہاں پہلے سے موجود تھے کیونکہ نوجوان نے اپنی داڑھی اور مونچھیں آئے یقیناً زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا لیکن شاید اس نے شروع سے ہی خود کو کلین شیو رہنے کی عادت ڈال لی تھی۔ کسی کا کلین شیو ہونا سلطانہ کے ساتھیوں کو کچھ زیادہ ہی عجیب لگتا تھا۔

"ارے...... یہ تو زنانی ہے زنانی۔" گجندر سنگھ قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ "یہ ڈاکو بن کر کیا کرے گا۔ اس سے کہو اپنے خصم کے پاس چلی جائے۔ یہاں کیا لینے آئی ہے؟"

نوجوان کا چہرہ غصے اور خجالت سے سرخ ہوگیا۔ اس کی رنگت ویسے بھی صاف تھی۔ اچانک ہی وہ اپنی جگہ سے چیتے کی طرح اچھلا اور گجندر سنگھ پر جا پڑا۔ گجندر بری طرح لڑکھڑایا۔ اس نے سنبھلنے کی کوشش کی لیکن اسی دوران نوجوان نے اسے دھوبی پٹڑا لگایا اور اسے نیچے گرا دیا۔ وہ اس کے سینے پر چڑھ بیٹھا اور دونوں ہاتھوں سے اس کا گلا گھونٹنے کی کوشش کرنے لگا۔ سلطانہ نے پیچھے سے اس کی قمیض مٹھی میں جکڑ کر ایک ہی ہاتھ سے اوپر اٹھالیا اور ایک طرف کھڑا کر دیا۔

نوجوان اب بھی غصے سے لال بھبھوکا تھا اور دوبارہ گجندر سنگھ پر جھپٹنے لگا تھا لیکن سلطانہ کا بازو بیچ میں ایک شہتیر کی طرح حائل ہوگیا۔ پھر اسی بازو سے سلطانہ نے اسے پیچھے دھکیل دیا۔ نوجوان دبلا پتلا تھا لیکن ایسا لگتا تھا کہ غصے نے اس میں غیر معمولی طاقت بھر دی تھی لیکن سلطانہ کی طاقت کے سامنے اس کی پھر بھی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ گجندر سنگھ بھی ایک جسیم اور طاقتور آدمی تھا لیکن اسے چونکہ ذرا بھی توقع نہیں تھی کہ ڈاکو بننے کی درخواست کرنے کے لیے آیا ہوا ایک دبلا پتلا نوجوان اچانک چیتے کی طرح اس پر چھلانگ لگا دے گا، اس لیے وہ گویا ایک طرح سے بے

خبری میں ہی مارا گیا تھا۔

اب وہ اچھل کر اٹھ کھڑا ہوا اور بپھرے ہوئے سانڈ کی طرح نوجوان کی طرف لپکا۔ اس کے نتھنوں سے واقعی سانڈ ہی کی طرح 'شوں شوں' کی سی آوازیں نکل رہی تھیں۔ باچھوں سے کف بہہ رہا تھا۔ سلطانہ کا دوسرا بازو اس کے راستے میں حائل ہوگیا۔

"میں اس لونڈے کو لکڑی کی طرح بیچ میں توڑ دوں گا۔" گجندر سنگھ دھاڑا۔

"اب کیا فائدہ...... جب اس نے توری کی طرح تجھے زمین پر گرا دیا۔" سلطانہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"میں چوکنا نہیں تھا۔ میں تو ہنسی مذاق میں لگا ہوا تھا۔ ورنہ اس لونڈے کی کیا مجال۔" اس نے شعلہ بار نظروں سے نوجوان کو گھورا۔

"نئے آدمی سے ہنسی مذاق کرتے وقت زیادہ چوکنا رہنا چاہیے۔" سلطانہ نے بزرگانہ لہجے میں کہا، پھر وہ وکرم سے مخاطب ہوا۔ "کیا نام بتایا تھا تم نے اس پٹھے کا......؟"

"سکھ دیو۔" وکرم کے بجائے اجنبی نوجوان نے خود جواب دیا۔

اس بار پریتم زور سے ہنسا اور نوجوان سے مخاطب ہوا۔ "یہ نام تم پر جچ نہیں رہا...... سکھ دیو کی بجائے تم اپنا نام سکھ دیوی رکھ لو۔"

"ابے...... اگر تم لوگوں کے نزدیک داڑھی مونچھ ہی مردانگی کی نشانی ہے تو میں تم لوگوں سے بھی بڑی داڑھی مونچھ رکھ لوں گا۔" نوجوان غرّایا۔ "اب یہ مذاق بند کرو۔ اگر اب کسی نے یہ مذاق کیا تو میں اس کی آنتیں نکال دوں گا۔" نوجوان نے قمیض کے نیچے کہیں چھپایا ہوا گراری دار رامپوری چاقو نکال لیا۔ اس نے نہایت مشاقانہ انداز میں ایک جھٹکے سے 'کررڑ' کی آواز کے ساتھ چاقو کھولا تو سب آنکھیں سکیڑ کر یوں غور سے اس کی طرف دیکھنے لگے جیسے وہ کسی اور سیارے سے آئی ہوئی مخلوق ہو۔

"ابے...... تو ہمارے گروہ میں شامل ہونے آیا ہے یا ہمارا باپ بننے آیا ہے؟" اس بار صادق گرجا۔

"میں تو گروہ میں شامل ہونے ہی آیا تھا مگر مجھے پتہ نہیں تھا یہاں اتنی بے عزتی ہوگی۔ نام تو میرا سکھ دیو ہے لیکن سنسار میں کہیں اور تھوڑا سا بھی سکھ، تھوڑی سی بھی عزت نہیں ملی تھی۔ میں نے سوچا تھا شاید سلطانہ اور اس کے ساتھی مجھے چھوٹے بھائی کی طرح گلے سے لگالیں

گے...... مگر تم لوگ تو باقی دنیا والوں سے بھی زیادہ گھمنڈی ہو۔ ٹھیک ہے...... میں تم لوگوں میں شامل ہونے کے قابل نہیں ہوں...... مت کرو شامل مجھے...... چلا جاتا ہوں میں۔'' اس کی آواز میں لرزش آ گئی۔

اس نے زمین پر پڑا ہوا موٹا سا کالا کپڑا خود ہی اپنے چہرے پر لپیٹ لیا اور پہلے سے زیادہ لرزاں آواز میں بولا۔ ''چلو وکرم...... مجھے واپس چھوڑ آؤ۔''

وکرم نے اجازت طلب سے انداز میں سلطانہ کی طرف دیکھا۔ سلطانہ ہنس دیا لیکن اس کے ہنسنے کا انداز اپنے ساتھیوں سے بہت مختلف تھا۔ وہ نوجوان کا مذاق نہیں اُڑا رہا تھا بلکہ اس صورت حال سے گویا محظوظ ہو رہا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے اس کے سامنے چھوٹے چھوٹے بچے اپنی بچگانہ اور معصومانہ سی باتیں کر رہے ہوں۔

اس نے نوجوان کے چہرے سے کپڑا کھینچ کر دور پھینک دیا اور اسے اپنے قریب کرتے ہوئے اس کا کندھا تھپک کر بولا۔ ''بچہ...... اگر سینے میں اتنا نازک دل رکھے گا تو ڈاکو کبھی نہیں بن سکے گا۔ تھیٹر کا ہیرو بن جائے گا...... یا پھر شاید کوی بن جائے گا۔ کویتا لکھا کرے گا۔ شاعری کیا کرے گا۔ یہ جو تیرے سینے میں دل ہے نا......'' اس نے سکھ دیو کے سینے کو ہاتھ سے تھپتھپایا۔ ''پہلے اسے فولاد کا بنا...... خیر...... یہ تیرے بس کی بات نہیں...... مگر ہمارے ساتھ رہے گا تو تیرا دل، تیرا بدن، سب کچھ لوہے کا ہو جائے گا۔''

پھر اس نے ساتھیوں کو مخاطب کیا۔ ''آج سے یہ ہمارا ساتھی ہے۔ جو بک بک جھک جھک ہوگئی سو ہوگئی۔ اب کوئی اس کا مذاق نہیں اُڑائے گا۔ سب اپنے اپنے دل صاف کر لو اور باری باری اسے گلے لگاؤ۔ وکرم اور دلبر اسے لائے ہیں۔ وہی دونوں اس کے استاد ہوں گے۔ آج رات ہم نئے ساتھی کے آنے کی خوشی منائیں گے۔''

پل بھر میں جیسے ماحول بالکل بدل گیا۔ ایک لمحے پہلے فضا میں جو تناؤ اور کشیدگی تھی یکدم دور ہوگئی۔ سلطانہ کے حکم میں جیسے جادو تھا۔ سب نے باری باری گرم جوشی کے سکھ دیو کو گلے لگایا حتیٰ کہ گجندر سنگھ نے بھی اسے سینے سے لگا کر مسکراتے ہوئے اس کی پیٹھ تھپکی۔ نوجوان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے لیکن اب یہ خوشی کے آنسو تھے۔ آخر میں اس نے انتہائی ممنونیت سے سلطانہ کے پاؤں چھوئے اور گلوگیر آواز میں بولا۔ ''سردار...... تمہارے بارے میں جیسا سنا تھا تمہیں ویسا ہی پایا۔''

سلطانہ نے اسے اپنے پاس کھڑا کر کے ساتھیوں کو مخاطب کیا۔ ''یہ دیکھنے میں زیادہ زور آور یا طاقتور نہیں لگتا لیکن اس کی آتما...... اس کی روح بڑی طاقتور ہے۔ یہ ہمارے ساتھ رہے گا تو اس کا بدن...... اس کا شریر بھی لوہے کی طرح مضبوط ہو جائے گا لیکن مجھے اس کی زیادہ فکر نہیں ہے۔ یہ اس سے پہلے بھی اپنی اندر کی مضبوطی...... اندر کی طاقت اور اندر کی دلیری کی وجہ سے بڑے بڑے کام کر سکتا ہے۔ میرا دل کہہ رہا ہے کہ یہ ہمارے گروہ کے لیے اتنا ہی اچھا ساتھی ثابت ہوگا جتنے تم ہو۔''

پھر سلطانہ نے بھورے کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''تم کیا کہتے ہو بھورے؟''

بھورے نے پُرخیال نظروں سے ایک بار پھر سکھ دیو کا سرتاپا جائزہ لیا اور مونچھوں کو بل دیتے ہوئے سلطانہ کی طرف دیکھے بغیر بولا۔ ''میری رائے کبھی تمہارے رائے سے الگ نہیں ہوتی۔''

''بس...... تو پھر سکھ دیو آج سے ہمارا بھائی ہے۔ رات کو اس کے ہمارے ساتھ شامل ہونے کی باقاعدہ رسم ہوگی اور ہم چھوٹی موٹی خوشی منائیں گے۔ تھوڑا بہت ہلا گلا کریں گے۔'' سلطانہ نے اعلان کرنے کے انداز میں کہا۔

اس کے بعد سکھ دیو کو ڈیرے پر لے جایا گیا۔ ڈیرے پر صرف اسی کو لے جایا جاتا تھا جس کے بارے میں پورا یقین ہوتا تھا کہ وہ سلطانہ کے جاں نثاروں میں شامل ہو گیا ہے اور اگر کبھی زندہ گرفتار ہو بھی گیا تو پولیس کے بدترین تشدد کے باوجود زبان نہیں کھولے گا اور اپنے گروہ یا سلطانہ کے بارے میں کسی کو کوئی معلومات فراہم نہیں کرے گا۔ ویسے گروہ میں یہ اصول طے تھا کہ ہر آدمی زندہ گرفتار ہونے سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کرے گا اور گرفتاری پر موت کو ترجیح دے گا۔

رات کو سلطانہ نے اپنے ہاتھوں سے سکھ دیو کو پگڑی پہنائی۔ اس نے باری باری سب کے پیروں کو ہاتھ لگا کر سب سے آشیرواد لی۔ پھر سب کا منہ میٹھا کرایا گیا اور ٹھنڈائی کا دور چلا۔ ترنگ میں آ کر کچھ لوگ ناچنے لگے۔ ان کا ناچ کیا تھا بس بے ہنگم اچھل کود تھی۔ کچھ اپنی بے سری آوازوں میں گانے گا رہے تھے۔ ناچ گانا چاہے جیسا بھی تھا لیکن اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اس روز وہ لوگ بہت خوش تھے۔ دوسرے ہی روز سے وکرم اور دلبر نے سکھ دیو کو اسلحے کے استعمال کی تربیت دینی شروع کر دی۔ وہ صرف چاقو کے استعمال میں ماہر تھا اور اس معاملے میں

شاید گروہ میں کوئی بھی اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا۔

تربیت کے دوران اس کی ڈیوٹی اس مچان پر بھی لگائی جاتی رہی جو ڈیرے سے کچھ دور ایک اونچے اور گھنے درخت پر بنی ہوئی تھی۔ آٹھ آٹھ گھنٹے کے لیے باری باری کوئی نہ کوئی اس پر موجود رہتا تھا اور چاروں طرف نظر رکھتا تھا۔ یہ مچان کسی وقت خالی نہیں رہتی تھی۔ سلطانہ کا ڈیرہ اب کافی وسعت اختیار کر چکا تھا۔ اور کسی چھوٹے موٹے قلعے سے کم نہیں تھا۔ سلطانہ اسے 'چھوٹی دلی' کہتا تھا۔ یہ اس کی راجدھانی تھی۔ اس میں شک نہیں تھا کہ پورے روہیل کھنڈ میں ایک طرح سے اس کی متوازی حکومت چل رہی تھی۔

وہ پولیس وغیرہ سے ذرا بھی نہیں ڈرتا تھا اور بہت سے قصبوں اور بستیوں سے دن کی روشنی میں بھی گروہ سمیت گزرتا تھا۔ وہ اور اس کے ساتھی چہرے چھپانے کی بھی زحمت نہیں کرتے تھے۔ انہیں دیکھ کر گلیوں اور بازاروں میں لوگ ایک طرف ہٹ کر مؤدب کھڑے ہو جاتے تھے اور ان کے لیے راستہ چھوڑ دیتے تھے۔ چاروں طرف نعرے گونجنے لگتے تھے۔ ''سلطانہ ڈاکو کی جے...... سلطانہ ڈاکو کی جے۔''

راستے میں اگر کہیں پانچ سات پولیس والے موجود بھی ہوتے تھے تو وہ اسے روکنے کی کوشش کرنا تو درکنار اپنی بندوقیں کندھوں سے اتار کر زمین پر رکھ دیتے تھے اور سلیوٹ کرنے لگتے تھے۔ سلطانہ ہنستے ہوئے اپنے ساتھیوں سے کہتا تھا۔ ''یہ سلامیاں اور یہ نعرے صرف میرے لیے ہیں۔ جب میں مر جاؤں گا تو یہ سلامی اور یہ نعرے بھی مر جائیں گے۔ کمشنر، وائسرائے یا جارج پنجم کے لیے جو نعرے لگائے جاتے ہیں اور انہیں جو سلامیاں دی جاتی ہیں وہ ان کے لیے نہیں، ان کے عہدوں کے لیے ہوتی ہیں۔ جب یہ لوگ نہیں ہوں گے تو لوگ یہی نعرے دوسرے کمشنر، دوسرے وائسرائے بادشاہ کے لیے لگانے لگیں گے...... انہیں سلامیاں دینے لگیں گے...... لیکن سلطانہ کے حصے کی سلامی صرف سلطانہ ہی لے سکتا ہے۔''

نجیب آباد، بجنور، مراد آباد، کاشی پور، رام پور، جسپور اور ان کے گرد و نواح میں پھیلے ہوئے سیکڑوں گاؤں، دیہات اور قصبوں میں ٹھاکروں، دولت مند برہمنوں، خوشحال بنیوں اور نوابوں کو چھوڑ کر باقی سب لوگ سلطانہ کو ڈاکو نہیں بلکہ اپنا دوست اور ہمدرد محسوس کرتے تھے جبکہ خوشحال اور بالادست طبقے کے لوگ اس کے نام سے کانپتے تھے۔

اس کے بارے میں طرح طرح کے افسانے بھی مشہور ہو چکے تھے جن کی وجہ سے اس

کے رعب و دہشت میں اضافہ ہوا تھا۔ ایک عام خیال یہ تھا کہ وہ پراسرار قوتوں کا مالک ہے۔

اس کے گروہ میں ایک آدمی دلپت تھا جس کی شکل صورت اور قد کاٹھ میں سلطانہ کی کافی مشابہت تھی۔ ایک مرتبہ سلطانہ نے اپنے گروہ کو دو حصوں میں تقسیم کیا۔ ایک حصے کی سربراہی سلطانہ نے خود سنبھالی اور کاشی پور کے ایک نواحی قصبے کی طرف چلا گیا۔ دوسرے حصے کی سربراہی اس نے بھورے اور دلپت کو سونپ کر بجنور کے ایک قریبی قصبے میں لوٹ مار کے لیے بھیج دیا۔ دونوں جگہیں ایک دوسرے کی قطعی مخالف سمت میں تھیں اور ان کے درمیان کم از کم تیس میل کا فاصلہ تھا۔

دونوں جگہوں پر زبردست لوٹ مار ہوئی۔ تین چار آدمی قتل بھی ہو گئے۔ بجنور سلطانہ کاشی پور کے قریب موجود تھا۔ جب دونوں جگہ کی لوٹ مار کی خبریں سامنے آئیں اور پولیس رپورٹیں تیار ہوئیں تو یہ تاثر پیدا ہوا کہ سلطانہ ڈاکو بیک وقت دو جگہوں پر موجود تھا جن کے درمیان تیس میل کا فاصلہ تھا۔ اس طرح کے دو تین واقعات اور رونما ہوئے تو سلطانہ کے بارے میں یہ تاثر پختہ ہو گیا کہ وہ پراسرار قوتوں کا مالک تھا۔ اس کے بعد عام پولیس والے تو اس سے اور بھی زیادہ ڈرنے لگے۔ انہیں اگر بروقت اس کی لوٹ مار کی اطلاع مل بھی جاتی تھی تب بھی وہ موقع واردات پر پہنچنے سے گریز کرتے تھے۔

بے حساب مال و دولت لٹانے کے باوجود اس کے پاس مال و زر کی کوئی کمی نہیں تھی۔ کیمپ میں بڑے بڑے جھونپڑوں کے فرش میں قدم قدم پر ہیرے، موتی اور سونے، چاندی کے زیورات دفن تھے۔ ڈھیروں نقد رقم بھی انہوں نے مختلف حفاظتی تدبیروں کے ساتھ ادھر ادھر دفن کر رکھی تھی۔ چاندی کے روپوں سے بھرے ہوئے کئی گھڑے سر بہ مہر حالت میں زمین میں دفن تھے۔ سلطانہ کا ڈیرہ اتنے بڑے خزانے کا مدفن تھا جس کا کوئی تصور نہیں کر سکتا تھا۔ سونے چاندی کے بہت سے زیورات سلطانہ نے ایک سنار سے پگھلوا لیے تھے اور سیروں سونا چاندی اس نے ٹھوس شکل میں جھونپڑوں کے اندر مٹی کے دو ستونوں میں چھپایا ہوا تھا۔

یہ سارا خزانہ گروہ کے سب لوگوں کا مشترکہ تھا۔ سلطانہ کا حصہ سردار کی حیثیت سے سب سے زیادہ تھا۔ گروہ کے جو لوگ تھوڑا بہت لکھنا پڑھنا جانتے تھے، ان کی مدد سے ہی کھاتوں میں سب چیزوں کا حساب کا اندراج کرالیا جاتا تھا اور لوٹ مار کی ہر واردات کے بعد مال غنیمت کی تقسیم ہو جاتی تھی۔ کاغذات میں سب کچھ لکھا ہوا تھا کہ کون سی چیز کس کی تھی اور کہاں موجود تھی

لیکن یہ سب کچھ ایسے اشاروں میں لکھا ہوا تھا جنہیں وہ خود ہی سمجھ سکتے تھے۔ سلطانہ کے مال لٹانے کی عادت پر اس کے کسی ساتھی نے کبھی اعتراض نہیں کیا تھا اور کبھی کوئی اس لالچ میں نہیں آیا تھا کہ جان ہتھیلی پر رکھ کر لوٹا ہوا وہ مال بھی ان کے درمیان تقسیم ہونا چاہیے۔ دیگر بہت سے معاملات کی طرح اس معاملے میں بھی ان کی سوچ مشترک تھی۔

ضرورت پڑنے پر سلطانہ بے پناہ سفاکی اور سنگدلی کا مظاہرہ بھی کر سکتا تھا لیکن کسی بھی وقت جذبات اس پر غلبہ بھی پا سکتے تھے اور اس کے دل میں گداز بھی پیدا ہو سکتا تھا۔ ایک بار وہ لوگ ہردوار سے دس میل دور شمال میں ایک قصبے کے سب سے بڑے زمیندار کی حویلی میں گھسے لوٹ مار کر رہے تھے۔ وہ دن دہاڑے ہی اس کی وسیع حویلی میں آن گھسے تھے اور انہوں نے سب گھر والوں کو رسیوں سے باندھ دیا تھا۔ کچھ زیورات اور نقدی ان کے ہاتھ لگی تھی لیکن اتنا مال نہیں مل رہا تھا جتنے کی مخبری ہوئی تھی۔ وہ لوگ جھنجلاہٹ کا شکار تھے۔ انہوں نے گھر والوں کے ساتھ مار پیٹ بھی کی تھی لیکن ان کا کہنا یہی تھا کہ ان کا کل مال و متاع وہی تھا جو ان کے ہاتھ لگ چکا تھا۔

سلطانہ حویلی کے طویل و عریض احاطے میں کھڑا چاروں طرف کا جائزہ لے رہا تھا اور اس مسئلے پر غور کر رہا تھا۔ وہ ساون کا مہینہ تھا اور آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ اسے یہ اندیشہ بھی محسوس ہو رہا تھا کہ کہیں بارش شروع نہ ہو جائے۔ وہ اپنی ادھیڑ بن میں تھا اور ڈھائی تین سال کا ایک بچہ روتا، منہ بسورتا نہ جانے کہاں سے اس کے پاس آ گیا اور اس کے کرتے کا دامن کھینچ کھینچ کر اس سے ضد کرنے لگا کہ وہ اسے جھولے پر بٹھا دے۔ وہ ایک طرف اشارہ کر رہا تھا۔ تب سلطانہ نے دیکھا کہ احاطے میں ایک جگہ پیپل کے ایک اونچے اور گھنے درخت میں جھولا پڑا ہوا تھا۔ بچہ اس پر جھولا جھولنے کی فرمائش کر رہا تھا۔

سلطانہ جھک کر بچے کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرایا۔ وہ ایک گورا چٹا، گول مٹول سا بچہ تھا۔ صاف ستھرے کپڑوں میں تھا۔ چہرے پر بچپن کی معصومیت تھی۔ روتے، منہ بسورتے ہوئے وہ سلطانہ کو اور بھی پیارا لگا۔ اس معصوم کو پتا ہی نہیں تھا کہ اس کے گھر میں ڈاکا پڑ رہا تھا اور اس کے سب گھر والے اندر بڑے کمرے میں بندھے بیٹھے تھے۔ اسے دیکھ کر سلطانہ کو اپنا بیٹا راجکمار یاد آ گیا۔ وہ بھی اس وقت اتنا ہی بڑا تھا اور تقریباً اسی جیسا تھا۔

اس نے جھک کر بچے کو اٹھایا اور لے جا کر جھولے پر بٹھا دیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے

رسیاں پکڑ لیں اور سلطانہ سے فرمائش کی کہ اسے جھولا دے۔ سلطانہ نے آہستگی سے دھکیل کر اسے جھولا دیا۔ بچہ خوشی سے ہنسنے لگا۔ اس کے دو چار ساتھی جو مال کی تلاش میں گھر کی تلاشی لیتے ادھر ادھر پھر رہے تھے، گردنیں گھما گھما کر حیرت سے اسے دیکھنے لگے کہ ان کا سردار کس کام میں لگا ہوا تھا۔ سلطانہ نے بہ آواز بلند نہیں حکم دیا۔ ”غلے کے گودام کی تلاشی لو۔“

وہ دیکھ چکا تھا کہ حویلی کے احاطے میں غلے کا خاصا بڑا گودام موجود تھا جس میں مٹی کے اونچے اونچے لمبوترے گھڑے ایک قطار میں کھڑے ہوئے تھے۔ ان میں غلہ بھرا ہوا تھا۔ سلطانہ کے ذہن میں اچانک ہی ان گھڑوں کا خیال آیا تھا۔ چند لمحے بعد اسے آوازوں سے اندازہ ہوا کہ اس کے ساتھیوں نے غلے کے وہ بڑے لمبوترے گھڑے فرش پر اُلٹ دیئے تھے۔ سلطانہ اطمینان سے احاطے میں کھڑا بچے کو جھولا جھلاتا رہا اور اس کی مسرت بھری آوازوں سے محظوظ ہوتا رہا۔

تھوڑی دیر بعد اس کے ساتھی گودام سے نکلے تو ان کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں۔ وہ اپنے ہاتھوں میں سونے کے بہت سے زیور اٹھائے ہوئے تھے جن میں سے بعض میں ہیرے اور دوسرے جواہر بھی جڑے ہوئے تھے۔ نگیشر اس کے قریب آ کر سحر زدہ سے لہجے میں بولا۔ ”مال کے بارے میں جاننے کی کوئی خاص شکتی ہے تمہارے پاس سلطانہ......! شاید مال خود آواز دے کر تمہیں بتاتا ہے کہ میں یہاں ہوں۔“

سلطانہ مسکرا دیا۔ اس دوران بھورے بھی اس کے قریب آ گیا اور نرمی سے بولا ”چلو...... بہت لاڈ ہو گیا اس بالک سے...... اب یہاں سے نکلنے کی فکر کرو...... کہیں برسات نہ شروع ہو جائے۔“

اس سے دوسرے دن سلطانہ کی چنبیلی سے ملاقات طے تھی اور اسے سادھو کے ڈیرے پر جانا تھا۔ سادھو کے ڈیرے پر ایک پُر کیف اور پُر نشاط رات گزارنے کے بعد دوسرے روز دن چڑھے وہ اور چنبیلی اپنے گھوڑوں پر واپس روانہ ہوئے۔ گزشتہ روز کی بارشوں کے بعد زمین نم تھی اور خنک ہوا چل رہی تھی۔ چنبیلی پہلے سے کچھ زیادہ حسین اور نکھری نکھری لگ رہی تھی۔ اس کے سیاہ ریشمی بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ سلطانہ کو مراد آباد کے نواح تک اس کے ساتھ ساتھ جانا تھا پھر جنگل میں داخل ہو کر اپنے راستے پر ہو لینا تھا۔

ایک پہاڑی کے گرد چکر کاٹ کر وہ جیسے ہی کھلی جگہ میں آئے، اچانک ان دونوں کو ہڑبڑا

کر اپنے گھوڑوں کی لگامیں کھینچنا پڑیں۔ سامنے تقریباً ایک فرلانگ کے فاصلے پر دس بارہ گھڑسوار سیدھے ان کی طرف آ رہے تھے اور وہ سب کے سب پولیس کی وردی میں تھے۔ سلطانہ کی عقابی نظروں نے یہ تو دیکھ لیا کہ ان میں کوئی بھی فریڈی ینگ نہیں تھا لیکن بہرحال وہ پولیس والے تھے اور سب کے سب مسلح تھے۔ سلطانہ کو اپنے سے زیادہ چنبیلی کی سلامتی کی فکر تھی۔ اس نے نیچی آواز میں اسے ہدایت کی۔ ''سیدھے ہاتھ کی طرف جو جنگل ہے ادھر گھوڑا دوڑاؤ۔ میں تمہارے پیچھے پیچھے آؤں گا۔'' وہ چنبیلی کی حفاظت کے لیے اس کے پیچھے رہنا چاہتا تھا۔ چنبیلی نے اس کی ہدایت پر فوری عمل کرتے ہوئے گھوڑے کو گھمایا اور تیزی سے جنگل کی طرف روانہ ہوئی۔ سلطانہ اس کے پیچھے تھا۔ عقب سے انہیں کسی کے چیخنے کی آواز آئی۔ کوئی انہیں رکنے کا حکم دے رہا تھا۔ ان کا رکنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

دوسرے ہی لمحے فائروں کے دھماکوں سے ویرانے کا سکوت درہم برہم ہوگیا......!



پولیس والوں نے سلطانہ اور چنبیلی کا تعاقب شروع کر دیا تھا۔ ان کے للکارنے پر جب وہ دونوں نہیں رُکے تھے تو انہوں نے فائرنگ بھی شروع کر دی تھی۔ چونکہ فائرنگ کرنے والے اور ان کا ہدف دونوں ہی دوڑتے ہوئے گھوڑوں پر سوار تھے، اس لیے گولیوں کا اپنے نشانے پر لگنا ذرا مشکل تھا لیکن یہ محض ایک اتفاق اور سلطانہ کی خوش قسمتی تھی۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ یہ خوش قسمتی کب تک اس کا ساتھ دے گی۔

اس نے خود ابھی پلٹ کر پولیس پارٹی پر ایک فائر بھی نہیں کیا تھا۔ اس میں ایک مصلحت تھی۔ چنبیلی اور وہ، آگے پیچھے گھنے جنگل میں داخل ہو گئے۔ جلد ہی وہ ایک ایسے حصے میں پہنچ گئے جہاں دو گھوڑے برابر برابر نہیں چل سکتے تھے۔ پولیس والے مستعدی سے ان کے تعاقب میں تھے اور آوازوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ بھی جنگل میں داخل ہو چکے تھے۔ سلطانہ کو زیادہ تر یہی تجربہ ہوا تھا کہ پولیس والے ان لوگوں کے تعاقب میں جنگل میں گھستے ہوئے گھبراتے تھے کیونکہ ڈاکوؤں کے لیے تو جنگلات گھر کی طرح تھے لیکن پولیس والوں کے لیے وہ الگ ہی دنیا تھی۔ مگر یہ پولیس پارٹی ان کا پیچھا چھوڑتی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ شاید یہ دیکھ کر ان کے حوصلے بڑھ گئے تھے کہ سلطانہ اس وقت صرف ایک عورت کے ساتھ تھا۔ اسے ہلاک یا گرفتار کرنے کا اس سے اچھا موقع انہیں مشکل سے ہی مل سکتا تھا۔

اس پولیس پارٹی کی قیادت درحقیقت جاوید ملک کر رہا تھا جو کبھی فریڈی ینگ کی اجازت سے اور کبھی اس کی اجازت کے بغیر ہی اپنی مخصوص ٹیم میں سے کچھ ساتھیوں کو ہمراہ لے کر اس امید پر مختلف علاقوں کے دورے پر نکل جاتا تھا کہ شاید کبھی اتفاقاً سلطانہ اور اس کے ساتھیوں سے سامنا ہو جائے۔ اس کے یہ دورے کبھی کسی مخبری کے باعث ہوتے تھے اور کبھی وہ مخبری کے بغیر ہی نکل پڑتا تھا۔ اس نے دبی دبی زبان میں ینگ کے طریقۂ کار سے اختلاف کرنا شروع

کر دیا تھا۔ اسے کم ہی امید تھی کہ ینگ بھی سلطانہ کو گرفتار یا ہلاک کرنے میں کامیاب ہو سکے گا اور یہ امید تو اسے بالکل ہی نہیں تھی کہ وہ کبھی سلطانہ کے پورے گروہ کا قلع قمع کر سکے گا۔ اسے اندیشہ یہی تھا کہ ینگ اگر کبھی قدرت کی کسی بہت ہی بڑی عنایت کی بدولت سلطانہ کو ختم کرنے میں کامیاب ہو بھی گیا تو اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا کیونکہ گروہ میں سے کوئی دوسرا فوراً ہی سلطانہ کی جگہ سنبھال لے گا اور وہ یقیناً سلطانہ کا متبادل ثابت ہوگا۔

دوسری طرف ینگ کو اس کے اس طریقۂ کار سے اتفاق نہیں تھا کہ وہ پولیس پارٹی کو لے کر اس امید پر مختلف علاقوں کی خاک چھاننے کے لیے نکل کھڑا ہوتا تھا کہ سلطانہ اور اس کے ساتھیوں سے اس کا سامنا ہو جائے گا۔ ینگ کا خیال یہی تھا کہ سلطانہ محض اتفاقات کے سہارے ہاتھ آنے والا نہیں تھا۔ اس کے لیے ٹھوس حکمت عملی کی ضرورت تھی جس میں وہ سلطانہ کی نفسیات کو بھی مدنظر رکھنا چاہتا تھا۔ جاوید ملک نے اب اس سلسلے میں ہونے والی میٹنگوں میں اکثر ینگ کی باتوں پر زیرلب طنزیہ انداز میں مسکرانا شروع کر دیا تھا۔

اس وقت گویا اس کا نظریہ صحیح ثابت ہو گیا تھا کہ کوشش جاری رکھی جائے تو سلطانہ سے اتفاقاً بھی سامنا ہو سکتا ہے...... اور یہ دیکھ کر تو اس کا دل کچھ زیادہ ہی خوشی اور جوش و خروش سے بھر گیا تھا کہ سلطانہ اپنے گروہ کے ساتھ نہیں بلکہ اپنی محبوبہ کے ساتھ تھا۔ اگر آج وہ سلطانہ اور اس کی محبوبہ کو گرفتار یا ہلاک کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو ہندوستان پولیس کی تاریخ میں اس کا نام امر ہو سکتا تھا۔ اس صورت میں فریڈی ینگ کا سارا تجربہ، اس کی شہرت، ساکھ اور فلسفیانہ قسم کے نظریے...... سب کچھ دھرا رہ جاتا۔

جاوید ملک کے ذہن پر اسی قسم کے خیالات کی یلغار تھی اور وہ اپنے ساتھیوں سے کہیں زیادہ پُرجوش انداز میں ان سے بہت آگے گھوڑا دوڑاتا چلا جا رہا تھا۔ اس نے سلطانہ پر بہت سے فائر کیے تھے لیکن کوئی بھی گولی اسے یا چنبیلی کو نہیں لگ سکی تھی جس پر جاوید ملک کو حیرت بھی تھی تاہم ابھی وہ مایوس نہیں تھا۔ اسے یقین تھا کہ آج اس کی جدوجہد کا کوئی نہ کوئی فیصلہ کن نتیجہ ضرور نکلے گا۔ وہ سلطانہ اور چنبیلی کے تعاقب میں بے دھڑک جنگل میں بھی داخل ہو گیا تھا۔ اس نے ایک لمحے کے لیے بھی خوف محسوس نہیں کیا تھا اور سلطانہ کو بزدلوں کی طرح آگے آگے بھاگتے دیکھ کر وہ دل ہی دل میں بہت خوش تھا۔

جنگل میں داخل ہونے کے بعد اسے سلطانہ اور چنبیلی کو کہیں نظر نہ آئے لیکن اندازہ ہو گیا

کہ وہ کس طرف گئے ہوں گے۔ وہ ابھی اس سمت میں تھوڑا ہی آگے گیا تھا کہ اچانک گولیوں کے دھماکوں سے اس کے کانوں کے پردے پھٹتے پھٹتے بچے۔ اسے یوں لگا جیسے گولیاں اس کے کانوں کے بالکل قریب چلائی گئی تھیں اور یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ ان میں سے کوئی اسے نہیں لگی تھی لیکن اس کا گھوڑا اس بری طرح اوندھا گرا کہ قلابازی کھا گیا۔

جاوید ملک بروقت اس پر سے چھلانگ لگانے میں کامیاب ہو گیا۔ اگر اسے ایک لمحے کی بھی تاخیر ہوئی ہوتی تو وہ اپنے ہی گھوڑے کے نیچے کچلا جا چکا ہوتا یا دب جاتا کیونکہ اس کا گھوڑا جہاں گرا تھا وہیں ساکت ہو گیا تھا۔ جاوید پیچھے دیکھے بغیر درختوں کے درمیان بھاگتا چلا گیا۔ گولیوں کی تڑتڑاہٹ اور کچھ افراتفری کی سی آوازیں بدستور سنائی دے رہی تھیں۔ اس نے کئی انسانی چیخیں اور گھوڑوں کی تیز ہنہناہٹ بھی سنی۔

وہ رکا نہیں اور اندھا دھند بھاگتا چلا گیا حالانکہ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کے پیچھے پیچھے اس کے ساتھی بھی جنگل میں آ گھسے تھے اور ان پر بھی قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ یقیناً ان پر بھی گولیوں کی بوچھاڑ ہوئی تھی۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ ان میں سے کون مر گیا تھا اور کون زندہ بچا تھا۔ اس اچانک اور قطعی غیر متوقع افتاد سے اس کا دماغ جھنجھنا گیا تھا اور اعصاب لرز کر رہ گئے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر ہوا کیا تھا؟

اس نے سلطان اور چنبیلی کو جنگل میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔ وہ جب ان دونوں کا تعاقب کرتے ہوئے جنگل میں داخل ہوا تو وہ اسے کہیں نظر نہیں آئے تھے اور اسے یہ بھی یقین تھا کہ وہ کہیں گھات لگا کر نہیں بیٹھے تھے۔ ان کی ساری کوشش شاید صرف یہ تھی کہ وہ اپنے آپ کو پولیس کی یلغار سے بچا کر نکل جائیں۔ جنگل میں جاوید ملک کو دوسرے لوگوں کی موجودگی کے بھی کوئی آثار دکھائی نہیں دیئے تھے۔

......تو پھر گولیوں کی بارش کہاں سے ہوئی تھی؟ یہ سوال اسے پریشان کر رہا تھا۔

آخر ایک جگہ پہنچ کر اس نے خود کو محفوظ محسوس کیا تو رک گیا اور چھوٹے درختوں کے ایک جھنڈ کے درمیان بیٹھ کر ہانپنے لگا۔ تب اچانک اس کی سمجھ میں آیا کہ ہوا کیا تھا۔ اصل میں کچھ لوگ اونچے درختوں پر، پتوں کے درمیان چھپے بیٹھے تھے جنہوں نے اس پر اور اس کے پیچھے آنے والے ساتھیوں پر گولیوں کی بارش کی تھی۔ اس کی خوش قسمتی تھی کہ وہ گولیوں کی اس بارش سے زندہ نکل آیا تھا۔

اپنے بچ جانے کی یہ خوشی صرف ایک لمحے کی تھی۔ دوسرے ہی لمحے اپنے ساتھیوں کے بارے میں فکر اور تشویش نے اسے آگھیرا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ ان میں سے کون زندہ بچا تھا اور کسے موت نگل گئی تھی۔ اسے کچھ یوں لگا تھا جیسے فائرنگ نے اس کے ساتھیوں کو ہڑبڑا کر اِدھر اُدھر نکل جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ جس کا جدھر منہ اٹھا تھا وہ ادھر نکل بھاگا تھا لیکن ان میں سے کچھ نہ کچھ ضرور مارے گئے تھے۔ یہ بات طے تھی کہ سب کے سب زندہ نہیں بچے ہوں گے۔

اب گو کہ سناٹا چھا چکا تھا۔ گولیوں کی تڑتڑاہٹ تھم گئی تھی لیکن جاوید اپنے اندر اتنی ہمت محسوس نہیں کر رہا تھا کہ واپس جا کر صورت حال کا جائزہ لیتا اور دیکھتا کہ اس کے ساتھیوں پر کیا گزری تھی؟ موت اُسے چھو کر گزری تھی اور اس کے اعصاب ابھی تک منتشر تھے۔ اپنا بچ جانا اسے ایک انہونا سا واقعہ محسوس ہو رہا تھا۔ ساتھ ہی اسے یہ احساس بھی ہوا کہ سلطانہ اتنا ترنوالا بھی نہیں تھا جتنا وہ سمجھ رہا تھا۔ شاید ینگ کی حکمت عملی درست تھی جو سلطانہ کے سلسلے میں پھونک پھونک کر قدم اٹھاتا تھا۔

اب اسے اپنی کچھ دیر پہلے کی کیفیت خود قابل رحم لگ رہی تھی جب اس نے سامنے سے صرف سلطانہ اور چنبیلی کو آتے دیکھ کر سوچا تھا کہ آج تو شاید قسمت اس پر مہربان ہو گئی ہے اور شکار خود چل کر جال کی طرف آ رہا ہے۔ اب اس کی سمجھ میں آیا کہ سلطانہ جب یکدم پلٹ کر جنگل کی طرف بھاگا تھا تو درحقیقت وہ پولیس پارٹی کو اپنے چوہے دان کی طرف لے جا رہا تھا۔

دراصل یہ سلطانہ کی ایک احتیاطی تدبیر اس کے کام آ گئی تھی۔ وہ جب بھی سادھو کے ہاں چنبیلی سے ملنے آتا تھا اپنے چار ساتھیوں کو پہلے ہی قریبی جنگل میں بھیج دیتا تھا۔ اس کی ہدایت یہی تھی کہ وہ اس وقت تک جنگل میں چھپے رہا کریں جب تک قریبی میدان سے سلطانہ اور چنبیلی کو رخصت ہوتے نہ دیکھ لیں۔ اگر سادھو کے جھونپڑے میں سلطانہ کے قیام کے دوران انہیں کسی گڑبڑ کا احساس ہو یا فائرنگ وغیرہ کی آواز سنائی دے تو وہ سلطانہ کی مدد کے لیے فوراً پہنچ جائیں۔ اس روز بھی سلطانہ کے چار ساتھی جنگل میں موجود تھے اور پولیس کو اس کے تعاقب میں آتے دیکھ کر درختوں پر چڑھ گئے تھے۔ انہوں نے اپنا کردار بڑی عمدگی سے ادا کیا تھا۔

ادھر درختوں کے جھنڈ میں چھپا ہوا جاوید ملک اس الجھن میں تھا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے؟ اس کے چاروں طرف سکوت چھایا ہوا تھا جو اسے موت کا سناٹا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ واپس جا کر دیکھے، اس جگہ کیا ہوا تھا جہاں اوپر سے گولیوں کی بارش ہوتی

محسوس ہوئی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہاں کوئی بہت بری خبر اس کی منتظر ہو گی...... لیکن بہر حال...... اسے وہاں جا کر صورت حال کا جائزہ تو لینا تھا۔ وہ چھپ کر کب تک بیٹھ سکتا تھا؟

وہ جھکا جھکا درختوں کی آڑ لیتا ہوا کسی درندے کی طرح چوکنا ہو کر نہایت احتیاط سے واپس روانہ ہوا۔ وہ اوپر سے نیچے، دائیں سے بائیں، آگے پیچھے، ہر طرف دیکھتا ہوا جا رہا تھا۔ ہر قدم پر اسے اندیشہ محسوس ہوتا تھا کہ ابھی کسی سمت سے گولی آئے گی اور اس کا لہو چاٹ جائے گی۔

اب اسے معلوم ہوا تھا کہ پولیس والے سلطانہ اور اس کے گروہ کے تعاقب میں، جنگلوں میں داخل ہونے سے کیوں گھبراتے تھے۔ سلطانہ اور اس کے ساتھی واقعی چرند پرند اور درندوں کی طرح جنگل کی مخلوق بن کر رہ گئے تھے۔ جنگل ان کے گویا گھر کی طرح تھے جبکہ دوسروں کے لیے وہاں قدم قدم پر دشواریاں اور خطرات تھے۔ سلطانہ اور اس کے ساتھی اس لیے جنگلی درندوں سے بھی زیادہ خطرناک تھے کہ ان کے پاس نہ جانے کتنا اسلحہ تھا۔

جاوید ملک کو واپس اس جگہ پہنچنے میں خاصی دیر لگ گئی جہاں اس کے سر پر گویا قیامت ٹوٹی تھی۔ وہاں پہنچ کر اس کا دل ڈوب سا گیا۔ جنگل کی زمین پر بکھرے ہوئے خشک پتوں اور ٹہنیوں پر اِدھر اُدھر اس کے پانچ ساتھیوں کی لاشیں الٹی سیدھی پڑی تھیں۔ باقی کے گھوڑے غائب تھے۔ شاید وہ دھماکوں سے گھبرا کر اِدھر اُدھر کہیں بھاگ گئے تھے۔ اس کے مزید پانچ ساتھی نہ جانے کہاں تھے۔ شاید وہ بھی جانیں بچا کر اِدھر اُدھر کہیں نکل گئے تھے۔ اس کے دل کو ذرا سا اطمینان یہ دیکھ کر ہوا کہ وہاں ایک ڈاکو کی لاش بھی پڑی تھی۔ وہ شاید اسی درخت سے گرا تھا جس کے نیچے اس کی لاش پڑی تھی۔

جاوید ابھی بوجھل دل کے ساتھ صورت حال کا جائزہ لے رہا تھا کہ اسے اپنے عقب میں خشک پتوں کی چرچراہٹ سنائی دی۔ وہ اپنی رائفل کا رخ ادھر کرتے ہوئے تیزی سے گھوما اور عین ممکن تھا کہ خوف اور خطرے کے احساس کی وجہ سے غیر ارادی طور پر وہ ٹریگر بھی دبا دیتا لیکن وہ بروقت گولی چلاتے چلاتے رک گیا۔ اس نے اپنے ایک ماتحت اور ساتھی انسپکٹر کو اپنی طرف آتے دیکھ لیا تھا۔ وہ بھی اس ہی کی طرح جھکا جھکا نہایت محتاط انداز میں اس کی طرف آ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر دہشت تھی۔ جاوید کے قریب آ کر رکنے کے بعد بھی وہ اپنی رائفل ادھر اُدھر گھماتے ہوئے متلاشی نظروں سے چاروں طرف دیکھتا رہا جیسے اسے اندیشہ ہو کہ ابھی درختوں کے درمیان سے کوئی عفریت نکل کر اس پر حملہ آور ہو جائے گا۔ ”یہ کیا ہو گیا رام لعل......؟“

جاوید نے اپنے ساتھی پولیس والوں کی لاشوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نہایت متاسفانہ لہجے میں کہا۔ ''ہمارے پانچ آدمی چند سیکنڈ میں مارے گئے......؟''

''سر......ہمیں کیا پتا تھا کہ وہ راکشش درختوں کے اوپر چھپے ہوئے ہوں گے۔'' رام لعل بھی گلوگیری آواز میں بولا۔ ''اور سر......وہ آدمی نہیں...... چھلاوے تھے چھلاوے......وہ تو اپنے ہتھیاروں سمیت بندروں کی طرح شاخیں پکڑ کر ایک درخت سے دوسرے درخت پر چھلانگیں لگا رہے تھے۔ وہ خبیث ذرا سی دیر میں اپنی کارروائی کر کے غائب ہو گئے۔ جنگل میں کہیں ان کے گھوڑے بھی موجود نہیں تھے۔''

''تم لوگوں نے ان کا مقابلہ کرنے کی کوشش نہیں کی؟'' جاوید نے پوچھا۔

رام لعل نے کچھ ایسی نظروں سے اس کی طرف دیکھا جیسے کہنا چاہ رہا ہو۔ ''سر......آپ تو خود گولیوں کی بوچھاڑ ہوتے ہی غائب ہو گئے تھے۔ ہم سے آپ مقابلے کے بارے میں پوچھ رہے ہیں۔''

جاوید گویا اس کی خاموش نگاہوں کا مطلب سمجھتے ہوئے دیانتداری سے بولا۔ ''میں مانتا ہوں کہ چند سیکنڈ کے لیے واقعی میں بدحواس ہو گیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ ہوا کیا ہے......لیکن جیسے ہی میرے حواس ٹھکانے آئے میں یہاں واپس آ گیا۔''

''ہم نے بھی اسی طرح اس اچانک حملے سے سنبھلنے کے بعد پوزیشن لے کر مقابلہ کرنے کی کوشش کی تھی۔'' رام لعل بردباری سے بولا۔ ''تبھی تو یہ ایک ڈاکو مارا گیا اور وہ لوگ بھاگ بھی گئے۔ ورنہ شاید ہم سارے کے سارے ہی مارے جاتے۔''

اس دوران جاوید ملک کے دو مزید چار ساتھی بھی اِدھر اُدھر سے واپس آ گئے جو زندہ بچ گئے تھے انہوں نے اپنے گھوڑوں کی تلاش شروع کر دی جو بدک کر بھاگ گئے تھے۔ اب انہیں ان لاشوں کو انہی گھوڑوں پر لاد کر شہر لے جانا تھا۔ اس واقعے نے جاوید ملک کے دل میں سلطانہ کی نفرت کو کچھ اور بڑھا دیا۔ اس نے دل ہی دل میں عہد کیا کہ آئندہ وہ بہتر منصوبہ بندی کے ساتھ سلطانہ کو تلاش کرنے کی کوشش کرے گا۔



سلطانہ اور اس کا گروہ جب اپنے مرنے والے ساتھی کا سوگ منا چکا اور ان کے ہاتھوں مارے جانے والے پولیس افسروں کی تدفین یا انتم سنسکار تمام تر سرکاری اعزاز کے ساتھ ہو چکی

تو دونوں فریقوں کی سرگرمیاں ایک بار پھر شروع ہو گئیں۔ پولیس والے تو سلطانہ اور اس کے ساتھیوں کو پکڑنے یا ہلاک کرنے کی کوششیں اپنا فرض سمجھ کر کرتے تھے لیکن سلطانہ اور اس کا گروہ بھی لوٹ مار اور قتل و غارت کچھ اسی طرح کرتا تھا جیسے یہ ان کا اہم فریضہ یا زندگی کا ضروری حصہ ہو۔ سلطانہ کی تمام تر سخاوت کے باوجود ان کے پاس مال و دولت کی کمی نہیں تھی لیکن وہ مزید لوٹ کر لاتے رہتے تھے۔

ادھر پانچ پولیس والوں کے مرنے کے واقعے کے بعد جاوید ملک اور فریڈی ینگ کے درمیان ایک غیر محسوس سا کھنچاؤ آ گیا تھا حالانکہ ینگ نے جاوید ملک کو ذرا سی بھی سرزنش نہیں کی تھی۔ اس نے واقعے کے چند دن بعد اپنے دفتر میں جاوید ملک سے تنہائی میں ملاقات کے دوران یہی کہا تھا۔ ''میں تمہارے طریقہ کار کو غلط قرار نہیں دے رہا۔ تمہاری جگہ میں ہوتا تو شاید میں بھی سلطانہ اور اس کی محبوبہ کو اپنے سامنے دیکھ کر انہیں پکڑنے کے لیے دوڑ پڑتا...... خاص طور پر اس وقت جب میرے ساتھ دس مسلح ماتحت بھی ہوتے...... اس کے باوجود میں ایک بار پھر تمہیں یہی نصیحت کروں گا کہ سلطانہ کے سلسلے میں کبھی جلد بازی کا مظاہرہ نہ کرنا۔ میرا دل کہتا ہے کہ اس فتنے سے نپٹنے کے سلسلے میں طاقت سے زیادہ تحمل و تدبر کام آئے گا۔''

''ہمارے اس تحمل اور تدبر کے دوران نہ جانے کتنا نقصان ہو جائے گا۔'' جاوید ملک کا لہجہ دھیما، لیکن قدرے طنزیہ تھا۔

''جلد بازی میں نقصان اس سے بھی زیادہ ہو سکتا ہے۔'' ینگ نے نرمی سے کہا۔

''کیا ہم اتنے زیادہ تحمل اور تدبر سے کام لیں گے کہ اب بھی چنبیلی تک کو گرفتار نہیں کریں گے؟'' جاوید ملک دبی دبی ناگواری سے بولا۔ ''ہم اپنی آنکھوں سے اسے سلطانہ کے ساتھ دیکھ چکے ہیں۔ یہ بات طے ہو چکی ہے کہ وہ سلطانہ کی محبوبہ ہے...... اور وہ پورے روہیل کھنڈ کی پولیس کی آنکھوں کے سامنے ٹھاٹ سے اپنے گھر میں رہ رہی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے وہ کوئی ناچنے والی نہیں بلکہ کوئی راجکماری یا ملکہ ہے جس پر ہم ہاتھ نہیں ڈال سکتے۔''

''اس وقت وہ ہمارے لیے کسی راجکماری یا ملکہ سے اہم ہے۔'' ینگ بولا۔ ''میں اب بھی اپنی اس بات پر قائم ہوں کہ شاید اسی کے ذریعے ہم سلطانہ تک پہنچ سکیں۔''

''شاید اس وقت تک ہماری آدھی پولیس فورس قتل ہو جائے۔'' جاوید ملک کے لہجے میں تلخی تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ اپنے غصے کو قابو میں رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"اگر تم نے اسے اٹھایا اور پوچھ گچھ کے سلسلے میں اس کے ساتھ کوئی بدسلوکی کی...... تو اس سے زیادہ پولیس والے مارے جائیں گے جتنے فی الحال مارے جارہے ہیں۔ یہ میری پیشگوئی ہے۔" ینگ کا تحمل برقرار تھا۔

"چنبیلی کا آزاد رہنا مجھے پولیس کی شرمناک شکست محسوس ہوتا ہے۔" جاوید ملک نے بالآخر گویا دل کی بات کہہ دی۔

"جنگ میں کبھی کبھی مصلحت کے تحت پسپائی بھی اختیار کرنا پڑتی ہے۔ اس کا مطلب سچ مچ شکست نہیں ہوتا۔" ینگ بولا۔

"سر...... میں کوشش کررہا ہوں کہ آپ کی سوچ اور آپ کے طریقۂ کار کے مطابق چل سکوں لیکن اگر کبھی تھوڑا بہت اِدھر اُدھر ہو جایا کروں تو آپ برا نہ منایا کریں۔" جاوید بولا۔ "پھر وہ ینگ سے اجازت لے کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ ینگ سگار کے ہلکے ہلکے کش لیتے ہوئے پُرخیال انداز میں اسے جاتے دیکھتا رہا۔



اس روز بھورے کہیں باہر سے آیا تو بے حد پُرجوش نظر آرہا تھا۔ وہ وڈیرے پر پہنچتے ہی سیدھا سلطانہ کے پاس گیا اور بولا۔ "مجھے اس آدمی کا پتا چل گیا ہے جس نے تمہارے بارے میں مخبری کی تھی کہ تم چنبیلی کے مکان پر اس سے ملنے جاتے ہو...... جس کے بعد چار پولیس والے وہاں گھات لگا کر بیٹھنے لگے تھے...... جن میں سے دو تمہارے ہاتھوں مارے گئے تھے۔"

"کیا یہ پکی بات ہے کہ تمہیں جس آدمی کے بارے میں پتا چلا ہے...... واقعی مخبری اسی نے کی تھی؟" سلطانہ نے بھنویں اچکاتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں...... جب مجھے خود پکا یقین ہوگیا، اس کے بعد ہی تو میں تمہارے پاس آیا ہوں۔" بھورے بولا۔ "ورنہ اُڑتی اُڑتی خبریں تو مجھے کئی دن پہلے ملی تھیں۔ مجھے خود یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ آدمی تمہاری مخبری کرسکتا ہے کیونکہ وہ ایک غریب آدمی ہے اور اس سے پہلے کبھی کسی غریب آدمی نے سلطانہ کی مخبری کے بارے میں شاید سوچا بھی نہیں تھا۔"

"یہ تو تم واقعی عجیب خبر لائے ہو۔" سلطانہ بھی حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

"اب کرنا کیا ہے؟" بھورے نے دریافت کیا۔ "میں نے تم سے پوچھے بغیر کوئی قدم اٹھانا مناسب نہیں سمجھا۔"

"ہوں......" سلطانہ نے پُرخیال انداز میں مونچھ کو بل دیتے ہوئے ہنکارا بھرا۔ "یہ تو تم نے اچھا کیا کہ خود کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ ایسے کاموں میں جلد بازی کی ضرورت نہیں ہوتی۔"

وہ ایک لمحے خاموش رہا پھر گویا فیصلے پر پہنچتے ہوئے بولا۔ "غریب ہونے کی وجہ سے اس آدمی کو معاف نہیں کیا جاسکتا۔ اس نے سلطانہ کے بارے میں مخبری کی ہے۔ دوش بہت بڑا ہے...... سزا تو اسے ملنی چاہیے...... کہاں رہتا ہے وہ؟"

"مراد آباد سے باہر ایک غریبانہ سی بستی میں رہتا ہے۔ چنبیلی کے گھر سے زیادہ دور نہیں ہے اس کا گھر۔" بھورے نے بتایا۔

"بس...... تو پھر سفر کی تیاری کرو۔ آج رات ہی اس کے ساتھ حساب کتاب صاف ہو جانا چاہیے۔" سلطانہ نے کہا۔ "ہم صرف سات آدمی جائیں گے۔"

جب سلطانہ یہ ہدایت کرتا تھا تو اس کا مطلب ہوتا تھا کہ اس کے ساتھ اس کے صرف وہی چھ ساتھی جائیں گے جو شروع ہی سے اس کے ساتھ تھے اور اس کے بچپن کے دوست تھے۔

شام کے سائے گہرے ہوتے ہی وہ لوگ گھوڑوں پر سوار ہو کر مراد آباد کی سمت روانہ ہوگئے۔ وہ جب وہاں پہنچے تو گہری رات کا سکوت ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔ اس بستی میں چند کتوں نے بھونک کر ان کا استقبال کیا جہاں ان کے مطلوبہ "مجرم" کا مکان تھا۔ مکان قدرے بلندی پر تھا۔ سلطانہ نے دھندلی چاندنی میں بہت دور تک گردوپیش کا جائزہ لیا تو اسے چنبیلی کے مکان کا تاریک ہیولا بھی دکھائی دیا۔ اس کے دل میں گدگدی سی ہوئی۔ گو کہ اسے معلوم تھا کہ اب پولیس یا سی آئی ڈی والے چنبیلی کے مکان کی نگرانی نہیں کررہے تھے لیکن اس کا وہاں جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اس وقت وہ کسی اور "مشن" پر آیا ہوا تھا۔ جب وہ کسی اہم مقصد کے لیے نکلا ہوتا تھا تو بھرپور کوشش کرتا تھا کہ چنبیلی کے بارے میں کوئی رومان انگیز تصور بھی اس کے ذہن پر حملہ نہ کرنے پائے۔

مکان کا محلِ وقوع دیکھ کر اسے اندازہ ہوگیا کہ وہ شخص کس طرح اس کے بارے میں مخبری کرنے میں کامیاب ہوا ہوگا۔ اسے شاید کبھی سلطانہ کا ہیولا وہاں متحرک نظر آیا ہوگا جہاں چنبیلی کا مکان تھا۔ پھر شاید اس نے کافی محنت سے اس سلسلے میں "جاسوسی" کی ہوگی۔ اس کے باوجود سلطانہ کے بارے میں کسی کا مخبری کرنا خود سلطانہ کے لیے حیرت انگیز تھا۔ اب تو اس کے بارے میں خود اس کے ہاتھوں لٹنے والے بنیوں، ساہوکاروں اور زمینداروں نے بھی اس کے بارے

میں پولیس کو کوئی بات بتانا چھوڑ دیا تھا۔ شاید وہ اپنی تقدیر پر شاکر ہو گئے تھے۔ انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ اس فتنے پر قابو پانا پولیس کے بس کی بات نہیں تھی، اس لیے اب اسے مزید ناراض کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

سلطانہ کے آدمی جن بنیوں سے مہینے بیس دن کا راشن لینے جاتے تھے، اب وہ بھی ان کے بارے میں جان چکے تھے کہ وہ سلطانہ کے گروہ کے لوگ ہیں لیکن کوئی ان کے بارے میں زبان نہیں کھولتا تھا۔ دکانداروں کے لیے یہی غنیمت تھا کہ سلطانہ کے آدمی ہر چیز کے پیسے دوسروں سے کچھ زیادہ ہی دے کر جاتے تھے۔ ان میں سے اگر کوئی سلطانہ کے گروہ کے ہاتھوں لٹ چکا ہوتا تھا تب بھی شاید وہ یہ سوچ کر صبر کر لیتا تھا کہ اس کے اپنے ہی گئے ہوئے مال میں سے کچھ تو واپس آ رہا ہے۔

اس پس منظر میں سلطانہ کو اس آدمی پر حیرت کی تھی جس نے غریب ہوتے ہوئے بھی اس کی مخبری کی تھی۔ غریب تو اس سے محبت کرتے تھے۔ معمول کی رسمی کارروائی کے دوران یا کسی ڈکیتی وغیرہ کے بعد جب پولیس یا سی آئی ڈی والے کسی گاؤں، قصبے یا بستی میں تفتیش کے لیے آتے تھے تو بہت سے لوگوں سے پوچھتے تھے کیا انہوں نے ڈکیتی کے دوران یا ویسے ہی عام حالات میں کبھی سلطانہ یا اس کے کسی آدمی کو دیکھا ہے؟ کیا وہ اس گروہ کے کسی ڈاکو کے بارے میں کچھ جانتے ہیں؟ تو سب کا جواب نفی میں ہوتا تھا۔ سب انجان بن جاتے تھے۔ ڈکیتی کے دوران اگر کوئی ڈاکوؤں کو دیکھنے کا اعتراف بھی کرتا تھا تو یہی کہتا تھا کہ ان کے چہروں پر ڈھاٹے بندھے ہوئے تھے، اس لیے وہ یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ چنانچہ پولیس اور سی آئی ڈی کی عام سی اور رسمی رپورٹوں میں زیادہ تر یہی لکھا ہوتا تھا۔ ''بھرپور تفتیش کی گئی لیکن درج ذیل باتوں کے سوا کوئی خاص اور کارآمد معلومات حاصل نہیں ہو سکیں۔''

''درج ذیل'' باتیں وہی ہوتی تھیں جو وہ اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ اپنی رپورٹوں میں لکھ چکے ہوتے تھے۔ اس طرح وہ بھی بس اپنی ڈیوٹی بھگتاتے تھے اور جان چھڑا لیتے تھے۔

بستی میں شاید کسی طرح یہ خبر پھیل چکی تھی کہ سلطانہ اور اس کے ساتھی ایک خاص گھر پر آ رکے ہیں۔ رات کا سکوت کچھ اور گہرا ہو گیا تھا۔ حتیٰ کہ کتوں نے بھی بھونکنا بند کر دیا تھا۔ لوگوں شاید یہ اندازہ بھی ہو گیا تھا کہ ایسی غریبانہ بستی میں ڈاکا ڈالنے تو نہیں آ سکتا، یقیناً وہ کسی اور کام سے آیا ہوگا۔ شاید انہیں یہ اندازہ بھی ہو گیا تھا کہ رات کے اس پہر وہ اپنے چند ساتھیوں

کے ہمراہ غریبوں کی مدد کے لیے بھی نہیں آیا ہوگا ورنہ وہ اس طرح ایک مخصوص گھر کے سامنے جا کر نہ رکتا۔ فضا میں جیسے خوف کی لہریں سی پھیل گئی تھیں۔ کچھ بعید نہیں تھا کہ لوگوں کو پہلے ہی اندازہ ہو گیا ہو یا سُن گُن مل گئی ہو کہ ان کی بستی کے ایک آدمی کی شامت آنے والی تھی۔

سلطانہ کے ساتھی گھوڑوں سے اتر چکے تھے۔ بھورے منتظر انداز میں سلطانہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ گویا پوچھ رہا ہو کہ کیا کرنا ہے؟ سلطانہ نے اشارہ کیا، تین آدمیوں نے چند قدم پیچھے ہٹ کر دوڑتے ہوئے بیک وقت اپنے کندھوں سے دروازے پر ٹکر رسید کی۔ ایسا لگا جیسے تین غصیلے بھینسے ایک ساتھ دروازے سے ٹکرا گئے ہوں۔ دروازہ اکھڑ کر اندر جا گرا۔ اندر سے کسی کی خوفزدہ سی چیخ ابھری۔ وہ سب رائفلیں سنبھالے، نیچے گرے ہوئے دروازے کو پھلانگتے، یکے بعد دیگرے اندر چلے گئے۔

چھوٹے صحن سے ذرا آگے ایک بڑا سا کمرا تھا جس کا دروازہ کھلا نظر آ رہا تھا۔ سامنے ہی چھت کی بلی میں لالٹین لٹکی ہوئی تھی جس کی زرد روشنی میں چند افراد بستروں پر اٹھ کر بیٹھے دکھائی دیئے۔ سلطانہ اور بھورے دروازے پر پہنچ گئے۔ باقی لوگ صحن میں ہی رک گئے۔ کمرے میں جھانکتے ہی سلطانہ کو حیرت کا ہلکا سا جھٹکا لگا۔ اس کے سامنے پرانی سی ایک چادر سے جھانکتا ہوا چاند سا چہرہ تھا۔ اس لڑکی کی عمر بہ مشکل پندرہ سولہ سال ہوگی جو بستر پر اٹھ بیٹھی تھی اور پرانی سی چادر کو اوپر کھینچ کر غیر ارادی سے انداز میں اپنے وجود کو ڈھانپنے کی کوشش کر رہی تھی۔

اس کے حسین چہرے پر لڑکپن اور شباب گلے مل رہا تھا لیکن چہرے سے نیچے صرف شباب ہی شباب تھا جس کا تھوڑا سا حصہ ہی میلی چادر میں چھپ پایا تھا۔ اس کی ہرنی جیسی بڑی بڑی آنکھیں خوف سے پھیل کر کچھ اور بڑی ہو گئی تھیں۔ اس کے لمبے، سیاہ ریشمی بال اس وقت الجھے ہوئے اور بے ترتیب تھے لیکن اس بے ترتیبی میں بھی ایک حسن تھا۔ اس کے برابر والی چارپائی پر کافی حد تک اسی کے انداز میں ایک عورت اٹھ کر بیٹھی ہوئی تھی۔

اس کی شکل میں لڑکی کی بڑی شباہت تھی...... یا یوں کہنا چاہیے تھا کہ لڑکی کی شکل میں اس کی شباہت تھی۔ عورت کی عمر بتیس چونتیس سال ہوگی۔ سلطانہ کے لیے اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ وہ لڑکی کی ماں تھی لیکن اگر وہ خود کو اس کی بڑی بہن بھی کہتی تو شاید کسی کے لیے بھی یقین کرنا مشکل نہ ہوتا۔ سلطانہ نے ''گدڑی میں لعل'' والا محاورہ آج تک صرف سنا تھا لیکن آج وہ اسے بالکل سچ محسوس ہوا۔

ان دونوں کی چارپائیوں سے ذرا ہٹ کر ایک اور چارپائی تھی جس پر دہشت زدہ سی حالت میں بیٹھا ہوا شخص یقیناً وہی تھا جس کی وجہ سے وہ لوگ اس وقت یہاں آئے تھے۔ وہ نہایت معمولی سی شکل صورت کا ایک ادھیڑ عمر آدمی تھا جو اپنے الجھے ہوئے کھچڑی بالوں کی وجہ سے کچھ اور بھی زیادہ وحشت زدہ لگ رہا تھا۔ وہ گھرانہ شاید تین ہی افراد پر مشتمل تھا۔ گھر میں کسی اور کی موجودگی کے کوئی آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔

وہ تینوں پلکیں جھپکائے بغیر، پھٹی پھٹی آنکھوں سے سلطانہ اور بھورے کو دیکھ رہے تھے۔ ایک لمحے کے لیے شاید ان کے ذہنوں میں یہ خیال بھی آیا ہو کہ وہ کوئی بھیانک خواب دیکھ رہے ہیں۔ فضا میں پھیلی ہوئی خوف کی لہریں شاید اب صرف اس ایک کمرے میں مرتکز ہو گئی تھیں۔ بھورے اور سلطانہ موٹی موٹی سرخ آنکھوں سے ایک ٹک اب صرف اس شخص کو گھور رہے تھے جسے یقیناً معلوم ہو چکا تھا کہ وہ وہاں کیوں آئے تھے۔ انہیں کچھ بھی کہنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ وہ شخص اچانک چارپائی سے اٹھا اور گرتا پڑتا کمرے کے دروازے تک پہنچ کر سلطانہ کے پیروں میں گر پڑا۔

”مجھے معاف کر دو سلطانہ...... مجھے معاف کر دو۔“ وہ گڑگڑایا۔ ”میں پاگل ہو گیا تھا...... میری عقل ماری گئی تھی۔ بھگوان کے لیے مجھے معاف کر دو......“

گویا اب چھان بین کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ صحیح آدمی تک پہنچے تھے اور اس نے ان کے کچھ کہے بغیر اعتراف جرم کر لیا تھا۔ سلطانہ نے ہلکی سی ٹھوکر مار کر اسے پیچھے کیا اور غرانے کے سے انداز میں بولا۔ ”کیا ملا تجھے میری مخبری کر کے......؟“

بہت تھوڑی سی رقم...... حالانکہ انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ میری بیٹی کی شادی کرا دیں گے......“ اس نے کانپتے ہوئے بازو سے پیچھے چارپائی پر بیٹھی چاند سے چہرے والی لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔ ”اور اسی لالچ میں میں نے یہ کام کیا تھا۔ غریب کے گھر میں حسین بیٹی نہیں ہونی چاہیے۔ جو بھی نظر ڈالتا ہے بری ڈالتا ہے۔ میں چاہتا تھا جلدی سے جلدی اس کا بیاہ ہو جائے۔ ایک پولیس والے کی باتیں سن کر میرے دماغ میں یہ خیال آیا تھا۔ اس نے بڑی امید دلائی تھی کہ اگر میں کوئی کام کی بات بتاؤں تو میری بیٹی کی شادی کا بندوبست ہو جائے گا...... مگر وہ نہیں ہوا۔“ اس کی آواز گلے میں اٹکنے لگی۔ سلطانہ جس طرح ایک ٹک اس کی طرف دیکھ رہا تھا اس سے اس کی کپکپاہٹ میں اضافہ ہو رہا تھا۔

”سرکار کے وعدے تو ایسے ہی ہوتے ہیں میری جان......“ سلطانہ نرمی سے بولا۔ ”تم سلطانہ کے پاس آ جاتے۔ تمہاری بیٹی کی شادی ہو جاتی۔“

”میں نے یہ کوشش بھی کی تھی لیکن میں تم تک نہیں پہنچ سکا...... اور جب تم چنبیلی کے گھر آتے تھے، اس وقت تمہارے پاس آنے کی مجھ میں ہمت نہیں تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ تم نہ جانے کیا سمجھو...... اور کہیں مجھے دور سے ہی گولی نہ مار دو۔“ وہ شخص تقریباً روتے ہوئے بولا۔ بھورے نے سلطانہ کو اس کا نام دھنو بتایا تھا۔ یہ بھی ایک ستم ظریفی تھی۔ دھنو عام طور پر مالدار آدمی کو کہا جاتا تھا جبکہ وہ شخص گردن تک غربت کی دلدل میں دھنسا نظر آ رہا تھا۔

”تم نے کوئی خاص کوشش نہیں کی ہو گی ورنہ جسے مجھ سے ملنے کی ضرورت ہوتی ہے وہ کسی نہ کسی طرح آخر کار مجھ تک پہنچ ہی جاتا ہے۔“ سلطانہ بولا۔ اس کا لہجہ سپاٹ تھا۔ پھر اس نے گردن گھما کر اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا۔ ان میں سے چار آدمی آگے آئے۔ انہیں معلوم تھا کہ انہیں کیا کرنا ہے۔ انہوں نے ایک جھٹکے سے دھنو کو اٹھایا اور تقریباً گھسیٹتے ہوئے صحن میں لے آئے۔ وہ گڑگڑا رہا تھا، معافیاں مانگ رہا تھا۔

اس کی بیوی کچھ اس طرح چارپائی سے اتری جیسے گر پڑی ہو۔ وہ گرتی ہوئی آگے آتے ہوئے، پھٹی پھٹی سی آواز میں بولی۔ ”یہ تم کیا کرنے لگے ہو سلطانہ......؟ میں نے تو سنا تھا تم غریبوں کے بڑے ہمدرد ہو......“

”ان غریبوں کا نہیں، جو یہ کوشش کریں کہ میں انگریزوں یا ان کے غلاموں کے ہاتھوں مارا جاؤں۔“ سلطانہ نے گویا اس کی کوئی غلط فہمی دور کی۔ پھر اس نے رائفل کی نال ماں بیٹی کی طرف گھماتے ہوئے کسی درندے کی طرح غرانے کے سے انداز میں کہا۔ ”یہاں چاہے کچھ بھی ہوتا رہے...... تم میں سے کسی نے اگر چیخ پکار کی تو میں نہیں کہہ سکتا اس کے بدن میں کتنی گولیاں اتر جائیں۔“

لڑکی بدستور چارپائی پر ہی بیٹھی تھی لیکن اس نے یوں سختی سے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا جیسے چیخ روکنے کی کوشش کر رہی ہو۔ دونوں ماں بیٹی جہاں موجود تھیں وہاں سے صحن کا منظر دیکھ سکتی تھیں۔ سلطانہ کے ساتھیوں نے چند سیکنڈ میں دھنو کے ہاتھ، رسی کے ایک ٹکڑے سے اس کی پشت پر باندھ دیئے تھے۔ گھر کے صحن میں بیری کا ایک درخت موجود تھا۔ سلطانہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”وہ...... ایک کہاوت ہے نا...... جس گھر میں بیری ہو اس میں پتھر تو آتے ہی

ہیں...... اشارہ بیٹیوں کی طرف ہے...... مگر اس گھر میں تو بیری بھی موجود ہے اور بیٹی بھی۔“

اس نے اپنے ساتھیوں کو کوئی ہدایت نہیں دی تھی لیکن وہ گویا خوب سمجھتے تھے کہ کس لیے وہ کیا چاہتا ہے۔ بھورے زمین پر اکڑوں بیٹھ گیا اور گجندر اس کے کندھوں پر بیٹھ گیا جس کے بعد بھورے اٹھ کھڑا ہوا۔ گجندر اب اس کے کندھوں پر کھڑا ہو گیا اب دو آدمیوں کے قد کے برابر اونچا ہو گیا تھا۔ اس نے بیری کی ایک اونچی اور مضبوط شاخ میں ایک رسی لٹکا دی۔ یہ دراصل پھانسی کا پھندا تھا۔ دھنو کو اندازہ ہو گیا کہ اس کے ساتھ کیا ہونے والا تھا لیکن اب وہ گڑگڑا بھی نہیں پا رہا تھا۔ خوف کی شدت سے اس کے حلق سے اب محض گھگھیانے کی سی آوازیں نکل رہی تھیں۔

دو آدمیوں نے اسے بازوؤں پر اُٹھا کر کافی اونچا کر دیا۔ پھانسی کا پھندا عین اس کے چہرے کے سامنے آ گیا۔ اس کی آنکھیں دہشت سے پھیل گئیں لیکن اس کے حلق سے گھگھیانے کی سی آوازیں برآمد ہونا بند ہو گئیں۔ شاید خوف کی انتہا کو پہنچ کر اس کی آواز ہی معدوم ہو گئی تھی۔ بس اس کے ہونٹ خاموشی سے تھرتھرا رہے تھے۔ گجندر نے ایک لمحے میں پھندا اس کے گلے میں ڈال دیا۔ جن دو آدمیوں نے اسے اونچا کیا ہوا تھا انہوں نے اچانک اسے چھوڑ دیا اور وہ پھانسی کے پھندے میں جھولنے لگا۔

اس کے حلق سے صرف چند سیکنڈ کے لیے خرخراہٹ کی سی آوازیں نکلیں اور معدوم ہو گئیں اس کی آنکھیں حلقوں سے ابل پڑی تھیں اور جسم کو جھٹکے سے لگ رہے تھے۔ کمرے میں موجود اس کی بیوی اور بیٹی نے اپنے چہرے ہاتھوں میں چھپاتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔ گجندر بھورے کے کندھوں سے کود کر نیچے آ گیا۔ وہ سب ذرا پیچھے ہٹ کر کھڑے ہو گئے اور انہاک سے اپنے سامنے کا منظر دیکھنے لگے۔ چند ہی لمحوں میں دھنو کا جھولتا ہوا جسم ساکت ہو گیا۔ حلقوں سے باہر کو آئی ہوئی آنکھیں بے نور ہو گئیں۔ اس کا چہرہ بھیانک دکھائی دینے لگا تھا۔ روح یقیناً اس کے جسم کا ساتھ چھوڑ چکی تھی۔ پھانسی کا عمل مکمل ہو چکا تھا۔ سلطان عرف سلطانہ نے منہ سے کوئی لفظ نکالے بغیر محض آنکھوں کے اشارے سے اس کی پھانسی کا حکم جاری کیا تھا اور اس پر عمل درآمد ہو گیا تھا۔ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ وہ جہاں کھڑا ہو جاتا تھا وہ جگہ گویا اس کی سلطنت ہو جاتی تھی۔ وہاں اس کا حکم چلتا تھا۔

سلطانہ نے اپنے ڈھیلے ڈھالے کُرتے کے نیچے ہاتھ ڈالا اور کسی جیب سے پرانے نوٹوں

کی ایک گڈی نکالی جو ڈوری میں بندھی ہوئی تھی۔ وہ کمرے کے دروازے تک پہنچا، جہاں دھنو کی بیوی جواب بیوی نہیں رہی تھی بلکہ بیوہ ہو چکی تھی بدستور دونوں ہاتھوں میں منہ چھپائے بیٹھی تھی۔ اس کا جسم ہولے ہولے کپکپا رہا تھا۔ کمرے میں چارپائی پر بیٹھی لڑکی نے اب اپنے آپ کو پوری طرح چادر میں چھپا لیا تھا۔

”اے عورت...... بات سنو۔“ سلطانہ نے نرمی سے کہا۔

عورت نے دھیرے دھیرے ہاتھ چہرے سے ہٹائے۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ وہ اس طرف نہیں دیکھ رہی تھی جہاں اس کا شوہر ایک لاش کی صورت میں پھانسی کے پھندے میں لٹکا ہوا تھا۔ سلطانہ نے نوٹوں کی گڈی اس کی گود میں رکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ بیٹی کی شادی کے لیے رکھ لو۔ اگر کوئی رشتہ ڈھونڈ چکی ہو تو بہت اچھی بات ہے...... اگر ابھی نہیں ڈھونڈا تو ڈھونڈ لینا۔ ڈھونڈنے میں کوئی مشکل پیش آ جائے تو جا کر چنبیلی کو میرے نام پیغام دے دینا۔ پیغام مجھ تک پہنچ جائے گا۔ میں کسی نہ کسی طرح تمہاری بیٹی کے لیے کوئی اچھا رشتہ بھی ڈھونڈ دوں گا۔“

عورت نے بھیگی بھیگی آنکھوں میں نفرت لیے اس کی طرف دیکھا۔ اب وہ پہلے جیسی خوبصورت نہیں لگ رہی تھی۔ چند منٹ اس نے چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپائے رکھا تھا اور اس مختصر سے وقت میں اس کے چہرے میں جیسے کوئی تبدیلی آ گئی تھی۔ اس کے نقوش میں سے حسن گویا کسی نے نچوڑ لیا تھا۔ وہ نوٹوں کی گڈی اپنی گود سے اٹھا کر آہستگی سے اس کے قدموں میں پھینکتے ہوئے بیٹھی بیٹھی سی آواز میں بولی۔ ”نہیں چاہیے مجھے تمہارا پیسہ...... اپنے پاس ہی رکھو اپنی یہ لوٹ مار کی دولت...... پتا نہیں کس کس کا خون لگا ہو گا ان نوٹوں پر...... بڑا آیا دیالو...... میرا گھر اجاڑ کر میری بیٹی کا بیاہ کرانے چلا ہے...... ہونہہ......“

اس نے نفرت سے زمین پر تھوک دیا۔ شاید دہشت کی ایک خاص منزل سے گزرنے کے بعد وہ بے خوف ہو گئی تھی۔ سلطانہ ہولے سے ہنس دیا۔ اس نے نہ عورت کو کوئی جواب دیا اور نہ ہی نوٹوں کی گڈی زمین سے اٹھائی۔ اس نے اپنے ساتھیوں کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔ ”آؤ چلیں۔“

وہ سب قدرے بوجھل سے قدموں سے چلتے ہوئے اس شگاف کے راستے باہر آ گئے جہاں کچھ دیر پہلے لکڑی کے تختوں کا بے ہنگم دروازہ نصب تھا۔ باہر آنے سے پہلے سرجو اور صادق نے دو بار گردن گھما کر صحن میں پڑی نوٹوں کی گڈی کی طرف دیکھا۔ وہ یقیناً ایک بڑی رقم تھی

جس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔ گجندر ہچکچاتے ہوئے بول ہی اٹھا۔ ''عورت پیسے کہیں پھینک نہ دے۔''

''تم بے فکر رہو...... وہ نہیں پھینکے گی۔'' سلطانہ نے اعتماد سے کہا اور اپنے مخصوص انداز میں چھلانگ لگا کر کسی چھلاوے کی طرح چیتک پر سوار ہوگیا۔

بھورے اور دیگر تمام ساتھی بہت آہستگی سے گھوڑوں پر سوار ہوئے۔ ان کے انداز سے کچھ ایسا لگ رہا تھا جیسے ان کا وہاں سے واپس جانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ اس چیز کو سلطانہ نے بھی محسوس کرلیا۔ اس نے قدرے حیرت سے باری باری ان سب کی طرف دیکھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا بھورے بول اٹھا۔ ''سلطانہ...... ایک بات کہوں...... برا تو نہیں مناؤ گے؟''

''ہمارے گروہ میں صرف تم ہی ہو جو میرے برا منانے کی پروا کیے بغیر بھی کوئی بات کہہ سکتے ہو۔'' سلطانہ بولا۔

''وہ دراصل بات یہ ہے کہ......'' اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا اور عجیب سی نظروں سے باقی ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے چند لمحوں سے ان کے درمیان آنکھوں ہی آنکھوں میں کوئی بات چل رہی تھی۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد بھورے نے سلسلہ کلام جوڑا اور پیچھے دھنو کے مکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''ماں بیٹی دونوں بہت خوبصورت ہیں۔ اگر تم اجازت دو......'' اس نے بات ادھوری چھوڑ دی اور ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔

بات چیت کے معاملے میں اکثر حالات میں سلطانہ خاصا تیز طرار لگتا تھا اور اس کے انداز میں حاضر جوابی بھی ہوتی تھی لیکن اس وقت وہ حیرت سے منہ کھولے یوں اایک ٹک بھورے کی طرف دیکھتا رہ گیا جیسے اس کی سمجھ میں نہ آرہا ہو کہ کیا بولے۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بڑی مشکل سے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے گھٹی گھٹی سی آواز میں بولا۔ ''بھورے...... مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ تم لوگ کب انسانیت سے اس حد تک گر گئے...... مجھے یقین نہیں آرہا کہ اس وقت ...... ان حالات میں بھی تم ایسا سوچ سکتے ہو......!''

''کم سے کم تمہیں تو ایسا نہیں کہنا چاہیے سلطانہ۔'' بھورے محتاط لہجے میں بولا۔ ''تم خود سوچو...... ہم لوگ کب سے اکیلے رہ رہے ہیں۔''

وہ مزید کچھ نہ بولا اور آنکھوں میں ایک عجیب سی بے چارگی لیے سلطانہ کی طرف دیکھتا رہا۔ وہاں روشنی بہت کم تھی اس کے باوجود سلطانہ اس کی آنکھوں میں عجیب سی بے چارگی کے

علاوہ بھی بہت کچھ دیکھ سکتا تھا۔ ان آنکھوں میں کچلے ہوئے جذبوں کے شراروں کے علاوہ بغاوت کی مدھم سی چنگاریاں بھی جیسے کہیں دور دراز، تاریک گوشوں میں جھلملا رہی تھیں۔ اسے یوں لگا جیسے بھورے اس سے خاموشی کی زبان میں کہہ رہا تھا۔ ''تم نے اپنے لیے تو چنبیلی کی رفاقت کا بندوبست کرلیا...... تم نے کبھی ہمارے بارے میں کچھ سوچا......؟''

سلطانہ کو آج پہلی بار احساس ہوا کہ شاید چنبیلی کی وجہ سے اس کے اور اس کے سب سے زیادہ جاں نثار ساتھیوں کے درمیان ایک نادیدہ سی خلیج حائل ہوگئی تھی اور اسے پتا ہی نہیں چلا تھا۔ اسے اس پہلو کی طرف دھیان دینے کی فرصت ہی نہیں ملی تھی۔

اس کے سینے سے ایک طویل اور بوجھل سی سانس خارج ہوئی۔ جب وہ بولا تو اس کا لہجہ کچھ معذرت خواہانہ سا تھا۔ ''معاف کرنا دوستو...... شاید کافی دنوں سے میں کسی معاملے میں خودغرض ہوگیا تھا......شاید یہ میری خودغرضی نہیں بے دھیانی تھی......لیکن فی الحال تم لوگ یہاں سے چلو۔ ہم ڈیرے پر پہنچ کر اطمینان سے بیٹھ کر اس سلسلے میں بات کریں گے۔'' اس نے گھوڑا آگے بڑھا دیا۔

اس کے ساتھیوں نے سر جھکائے اور گویا بادل ناخواستہ اس کے پیچھے چل دیئے۔



ڈیرے تک واپسی کے سفر کے دوران سلطانہ اور اس کے تمام ساتھی چپ چپ ہی رہے۔ آپس میں کوئی بات نہ کرنے کی وجہ سے انہوں نے سفر بھی معمول سے کچھ زیادہ تیز رفتاری سے طے کیا۔

ڈیرے پر پہنچ کر انہوں نے اپنے گھوڑے اصطبل میں باندھے اور بڑے کمرے میں جمع ہو گئے جو سلطانہ کا ٹھکانہ تھا۔ ڈیرے پر پہلے سے موجود ساتھی بھی وہیں آ گئے۔ وہاں ایک تخت بھی پڑا تھا جس پر قالین بچھا ہوا تھا اور گاؤ تکیہ رکھا تھا۔ سلطانہ کو جب اپنے ساتھیوں سے کسی خاص مسئلے پر تبادلۂ خیال کرنا ہوتا تھا تو وہ اسی تخت پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھتا تھا۔ اس وقت وہ کوئی چھوٹا موٹا بادشاہ ہی لگتا تھا اور یہ محسوس ہوتا تھا جیسے وہ اپنے دربار سے خطاب کر رہا ہو یا پھر اپنے خاص وزیروں اور مصاحبوں سے کسی مسئلے پر تبادلہ خیال کر رہا ہو۔

اس روز وہ اپنے تخت پر قدرے تھکے تھکے انداز میں نیم دراز ہو گیا۔ اس کے ساتھیوں میں سے جسے جہاں جگہ ملی وہ وہاں بیٹھ گیا۔ اس کے ساتھیوں نے محسوس کر لیا تھا کہ سلطانہ ان کے ساتھ کسی خاص موضوع پر تبادلہ خیال کرنا چاہتا ہے۔ انہیں موضوع کا بھی اندازہ تھا۔ یہ احساس انہوں نے خود ہی اسے دلایا تھا کہ انہیں اس موضوع پر بات کرنی چاہیے۔

چند لمحے ماحول پر ایک کشیدہ سی خاموشی چھائی رہی۔ پھر سلطانہ کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے بولا۔ ”سب سے پہلے میں تم سب دوستوں سے معافی چاہتا ہوں۔ ایک معاملے میں شاید مجھے صرف اپنا آپ یاد رہ گیا تھا اور تم لوگوں کو میں بھول گیا تھا۔ میں نے اپنے لئے تو چنبیلی ڈھونڈ لی تھی لیکن تم لوگوں کو کانٹوں پر لوٹنے کے لیے ہی چھوڑا ہوا تھا۔ آج میں نے اپنے کچھ دوستوں کی آنکھوں میں یہ بات پڑھ لی ہے۔ میں ایک اَن پڑھ آدمی ہوں مگر آنکھوں کی زبان اچھی طرح پڑھ سکتا ہوں۔“

وہ ایک لمحے کے لئے خاموش ہوا۔ اس کے چند ساتھیوں نے سر جھکا لیا۔ شاید وہ اسے اپنی آنکھوں سے وہ تاثر دینے پر شرمندہ تھے جس کا سلطانہ تذکرہ کر رہا تھا۔“

سلطانہ نے سلسلہ کلام جوڑا۔ ”میں ہمیشہ تم لوگوں کو ایسی ویسی عورتوں کے پاس جانے سے بھی منع کرتا رہا ہوں۔ اس لئے نہیں کہ میں خود کوئی بہت پارسا آدمی ہوں اور تم لوگوں کو بھی کوئی سادھو سنت بنانا چاہتا ہوں بلکہ اس کی وجہ صرف یہی تھی کہ ایسی ویسی عورتوں کے پاس جانے میں بڑے خطرے ہوتے ہیں۔ دوسرے خطروں کو تو چھوڑو...... سب سے بڑا خطرہ پکڑے جانے کا ہوتا ہے۔ مجھے پتا ہے کئی بڑے بڑے ڈاکو صرف کسی عورتوں کی وجہ سے پکڑے گئے ہیں حالانکہ ڈاکو خود بھی کئی عورتوں پر بڑا مال لٹاتے ہیں۔ اس کے باوجود کچھ اور مال کے لالچ میں پولیس کی مخبر بن جاتی ہیں اور کبھی بھی پولیس انہیں مخبری پر کسی طرح مجبور بھی کر دیتی ہے۔ کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ انہیں میٹھی میٹھی اور چکنی چپڑی باتیں کر کے ڈاکوؤں سے کچھ اگلوانے کی بھی ضرورت نہیں پڑتی بلکہ ڈاکو خود ہی ٹھنڈیائی، چرس، گانجے یا شراب کے نشے میں ترنگ میں آ کر خود ہی انہیں اپنے بارے میں ہر بات بتا دیتے ہیں۔ اپنا ٹھکانا تک بتا دیتے ہیں۔“

ایک گہری سانس لے کر وہ ایک لمحے کے لئے خاموش ہوا۔ ”بس ایسے ہی کچھ خیال، کچھ وہم میرے دل میں آتے تھے جن کی وجہ سے میں تم لوگوں کو بھی کبھی کبھار نصیحت کرتا رہتا تھا کہ ایسی ویسی اور کسی عورتوں سے دور رہنے میں ہی تم لوگوں کا بھلا ہے۔ مجھے پتا ہے......اور اس بات کی بہت خوشی بھی ہے کہ تم لوگوں نے ہمیشہ میری اس نصیحت پر عمل کیا لیکن اب میں اپنی یہ نصیحت واپس لے رہا ہوں۔ تم میں سے ہر ایک اپنی مرضی کا مالک ہے چاہے تو اس پر عمل کرے اور نہ چاہے تو نہ کرے۔ مجھے کسی سے کوئی شکوہ نہیں ہوگا اور میں کسی سے اس سلسلے میں کوئی جواب نہیں مانگوں گا۔ بس میری ایک چھوٹی سی بنتی ہے...... ہو سکے تو اس کا خیال رکھنا۔“

اس نے ایک لمحے کے لئے خاموش ہو کر سب کی طرف گہری نظر سے دیکھا پھر بولا۔ ”بس...... اتنی کوشش کرنا کہ کبھی ترنگ میں آ کر انہیں اپنے اس ٹھکانے کے بارے میں نہ کچھ بتا دینا۔ یہ ہم سب کی زندگی اور موت کا سوال ہے۔“

اس کے ساتھیوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں قدرے ندامت تھی۔ چند لمحے کی خاموشی کے بعد بھورے گویا سب کی ترجمانی کرتے ہوئے بولا۔ ”تمہاری

طرف سے اجازت کا بہت شکریہ...... ضروری نہیں کہ ہم اس سے فائدہ اٹھائیں لیکن اگر ایسا ہوا بھی اطمینان رکھو تمہیں کبھی شکایت کا موقع نہیں ملے گا اور افسوس نہیں ہوگا کہ تم نے اجازت کیوں دی۔''

''مجھے آج اچانک احساس ہوا کہ کسی بھی قسم کی بھوک حد سے بڑھ جائے تو انسان بہت کمینہ ہو جاتا ہے...... کچھ بھی کر سکتا ہے...... کوئی زیادہ برا وقت آنے سے پہلے بہتر ہے کہ کوئی چھوٹی سی کھڑکی...... کوئی چھوٹا سا دروازہ کھول لیا جائے تاکہ کوئی دم گھٹ کر نہ مر جائے یا گھٹن کی وجہ سے پاگلوں، دیوانوں والی کوئی حرکت نہ کر گزرے۔'' سلطانہ آج جتنا سنجیدہ اور مدبر نظر آ رہا تھا اس سے پہلے کبھی نظر نہیں آیا تھا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''آج میں ایک اور بہت خاص بات تم لوگوں سے کہنا چاہتا ہوں...... اور یہ بالکل نہ سمجھنا کہ میرا دل برا ہوا ہے اس لئے میں یہ بات کہہ رہا ہوں۔ یہ میں بالکل صاف دل سے اور خوشی سے کہہ رہا ہوں...... ہم میں سے کوئی بھی اگر اب گروہ سے الگ ہو کر شادی بیاہ کر کے کہیں گھر بسا کے بیٹھنا چاہتا ہے تو میری طرف سے اسے اجازت ہے۔ اب ہم میں سے ہر ایک کے پاس اتنا مال موجود ہے کہ کوئی چاہے تو کسی دور دراز علاقے میں جا کر چھوٹا موٹا مکان زمین خرید کر باقی زندگی آرام سے گزار سکتا ہے۔ کوئی بھی یہ نہ سمجھے کہ گروہ میں رہنا اس کی مجبوری ہے۔''

اس نے باری باری سب کی طرف دیکھا لیکن اس بار اس کے ساتھیوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں تبادلہ خیال بھی نہیں کیا۔ سب ایک ٹک یوں مجروح سی نظروں سے اس کی طرف دیکھتے رہے جیسے کہہ رہے ہوں۔ ''یہ تم نے کیا غیروں جیسی بات کر دی......!''

ایک بار پھر بھورے نے ہی ان کی ترجمانی کی ذمے داری سنبھالی اور کہا۔ ''ہم سب کو ایک دوسرے سے صرف موت ہی الگ کر سکتی ہے۔ ہم میں سے اب کسی کے دل میں بھی کسی اور طرح کی زندگی گزارنے کی تمنا نہیں ہے۔''

سب نے سر ہلا کر بھورے کی بات کی تائید کی۔ تب سلطانہ گاؤ تکیے پر سر رکھ کر تخت پر دراز ہوتے ہوئے قدرے اطمینان سے بولا۔ ''میرے دل پر ایک بوجھ سا تھا۔ دھنو کو پھانسی دینے کے بعد جب ہم واپس روانہ ہوئے...... اور وہ ماں بیٹی والی بات ہوئی تب سے میرے دل پر بوجھ تھا۔ اب تم لوگوں سے بات کر کے وہ بوجھ کچھ ہلکا ہو گیا ہے۔ مجھے کچھ یوں لگ رہا تھا جیسے اس عورت اور اس کی بیٹی نے ہمیں کوئی بہت بڑی بددعا دی تھی۔ ویسے تو ہمیں پتا نہیں، کتنے

لوگوں نے کتنی بددعائیں دی ہوں گی۔ اب تک ہم نے اتنے لوگوں کو لوٹا ہے...... اتنے لوگوں کو قتل کیا ہے کہ صحیح تعداد بھی یاد نہیں۔ ظاہر ہے ان سب کے دلوں سے ہمارے لئے دعائیں تو نکلی نہیں ہوں گی...... بددعائیں ہی نکلی ہوں گی...... لیکن مجھے کبھی ڈر نہیں لگا۔ شاید دل کو یہ بھروسا رہتا تھا کہ کوئی بددعا مجھے نہیں لگے گی۔ ان ماں بیٹی نے ہمارے سامنے حالانکہ منہ سے کچھ نہیں کہا تھا لیکن مجھے کچھ ایسا ڈر سا لگنے لگا جیسے ان کی بددعائیں ہمیں لگنے والی ہیں۔''

''ارے چھوڑو سلطانہ......'' بھورے نے بے پروائی سے اسے ہاتھ ہلا کر کہا اور گویا سلطانہ کی ہمت بندھانے کی کوشش کی۔ ''اگر ہم اس طرح کی باتوں پر دل میں وہم پالنے لگے تو پھر ہم ڈاکو نہیں رہ سکتے۔ ہمیں سچ مچ کہیں دور دراز علاقوں میں جا کر شرافت کی زندگی شروع کرنی پڑے گی۔''

''ہاں...... میں خود بھی دل ہی دل میں اپنے آپ کو یہ سمجھاتا ہوں۔'' سلطانہ لیٹے لیٹے چھت کو تکتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولا۔ اس کے باوجود مجھے آج کسی کی کہی ہوئی یہ بات بار بار یاد آ رہی تھی کہ بدلہ لینے سے زیادہ مزا معاف کرنے میں ہے۔ خاص طور پر اس وقت...... جب آپ بدلہ لینے کی طاقت بھی رکھتے ہوں...... کہنے والے نے شاید ٹھیک ہی کہا تھا ہم دھنو کو معاف بھی کر سکتے تھے۔ اس کی مخبری سے میرا تو کچھ نہیں بگڑا تھا۔ الٹا پولیس کے دو اے ایس آئی مارے گئے تھے۔''

''جو ہو گیا سو ہو گیا...... اب تم ان باتوں کے بارے میں سوچ کر اپنا دل خراب مت کرو۔'' بھورے نے ایک بار پھر اسے سمجھایا۔ ''تم سلطان ہو...... سلطان...... اور سلطان کا مطلب بادشاہ ہوتا ہے۔ اگر تم سچ مچ کے بادشاہ نہیں ہو تب بھی کم سے کم تم ڈاکوؤں کے بادشاہ تو ضرور ہو اور بادشاہوں کو اپنی حکومت چلانے کے لئے دل ذرا سخت رکھنا پڑتا ہے اور بہت سے سخت فیصلے کرنے پڑتے ہیں۔ سلطانہ کی مخبری کرنے والے کو سخت سزا دینا ضروری تھا ورنہ دھیرے دھیرے نہ جانے کس کس کو سلطانہ کی مخبری کرنے کا شوق پیدا ہونے لگے۔ اب تم ان باتوں کو دماغ سے نکال دو اور آرام سے سو جاؤ۔ تم کہہ رہے تھے کل تمہیں اپنے بیٹے سے ملنے جانا ہے۔ یاد ہے نا......؟''

''ہاں...... یہ کام بھلا میں کیسے بھول سکتا ہوں۔'' سلطانہ مسکرایا پھر اس نے گویا کسی تصور سے محظوظ ہوتے ہوئے آہستگی سے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے قریبی چھ ساتھی اس کے ساتھ ہی

کمرے میں رہتے تھے جبکہ باقی دو کمرے دوسرے ساتھیوں کے لئے مخصوص تھے۔ وہ لوگ ان کمروں میں جانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

✥……✦……✥

دوسرے روز سلطانہ کاشی پور کے قریب چھوٹے سے ایک میدان میں اپنے چھ قریبی ساتھیوں کے ہمراہ موجود تھا۔ اس میدان میں وہ اپنے بیٹے سے ملاقات کرتا تھا۔ اس کا بیٹا راجکمار اب چار سال کا ہو چکا تھا اور اس کی اٹھان اپنی عمر سے بہت اچھی تھی۔ وہ چھ سال کا لگتا تھا اور اس سے بھی بڑی عمر کے لوگوں کو پلک جھپکتے ہی اٹھا کر پٹخ دیتا تھا۔ سلطانہ نے اس کی تربیت کے لیے ایک آدمی مقرر کیا ہوا تھا جس کی رہائش کا اس نے کاشی پور میں ہی بندوبست کیا ہوا تھا۔ وہ آدمی راجکمار کو لڑائی بھڑائی، گھڑسواری اور داؤ پیچ سکھاتا تھا۔ اس نے تین سال کی عمر سے ہی راجکمار کی تربیت شروع کر دی تھی جس کے نتیجے میں وہ اب کوئی عام بچہ نہیں رہا تھا۔

اب سلطانہ اس الجھن میں تھا کہ اسے لکھانے پڑھانے کا بھی بندوبست کرے یا نہیں؟ کبھی وہ سوچتا کہ اس کا بیٹا آگے چل کر چاہے کچھ بھی بنے، اسے پڑھانے لکھانے میں تو کوئی حرج نہیں تھا۔ پھر وہ سوچتا کہ اس کے بیٹے کو بھی آگے چل کر ڈاکو ہی بننا تھا...... سلطانہ سے بھی بڑا ڈاکو...... اور اس کے لئے پڑھنا لکھنا ضروری نہیں تھا...... بلکہ اسے اندیشہ محسوس ہوتا کہ پڑھ لکھ کر وہ کہیں بزدل نہ ہو جائے چنانچہ وہ اسے پڑھانے لکھانے کا ارادہ ملتوی کر دیتا لیکن یہ کشمکش ابھی اس کے دماغ میں ختم نہیں ہوئی تھی۔

وہ اس چھوٹے سے میدان میں اپنے بچے کے ساتھ بچوں ہی کی طرح کھیلتا تھا۔ وہ دونوں خوب دوڑتے بھاگتے تھے۔ راجکمار کے ساتھ سلطانہ بھی بچوں کی طرح کھیل کود اور شرارتیں کرتا۔ اس کی حرکتوں پر وہ ہنستے ہنستے بے حال ہو جاتا۔ یہ اس کے لئے زندگی میں سب سے زیادہ خوشی کے لمحے ہوتے تھے۔ اس کے چھ قریبی ساتھی اس دوران اس چھوٹے سے میدان کے ارد گرد گھوم کر پہرہ دیتے تھے اور کبھی آپس میں گپ شپ کرنے یا کچھ کھانے پینے بھی بیٹھ جاتے تھے۔

اس روز بھی یہ سلسلہ چل رہا تھا کہ بھورے کو دور سے ایک گھڑسوار آتا دکھائی دیا۔ وہ کبھی درختوں کی اوٹ میں ہو جاتا اور کبھی درختوں کی اوٹ سے نکل کر پگڈنڈی پر آتا دکھائی دیتا۔ بھورے کے پاس دوربین موجود تھی۔ اس نے دوربین آنکھوں سے لگا کر دیکھا تو قدرے حیرت

سے بول اٹھا۔ ''ارے...... یہ تو وکرم ہے...... گھوڑے پر اپنے پیچھے نہ جانے کسے اٹھائے آ رہا ہے۔''

سلطانہ کے دوسرے ساتھی جنہوں نے اپنی رائفلیں سیدھی کر لی تھیں ایک بار پھر بے فکری سے آپس میں گپ شپ کرنے لگے۔ ان کا ساتھی وکرم جب گھوڑے پر ایک شخص کو پیچھے بٹھائے قریب پہنچا تو انہیں یہ دیکھ کر قدرے حیرت ہوئی کہ اس شخص کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی دونوں ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے اور اسے گھوڑے سے گرنے سے بچانے کے لئے وکرم نے ایک رسی کے ذریعے اپنے ساتھ باندھا ہوا تھا۔ وہ اسے ایک قیدی کی طرح ساتھ لایا تھا۔ وہ میدان میں آ کر رُکا تو سب اس کے گرد جمع ہو گئے جن میں سلطانہ کا کمسن بیٹا راجکمار بھی شامل تھا۔

وکرم نے رسی کھولی اور گھوڑے سے اتر آیا۔ اس نے اجنبی کے ہاتھوں کی بندشیں کھولیں اور اسے بازوؤں سے پکڑ کر گھوڑے سے اتارا۔ اس کی آنکھوں سے پٹی اس نے اب بھی نہیں کھولی تھی۔ وہ مضبوط کاٹھی کا ایک ادھیڑ عمر شخص تھا۔ اس کی خشخشی سی داڑھی بھی تھی۔ ان سب کے لئے وہ اجنبی تھا۔

''کون ہے یہ......؟'' سلطانہ نے اسے گھورتے ہوئے وکرم سے پوچھا۔

''سردار...... یہ نجیب آباد کے قریب ایک گاؤں کا رہنے والا ہے۔'' وکرم نے بتایا۔ ''کئی دنوں سے یہ لوگوں سے پوچھتا پھر رہا ہے کہ کیا کوئی اسے سلطانہ سے ملوا سکتا ہے...... اسے سلطانہ سے بہت ضروری کام ہے۔ ویسے یہ سبزی فروش ہے۔ ٹوکرے میں سبزی رکھ کر نجیب آباد میں گلی گلی بیچتا ہے۔ پربھوداس اس کا نام ہے۔ مجھے کسی سے پتا چلا کہ ایک آدمی سلطانہ سے ملنے کی کوشش کر رہا ہے تو میں نے سوچا چل کر دیکھوں، کیا معاملہ ہے۔ اس سے بات کرنے کے بعد میں اسے ساتھ ہی لے آیا۔''

''اس کی آنکھوں سے پٹی کھول دو۔'' سلطانہ نے حکم دیا۔

وکرم نے پٹی کھولی تو پربھوداس یوں آنکھیں پٹ پٹانے لگا جیسے اندھیرے سے اچانک روشنی میں آ گیا ہو۔ پھر اس کی نظر سلطانہ پر پڑی تو وہ ''سلطانہ کی جے......'' کا نعرہ لگاتے ہوئے اس کے پیروں میں گر پڑا۔ سلطانہ نے اس کا کرتا مٹھی میں جکڑتے ہوئے ایک جھٹکے سے اسے سیدھا کھڑا کیا اور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ ''کیوں ملنا چاہتا تھا مجھ سے

......؟"

پربھوداس ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "سلطانہ جی ......شاید آپ کو یاد ہو کہ کئی مہینے پہلے آپ نے ہماری بستی رام نگر میں رام جی کا مندر صحیح طریقے سے بنانے کیلئے پجاری ہربنس لال کو ایک بڑی رقم دی تھی؟" سلطانہ آنکھیں سکیڑ کر گویا ذہن پر زور دیتے ہوئے بولا۔ "تم اس پجاری کی بات کر رہے ہو جو رام نگر میں ایک کچی کوٹھری میں مندر بنائے بیٹھا تھا؟"

"ہاں......" پربھوداس نے جلدی سے اثبات میں سر ہلایا۔ "وہ انتظار کرتا رہتا تھا کہ لوگ مندر کے لئے کچھ پیسہ دیں...... کچھ دان پن کا پیسہ جمع ہو تو وہ اچھے طریقے سے ذرا بڑی زمین پر پکا مندر بنائے لیکن پیسہ جمع ہی نہیں ہوتا تھا۔ بستی کے لوگ غریب ہیں۔ ان بے چاروں کے لیے پیٹ پالنا ہی مشکل رہتا ہے...... وہ مندر کے لئے کہاں سے پیسہ دیں۔ پجاری ہربنس لال کا ایک بار آپ سے سامنا ہوا تھا تو اس نے ڈرتے ڈرتے آپ سے یہ بات کر ڈالی تھی۔ آپ نے اسے اتنی رقم دے دی تھی جتنی اس نے خواب میں بھی نہیں دیکھی تھی۔"

پربھوداس ایک لمحے کے لئے خاموش ہوا تو سلطانہ نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"تو اب کیا ہوا؟ کیا پجاری پیسے لے کر بھاگ گیا؟"

"نہیں ......نہیں سلطانہ جی ......" پربھو فوراً کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولا۔ "وہ تو بڑا بھلا مانس ہے۔ اس نے دن رات ایک کر کے آپ کے پیسے سے بڑا اچھا مندر بنالیا ہے۔ بستی کے لوگوں کو یقین نہیں آرہا کہ ان کی بستی میں اتنا اچھا مندر بن گیا ہے۔ کچھ پیسہ پجاری کے پاس پہلے کا بھی جمع تھا...... مندر بنتے دیکھ کر کچھ اور لوگ بھی نہ جانے کہاں کہاں سے آ کر پیسے دے گئے۔ مندر ایسا بن گیا جیسا پجاری ہربنس لال نے بھی نہیں سوچا تھا۔ آس پاس کی بستیوں کے لوگ بھی اسے دیکھنے آتے ہیں اور یوں آنکھیں مل مل کر دیکھتے ہیں جیسے انہیں شک ہو کہ وہ کوئی سپنا دیکھ رہے ہیں۔"

"تو اب تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟" سلطانہ نے الجھن سے پوچھا۔ "مجھ سے کیوں ملنا چاہ رہے تھے؟ کیا اب پجاری کو مندر میں کوئی بچا کھچا کام کرنے کے لئے اور پیسہ چاہیے؟"

"نہیں ......نہیں ......" پربھوداس نے تیزی سے نفی میں ہاتھ ہلایا۔ "ایسی کوئی بات نہیں ...... وہ بے چارہ تو یہ چاہ رہا ہے کہ صرف ایک بار آپ اس مندر میں تھوڑی دیر کے لئے آ جائیں۔ اس روز وہ بڑی پوجا کرانا چاہتا ہے اور سارے بستی والوں کو بتانا چاہتا ہے کہ یہ مندر

سلطانہ کی وجہ سے بنا ہے۔ بس...... وہ بے چارہ اس کام کے لئے آپ کو بلانا چاہتا ہے لیکن اسے کوئی ایسا طریقہ نہیں سوجھ رہا تھا جس سے وہ اپنی بات آپ تک پہنچا سکے۔ اس نے مجھ سے ذکر کیا تو میں نے کہہ دیا کہ اچھا میں کوشش کروں گا۔ میں لوگوں سے پوچھتا پھر رہا ہوں کہ سلطانہ تک پہنچنے کا کیا طریقہ ہے۔ لوگ میری بات سن کر ہنستے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ سلطانہ تک پہنچنے کا طریقہ تو پورے ہندوستان کی پولیس ڈھونڈتی پھر رہی ہے۔ کوئی کہتا ہے پربھوداس...... اگر تو امیر ہوتا تو تجھے سلطانہ تک پہنچنے کا طریقہ ڈھونڈنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی وہ خود تجھ تک پہنچ جاتا۔ لوگ میرا مذاق اُڑاتے رہے لیکن میں لوگوں سے بات کرتا رہا...... اور آخر آپ تک پہنچ ہی گیا۔"

اس نے ایک بار پھر سلطانہ کے پاؤں چھونے کی کوشش کی لیکن سلطانہ نے اسے روک دیا۔ وہ ہاتھ باندھتے ہوئے بولا۔ "دیکھیں انکار نہ کریئے گا...... یہ صرف پجاری جی کی اور میری بنتی ہی نہیں بہت سے دوسرے لوگوں کی بھی آشا ہے۔ ان کی تمنا ہے کہ آپ مندر میں آئیں باہر کے کسی آدمی کو آپ کے آنے کا پتا نہیں چلے گا اور اگر پولیس تک خبر پہنچ بھی گئی تو آپ کی حفاظت، بڑی پوجا کے لئے آنے والوں کی ذمے داری ہو گی۔ آپ کو کسی طرف سے چنتا کرنے کی ضرورت نہیں۔"

"اگر ہم چنتا کرنے والے لوگ ہوتے تو ڈاکو نہ بنتے۔" سلطانہ اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولا۔ "اور سلطانہ کی حفاظت کے لئے کسی کو پریشان ہونیکی ضرورت نہیں۔ سلطانہ اور اس کے ساتھی اپنی حفاظت کرنا خوب جانتے ہیں۔"

"تو پھر میرے لئے کیا حکم ہے؟" پربھو التجائیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "میں پجاری جی کو کیا جواب دوں؟"

سلطانہ نے ایک لمحے کچھ سوچا پھر۔ "جا کر پجاری سے کہہ دینا...... اگلے منگل وار کو بارہ بجے سے پہلے پہلے سلطانہ مندر میں ہو گا۔"

"پکی بات......؟" پربھو کو گویا یقین نہیں آرہا تھا۔ "تمہیں کسی نے بتایا نہیں کہ سلطانہ کبھی کچی بات نہیں کرتا؟" سلطانہ نے اسے گھورا اور اس کے وجود میں ایک لمحے کے لئے کپکپی سی آ گئی۔

"وہ......بس...... مجھے اپنی خوش نصیبی پر یقین نہیں آرہا...... اس لئے پوچھ رہا تھا۔ مجھے تو ابھی تک یہی لگ رہا ہے جیسے میں کوئی سپنا دیکھ رہا ہوں۔" پربھوداس انتہائی عاجزی سے بولا۔

"چلو......بس......اب یقین کر لو اور واپس جاؤ۔ میرا یہ وقت بہت قیمتی ہے۔ میں اس میں سے کچھ اور حصہ تمہیں نہیں دے سکتا۔" سلطانہ نے اپنے بیٹے راجکمار کی طرف والہانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے بیٹے کو گود میں اٹھا لیا اور وکرم کو اشارہ کیا۔ وکرم نے پربھو کو گھوڑے پر بٹھا کر ایک بار پھر اس کے ہاتھ پیچھے باندھ دیئے اور آنکھوں پر موٹا سیاہ کپڑا باندھ دیا۔ خود گھوڑے پر بیٹھنے کے بعد اس نے اپنے اور پربھو کے گرد ایک رسی بھی باندھ لی۔ وہ جس طرح پربھو کو وہاں لایا تھا اسی طرح واپس بھی لے چلا۔ سلطانہ کے ساتھی ایک بار پھر میدان کے گرد پہرہ دینے لگے اور سلطانہ اپنے بیٹے کے ساتھ کھیل کود اور بھاگ دوڑ میں مصروف ہو گیا۔



ڈی ایس پی فریڈی ینگ اس وقت اپنے دفتر میں بیٹھا کچھ کاغذات کے مطالعے میں مصروف تھا جب اردلی نے اسے جاوید ملک کی آمد اطلاع دی۔ چند لمحے بعد جاوید ملک کمرے میں داخل ہوا تو اس کے ساتھ ایک دیہاتی بھی تھا۔ ینگ نے آنکھیں سکیڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ اسے اس کا چہرہ کچھ شناسا سا معلوم ہو رہا تھا، شاید وہ پہلے بھی اس سے مل چکا تھا۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر نہایت عاجزانہ انداز میں ینگ کو پرنام کیا۔ ینگ نے جواباً ہاتھ جوڑنے کے بجائے محض سر ہلا کر جواب دیا۔ جاوید ملک نے ینگ سے مصافحہ کیا تھا اور اس کے مقابل بیٹھ گیا۔ وہ دیہاتی سا شخص میز کے قریب ہی ہاتھ جوڑے کھڑا رہا۔

"سر...... یہ پربھو داس ہے...... اس سے آپ کی ایک سرسری سی ملاقات پہلے بھی ہو چکی ہے۔" جاوید ملک نے اس شخص کی طرف اشارہ کیا...... اور تب ینگ کو یاد آ گیا کہ کچھ دن پہلے اس شخص کا تعارف سرراہ اس سے کرایا گیا تھا اور بعد میں اسے بتایا گیا تھا کہ وہ پولیس کا مخبر ہے اور بہت کام کا آدمی ہے۔ اس وقت پربھو داس بڑی حد تک اس پربھو داس سے مختلف نظر آ رہا تھا جو سلطانہ سے ملنے گیا تھا۔ اس وقت اس کے چہرے پر خالص دیہاتیوں والی جو ایک مخصوص سادگی اور بھولپن نظر آ رہا تھا وہ اب غائب تھا۔ اس وقت وہ اپنی تمام تر عاجزی کے باوجود ایک چالاک اور شاطر آدمی دکھائی دے رہا تھا۔

"ہاں...... مجھے یاد آ گیا۔" ینگ نے سر ہلا کر کہا۔ پھر اس نے سنبھل کر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ مزید عاجزی سے شکریہ ادا کرتے ہوئے بیٹھ گیا۔

"سر...... ہم نے کافی دنوں سے پربھو کو سلطانہ ڈاکو کے سلسلے میں کام پر لگایا ہوا تھا اور اس

نے بلاشبہ بڑا زبردست کام کیا ہے۔ اگلے منگل کو بارہ بجے تک ہم سلطانہ ڈاکو کو ہلاک کر سکتے ہیں۔" جاوید ملک یہ کہتے ہوئے کچھ اور طلب سے انداز میں ینگ کی طرف دیکھنے لگا۔

ینگ نے نہایت تحمل سے اس کی بات سنی۔ اس کے تاثرات میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ اپنی مخصوص بردباری سے بولا۔ "تمہیں معلوم ہے میں سلطانہ کو زندہ گرفتار کرنے میں زیادہ دلچسپی رکھتا ہوں۔"

"سر...... یہ تو حالات پر منحصر ہے۔ اگر حالات اجازت دیں اور اسے زندہ گرفتار کیا جا سکے تو اس کی کوشش بھی کی جا سکتی ہے لیکن اگر صورتحال ایسی نہ ہو تو اسے ہلاک کرنے میں بھی ہمیں دریغ نہیں کرنا چاہیے۔" جاوید ملک بولا۔

ینگ نے اس بات کا جواب دینے کے بجائے پوچھا۔ "پربھو داس کیا خبر لایا ہے اور کیا منصوبہ بنانا چاہ رہے ہو تم؟"

جاوید ملک نے اسے بتایا کہ پربھو داس کیا خبر لایا تھا۔ اس کی خبر کی روشنی میں اب انہیں سادہ لباس میں رام نگر جا کر مندر اور اس کے گردوپیش کا جائزہ لینا تھا۔ اس کے بعد انہیں اپنی حکمت عملی طے کرنی تھی۔ اس روز ہفتہ تھا اور شام ہو رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ ان کے پاس تیاری کے لئے کم از کم دو دن تھے۔

"کیا سلطانہ وہاں اکیلا آئے گا؟" ینگ نے پربھو داس سے پوچھا۔

"سر...... اس سلسلے میں اس نے کوئی صاف بات نہیں کی۔" پربھو داس ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "اس نے مجھ سے صرف یہ کہا کہ جا کر پجاری جی سے کہہ دو کہ اگلے منگل وار کو بارہ بجے سے پہلے پہلے سلطانہ مندر میں ہوگا۔ میں نے اس سے زیادہ کچھ نہیں پوچھا۔ وہ شک میں پڑ سکتا تھا۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ اس نے بڑی غربت میں پرورش پائی ہے اور ان پڑھ سا آدمی ہے، اس لئے بے وقوف ہوگا لیکن میرے خیال میں وہ بے وقوف بالکل نہیں ہے، بہت تیز آدمی ہے۔"

"مجھے یہ بات بہت اچھی طرح معلوم ہے۔ جو اسے بے وقوف سمجھتا ہے بڑی غلطی کرتا ہے۔" ینگ بولا۔ "بہرحال...... یہ بات طے نہیں ہے کہ وہ اکیلا آئے گا یا اپنے آدمیوں کو ساتھ لائے گا......!" یہ کہتے ہوئے وہ گویا کسی سوچ میں الجھا ہوا تھا۔



سلطانہ جب مندر میں پہنچا تو بیسیوں لوگ بڑی پوجا میں حصہ لینے کے لئے مندر میں

آرہے تھے۔ پجاری نے بڑی پوجا کا اعلان تو کر دیا تھا لیکن کسی کو یہ نہیں بتایا تھا کہ اس روز اس کے مندر میں ایک قسم کے مہمان خصوصی کے طور پر آنے والی شخصیت کون ہوگی۔ سلطانہ اکیلا نہیں آیا تھا چنبیلی بھی اس کے ساتھ تھی۔ دونوں صاف ستھرے معززانہ لباس میں تھے۔ سلطانہ کو گو کہ سرسری نظر میں معاملہ سادہ ہی دکھائی دیا تھا لیکن اس کے باوجود وہ احتیاطی تدابیر کے بغیر نہیں آیا تھا۔ اس کے تمام ساتھی اس کے ہمراہ تھے لیکن اس وقت انہیں دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ ڈاکو تھے۔

وہ بھی صاف ستھرے لباسوں میں تھے اور دیہاتی، مگر سفید پوش دکھائی دے رہے تھے۔ ان کے ہتھیار ان کے لباسوں میں چھپے ہوئے تھے اور وہ پوجا کے لئے آنے والے لوگوں کی ٹولیوں میں شامل ہو کر مندر میں آرہے تھے۔ چند ساتھیوں نے مندر سے باہر ہی غیر محسوس سے انداز میں ایسی جگہیں سنبھال لی تھیں جہاں سے وہ چاروں طرف نظر رکھ سکتے تھے۔ سلطانہ اور اس کے ساتھی بظاہر دوسرے سب لوگوں کی طرح خوشی خوشی بڑی پوجا میں حصہ لینے کے لئے آرہے تھے لیکن غیر محسوس انداز میں ان کی اپنے اطراف پر نظر تھی۔

مندر کو دیکھ کر واقعی سلطانہ کا دل خوش ہوگیا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ اتنا بڑا مندر اس کی وجہ سے بن گیا تھا۔ اسے تو صحیح طور پر یاد بھی نہیں تھا کہ اس نے پجاری ہربنس لال کو کتنی رقم دی تھی۔ لوگ مندر کے کشادہ صحن میں جمع ہو رہے تھے۔ سامنے ہی برآمدے کے چبوترے پر پجاری ہربنس لال، سلطانہ کے استقبال کے لئے کھڑا تھا۔ پربھوداس بھی اس کے قریب ہی کھڑا تھا اور برآمدے کی چھت میں لٹکی ہوئی گھنٹیاں بجا رہا تھا۔ پجاری کے ہاتھوں میں گیندے کے پھولوں کے بہت سے ہار تھے۔ اسے سلطانہ کی آمد کی اطلاع مل چکی تھی۔ چنبیلی کو اس کے ساتھ دیکھ کر وہ یہی سمجھا کہ وہ سلطانہ کی بیوی ہوگی۔ ان دونوں نے پجاری کے پاؤں چھوئے اور پجاری نے دونوں کو ہار پہنائے۔

پھر وہ سلطانہ کے سامنے ہاتھ جوڑ کر اسے اس کے نام کے بغیر مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

''مہاراج! آپ جیسے دیالو آدمی روز روز پیدا نہیں ہوتے۔ آپ کے جانے کے بعد میں لوگوں کو بتا دوں گا کہ یہ مندر اصل میں آپ کے پیسے سے بنا ہے۔ جب تک یہ مندر اس دھرتی پر موجود رہے گا لوگ آپ کے لئے دعا کرتے رہیں گے۔''

''لوگوں کو اس بات پر اعتراض نہیں ہوگا کہ لوٹ مار کے پیسے سے مندر بن گیا؟'' سلطانہ

نے مسکراتے ہوئے دھیمی آواز میں پوچھا۔

''سلطانہ کے مال پر کسی کو اعتراض نہیں ہوسکتا...... اور ویسے بھی...... اصل بات یہ ہے کہ مندر بنا چاہئے...... جیسے بھی چاہے بنے......''

سلطانہ اور چنبیلی بظاہر پجاری کے سامنے سر جھکائے کھڑے تھے لیکن سلطانہ کن انکھیوں سے قطعی غیر محسوس انداز میں ہر طرف دیکھ رہا تھا۔

اسی دوران اس نے محسوس کیا کہ پربھوداس نے اپنی دانست میں نظر بچا کر دو تین مرتبہ چور نظروں سے ایک طرف دیکھا تھا۔ سلطانہ نے بھی اس طرف دیکھا اور کسی کو اس بات کا احساس نہیں ہونے دیا۔ اس طرف کچھ دور ایک پہاڑی تھی۔ اگر کوئی اس پہاڑی کی چوٹی پر کھڑا ہوتا تو مندر کے صحن کا منظر آسانی سے دیکھ سکتا تھا لیکن فاصلہ ذرا زیادہ ہونے کی وجہ سے شاید اسے لوگ چھوٹے چھوٹے دکھائی دیتے اور صورتیں نہ پہچانی جاتیں۔ مندر کے گردوپیش میں یہی ایک جگہ تھی جہاں سے کوئی چھپ کر بھی مندر کے صحن کا منظر دیکھ سکتا تھا ورنہ مندر کے چاروں طرف کھلا میدان تھا۔ وہاں اگر کوئی مشکوک آدمی نظر آتا یا کوئی مشکوک حرکت ہوتی دکھائی دیتی تو باہر موجود سلطانہ کا کوئی آدمی اس سے نپٹ سکتا تھا یا کسی مخصوص آواز کے ذریعے باقی ساتھیوں کو سگنل دے سکتا تھا۔ سلطانہ کے ساتھی بھی ایک دن پہلے ہی آکر مندر اور اس کے گردوپیش کا جائزہ لے گئے تھے اور یہ معلومات بھی کر گئے تھے کہ بڑی پوجا صحن میں ہوگی کیونکہ مندر میں وہی سب سے کھلی اور ہوادار جگہ تھی تاہم سلطانہ کے ساتھیوں نے پہاڑی کو خطرناک جگہ قرار نہیں دیا تھا۔ ان کے خیال میں اتنی دور سے انہیں کوئی نقصان پہنچانا ذرا مشکل ہی تھا۔

سلطانہ نے جب پربھوداس کی نظروں کے تعاقب میں اس پہاڑی کی طرف دیکھا تو اسے وہاں پر کچھ نظر نہ آیا لیکن اس نے پربھوداس کے چہرے پر اضطراب کی ایک نہایت مدھم سی لہر ابھرتے اور معدوم ہوتے دیکھی۔ کسی اور کو شاید اس کا احساس بھی نہ ہوتا لیکن سلطانہ کی نظریں کچھ اور تھیں۔ اسے فضا میں کسی خطرے کی نہایت خفیف سی بو بھی محسوس ہو رہی تھی۔ بظاہر سر جھکا کر پجاری سے باتیں کرتے کرتے اس کی نظروں نے ایک بار پھر پربھوداس کی نظروں کا تعاقب کیا۔

اس بار اسے پہاڑی کی چوٹی پر کسی چیز کی معمولی سی حرکت کا احساس ہوا۔ ایسا لگا جیسے کوئی بلی یا پرندہ چوٹی کے عقب میں اچھل کر ایک جگہ سے دوسری جگہ گیا ہو۔ سلطانہ کے اعصاب تن

گئے۔ اس کا ہاتھ پہلے ہی اپنے ڈھیلے ڈھالے انگرکھے کے نیچے چھپی ہوئی رائفل کے دستے پر تھا۔ بظاہر ایسا ہی لگ رہا تھا جیسے وہ پجاری کے احترام میں سینے پر ہاتھ رکھے سر جھکائے کھڑا تھا۔
اس نے دھیمی آواز میں پجاری سے کہا۔ ”مہاراج! میں زیادہ دیر یہاں نہیں رک سکوں گا۔ شروع سے آخر تک بڑی پوجا میں حصہ نہیں لے سکوں گا۔ آپ کو پتا ہے میری جان ہر وقت خطرے میں رہتی ہے اور میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے پوجا پاٹ کرتے ہوئے دوسرے نردوش لوگوں کو اس پوتر جگہ پر کوئی نقصان پہنچے۔ بس...... میں تو آپ کے حکم پر چلا آیا تھا۔ میری حاضری لگ گئی...... اب مجھ پر اشیرواد کے ساتھ آگیا دیجئے۔“ اس نے ایک بار پھر پجاری کے سامنے ہاتھ جوڑ دیا۔ اس نے محسوس کیا کہ پربھو داس کان لگا کر اس کی بات سننے کی کوشش کر رہا تھا۔ برآمدے میں اور بھی بہت سے لوگ موجود تھے لیکن پربھو داس اس کی طرف متوجہ تھا۔ باقی لوگ آنکھیں بند کئے ہاتھ جوڑے اشلوک پڑھتے ہوئے جھومنے کے سے انداز میں دائیں بائیں ہل رہے تھے۔

پجاری ہرہنس لال برآمدے کے اونچے چبوترے پر کھڑا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے سلطانہ کے کندھے تھپکتے ہوئے والہانہ پن سے بولا۔ ”بچہ...... اس پوتر جگہ پر تجھے کوئی خطرہ نہیں ہوسکتا۔ یہاں اگر کسی نے تیری طرف ہاتھ بڑھایا تو لوگ میرے ایک شارے پر اس کی تکا بوٹی کر دیں گے۔“
”لیکن میں ایسا نہیں چاہتا۔“ سلطانہ مسکراتے ہوئے تحمل سے بولا۔ ”یہ ایسی جگہ ہے جہاں خون خرابہ دیکھنا مجھے بالکل اچھا نہیں لگے گا۔“
جس وقت ان کے درمیان یہ بات چیت ہو رہی تھی، پہاڑی کی چوٹی کے عقب میں ڈی ایس پی فریڈی ینگ اور جاوید ملک اوندھے لیٹے ہوئے تھے۔ دونوں کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں جن پر دوربینیں لگی ہوئی تھیں۔ ینگ اپنی دوربین سے دیکھ رہا تھا کہ سلطانہ ہاتھ جوڑے، سر جھکائے، نہایت دھیمی اور مہربان سی مسکراہٹ کے ساتھ پجاری سے کوئی بات کر رہا تھا۔ وہ ینگ کے نشانے پر تھا۔ اس کے لیے اس وقت سلطانہ کو گولی مارنا قطعی مشکل نہیں تھا۔
عین اس لمحے جاوید جھنجلائے ہوئے سے انداز میں بولا۔ ”سر...... آخر آپ اسے گولی کیوں نہیں مار رہے؟“
”میں نے کہا نا کہ میری پہلی ترجیح اسے زندہ گرفتار کرنا ہے۔“ ینگ نے اطمینان سے

جواب دیا اور اپنی رائفل کی نال نیچی کرتے ہوئے ترچھی نظروں سے اس کی رائفل کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”مجھے معلوم ہے تمہاری انگلی ٹریگر دبانے کے لئے بے چین ہے لیکن میں ایک بار پھر تمہیں یاد دلا دوں کہ اگر تم نے میری ہدایت کے بغیر گولی چلائی تو ڈسپلن کی خلاف ورزی اور افسر کی حکم عدولی کے قانون کے تحت تمہارے خلاف سخت کارروائی ہوسکتی ہے۔“
ینگ کی یہ بات سن کر شاید جاوید ملک نے دانت پیسے تھے۔ پھر وہ زہریلے سے لہجے میں بولا۔ ”تو پھر آئیے...... پہاڑی سے اتر کر مندر میں چلتے ہیں اور ہاتھ جوڑ کر سلطانہ سے التجا کرتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو ہمارے حوالے کر دے۔“
ینگ نے ایک بار پھر ترچھی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ اسے شاید اندیشہ محسوس ہوا کہ جاوید ملک فائر نہ کر دے۔ وہ اس کی رائفل کی نالی پر ہاتھ رکھ کر اسے ذرا نیچے کرتے ہوئے بولا۔ ”یہ بات اتنے طنزیہ انداز میں کہنے کی ضرورت نہیں...... اگر موقع محل کے لحاظ سے مجھے سلطانہ سے ایسی کوئی درخواست کرنی بھی پڑ گئی...... اور مجھے اس کا کوئی فائدہ نظر آیا تو میں ضرور کرلوں گا۔ میں اس میں ذرا بھی نہیں شرماؤں گا اور نہ ہی اسے انا کا مسئلہ بناؤں گا۔ عین ممکن ہے کسی دن سلطانہ کو مجھ سے درخواست کرنی پڑ جائے کہ میں اسے گرفتار کرلوں۔“
جاوید ملک نے اپنا ہیٹ ذرا اوپر کرتے ہوئے گردن ذرا ترچھی کرتے عجیب سی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں گویا کہہ رہی تھیں۔ ”مسٹر ینگ! کبھی کبھی مجھے شبہ ہوتا ہے کہ آپ کا دماغی توازن ٹھیک نہیں ہے۔ شاید آپ کچھ کھسکے سے ہوئے ہیں۔“
تاہم اس نے شاید خود پر ضبط کرتے ہوئے حتی الامکان تحمل سے کہا۔ ”سر...... آئی جی صاحب نے مجھے اور آپ کو اپنے حکم کے بندھن میں باندھ کر ایک ہی مشن کے لئے اکٹھا تو کر دیا ہے لیکن ہمارے خیالات میں زمین آسمان کا فرق ہے...... اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس فرق کے ہوتے ہوئے ہم ایک ساتھ اس مشن میں کیسے کامیاب ہو سکتے ہیں؟“
”ہاں...... میں بھی کچھ دن سے محسوس کر رہا ہوں کہ ہمارے درمیان کوئی ایسی نادیدہ خلیج موجود ہے لیکن اگر تم چاہو تو اس خلیج کو پاٹ سکتے ہو۔“ ینگ نے اطمینان سے کہا۔ ”اس کے لئے تمہیں اپنے آپ کو صرف یہ یقین دلانا ہوگا یا یوں کہو کہ اپنے آپ کو یاد دلانا ہوگا کہ اس مہم کا انچارج میں ہوں۔ اس مشن کے سلسلے میں اصل اتھارٹی میں ہوں۔“
”وہ تو مجھے اچھی طرح یاد ہے لیکن کسی بھی مہم میں کامیابی ساتھیوں کے صلاح مشورے

سے ہی ہوتی ہے۔'' جاوید ملک کے لہجے میں شکوہ تھا۔'' ہماری مہم طول پکڑتی جا رہی ہے اور گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ آپ نے میری بات ماننا بالکل ہی چھوڑ دیا ہے۔ یہاں آتے وقت بھی میں نے کہا کہ ہم بھاری نفری لے کر چلتے ہیں اور سلطانہ کو گھیر کر مارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ آج فیصلہ کن معرکہ ہو سکتا تھا...... لیکن آپ نے میری بات نہیں مانی۔''

''یہاں سلطانہ کو گھیر کر مارنے کی کوشش میں بہت خونریزی ہو سکتی ہے۔ ہمارے اپنے آدمیوں کے ساتھ ساتھ دوسرے بہت سے بے گناہ اور لاتعلق لوگ مارے جاتے۔'' ینگ تحمل سے بولا۔'' خونریزی کے ذریعے سلطانہ کو پکڑنا میری آخری ترجیح ہے۔''

''ایک آدمی کو مارنے میں زیادہ خونریزی کی نوبت نہیں آسکتی تھی۔'' جاوید بولا۔

ینگ نے کچھ اس طرح اس کی طرف دیکھا جیسے اسے شک ہو کہ اس کا دماغ چل گیا ہے۔

پھر اس نے بے یقینی سے پوچھا۔'' کیا تمہارے خیال میں سلطانہ یہاں اکیلا آیا ہوا ہے؟''

''ہاں ...... میرا خیال تو کچھ ایسا ہی ہے۔'' جاوید اب کچھ گڑبڑا کر بولا۔ پھر اس نے دوبارہ رائفل کی دوربین سے آنکھ لگائی۔ ینگ کے انداز نے گویا اسے شک میں ڈال دیا تھا۔ چند لمحے مندر کا جائزہ لینے کے بعد وہ پہلے ہی جیسی خود اعتمادی سے بولا۔'' ہاں...... مجھے تو کہیں اس کا کوئی ساتھی دکھائی نہیں دے رہا۔''

ینگ گہری سانس لے کر رہ گیا۔ پھر اس نے لیٹے ہی لیٹے ڈھلان سے نیچے کی طرف کھسکنا شروع کر دیا۔ اگر وہ کھڑے ہوتے تو انہیں پہاڑی کے دوسری طرف سے دیکھا جا سکتا تھا۔ اس نے جاوید کو بھی اشارہ کیا اور کہا۔'' آؤ...... چلیں......''

''ہم کہاں جا رہے ہیں؟'' جاوید نے حیرت سے پوچھا۔

''ابھی میری یہ تمام اس قسم کی کوششیں تمہیدی ہیں۔'' ینگ نے نیچے کی طرف کھسکتے کھسکتے رک کر کہا۔'' میں اس فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ سلطانہ کے مسئلے سے نپٹنے کے لئے میری آخری اور فیصلہ کن حکمت عملی کیا ہوگی۔ فیصلے پر پہنچنے کے بعد اگر کچھ خونریزی کا خطرہ بھی ہوا تو میں اس کی پروا نہیں کروں گا۔''

''اس وقت تک تو سلطانہ آدھے ہندوستان کو لوٹ چکا ہوگا اور اس کا گروہ شاید ایک اچھی خاصی فوج میں تبدیل ہو چکا ہوگا۔'' جاوید کے لہجے میں تلخی تھی۔

''نہیں ...... ایسی نوبت نہیں آئے گی۔'' ینگ کے لہجے میں اب بھی تحمل اور خود اعتمادی

تھی۔ پھر اس نے دوبارہ کھسکنا شروع کرتے ہوئے کہا۔'' آؤ...... اب تم بھی آجاؤ۔ سلطانہ کو پہاڑی پر کسی کی موجودگی کا احساس ہو گیا ہے اور وہ اب رخصت ہونے ہی والا ہے۔ اگر اس نے اپنے آدمیوں سمیت پہاڑ کا رخ کر لیا تو پھر ہم دونوں مارے جائیں گے اور اس بنجر و خشک پہاڑی پر کوئی آڑ یا جائے پناہ بھی نہیں ہے۔''

جاوید ملک نے گویا اس کی بات کی تصدیق کے لئے ایک بار پھر رائفل کی دوربین سے آنکھ لگائی۔ اسے تسلیم کرنا پڑا کہ ینگ کے پاس بہرحال تجربہ اور مشاہدہ تھا۔ صرف تجربہ اور مشاہدہ ہی نہیں بلکہ اس کے پاس شاید کوئی نامعلوم حس بھی تھی جو اسے بعض باتوں سے آگاہ کرتی تھی۔ وہ ینگ کی تقلید میں ڈھلان کی طرف کھسکنے تو لگا لیکن دل ہی دل میں وہ بھی اس کے فیصلے سے متفق نہیں تھا۔ دوربین سے اس نے دیکھ لیا تھا کہ سلطانہ اور چنبیلی واقعی ہجوم میں راستہ بناتے ہوئے مندر کے بڑے دروازے کی طرف بڑھنے لگے تھے اور ان کے ساتھ ہی پوجا کرنے والے لوگوں میں سے بھی کئی آدمی حرکت کرتے دکھائی دینے لگے تھے۔

جاوید ملک نے سوچا بھی نہیں تھا کہ پولیس کے انتہائی خاص مخبر کی اطلاع پر وہ یہاں آئیں گے۔ بڑے زور و شور سے حکمت عملی بنائیں گے، پہاڑی پر گھات لگا کر بیٹھیں گے اور پھر اچانک یوں واپس چل دیں گے جیسے وہ بس یہی کچھ کرنے آئے تھے۔ وہ دونوں جب کچھ نیچے آگئے تو اٹھ کھڑے ہوئے۔ اب پہاڑی کے دوسری طرف سے ان کے دیکھ لئے جانے کا خطرہ نہیں تھا۔ رائفلیں ہاتھوں میں لئے وہ سنبھل سنبھل کر اترنے لگے۔ ڈھلان پر اترنا ایک مشکل کام تھا۔

دوسری طرف سلطانہ اور اس کے ساتھی دھیرے دھیرے مندر سے نکل آئے تھے اور دو دو چار چار کی ٹولیوں میں مختلف سمتوں میں جا رہے تھے۔ انہوں نے اپنے گھوڑے مختلف جگہوں پر باندھے ہوئے تھے۔ وہ بظاہر ایک دوسرے سے لاتعلق نظر آ رہے تھے لیکن آنکھوں ہی آنکھوں میں ان کا ایک دوسرے سے رابطہ تھا۔ ان کے خاموش نیٹ ورک کا کسی کو اندازہ نہیں ہو سکتا تھا۔ سلطانہ نے نیچی آواز میں بھورے سے کہا۔'' پربھو داس پولیس کا مخبر ہے۔''

''ہاں...... مجھے اندازہ ہو گیا ہے۔'' بھورے اطمینان سے بولا۔'' کیا چلتے چلتے اس کا پتہ صاف کر دوں؟''

سلطانہ نے ایک لمحے سوچا پھر کہا۔'' ابھی رہنے دو...... ذرا اور اچھی طرح پتا چل جائے۔

پھر اس کا بھی کچھ کرنا ہی پڑے گا۔ لگتا ہے ابھی دھنو کے انجام کی کہانی اس تک نہیں پہنچی۔ اس کے ساتھ بھی دھنو والا طریقہ ہی اختیار کرنا ہوگا۔ مخبروں کے لئے بس وہی ایک طریقہ مقرر کرلو۔''

''ٹھیک ہے۔'' بھورے نے کسی عام اور شریف شہری کی طرح سر جھکا کر چلتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔ وہ گویا روز مرہ زندگی کے معاملات کے بارے میں بات کرتے ہوئے جا رہے تھے۔ پھر بھورے نے سرسری سے لہجے میں پوچھا۔''تمہارے خیال میں پہاڑی کے پیچھے کون تھا؟''

''میرے خیال میں وہ ینگ ہی ہوسکتا ہے۔'' سلطانہ بولا۔''مجھے نشانے پر لینے کے بعد بھی اتنا تحمل وہی دکھا سکتا تھا۔ کوئی اور ہوتا تو ضرور گولی چلا دیتا۔ میں اپنے آپ کو اور چنبیلی کو گولیوں سے بچانے کے لئے تیار تھا لیکن شاید کچھ اور نردوش لوگ مارے جاتے۔''

اس نے چنبیلی کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ اس کی دلکش اور جھیل سی گہری آنکھوں میں تشویش کی کوئی پرچھائیں نہیں تھی۔ وہ زندگی اور موت کے سفر میں سلطانہ کے شانہ بشانہ اور ہمقدم رہنے کی عادی ہو چکی تھی۔

بھورے نے پُرخیال انداز میں سر ہلایا اور چلتے چلتے ذرا سا مڑ کر سرسری سے انداز میں پہاڑی کی طرف دیکھا اور بولا۔''میرا خیال ہے وہ جو کوئی بھی تھا جو کوئی بھی تھے وہ جا چکے ہیں۔''

''ہاں...... مجھے معلوم ہے۔'' سلطانہ ادھر دیکھے بغیر بولا۔''وہ ابھی سنبھل سنبھل کر پہاڑی سے اتر رہے ہوں گے۔ معلوم نہیں کیا سوچ کر آئے تھے اور کیا سوچ کر واپس جا رہے ہیں۔ بہرحال ......ہمیں ادھر جانے کی ضرورت نہیں۔ ہمیں اب اپنا رستہ پکڑنا چاہئے۔''



سلطانہ کو ایک بار پھر چنبیلی کے ذریعے پیغام ملا کہ ڈی ایس پی ینگ اس سے کہیں اکیلے میں ملاقات کرنا چاہتا ہے۔ سلطانہ مسکراتے ہوئے بولا۔''یہ آدمی ضد کا اور اپنی دھن کا بڑا پکا لگتا ہے۔ کسی سود خور بنیے کی طرح میرے پیچھے پڑ گیا ہے۔''

پھر ایک لمحے سوچ کر وہ بولا۔''چلو......ٹھیک ہے مل لیتا ہوں لیکن میں اس سے کھلے میدان میں ملوں گا جہاں میں دور دور تک نظر رکھ سکوں اور دور ہی سے دیکھ سکوں کہ وہ اکیلا ہی آ رہا ہے۔ ویسے مجھے امید ہے وہ اپنے وعدے کا پاس رکھے گا۔ میری نظر میں ایک جگہ ہے وہاں ایک چھوٹی سی پہاڑی بھی ہے جس پر سے چاروں طرف دور دور تک دیکھا جا سکتا ہے۔ میں اسے

وہاں بلاتا ہوں۔ تم اس سے دن اور وقت طے کرلو۔ مجھے پیغام بھجوا دو، میں وہاں اس کا انتظار کروں گا۔ اس جگہ کے بارے میں میں تمہیں سب کچھ سمجھا دیتا ہوں۔ میری ایک شرط یہ بھی ہوگی کہ وہ کوئی ہتھیار لے کر نہیں آئے گا لیکن اسے بتا دینا کہ میرے پاس چھ گولیوں والا ایک ویبلے ریوالور ہوگا۔ میں دیکھتا ہوں اس میں اتنی ہمت ہے یا نہیں کہ خود نہتا آ کر مجھ سے مل سکے جبکہ میرے پاس ریوالور موجود ہو۔''

''میرا خیال ہے وہ آ جائے گا۔'' چنبیلی کچھ سوچتے ہوئے بولی۔''تو پھر میں اس کے سواگت کے لئے تیار ہوں۔'' سلطانہ نے کہا اور جائے ملاقات کے بارے میں چنبیلی کو سمجھانے لگا۔



چنبیلی نے سلطانہ کی ہدایات اچھی طرح ذہن نشین کرلیں اور پھر ینگ کو مطلع کر دیا کہ اس کی ملاقات سلطانہ سے کہاں اور کس طرح ہو سکتی ہے۔ ینگ نے فوراً آمادگی ظاہر کر دی۔ ایک ہفتے بعد ملاقات طے پا گئی۔ ایک مخصوص مقام تک چنبیلی خود ینگ کو اپنے ساتھ لے کر گئی۔ دونوں الگ الگ گھوڑوں پر تھے۔ ایک چشمے کے قریب گھوڑا روکتے ہوئے چنبیلی بولی۔ ”صاحب! یہاں سے آگے آپ کو اکیلے جانا ہوگا......“

پھر اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔ ”ادھر تقریباً ایک میل آگے آپ کو چھوٹا سا ایک ٹیلا دکھائی دے گا۔ اس کے پیچھے سلطانہ آپ کا انتظار کر رہا ہوگا۔“

”ٹھیک ہے......تمہارا بہت شکریہ چنبیلی!“ ینگ نے کہا اور گھوڑا آگے بڑھانے ہی لگا تھا کہ چنبیلی نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔ ”معافی چاہتی ہوں صاحب......“ چنبیلی گھوڑے سے اترتے ہوئے بولی۔ ”اچھا نہیں لگتا لیکن کیا کروں......جس طرح سلطانہ نے حکم دیا ہے مجھے اس طرح کرنا پڑے گا۔ مجھے آپ کو یہاں سے آگے بھیجنے سے پہلے آپ کی تلاشی لینی پڑے گی۔“

ینگ نے ایک گہری سانس لی اور گھوڑے سے اتر آیا۔ دونوں ہاتھ اٹھاتے ہوئے وہ بولا۔ ”لو بھئی......تلاشی بھی لے لو۔ ایسا انگریز پولیس آفیسر شاید تمہیں آئندہ زندگی میں کبھی نہ ملے گا جو ہندوستان کے سب سے بڑے ڈاکو سے ملنے اکیلا ایک ویرانے میں اسی کی مقرر کی ہوئی جگہ پر جا رہا ہو......اس کے پاس کوئی ننھا سا چاقو تک نہیں ہو......اور وہ ڈاکو کی محبوبہ کو تلاشی بھی دے کر جا رہا ہو......!“

”میں مانتی ہوں صاحب جی......“ چنبیلی ہاتھ جوڑ کر بولی۔ ”آپ سچ مچ بہت بڑے آدمی ہیں۔ آپ جیسے لوگ روز روز پیدا نہیں ہوتے......“

پھر جیسے اسے کوئی خیال آیا۔ مسکراتے ہوئے اس نے اضافہ کیا۔ ”اور سلطانہ جیسے آدمی بھی روز روز پیدا نہیں ہوتے۔“

”ینگ تائید کے سے انداز میں سر ہلاتے ہوئے ہنکارا بھر کر رہ گیا۔ چنبیلی نے اچھی طرح اس کی تلاشی لی۔ پھر اس نے گھوڑے کی زین کو بھی ذرا اوپر کر کے دیکھا۔ اس دوران ینگ اپنے چہرے پر ایک عجیب سی مسکراہٹ لئے بغور اس کی طرف دیکھتا رہا۔ آخر چنبیلی نے مطمئن ہونے کے بعد سر ہلا کر اسے آگے جانے کی اجازت دے دی اور خود اپنے گھوڑے پر بیٹھ کر واپس روانہ ہو گئی۔

ینگ گرد و پیش کا جائزہ لیتے ہوئے آگے بڑھا۔ ویسے ترائی کا تقریباً سارا علاقہ جنگلوں اور سبزہ زاروں سے پٹا پڑا تھا لیکن یہ ٹکڑا کچھ صحرائی سا دکھائی دے رہا تھا۔ زمین ریتیلی، مگر سخت تھی کہیں کہیں پتھر بھی بکھرے ہوئے تھے۔ دور دور تک سناٹا اور ویرانی تھی مگر ینگ کو کچھ یوں لگ رہا تھا جیسے کہیں سے نادیدہ آنکھیں اسے دیکھ رہی تھیں۔ اس تصور سے اس کے وجود میں پہلے ہی ایک خفیف سا ہیجان برپا تھا کہ وہ ہندوستان کے سب سے بڑے ڈاکو سے تنہائی میں ملاقات کرنے جا رہا تھا۔ اب یہ احساس اس کے ہیجان کو ذرا بڑھا رہا تھا کہ کہیں سے کوئی نادیدہ آنکھ اسے دیکھ رہی تھی حالانکہ اردگرد کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس کی آڑ میں چھپ کر کوئی اسے دیکھ سکتا۔

اسے نہیں معلوم تھا کہ سلطانہ نے جس ٹیلے کے قریب اسے بلایا تھا وہ اسی پر لیٹا، اس کی اوٹ سے دوربین کے ذریعے اسے دیکھ رہا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے ینگ، رام نگر کے قریب بنے والے نئے مندر میں سلطانہ کی آمد کے موقع پر ایک پہاڑی کی اوٹ سے اسے دیکھ رہا تھا۔

ینگ کے ذہن کے کسی گوشے میں اس اندیشے نے بھی سر ابھارا تھا کہ سلطانہ موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے قتل کرنے کی کوشش تو نہیں کرے گا؟ کیونکہ وہ چنبیلی کو تلاشی دے کر حسب وعدہ بالکل نہتا ہو کر سلطانہ سے ملنے جا رہا تھا لیکن اس نے سلطانہ کے لئے نہ تو ایسی کوئی شرط رکھی تھی اور نہ ہی اسے معلوم تھا کہ سلطانہ خالی ہاتھ آئے گا یا اس کے پاس کوئی ہتھیار ہوگا؟

اسے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ سلطانہ اکیلا ہوگا یا اس کے ساتھ کوئی اور بھی ہوگا؟ ینگ نے تو ملاقات کے لئے اپنی طرف سے کوئی شرط ہی نہیں رکھی تھی......اور شاید اسی لئے سلطانہ ملاقات کے لئے تیار بھی ہو گیا تھا لیکن ینگ کو احساس تھا کہ وہ بہرحال ایک جواء کھیل رہا تھا۔ اس نے گویا اپنے آپ کو سلطانہ کے سپرد کر دیا تھا۔ سلطانہ اسے ہلاک بھی کر سکتا تھا اور اغوا کر کے یرغمال

بھی بنا سکتا تھا۔ تاہم ینگ اسی امید کے سہارے اس سے ملاقات کے لئے چل دیا تھا کہ وہ ایسی کوئی بھی حرکت نہیں کرے گا۔ اس کی امید کی بنیاد صرف یہ تھی کہ اس کے اندازے کے مطابق سلطانہ ڈاکو ضرور تھا لیکن وہ بزدل نہیں تھا۔ ینگ کا تجربہ تھا کہ دھوکے اور وعدہ خلافی کی توقع بزدلوں سے رکھی جاسکتی تھی، بہادروں سے نہیں۔

بہرحال وہ اپنے اضطراب کو چھپائے بظاہر بے پروائی سے اپنے گھوڑے کو دلکی چلاتا ہوا، اِدھر اُدھر دیکھتا آگے بڑھتا رہا۔ ٹیلے تک بلندی پر اس کی آڑ میں لیٹا ہوا سلطانہ اب صاف طور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ینگ حسب وعدہ تنہا آرہا تھا اور اس کے عقب میں دور دور تک کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ سلطانہ نے ملاقات کے لئے یہ جگہ اسی وجہ سے منتخب کی تھی کہ آنے والے پر وہ بہت دور سے نظر رکھ سکتا تھا۔ وہ انگریزوں پر بھروسا نہیں کرتا تھا لیکن اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ ینگ ایک مختلف قسم کا انگریز تھا۔

ٹیلے کے قریب پہنچ کر ینگ رک گیا اور سر اٹھا کر چوٹی کی طرف دیکھتے ہوئے بہ آواز بلند بولا۔

"سلطانہ اٹھ کھڑا ہوا۔ گلے میں لٹکی ہوئی دوربین اس نے پشت پر کرلی اور بہ آواز بلند جواب دیا۔ "ہاں ...... میں یہاں ہوں ...... لیکن میں تم سے ڈر کر چھپا ہوا نہیں ہوں۔ میں تو صرف یہ دیکھنے کے لئے چھپا ہوا تھا کہ تم مجھ سے کوئی دھوکا کرنے کی کوشش تو نہیں کرو گے۔"

اس نے چھلانگ لگادی اور ینگ کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ ٹیلے کی بلندی اچھی خاصی تھی۔ کوئی بھی اس پر چھلانگ لگانے میں یقیناً ہچکچاہٹ کا شکار ہوتا لیکن سلطانہ پلک جھپکتے میں چھلانگ لگا کر نیچے آ گیا تھا۔ اس کے انداز کو دیکھ کر ینگ کے ذہن میں کسی چیتے کا خیال آیا تھا۔ سلطانہ کی کمر کے گرد لپٹی ہوئی گولیوں کی پیٹی میں ایک ریوالور بھی جھول رہا تھا۔

ینگ ریوالور کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولا۔ "میں چنبیلی کو تلاشی دے کر بالکل نہتا یہاں آیا ہوں اور تمہاری کمر سے ریوالور بندھا ہوا ہے ......!"

"تمہیں اس سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ...... اس سے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا ......" سلطانہ بھی مسکراتے ہوئے بولا۔ "اگر میرا تمہیں نقصان پہنچانے کا ارادہ ہوتا تو وہ میں خالی ہاتھ بھی پہنچا سکتا تھا ......"

ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ گویا ریوالور کی موجودگی کی وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

"قریب ہی ایک جنگل ہے جس سے میں گزر کر آرہا ہوں۔ وہ کچھ خطرناک ہے۔ اس میں درندے بھی ہوتے ہیں اس لئے میں نے احتیاطاً صرف ایک ریوالور ساتھ لے لیا تھا۔ کوئی بڑا ہتھیار میں اپنے ساتھ نہیں لایا ہوں۔"

ینگ بے پروائی سے ہاتھ اٹھا کر بولا۔ "وضاحتوں کی ضرورت نہیں ...... میں تو یونہی تمہیں چھیڑ رہا تھا۔ مجھے تو موت کے منہ میں جانے کا خطرہ مول لینا ہی تھا۔ اب خود تم خالی ہاتھ آتے یا توپ ساتھ لے کر آجاتے میرے لئے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔"

"تم نے اتنی زحمت کیوں کی؟" سلطانہ نے اصل موضوع پر آتے ہوئے پوچھا۔

"مجھے تم سے درخواست کرنی تھی کہ اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر دو۔" ینگ نے سیدھے سادے انداز میں کہا۔

"صرف یہ بات کہنے کے لئے تم نے اتنی تکلیف اٹھائی اور اپنی جان کو خطرے میں ڈالا ......؟" سلطانہ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے تاثرات کچھ ایسے ہی تھے گویا اس نے زندگی میں اس سے زیادہ احمقانہ بات نہیں سنی تھی۔ "یہ پیغام تم ویسے بھی کسی کے ذریعے بھجوا دیتے ...... اور میں تمہیں جواب بھجوا دیتا کہ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں۔"

"باتیں تو تم سے بے شمار کرنے کو جی چاہتا ہے لیکن ان سب کا لب لباب بس یہی ایک جملہ ہے۔"

ینگ تحمل سے بولا۔ "مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ فوری طور پر تمہارا جواب یہی ہوگا لیکن پھر بھی ...... میں تمہیں سمجھانے کی ایک کوشش کرنا چاہتا ہوں۔ یہ کام میں اپنے ضمیر کی تسلی کے لئے کر رہا ہوں۔ میں چاہتا ہوں میرے ضمیر پر کوئی بوجھ نہ رہے۔ مجھے آئندہ زندگی میں ہمیشہ یہ اطمینان رہے کہ تمہارے معاملے میں، میں نے ہر طریقہ آزمایا تھا۔"

"تم اپنے ضمیر پر بالکل کوئی بوجھ محسوس نہ کرو ......" سلطانہ نے گویا بڑے خلوص سے اسے مشورہ دیا۔ "میں ایک ڈاکو ہوں ...... میں اپنا کام کرتا رہوں گا، تم ایک پولیس افسر ہو تم اپنا کام کرتے رہو۔ میں تم سے کبھی کوئی شکوہ نہیں کروں گا ...... اور ڈاکو کو بھلا شکوہ کرنے کا حق بھی کیا ہے؟"

"دیکھو ...... ایک نہ ایک روز تمہیں ایسے ہی کسی ویرانے ...... یا کسی جنگل میں گولیاں کھا کر مرجانا ہے۔ انجام تو تمہارا یہی ہے۔ تم نے بہت طوفان مچالیا ...... اپنے دل کے بہت سے ارمان

نکال لئے...... اب بہت ہو چکی...... تباہی و بربادی کی اس کہانی کو اب ختم کر دو۔ اس کہانی کو بہر حال ایک روز ختم ہونا ہی ہے۔ تم خود ختم کر دو تو زیادہ اچھا ہے۔ ابھی پولیس نے تمہارے خلاف اپنی پوری طاقت، اپنے سارے وسائل استعمال نہیں کئے۔ جس دن پولیس اپنی ساری طاقت، سارے وسائل استعمال کرے گی، اس دن تمہیں پاتال میں بھی پناہ نہیں ملے گی۔"

"کوئی بات نہیں...... دیکھا جائے گا۔" سلطانہ بے پروائی سے بولا۔

"تم یہی چاہتے ہو کہ ایک روز تمہارا گولیوں سے چھلنی وجود خاک و خون میں لتھڑا ہوا کہیں پڑا ہو...... اور پھر اسے کسی مرے ہوئے جانور کی طرح گاڑی میں لاد کر شمشان گھاٹ بھیج دیا جائے؟" ینگ نرمی سے بولا۔

"اور اگر میں اپنے آپ کو تمہارے حوالے کر دوں...... ہتھیار ڈال دوں تو کیا مجھے کسی محل میں رکھا جائے گا؟ اکیس توپوں کی سلامی دی جائے گی؟" سلطانہ زہریلے انداز میں ہنس کر بولا۔ "ظاہر ہے اس کے بعد بھی جیل ہی میرا مقدر ہوگی...... جہاں میرے ساتھ نہ جانے کیا سلوک ہوگا...... پھر مجھے پھانسی دے دی جائے گی۔ وہ بھی کوئی ایسی حسین موت نہیں ہوگی۔ میری گردن ایک فٹ لمبی ہو جائے گی، آنکھیں باہر آ جائیں گی۔ زبان منہ سے باہر لٹک جائے گی۔ تمہارے خیال میں یہ بہت اچھا انجام ہے؟"

"ہاں...... ہوگا تو یہی......" ینگ نے تسلیم کیا۔ "میں تمہیں یہ دھوکا دینے کی کوشش نہیں کروں گا کہ میں تمہیں معافی دلوا دوں گا۔ معافی تو تمہیں کسی قیمت پر نہیں مل سکتی...... لیکن اگر تم اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر دیتے ہو تو نہ جانے کتنے بے گناہ انسانوں کی جانیں تمہارے ہاتھوں ضائع ہونے سے بچ جائیں گی۔ نہ جانے کتنے مالدار لوگ کنگال ہونے سے بچ جائیں گے۔ ملک کے ایک بڑے حصے میں ایک بڑا فساد تھم جائے گا۔"

"اور تمہیں ایک لاکھ روپیہ انعام مل جائے گا......" سلطانہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "میں نے سنا ہے انگریز سرکار نے مجھے ہلاک کرنے یا زندہ گرفتار کرنے پر انعام کی رقم پچاس ہزار روپے سے بڑھا کر ایک لاکھ کر دی ہے؟ بہت بڑی رقم ہے یہ...... تم نے شاید کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھی ہوگی......؟"

"ہاں...... یہ بات تو ہے......" ینگ نے تسلیم کیا۔ وہ دونوں اب ایک دوسرے کے سامنے اِدھر اُدھر ٹہلتے ہوئے بات چیت کر رہے تھے۔ کوئی ذرا دور سے دیکھتا تو یہی سمجھتا کہ دو

دوست چہل قدمی کرتے ہوئے گپ شپ کر رہے ہیں۔

"تم مجھے جان سے مار کر انعام کیوں نہیں حاصل کر لیتے؟" سلطانہ نے دریافت کیا۔ "رقم تو تمہیں اس طرح بھی مل جائے گی۔"

"میں تمہیں مارنا نہیں چاہتا......" ینگ نے گہری سنجیدگی سے جواب دیا۔ "کم از کم فی الحال میرے دل میں ایسی کوئی خواہش نہیں ہے۔ میں اپنا فرض بھی اس حد تک ادا کرنا چاہتا ہوں کہ تمہیں پکڑ کر قانون کے حوالے کر دوں۔ اس کے بعد وہ جانے اور اس کا کام......"

"مجھے افسوس ہے ینگ صاحب...... میں تمہاری یہ خواہش پوری نہیں کر سکتا......" سلطانہ نے گہری سانس لے کر فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "میں صرف قانون سے ہی نہیں، اس سماج سے بھی لڑ رہا ہوں...... اور اسی طرح لڑتے لڑتے مر جاؤں گا، ہتھیار نہیں ڈالوں گا۔"

"کیوں لڑ رہے ہو تم سماج کے ساتھ؟" ینگ نے ملائمت سے پوچھا۔

"تمہارے قانون...... تمہارے سماج...... تمہاری سرکار...... کسی نے بھی میرے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کیا۔ تمہیں کیا پتا، میں نے کیسی زندگی گزاری ہے...... میرا بچپن کیسے بیتا ہے......" سلطانہ کے لہجے میں زمانے بھر کی تلخی سمٹ آئی۔

"مجھے معلوم ہے، مجھے سب معلوم ہے......" ینگ نے بدستور نرمی اور رسان سے کہا۔ "میرے پاس تمہاری پیدائش سے لے کر اب تک کے حالات کا پورا ریکارڈ موجود ہے اور میں نے اس کا ایک ایک لفظ غور سے پڑھا ہے۔ ہر سماج، ہر معاشرے میں اس طرح کے واقعات پیش آتے رہتے ہیں۔ کچھ لوگوں کی زندگی ناخوشگوار گزرتی ہے۔ کچھ کے ساتھ زیادتیاں بھی ہو جاتی ہیں۔ اگر وہ سب کے سب تمہاری طرح بدلہ لینے کے لئے اٹھ کھڑے ہوں تو یہ دنیا جہنم بن جائے......"

اس نے ایک لمحے توقف کیا پھر پہلے سے بھی نرم لہجے میں بولا۔ "میں تمہیں ایک بات اور بتاتا چلوں...... یہ میرے دل کی بات ہے...... ایک نہ ایک روز اس ملک کو آزاد ہونا ہے۔ ہم انگریزوں کو یہاں سے جانا پڑے گا۔ عین ممکن ہے کہ ہمارے بعد تمہارے اپنے ملک کے لوگ تمہارے ساتھ...... یا تمہاری آنے والی نسلوں کے ساتھ اس سے بھی برا سلوک کریں جس نے تمہیں سماج کا باغی بنا دیا ہے۔ مجھے نہیں معلوم، اس وقت تم یا تمہاری آنے والی نسلیں کیا کریں گی؟"

ینگ یہ بات کرتے وقت چلتے چلتے رک گیا تھا اور اس کی پیٹھ ٹیلے کی طرف تھی۔ اس لمحے اس نے اچانک سلطانہ کو بجلی سی تیزی سے اپنا ریوالور نکالتے دیکھا۔ ینگ کو یقین ہو گیا کہ اس کی زندگی کا آخری لمحہ آن پہنچا تھا۔ سلطانہ کی یہ حرکت اتنی اچانک اور غیر متوقع تھی کہ ینگ فطری اور فوری طور پر کوئی ردعمل بھی ظاہر نہ کر سکا۔ وہ وہیں بُت بن کر رہ گیا۔ پے در پے دو دھماکے ہوئے اور اس نے آنکھیں بند کر لیں لیکن اسے حیرت ہوئی کہ اس کے جسم میں کہیں گولی پیوست ہونے کی تکلیف کیوں نہیں ہوئی تھی۔

اسی دوران اس نے دھم سے اپنے عقب میں کسی وزنی چیز کے گرنے کی آواز سنی۔ اس نے آہستگی سے آنکھیں کھولیں اور اسے احساس ہوا کہ وہ تو زندہ سلامت کھڑا تھا۔ اسے خراش بھی نہیں آئی تھی۔ اس نے گردن گھما کر پیچھے دیکھا تو ایک بڑا سا چیتا زمین پر پڑا نظر آیا جس کے جسم کو اس طرح جھٹکے لگ رہے تھے جیسے وہ دم توڑ رہا ہو۔

''معاف کرنا ینگ صاحب......'' اس نے سلطانہ کی پُرسکون آواز سنی۔ ''یہ چیتا شاید بھٹکتا ہوا جنگل سے اس طرف آ نکلا تھا...... یا شاید انسانوں کی بو سونگھ کر آ گیا تھا۔ یہ ٹیلے کی چوٹی پر تھا اور تم پر چھلانگ لگانے لگا تھا۔''

ینگ آہستگی سے اس کی طرف گھوما اور جب وہ بولا تو اس کی آواز کسی عجیب سے جذبے کے باعث بوجھل تھی۔ ''میں تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں سلطانہ......''

سلطانہ کے ریوالور کی نالی سے ابھی تک دھویں کی لکیر ہوا میں مدغم ہو رہی تھی۔ وہ نال پر پھونک مارتے ہوئے بے پروائی سے بولا۔ ''شکریے کی ضرورت نہیں...... رام نگر کے مندر میں مجھے دیکھ کر تم نے بھی گولی نہیں چلائی تھی۔ تم نے مجھے ایک نیا جیون دیا تھا۔ بہت جلدی حساب برابر ہو گیا۔ شاید بھگوان بھی یہی چاہتا ہے کہ سلطانہ پر کسی کا احساس زیادہ دیر نہ رہے......'' وہ ینگ کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا اور ریوالور اس نے دوبارہ ہولسٹر میں رکھ لیا۔

ینگ پہلے اس کے نشانے پر حیران نظر آ رہا تھا۔ اس نے چھلانگ لگاتے ہوئے چیتے کی پیشانی پر، عین آنکھوں کے درمیان دونوں گولیاں ماری تھیں۔ اسی لئے وہ اتنی جلدی مر گیا تھا۔ اب ینگ اس کی بات سن کر بری طرح چونک اٹھا تھا۔ وہ بے یقینی سے بولا۔ ''تمہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ پہاڑی پر میں تھا؟''

''ہاں...... مجھے موت کے قدموں کی چاپ بہت دور سے سنائی دے جاتی ہے...... اور

شاید میں اسی لئے اب تک بچا ہوا ہوں کہ یہ چاپ سن کر میں راستہ بدل لیتا ہوں......'' سلطانہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''میں نے تمہیں دیکھا نہیں تھا کیونکہ اس وقت میرے پاس دوربین نہیں تھی۔ ویسے بھی تم پہاڑی کی اوٹ میں چھپے ہوئے تھے...... لیکن میں نے موت کی آہٹ سن لی تھی...... پھر جب دیر تک گولی نہیں چلی تو میں نے سوچا، پورے ہندوستان کی پولیس میں صرف ایک ہی آدمی ہے جو مجھے بندوق کے نشانے پر لینے کے بعد زندہ چھوڑ سکتا ہے...... اور وہ فریڈی ینگ ہے۔''

فریڈی ینگ مسکرا دیا۔ سلطانہ نے تجسس سے پوچھا۔ ''تم نے مجھے کیوں چھوڑ دیا تھا؟ وہ ایک سنہری موقع تھا۔ ہندوستانی پولیس کی تاریخ میں تمہارا نام امر ہو جاتا...... اور تمہیں ایک لاکھ روپیہ انعام بھی مل جاتا۔ ایک لاکھ روپیہ بہت بڑی رقم ہے......!''

''مجھے ہندوستان کی پولیس کی تاریخ میں اپنا نام امر کرانے کا شوق ہے اور نہ ہی ایک لاکھ کی رقم جیب میں آنے کے خیال سے میرے دل کی گدگدی ہوتی ہے......'' ینگ سنجیدگی سے بولا۔ ''جب میں پہاڑی پر سے تمہارا نشانہ لئے ہوئے تھا۔ معلوم نہیں کیوں مجھ پر پھر وہی خواہش غالب آ گئی کہ میں تمہیں زندہ حالت میں انگریز سرکار کے حوالے کروں...... رقم تو اس طرح بھی مجھے مل ہی جائے گی لیکن مجھے اس سے دلچسپی نہیں ہے۔ اگر تم کہو تو تمہاری گرفتاری کے بعد میں انعام کی رقم کسی بھی ایسے شخص کو دے دوں گا جس کا نام تم مجھے لکھوا دو گے۔''

سلطانہ نے نہ جانے کیوں ایک زوردار قہقہہ لگایا اور خوشدلی سے بولا۔ ''ینگ صاحب...... تم واقعی ایک دلچسپ آدمی ہو۔''

دلچسپ تو شاید نہیں...... لیکن مختلف ضرور ہوں......'' ینگ بولا۔ ''جس طرح تم ایک مختلف قسم کے ڈاکو ہو اسی طرح میں ایک مختلف قسم کا پولیس والا ہوں۔ شاید یہ بھی قدرت کی طرف سے ہوتا ہے۔ ہر محکمے اور زندگی کے ہر میدان میں...... کہیں نہ کہیں ایک آدھ آدمی ایسا ضرور ہوتا ہے جو وہاں کے روایتی آدمیوں سے بالکل الگ اور مختلف ہوتا ہے۔''

''لیکن شاید یہ اچھا نہیں ہوا کہ اپنے اپنے میدان کے دو مختلف آدمی آمنے سامنے آ گئے ہیں۔'' سلطانہ بولا۔ ہم میں سے اگر ایک آدمی بھی روایتی ہوتا...... تو روایتی پولیس والے ہوتے یا میں روایتی ڈاکو ہوتا تو شاید ہماری کہانی اب تک ختم ہو چکی ہوتی۔ شاید تم دوسری دنیا میں پہنچ چکے ہوتے...... یا پھر میں اس دنیا میں نہ ہوتا۔''

"میرے خیال میں تو قدرت جو کرتی ہے، اچھا ہی کرتی ہے۔ قدرت ہم دونوں کو بار بار ایک دوسرے کے سامنے لا رہی ہے۔ شاید اس میں اس کی کوئی مصلحت ہے......" ینگ بولا۔ "میں ایک بار پھر کہوں گا تم اپنے آپ کو میرے حوالے کر دو۔"

سلطانہ گویا بڑے تحمل سے کام لیتے ہوئے مسکرایا اور دھیمے لہجے میں بولا۔ "یہ خواب دیکھنا چھوڑ دو ینگ صاحب!"

"ٹھیک ہے...... تو پھر ہم خوامخواہ کی باتوں میں وقت ضائع نہیں کرتے......" ینگ ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ "میں اب چلتا ہوں۔"

وہ اپنے گھوڑے کی طرف بڑھا لیکن پھر رک کر مُردہ چیتے کا جائزہ لینے لگا۔ اس نے پاؤں سے اس کا منہ ذرا سیدھا کیا اور دو گولیوں سے اس کی پیشانی پر پڑنے والے گڑھے کو دیکھنے لگا جس سے بہت سا خون اور بھیجا نکل کر ریتیلی زمین پر جمنے لگا تھا۔ شاید مُردہ چیتے کو دیکھ کر ینگ کو کوئی خیال آیا اور وہ مڑ کر سلطانہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "تمہیں ہلاک کرنا میری آخری ترجیح ہوگا...... اور میں بہت مجبوری کی حالت میں ایسا کروں گا۔"

میرا بھی تمہارے بارے میں یہی خیال ہے۔" سلطانہ مسکراتے ہوئے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولا۔

"میرا خیال یہ بھی ہے کہ دوستانہ ماحول میں یہ میری اور تمہاری آخری ملاقات تھی۔" ینگ بولا۔

"تمہارا خیال ہے...... تو شاید ٹھیک ہی ہو...... میں تم سے یہ نہیں کہوں گا تم اپنا خیال بدل لو......" سلطانہ بولا۔

"تمہارا بھی تو کوئی خیال ہوگا...... تم بھی اس سلسلے میں کچھ کہو۔" ینگ نے گویا اسے کریدنے کی کوشش کی۔

"میں دماغ سے نہیں دل سے سوچتا ہوں...... اور میرے دل کی بات میرے دل میں ہی رہنے دو۔" سلطانہ نے جواب دیا۔ اس کے ہونٹوں پر مدھم سی مسکراہٹ اب بھی برقرار تھی۔

"دل سے تو میں بھی سوچتا ہوں...... لیکن میں اپنے دل کی بات دوسروں کو بھی بتا دیتا ہوں۔" ینگ بولا۔

"بتا تو میں بھی دیتا ہوں...... لیکن اس وقت میرے پاس بتانے کے لئے کچھ نہیں ہے۔"

سلطانہ سنجیدگی سے بولا۔ "مجھے نہیں معلوم کہ ہماری آئندہ ملاقات کب ہو...... کن حالات میں ہو...... اور اس وقت میں کیا کروں...... میرے دل نے ابھی اس سلسلے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا...... میں یہ فیصلہ وقت پر چھوڑتا ہوں...... دیکھتے ہیں وقت ہمیں کیا دکھاتا ہے...... بہت سی باتیں اس طرح ہو جاتی ہیں جس طرح ہم نے سوچا بھی نہیں ہوتا۔ جیسے یہ چیتا اس ٹیلے کے اوپر سے تم پر کودنے لگا تھا۔ ہم میں سے کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے...... اور ایک سیکنڈ پہلے تک میں نہیں کہہ سکتا تھا کہ اگر میں ایسا ہوتے دیکھوں گا تو کیا کروں گا...... بس...... اسی طرح یہ بات، ہم وقت پر چھوڑ دیتے ہیں۔"

ینگ نے پُر خیال انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے دھیرے دھیرے اثبات میں سر ہلایا، پھر اپنے گھوڑے کی طرف بڑھ گیا جو گھاس کی تلاش میں ادھر اُدھر صحرائی سے پودوں پر منہ مار رہا تھا۔ اس نے گھوڑے کے منہ سے نکالی ہوئی لگام دوبارہ اس کے منہ میں ڈالی اور اس پر سوار ہو کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔ سلطانہ ٹیلے سے ٹیک لگائے وہیں کھڑا اسے جاتے دیکھتا رہا۔



آئی جی ایش ڈاؤن صبح اپنے آفس میں آ کر بیٹھے ہی تھے کہ اردلی نے آ کر اطلاع دی، ڈی ایس پی جاوید ملک ان سے ملنا چاہتے ہیں۔ ایش ڈاؤن نے بلا تاخیر اسے بلوایا۔ جب سے انہوں نے اسے سلطانہ ڈاکو اور اس کے گروہ کی سرکوبی کے سلسلے میں ینگ کی قیادت میں بنائی گئی خصوصی ٹیم میں بھیجا تھا تب سے اس سے براہ راست کوئی رابطہ نہیں تھا۔ بس انہیں ینگ کی طرف سے ہفتہ وار ایک مجموعی رپورٹ مل جاتی تھی جس میں کوئی امید افزا بات نہیں ہوتی تھی۔ آئی جی صاحب نے یہی سوچ کر جاوید ملک کو فوراً بلوا لیا تھا کہ شاید وہ براہ راست کوئی کام کی بات بتانے آیا ہو۔

جاوید ملک کمرے میں داخل ہوا تو اس کے چہرے پر گمبھیر سنجیدگی دیکھ کر آئی جی صاحب کا ماتھا ٹھنکا۔ تاہم انہوں نے اپنے چہرے پر کوئی تاثر نہ آنے دیا اور اس کے سلیوٹ کا جواب سر کی خفیف سی جنبش سے دے کر اسے اپنے مقابل بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ بیٹھ چکا تو آئی جی صاحب نے گہری نظروں سے اس کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔ "کیا سلطانہ کے سلسلے میں کوئی خاص کامیابی کی خبر تم ذاتی طور پر لے آئے ہو؟ تحریری طور پر تو ابھی تک مجھے کسی کامیابی کی اطلاع نہیں ملی۔"

''میں کیا رپورٹ لے کر آؤں گا سر...... اور تحریری طور پر بھی آپ کو کسی کامیابی کی اطلاع کہاں سے ملے گی......'' جاوید ملک کے لہجے میں تلخی اور مایوسی تھی۔ ''جن صاحب کو آپ نے ٹیم کی قیادت سونپی ہے ان کے تو کام کا انداز ہی باقی سب پولیس افسروں کی سمجھ سے باہر ہے۔''

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟'' آئی جی صاحب حیرت سے بولے۔ ''ینگ تو ایک بہت قابل اور غیر معمولی طور پر سمجھدار پولیس آفیسر ہے۔ اس کے کام کا انداز ذرا مختلف ضرور ہے لیکن اس کی کوششوں کے نتائج ہمیشہ بہت اچھے نکلتے ہیں۔''

''سر...... معذرت کے ساتھ کہوں گا...... کام کا انداز اتنا بھی مختلف نہیں ہونا چاہیے کہ پولیس عوام کی نظر میں تماشا بن کر رہ جائے۔ سلطانہ ہندوستان کی پولیس کو سب سے زیادہ مطلوب مجرم ہے...... اور حالت یہ ہے کہ اس کی محبوبہ اور شریک جرم، ہماری آنکھوں کے سامنے رہ رہی ہے اور ینگ صاحب اسے حراست میں لینے کے لئے تیار نہیں ہیں۔''

''کس کی بات کر رہے ہو؟'' آئی جی صاحب نے بھنویں اچکا کر پوچھا۔

''چنبیلی کی...... جو محض ایک رقاصہ ہے...... صاحب حیثیت لوگوں کی تقریبات میں ان کا...... اور ان کے مہمانوں کا دل بہلانا اس کا پیشہ تھا۔ جب سے سلطانہ سے اس کا تعلق استوار ہوا ہے اس نے یہ کام چھوڑ دیا ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ کسی خفیہ مقام پر ان کی ملاقاتیں ہوتی ہیں۔ وہ نہایت دیدہ دلیری اور بے خوفی سے اپنے پرانے مکان میں ہی رہ رہی ہے۔ اس کی نگرانی پر مقرر کئے گئے دو اے ایس آئی جو سلطانہ کے لئے بھی گھات لگا کر بیٹھے ہوئے تھے، سلطانہ کے ہاتھوں مارے جا چکے تھے۔ اس کے باوجود ینگ صاحب نے اس پر ہاتھ نہیں ڈالا۔''

''ہاں...... وہ رپورٹ میرے سامنے آئی تھی......'' آئی جی صاحب نے سر ہلایا۔ ''لیکن میں نے اس سلسلے میں اس لئے ینگ سے کوئی باز پرس نہیں کی کہ میں نے اسے مکمل اختیارات کے ساتھ اس مشن کا انچارج بنایا ہوا ہے...... اور جب آپ کسی کیس کے سلسلے میں کسی آفیسر کو مکمل طور پر خود مختاری سے کام کرنے کی اجازت دیتے ہیں تو پھر بات بات پر اس سے جواب طلبی نہیں کرتے۔ آپ صبر و تحمل اور خاموشی سے نتائج کا انتظار کرتے ہیں۔ دوسرے ابھی تک ینگ کو اس معاملے میں کسی بات پر میرے نہ ٹوکنے کی ایک وجہ یہ ہے کہ مجھے معلوم ہے وہ کوئی بھی کام مصلحت کے بغیر نہیں کرتا۔ اس کی بعض حرکتیں بڑی عجیب لگتی ہیں لیکن آخر میں وہ کسی نہ کسی طرح اپنے مطلوبہ نتائج حاصل کر لیتا ہے۔''

جاوید کے چہرے پر مایوسی اور بے بسی کی ہلکی سی پرچھائیں لہرائی۔ وہ شاید خاصی دشواری سے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے بولا۔ ''شاید اپنے خیال میں وہ بڑے زبردست قسم کے نفسیاتی داؤ پیچ کھیل رہے ہوں لیکن مجھے نہیں لگتا کہ سلطانہ کے سلسلے میں ان کی حکمت عملی کبھی کامیاب ہو سکے گی۔ مجھے تو اندیشہ ہے کہ وہ کہیں سلطانہ کے ہاتھوں مارے نہ جائیں...... اور ان کے ساتھ ساتھ شاید میں بھی......''

''کیا تمہیں یہ اندیشہ پریشان کر رہا ہے؟'' آئی جی صاحب بغور اس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرائے۔

''میں موت سے نہیں ڈرتا...... لیکن حماقتوں سے ضرور ڈرتا ہوں......'' جاوید مضبوط لہجے میں بولا۔ ''بعض حماقتوں کے بارے میں کسی کو اندازہ نہیں ہوتا کہ ان کے نتائج کتنے خوفناک ہو سکتے ہیں...... اور وہ حماقتیں کرنے والے احمقوں کو تو بالکل ہی اندازہ نہیں ہوتا......''

اس نے گویا براہ راست ہی ینگ کو احمق کہہ دیا تھا۔ آئی جی صاحب نے اسے نہیں ٹوکا اور بدستور پُر خیال انداز میں اس کی طرف دیکھتے رہے۔ وہ اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''کیا آپ سوچ سکتے ہیں کہ ایک مرتبہ سلطانہ اپنی محبوبہ سمیت ینگ صاحب کے اور میرے نشانے پر تھا۔ صرف ٹریگر دبانے کی دیر تھی اور یہ فساد ختم ہو جاتا...... لیکن انہوں نے اسے چھوڑ دیا...... کیا آپ اس بات کا یقین کر سکتے ہیں؟''

''ہاں...... یقین کر سکتا ہوں......'' آئی جی صاحب نے اطمینان سے جواب دیا۔ ''کیونکہ یہ بات اس نے خود مجھے بتا دی تھی۔''

جاوید بظاہر تو جس طرح بیٹھا تھا اسی طرح بیٹھا رہا لیکن اسے محسوس کچھ ایسا ہی ہوا تھا جیسے وہ حیرت کے مارے کرسی سے گرتے گرتے بچا تھا۔ آئی جی صاحب اس کی پھیلی ہوئی آنکھیں دیکھ کر گویا اسے تسلی دیتے ہوئے بولے۔ ''تمہیں اس بات پر اتنا پریشان نہیں ہونا چاہئے، اس نے تمہیں اپنی اس حرکت کی وجہ بھی تو بتائی ہوگی؟''

''جی ہاں......'' جاوید سنبھل کر بولا۔ ''لیکن ان میں سے کوئی بھی بات میرے دل کو نہیں لگی۔ معذرت کے ساتھ ایک بار پھر یہی کہوں گا کہ پولیس کا محکمہ ان خطوط پر نہیں چل سکتا۔ اگر کبھی پولیس آفیسر مسٹر ینگ کے انداز میں کام کرنے لگیں تو حکومت ایک نہ ایک دن سب کو گھر بھیج دے گی اور پولیس کے دفتروں پر تالے پڑ جائیں گے۔ مجھے کچھ یوں لگتا ہے جیسے ینگ

صاحب اچھی خاصی عمر کو پہنچ جانے کے بعد بھی خیالوں، خوابوں، کہانیوں اور افسانوں کی دنیا میں رہتے ہیں لیکن سلطانہ ڈاکو قصے کہانیوں کی دنیا کا کردار نہیں ہے۔ وہ حقیقی دنیا کا ایک سفاک اور بے رحم کردار ہے۔ ہمیں اس سے پولیس کی روایات کے مطابق ہی نپٹنا پڑے گا۔“

آئی جی صاحب تفہیمی انداز میں سر ہلاتے ہوئے چند لمحے پُرخیال انداز میں اس کی طرف دیکھتے رہے پھر گہری سانس لے کر بولے۔ ”مجھے تمہاری باتوں سے اختلاف نہیں ہے...... اور مجھے ینگ کی تمام باتوں سے اتفاق بھی نہیں ہے لیکن میں ابھی اسے آزادانہ طور پر کام کرنے کا موقع دیئے رکھنا چاہتا ہوں۔ مشکل کام بھی مکمل ہونے کی امید رکھی جاسکتی ہے جب آپ کسی پر بھروسا کر کے اسے پوری آزادی سے کام کرنے کا موقع دیں۔ ابھی میں اس سے مایوس نہیں ہوں کیونکہ اسے یہ ذمے داری قبول کئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ ابھی میں اس کے کام میں مداخلت نہیں کرنا چاہتا۔“

جاوید نے گویا آئی جی صاحب کا نرم رویہ دیکھ کر ذرا ہمت پکڑتے ہوئے کہا۔ ”سر...... کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ مجھے پندرہ بیس پولیس آفیسرز کی ایک الگ پارٹی دے کر اس کا سربراہ بنا دیا جائے اور میں ینگ صاحب سے الگ رہ کر اپنے طور پر سلطانہ کو گرفتار یا ہلاک کرنے کی کوشش کروں؟“

آئی جی صاحب نے پہلے تو کچھ ایسی نظروں سے اس کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں۔ ”اچھا...... تو آخر کار دل کی بات تمہاری زبان پر آہی گئی؟ یہ ساری تمہید شاید صرف اسی لئے تھی؟“ لیکن دوسرے ہی لمحے ان کے تاثرات بدل گئے اور ایسا محسوس ہونے لگا جیسے وہ جاوید کی تجویز پر ہمدردانہ انداز میں غور کر رہے ہیں۔

چند لمحے کی خاموشی کے بعد وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”نہیں...... میرے خیال میں یہ مناسب نہیں رہے گا۔ اس طرح مسئلہ حل ہونے کے بجائے شاید مزید پیچیدہ ہو جائے اور الجھنیں بھی بڑھ جائیں۔ دو پارٹیاں ایک ہی مقصد کے لئے کام کر رہی ہوں گی تو اصل مقصد حاصل ہونے کے بجائے ان میں آپس میں تصادم کی صورتحال پیش آسکتی ہے۔ بہتر یہ ہے کہ ابھی تم ینگ کے ساتھ ہی کام کرتے رہو۔ البتہ تم چاہو تو ہر اہم بات کے سلسلے میں علیحدگی میں میرے پاس آکر غیر رسمی اور زبانی طور پر رپورٹ دے سکتے ہو تاکہ میں ینگ کے ساتھ ساتھ تمہارے نقطہ نظر سے بھی واقف ہوں۔ میں کچھ عرصے اور انتظار کروں گا۔ اگر تب تک بھی ینگ

اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوا تو میں ٹیم کا سربراہ ہی بدل دوں گا۔ ہوسکتا ہے میں یہ کام تمہارے سپرد کروں۔ فی الحال تو ایک متوازی ٹیم شاید ینگ کے لئے بھی نا قابل قبول ہو اور وہ خود ہی یہ مہم سر کرنے سے معذرت کر لے۔ میں ایسا نہیں چاہتا۔ میں یہ چاہوں گا کہ وہ اپنی ناکامی تسلیم کر لے۔ اس کے بعد میں اسے اس مہم میں الگ کر دوں۔“

جاوید کے لئے آئی جی صاحب کی بات سے اتفاق کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ چند لمحے خاموش رہا پھر ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ”میں ایک اور بات بھی کرنا چاہتا تھا...... مجھے یہ بات کرتے ہوئے اچھا تو نہیں لگ رہا...... اس کا تعلق ہماری آپ کی نجی زندگیوں سے ہے...... شاید مجھے یہ موضوع چھیڑنا بھی نہیں چاہیے...... لیکن صرف اس لئے یہ بات کر رہا ہوں کہ آپ ہمارے لئے ایک اچھے اور مہربان افسر رہے ہیں...... آپ نے ہماری نجی زندگی تک کے مسائل میں دلچسپی لی ہے اور ضرورت پڑنے پر ہماری مدد کی ہے...... اس لئے میں آپ کی نجی زندگی میں بھی کسی گڑبڑ کے آثار دیکھ کر خاموش نہیں رہ سکتا......“

”بھئی جو بات ہے سیدھی طرح کہہ دو۔ اتنی لمبی تمہید نہ باندھو۔ میں برا نہیں مناؤں گا۔“ آئی جی صاحب اس کی بات کاٹتے ہوئے بولے۔

”وہ...... دراصل......“ جاوید ملک بھی ہچکچا رہا تھا۔ اس نے گویا بڑی مشکل سے بات کو آگے بڑھایا۔ ”میں نے محسوس کیا کہ مسٹر ینگ آپ کی صاحبزادی کو بھی نہ جانے کس طرح کسی حد تک متاثر کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ وہ اس سے کوئی ناجائز فائدہ نہ اٹھائیں۔ میری نظر میں یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ ایک ماتحت افسر کے اخلاق اور نرم دلی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کے گھر میں نقب نہیں لگانی چاہیے۔ مسٹر ینگ کو اپنی اور آپ کی صاحبزادی کے عمر کے درمیانی فرق کا بھی خیال رکھنا چاہیے۔“

آئی جی صاحب نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور بے پروائی سے بولے۔ ”اوہ...... تم اس بات کیلئے اتنی لمبی تمہید باندھ رہے تھے؟ مجھے سب معلوم ہے۔ البتہ جب بھی ینگ سے مل کر آتی ہے مجھے اس ملاقات کی ساری تفصیل بتا دیتی ہے۔ وہ ینگ کو پسند کرتی ہے۔ اگر وہ ینگ سے شادی کرنا چاہے گی اور ینگ بھی اس کے لئے تیار ہوگا تو میں اس شادی کے راستے میں رکاوٹ نہیں بنوں گا۔ عمروں کے فرق کو میں زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ البتہ بہت سمجھدار لڑکی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ کوئی ایسی حرکت یا کوئی ایسا فیصلہ نہیں کرے گی جو میرے یا اس کے لئے شرمندگی کا

باعث ہو۔ مجھے اپنی بیٹی پر بھروسا ہے اور میں نے اسے اپنی زندگی کے بارے میں تمام فیصلے کرنے کی آزادی دی ہوئی ہے۔"

جاوید ملک نے پوری کوشش کی کہ آئی جی صاحب کے جواب سے اسے جو مایوسی ہوئی تھی وہ اس کے چہرے سے نہ جھلکنے پائے۔ مزید چند منٹ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد اس نے اجازت چاہی۔ تب آئی جی صاحب نے ہاتھ اٹھا کر اسے رکنے کا اشارہ کیا اور قطعی غیر متوقع طور پر بولے۔ "چنبیلی والے معاملے پر البتہ میں نظر ثانی کرنے کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ میرا خیال ہے ہمیں واقعی اس عورت کو حراست میں لے لینا چاہیے۔ اس سے کچھ نہ کچھ معلومات ضرور ملیں گی۔"

جاوید کی آنکھوں میں امید کی چمک پیدا ہوئی اور وہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔ وہ جب بولا تو اس کے لہجے میں دبا دبا سا جوش تھا۔ "سر! یہ بھی ممکن ہے کہ اس کی گرفتاری کے بعد سلطانہ کوئی ایسی حرکت کرے کہ ہماری گرفت میں آجائے۔"

آئی جی صاحب نے کچھ سوچتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا اور ہنکارا بھرتے ہوئے بولے۔ "چنبیلی کا مکان کس تھانے کی حدود میں آتا ہے؟"

جاوید نے مراد آباد کے متعلقہ تھانے کا نام بتا دیا اور ساتھ ہی کہا۔ "میں خود جا کر ایس ایچ او کو چنبیلی کی گرفتاری کا حکم دیتا ہوں...... بلکہ ایسا کرتا ہوں...... میں یہ گرفتاری خود اپنی نگرانی میں کراتا ہوں۔"

"نہیں...... تم اس معاملے سے لاتعلق رہو......" آئی جی صاحب نے مشورہ دینے کے انداز میں کہا۔ "اگر اس معاملے میں تمہارا نام آیا تو ینگ ضرور یہی سمجھے گا کہ تم نے اس سے بالا ہی بالا کارروائیاں شروع کر دی ہیں۔ میں اس معاملے کو خود ہی دیکھتا ہوں اور متعلقہ تھانے کو اپنی طرف سے حکم جاری کرتا ہوں تاکہ تم پر آنچ نہ آئے۔"

جاوید نے اثبات میں سر ہلایا اور اجازت لے کر کمرے سے نکل آیا۔ اب وہ کسی حد تک خوش تھا۔ کم از کم ایک کام تو اسکی مرضی کے مطابق ہو رہا تھا۔ اس کا ضمیر مطمئن تھا۔ وہ اپنی دانست میں کسی سے حسد میں مبتلا تھا اور نہ ہی کسی سازش کا تانا بانا تیار کر رہا تھا۔ وہ اپنی سمجھ بوجھ اور عقل کے مطابق جس راستے کو صحیح سمجھتا تھا وہی اختیار کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پولیس کو جو مہم درپیش تھی۔ اس کے سلسلے میں جو طریقہ اس کے خیال میں ٹھیک تھا وہ اسے اختیار کرنے کی کوشش کر رہا

تھا۔ اس کے دل میں یہ خیال بھی پختہ ہو چکا تھا کہ ینگ پولیس کی ملازمت کے لئے موزوں آدمی نہیں تھا لیکن نہ جانے کس طرح اس محکمے میں آ گیا تھا۔



ینگ اس وقت نجیب آباد جم خانہ کلب میں کھانا کھا رہا تھا جب اسے اتفاقاً پتا چلا کہ چنبیلی کو گرفتار کر لیا گیا تھا اور اسے مراد آباد کے ایک نواحی تھانے میں رکھا گیا تھا۔ ایک پولیس آفیسر کی حیثیت سے اس کے لئے یہ کوئی خاص خبر نہیں ہونی چاہئے تھی لیکن نہ جانے کیوں اسے سن کر اس کا دل بیٹھ سا گیا۔ اس کی کوئی حس جیسے اسے خبردار کر رہی تھی کہ یہ بہت برا ہوا ہے۔ اس نے کھانا وہیں چھوڑا اور جم خانہ کلب کے دفتر میں آ کر آئی جی صاحب کو فون کیا۔ وہ پہلے تو اس خبر کی تصدیق کرنا چاہتا تھا اور پھر یہ جاننا چاہتا تھا کہ ایسا کس کے حکم سے ہوا تھا۔ وہ تو یہی سمجھ رہا تھا کہ سلطانہ ڈاکو کے سلسلے میں کوئی بھی قدم اس کی مرضی کے بغیر نہیں اٹھایا جا سکتا، وہ مکمل اختیارات کے ساتھ اس کیس کا انچارج ہے لیکن اب اچانک اتنا بڑا قدم اٹھا لیا گیا تھا اور اس سے کسی نے پوچھا تک نہیں تھا۔

فون پر اسے پتا چلا کہ آئی جی صاحب گھر پر نہیں تھے۔ وہ الزبتھ کے ساتھ کسی تقریب میں گئے ہوئے تھے۔ ینگ کچھ دیر جم خانہ کلب کے آفس میں ہی سوچوں میں گم بیٹھا رہا۔ پھر اس نے حرکت میں آنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے باہر آ کر پارکنگ کا رخ کیا اور اپنی جیپ میں بیٹھ کر مراد آباد کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس نے سیدھے متعلقہ تھانے میں ہی جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ چنبیلی کی گرفتاری کی خبر کتنی پرانی تھی۔ وہ ہندوستانی پولیس کے طور طریقوں اور ہتھکنڈوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ اسے یقین تھا کہ چنبیلی کو پولیس کی حراست میں جتنی زیادہ دیر ہو چکی ہوگی اس کے حق میں اتنا ہی برا ہوا ہوگا۔

وہ جب متعلقہ تھانے میں پہنچا تو اس کے اندیشے درست ثابت ہوئے۔ وہ اس وقت سادہ لباس میں تھا لیکن یہ اہم بات نہیں تھی کیونکہ تھانے کا عملہ اسے اچھی طرح پہچانتا تھا۔ اس کا عہدہ بھی معمولی نہیں تھا۔ اس کے علاوہ وہ انگریز بھی تھا۔ اس بات کی اپنی جگہ ایک اہمیت تھی لیکن اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ تھانے کا عملہ اسے کوئی خاص پروٹوکول نہیں دے رہا تھا۔ پہلے تو بیرونی کمرے میں بیٹھا ہوا محرر ہی اس کے ساتھ خاصی رکھائی کے ساتھ پیش آیا۔ اس نے اٹھ کر اسے سیلوٹ نہیں کیا اور کرسی پیش کرنے کی زحمت بھی نہیں کی۔ بس، بیٹھے بیٹھے ہی ہاتھ کے

اشارے سے سلام کردیا۔

"مجھے پتا چلا ہے کہ چنبیلی کو حراست میں لے لیا گیا ہے؟" ینگ نے تصدیق چاہی۔

"جی ہاں۔" محرر نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

"کس کے حکم سے؟" ینگ نے میز پر ذرا جھک کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے پوچھا۔ وہ بدستور کھڑا تھا۔

"آئی جی صاحب کے حکم سے۔" محرر نے نظر چُراتے ہوئے جواب دیا۔

ینگ گہری سانس لے کر رہ گیا۔ چنبیلی کی گرفتاری کی نہ صرف تصدیق ہوگئی تھی بلکہ ینگ کو یہ بھی معلوم ہوگیا تھا کہ تھانے کا عملہ اس سلسلے میں رُکھائی کا مظاہرہ کیوں کررہا تھا۔ وہ لوگ براہ راست آئی جی صاحب سے احکام ملنے کی وجہ سے اونچی ہواؤں میں اُڑ رہے تھے۔

"اسے کہاں رکھا گیا ہے؟" ینگ نے اپنے لہجے کو پُرسکون رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ وہ حوالات میں جھانک چکا تھا۔ چنبیلی اسے وہاں نظر نہیں آئی تھی۔ وہاں صرف چار پانچ آدمی موجود تھے جو شکلوں سے ہی عادی اور پیشہ ور مجرم دکھائی دے رہے تھے۔

محرر ایک لمحے خاموش رہا۔ وہ جواب دیتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔ شاید وہ جواب دینا ہی نہیں چاہ رہا تھا لیکن ینگ پلکیں جھپکائے بغیر ایک ٹک اسے کچھ اس طرح گھور رہا تھا کہ اسے جواب دیتے ہی بن پڑی۔ "سر...... وہ اس وقت پچھلے کمرے میں ہے......" پھر اس نے گویا ینگ کو خبردار کیا۔ "ایس ایچ او صاحب بھی وہیں ہیں......"

ینگ نے اس سے مزید کوئی بات نہیں کی۔ وہ تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ اس نے یہ تھانہ پوری طرح دیکھا ہوا نہیں تھا لیکن اسے اچھی طرح اندازہ تھا کہ "پچھلا کمرا" کس طرف ہوگا۔ ہر تھانے میں ایک ایسا کمرا ضرور ہوتا تھا جو پچھلا کمرا کہلاتا تھا لیکن ضروری نہیں تھا کہ وہ پچھلی طرف ہی ہوتا۔ وہ درحقیقت ٹارچر سیل ہوتا تھا اور کسی الگ تھلگ سی جگہ پر ہوتا تھا۔ وہ صرف بعض حوالاتیوں پر تشدد کے کام آتا تھا۔

ینگ اندازاً ہی سیدھا اس کمرے تک جا پہنچا۔ راستے میں ایک اے ایس آئی نے جھجکتے ہوئے اسے روکنے کی کوشش کی لیکن ینگ نے قہر آلود نظروں سے اسے گھورتے ہوئے ایک طرف دھکیل دیا۔ اس نے لات مار کر اس کمرے کا دروازہ کھولا۔ اسے کمرے میں جو منظر دیکھنے کو ملا اس کے ذہن کے کسی گوشے میں کچھ اسی قسم کے منظر کی توقع تھی۔ اس کے باوجود نہ جانے

کیوں اسے دھچکا سا لگا۔

کمرے کی اونچی چھت میں ایک آہنی کنڈا نصب تھا جس میں موٹی رسی لٹکی ہوئی تھی۔ اس رسی سے چنبیلی کے دونوں پاؤں باندھ کر اسے الٹا لٹکایا گیا تھا۔ لباس کے نام پر اس کے جسم پر صرف چند دھجیاں تھیں۔ اس لئے اس کے سیمیں بدن پر پڑے ہوئے کئی نیل بھی صاف نظر آرہے تھے۔ اس کے ہاتھ اس کی پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ اُلٹی لٹکی ہونے کی وجہ سے وہ ہاتھوں کو اس جگہ رکھنے میں بہ مشکل کامیاب ہو پا رہی تھی جہاں انہیں ہونا چاہیے تھا۔

اس کے جسم کا سارا خون سمٹ کر گویا اس کے چہرے اور سر میں آکر جمع ہورہا تھا جس کی وجہ سے اس کی گردن تک کی نسیں پھولی ہوئی تھیں۔ وہ نہ جانے کب سے اس حالت میں لٹکی ہوئی تھی اور تقریباً بے ہوش نظر آرہی تھی لیکن جب ینگ نے لات مار کر دروازہ کھولا تو اس نے گویا بہ مشکل آنکھیں ذرا سی کھول کر دروازے کی طرف دیکھا۔ ان اَدھ کھلی آنکھوں میں ایک ایسی اذیت، بے چارگی اور نفرت تھی کہ ینگ کے جسم میں جھرجھری سی آگئی۔

دوسرے ہی لمحے اس نے دوبارہ آنکھیں بند کرکے سانپ کی طرح اپنے جسم کو دہرا کرتے ہوئے اپنے سر کو کچھ اوپر اٹھانے کی کوشش کی۔ وہ بہرحال ایک رقاصہ تھی۔ اس کے جسم میں بلا کی لچک تھی لیکن اس وقت اس کی جو حالت تھی اس میں جمناسٹک کے کرتب کی طرح اس کا اپنے جسم کو یوں دہرا کرنا حیرت انگیز تھا۔ یقیناً سر اور چہرے میں خون جمع ہونے کی اذیت ناقابل برداشت ہوچکی تھی۔ دوسرے ہی لمحے وہ ایک بار پھر پہلے کی طرح الٹی جھولنے لگی۔ ایک سیاہ فام اور لحیم سا آدمی ایک موٹا سا بید لئے اس کے قریب کھڑا تھا۔ اس کے جسم پر قمیض کے بجائے صرف کھدر کی واسکٹ تھی جس کے بٹن کھلے ہوئے تھے۔ اس کی ڈھیلی ڈھالی شلوار پر عنابی سے چند دھبے بھی دکھائی دے رہے تھے جو غالباً خون کے تھے۔ وہ شخص اپنے حلیے، شکل وصورت اور ڈیل ڈول سے پورا جلاد معلوم ہورہا تھا۔

ینگ کے آنے سے پہلے وہ یقیناً چنبیلی کے جسم پر بید رسید کررہا تھا۔ چنبیلی کی چیخوں کا گلا گھونٹنے کے لئے اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا گیا تھا۔ ایس ایچ او قریب ہی ایک کرسی پر ٹانگیں چوڑی کئے بیٹھا اپنی موٹی موٹی مونچھوں کو بل دے رہا تھا۔ اس کے تاثرات بتارہے تھے کہ وہ اس ساری صورتحال سے بہت لطف اندوز ہورہا تھا......

✦

ینگ اس ایس ایچ او کو نہیں پہچانتا تھا لیکن وہ شاید ینگ کو پہچانتا تھا اس لئے اس دیکھ کر ڈھیلے ڈھالے سے انداز میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے ینگ کو سلیوٹ بھی کیا لیکن اپنے انداز سے پوری طرح ظاہر کر دیا کہ احترام کا یہ مظاہرہ وہ بادل ناخواستہ اور مجبوراً کر رہا تھا۔

''تم اس تھانے کے ایس ایچ او ہو؟'' ینگ نے تصدیق چاہی۔ اس کے کندھے پر لگی ہوئی دھات کی وہ نشانیاں جنہیں عام زبان میں ''پھول'' کہا جاتا تھا، اسے عہدے کے لحاظ سے انسپکٹر ظاہر کر رہی تھیں۔

''جی ...... سر!'' اس نے بظاہر مؤدبانہ لہجے میں جواب دیا لیکن اس کے چہرے پر دبے دبے سے تمسخرانہ تاثرات تھے۔

''نام کیا ہے تمہارا؟'' ینگ نے پلکیں جھپکائے بغیر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ اس کا لہجہ بظاہر پرسکون تھا لیکن اس کی تہہ میں چھپے ہوئے غیظ وغضب کو شاید ایس ایچ او محسوس کر سکتا تھا۔

''بھوپندر سنگھ۔'' اس نے پگڑی درست کرتے ہوئے اور اپنے لہجے کو باوقار بنانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''یہ تم اس عورت کیساتھ کیا کر رہے ہو بھوپندر سنگھ؟'' ینگ نے گویا الفاظ چباتے ہوئے کہا۔

''ہم تفتیش کر رہے ہیں سر......'' آپ سے زیادہ کون جانتا ہوگا، یہ سلطانہ ڈاکو کی سب سے قریبی ساتھی ہے۔'' بھوپندر سنگھ تیکھے لہجے میں بولا۔

''اگر تم اسے تفتیش کہتے ہو تو پھر وحشیانہ تشدد...... اذیت رسانی یا غیر انسانی سلوک کسے کہتے ہو؟'' ینگ نے ایک لمحے کے لئے دانت پر دانت جمانے کے بعد پوچھا۔ وہ انگریزی میں

بات کر رہا تھا۔

''سر...... مجھے اتنی گاڑی انگریزی تو کیا...... ڈھنگ کی اردو بھی نہیں آتی۔ مجھ سے آسان سی باتیں پوچھیں۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

''میں تم سے ایک بہت آسان سی بات کرتا ہوں...... بلکہ یوں کہو، تمہیں ایک آسان سا کام بتاتا ہوں...... تم فوراً اس عورت کی بندشیں کھولو اور اسے نیچے اتارو۔'' ینگ کا لہجہ گو کہ اب بھی پرسکون تھا لیکن اس کے لئے اپنا غصہ ضبط کرنا مشکل ہو رہا تھا۔

''سر...... آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟'' بھوپندر سنگھ کو گویا اس کی فرمائش پر حیرت ہوئی۔ ''ابھی تو تفتیش شروع ہی ہوئی ہے۔ ابھی تو پوری رات پڑی ہے اور مجھ سمیت اس تھانے میں نو دس آدمی ہیں۔ اب یہ ہمارے ہتھے چڑھی ہے تو ہم سب کو بھی اپنے اپنے دل کے ارمان نکالنے ہیں لیکن ہم چاہتے ہیں جب ہم اس کے پاس جائیں تو اس کی حالت ایسی ہو کہ ذرا سا چھونے سے بھی اس کی چیخیں نکل جائیں۔ یہ طریقہ زیادہ اچھا رہتا ہے۔ اگر اس نے اس سے پہلے زبان نہیں کھولی ہوگی تو اسوقت ضرور کھول دے گی۔''

پھر اس نے بظاہر بڑی سادگی اور معصومیت سے سوال کیا۔ ''سر...... آپ نے کبھی اس قسم کی عورت سے تفتیش کرتے وقت یہ طریقہ آزما کر دیکھا ہے؟''

بھوپندر سنگھ کے شاید وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ اسے اس سوال کا کیا جواب ملے گا۔ دوسرے ہی لمحے اس کے منہ پر اتنے زور کا تھپڑ پڑا کہ اس بڑے سے کمرے میں اس کی آواز گونج کر رہ گئی جو عقوبت خانے کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ اس کمرے کے در و دیوار اور فرش پر نہ جانے کتنے بے گناہوں کے لہو کے چھینٹے موجود رہے ہوں جن کے داغ صاف کر دیئے گئے ہوں گے۔ بہیمانہ تشدد کے دوران یہاں نہ جانے کتنی دردناک چیخوں کا گلا گھونٹا گیا ہوگا۔

بھوپندر سنگھ ایک تنومند آدمی تھا۔ وہ ینگ کے مقابلے میں جوان اور زیادہ بھاری بھر کم دکھائی دیتا تھا لیکن حیرت انگیز طور پر ینگ کا تھپڑ کھا کر وہ بری طرح لڑکھڑایا اور دور جا گرا۔ وہ فوراً ہی اٹھ کر کھڑا تو ہو گیا لیکن داڑھی مونچھوں کی اوٹ سے اس کا جتنا چہرہ دکھائی دے رہا تھا وہ خجالت سے سرخ ہو گیا۔ اس کا نچلا ہونٹ پھٹ گیا اور اس سے خون کی ایک پتلی سی لکیر بہہ نکلی تھی۔ لیکن اس نے خون صاف کرنے سے پہلے پگڑی درست کی۔

''سر...... یہ آپ نے اچھا نہیں کیا......'' وہ اپنے ہونٹ اور داڑھی پر الٹا ہاتھ پھیرتے

ہوئے بولا۔" آپ کو شاید معلوم نہیں ہے کہ ہم نے آئی جی صاحب کے حکم پر اس عورت کو اٹھایا ہے......"

"گدھے...... یہ معلوم ہونے کے بعد ہی تو میں یہاں آیا ہوں......" ینگ اس کی بات کاٹتے ہوئے اب یکدم گرج کر بولا۔ اس کا انداز اب بالکل بدل گیا تھا۔ وہ اب ٹھنڈے مزاج کا ایک مرنجاں مرنج قسم کا آدمی ہرگز دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اسکا چہرہ تمتما رہا تھا اور وہ شعلہ بار نظروں سے بھوپندر سنگھ کو دیکھ رہا تھا۔ بھوپندر کی آنکھوں میں اس کے لئے کینہ تھا۔

ینگ کے بدلے ہوئے انداز سے وہ جلاد نما شخص بھی ذرا سہم گیا تھا جو شاید وہاں ملزموں پر تشدد کرنے کے لئے مستقل طور پر مامور تھا۔ اس نے آہستگی سے اپنا موٹا بید پیچھے چھپا لیا تھا۔ بھوپندر سنگھ کا خجالت سے اس لئے بھی برا حال تھا کہ جلاد نما شخص کے علاوہ دو اے ایس آئی بھی اس دوران کمرے میں دروازے کے قریب آن کھڑے ہوئے تھے اور دو کانسٹیبلوں کے علاوہ اردلی بھی باہر سے کمرے میں جھانک رہا تھا۔

ایک لمحے کے توقف کے بعد جب ینگ بولا تو اس کے لہجے میں پہلی سی گھن گرج نہیں تھی لیکن اس کا انداز اب بھی بارعب تھا۔ وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔" آتے وقت میری آئی جی سے بات نہیں ہو سکی ورنہ میں چنبیلی کی رہائی کا حکم نامہ ساتھ ہی لے کر آتا۔ بہرحال ...... میں تمہاری آئی جی صاحب سے ہی نہیں کمشنر صاحب سے بھی بات کرا دوں گا۔ آئی جی صاحب نے نہ جانے کس کی باتوں میں آکر یہ حکم جاری کر دیا۔ میں جب انہیں ساری بات سمجھاؤں گا تو انہیں ضرور احساس ہو جائے گا کہ ان سے حماقت سرزد ہوئی ہے لیکن اس سے پہلے تم یہ بتاؤ کہ کیا آئی جی صاحب نے تمہیں یہ سب کچھ کرنے کا حکم دیا تھا جو تم کر رہے ہو؟ اور وہ جو تم اپنے آپ سمیت نو دس آدمیوں کا جو پروگرام بنائے بیٹھے ہو کیا اس کی بھی تمہیں آئی جی صاحب نے ہدایت کی تھی؟ میں انہیں جب تمہاری اس شاندار "تفتیش" کی تفصیلات بتاؤں گا تو تم ان کے سوالات کے جوابات دے سکو گے؟"

بھوپندر سنگھ کے چہرے پر ہلکی سی تشویش کے آثار نمودار ہوئے لیکن آدمی ڈھیٹ معلوم ہوتا تھا۔ بظاہر اپنی اکڑ اور بے پروائی قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔" سر...... اس قسم کے لوگوں کے ساتھ تفتیش کے یہی طریقے کارآمد ثابت ہوتے ہیں۔ آپ کیا سمجھتے ہیں کہ میں اس عورت کو عزت سے میز کرسی پر بٹھا کر چائے پانی پیش کر کے محبت سے سوالات کروں گا تو یہ سب

کچھ بتا دے گی؟"

"اچھا...... تم اپنی بکواس بند کرو اور اس عورت کو نیچے اتار کر اس کی رسیاں کھولو...... ورنہ ہو سکتا ہے کل تمہارے جسم پر یہ وردی نہ ہو۔" ینگ نے کچھ ایسے لہجے میں کہا کہ بھوپندر سنگھ کو مزید مزاحمت اور انکار کی جرأت نہ ہو سکی۔ ایک لمحے کی ہچکچاہٹ کے بعد اس نے جلاد نما شخص کو اشارہ کر دیا۔ چنبیلی جس رسی کے ذریعے الٹی لٹکی ہوئی تھی وہ چھت میں نصب ایک آہنی کنڈے سے گزر رہی تھی۔ اس کا دوسرا سرا ایک چھوٹی سی کھڑکی میں لگی ہوئی آہنی سلاخوں سے بندھا ہوا تھا۔

جلاد نما شخص نے چپکے سے اپنا بید ایک طرف رکھا اور رسی کا سرا کھڑکی میں سے کھول کر اسے مضبوطی سے پکڑا اور دھیرے دھیرے چنبیلی کو فرش پر اتارا۔ وہ نیم بے ہوش تھی، وہیں ڈھیر ہو گئی اور گہرے گہرے سانس لینے لگی۔ ایک لمحے کے لئے اس نے نیم وا آنکھوں سے ینگ کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں اس ایک لمحے میں جتنی شکرگزاری نظر آئی اسے شاید ہزاروں الفاظ میں بھی بیان نہیں کیا جا سکتا تھا۔

جلاد نما شخص اس کی بندشیں کھول چکا تو ینگ نے بارعب لہجے میں کہا۔" اسے کرسی پر بٹھا کر پانی پلاؤ اور اس کے سر پر ٹھنڈا پانی بھی ڈالو......"

ایک اے ایس آئی اس حکم پر عملدرآمد کے لئے دوڑا۔ ینگ نے گہری سانس لے کر کمرے کا جائزہ لیا۔ وہاں ایک کونے میں بہت سی ایسی چیزوں کا ڈھیر تھا جو یقیناً اذیت رسانی کے لئے استعمال کی جاتی تھیں۔ اس نے ان چیزوں سے نظر ہٹا کر ایک بار پھر قہرآلود نظروں سے بھوپندر سنگھ کی طرف دیکھا۔ اب وہ کچھ پریشان اور وحشت زدہ نظر آ رہا تھا۔ اس کے تاثرات کچھ اس شخص جیسے تھے جو بڑے اعتماد سے کوئی چال چلنے لگا ہو لیکن اچانک اسے احساس ہوا ہو کہ وہ چال تو الٹا اس کے گلے پڑنے والی ہے۔

"تم اتنے بڑے گدھے ہو......" ینگ نے ایک بار پھر اسے پھٹکارنے والے انداز میں کہا۔

"کہ تم نے چنبیلی کو گھر سے اٹھایا اور اس پر انسانیت سوز تشدد بھی شروع کر دیا لیکن تم نے اس تھانے کی حفاظت کے لئے کوئی بندوبست نہیں کیا۔ یہ تھانہ ایک الگ تھلگ سی جگہ پر ہے اور تم بتا رہے تھے کہ یہاں بھی تک سمیت نو دس آدمی ہیں...... اور وہ سب بھی اسی طرح کے خباثت

بھرے کاموں میں ہی مصروف ہوں گے......تم نے کوئی اضافی نفری بھی نہیں منگوائی اور اسے تھانے کی حفاظت کے لئے تعینات نہیں کیا۔"

"حفاظت کا بندوبست...... اضافی نفری...... وہ کس لئے......؟ بھوپندر سنگھ یہ پوچھتے وقت بالکل ہونق نظر آنے لگا تھا۔

ینگ نے ترحم آمیز سی نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔"تمہیں تو شاید یہ بھی معلوم نہیں کہ سلطانہ کا جاسوسی اور مخبری کا نظام پولیس کے جاسوسی اور مخبری کے نظام سے بہت بہتر ہے۔اسے جونہی پتا چلے گا کہ چنبیلی کو گرفتار کر کے اس تھانے میں لایا گیا ہے اور اس کے ساتھ یہ سلوک کیا جا رہا ہے تو وہ کسی بھی خطرے کی پروا کئے بغیر آندھی اور طوفان کی طرح یہاں آئے گا اور اس تھانے کی اینٹ سے اینٹ بجا دے گا۔تم لوگوں میں سے شاید کوئی بھی زندہ نہ بچے۔"

تھانیدار بھوپندر سنگھ کا ذہن اس نکتے کی طرف واقعی نہیں گیا تھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں لیکن وہ شاید ینگ کے سامنے اپنے خوف کا اظہار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ہونٹوں پر زبان پھیر کر پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔"خیر......اب اگر اس نے ایسی بے وقوفی کر بھی لی تو ہمارے تھانے کی نفری ہی اسے سبق سکھانے کے لئے کافی ہے۔"

ینگ یوں متاسفانہ انداز میں سر ہلا کر رہ گیا جیسے اسے یاد آ گیا ہو کہ بھینس کے آگے بین بجانا فضول تھا۔اس کی نظر ایک بار پھر چنبیلی پر جا ٹھہری جسے کرسی پر بٹھا کر پانی پلایا جا چکا تھا اور اس کے سر منہ پر پانی ڈال کر کپڑے سے پونچھ دیا گیا تھا وہ اب بھی نڈھال تھی اور اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار تھے لیکن اب وہ کم از کم حواس میں تھی۔

ینگ ایک نظر اس کی طرف دیکھ کر ایک بار پھر غصے سے بھوپندر سنگھ سے مخاطب ہوا۔

"خبیث انسان!تم نے تو اس کے لباس کی جگہ بھی چند دھجیاں ہی چھوڑی ہیں۔اس کے لئے جلدی سے کہیں سے کپڑے منگواؤ۔"

ایک اے ایس آئی بھوپندر سنگھ کے حکم کا انتظار کئے بغیر ہی اس ہدایت پر عمل کرنے کے لئے تیزی سے کہیں چلا گیا۔تب ینگ نے ایک بار پھر بھوپندر سنگھ کو مخاطب کیا۔"جب تک اس عورت کو ذرا باعزت حالت اور ہوش و حواس میں لانے کا بندوبست ہوتا ہے تب تک تم میرے ساتھ اپنے کمرے میں چلو...... میں تمہاری آئی جی صاحب اور کمشنر صاحب سے بات کراتا ہوں......"

"نہیں......نہیں......اس کی ضرورت نہیں......" ایس ایچ او ذرا گھبرا کر بولا۔"ابھی اس عورت کے خلاف باقاعدہ ایف آئی آر تو درج نہیں ہوئی ہے۔میں نے تو صرف آئی جی صاحب کے زبانی حکم پر ہی اسے اُٹھوا لیا تھا......"

"بہت کمال کے آدمی ہو تم......!" ینگ اس کی بات کاٹتے ہوئے طنزیہ لہجے میں بولا۔

"صرف زبانی حکم پر اتنا آگے چلے گئے؟"

"کیا کریں صاحب......آئی جی صاحب کا حکم ہمیں فون پر ملے یا کاغذ پر...... ہمارے لئے ایک ہی جیسا ہے۔" بھوپندر سنگھ عاجزی سے بولا۔"بہرحال......اب آپ کو ان سے یا کمشنر صاحب سے بات کرنے یا ان سے میری بات کرانے کی ضرورت نہیں......آپ صرف اتنا کریں کہ روزنامچے میں لکھ دیں کہ چنبیلی کو میں اپنی ذمہ داری پر اس تھانے سے لے جا رہا ہوں۔نیچے اپنے دستخط کر دیں......اور بس......اب مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ اس سلسلے میں مجھ سے کوئی جواب طلبی نہیں ہوگی......اور اگر کوئی ہوئی بھی تو میں جواب دہی کر لوں گا۔"

ینگ نے آہستگی سے اثبات میں سر ہلایا۔اسے بھوپندر سنگھ کے یکدم ہی سیدھا ہو جانے پر حیرت تھی۔وہ اس کے ساتھ اس کے کمرے میں آیا اور اس نے روزنامچے میں بھوپندر سنگھ کی مرضی کے مطابق چند سطریں لکھ دیں۔قلم واپس رکھنے کے بعد اس نے پوچھا۔"اب میں چنبیلی کو اپنے ساتھ لے جا سکتا ہوں؟"

"بالکل......" بھوپندر بلا تامل بولا۔"لیکن اگر آپ برا نہ مانئیں تو کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ اسے کہاں لے جائیں گے؟"

"میں اسے اس کے گھر پر چھوڑ دوں گا۔" ینگ نے جواب دیا۔

"کیا میں امید رکھوں کہ وہ اپنے گھر پر موجود رہے گی؟" بھوپندر نے محتاط لہجے میں پوچھا۔

"میں اس سے درخواست کروں گا کہ وہ اپنے گھر پر موجود رہے ......لیکن وہ میری درخواست کو ماننے کی پابند نہیں ہوگی۔تمہیں بہرحال اس کے بارے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔تم سے کوئی اس سلسلے میں کسی قسم کی پوچھ گچھ نہیں کرے گا۔اس کا میں تمہیں یقین دلاتا ہوں۔" ینگ الفاظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔

بھوپندر مطمئن نظر آنے لگا۔ینگ نے اس کی درخواست پر مزید چند منٹ وہیں بیٹھ کر

انتظار کیا، جس کے بعد دو اے ایس آئی چنبیلی کو وہیں لے آئے۔ وہ اب صحیح طور پر لباس میں تھی اور اس کی حالت کافی بہتر نظر آ رہی تھی جس کے لئے یقیناً کچھ کوششیں کی گئی تھیں۔ تاہم اس کے چہرے پر اضمحلال اور ایک عجیب سی اداسی اب بھی موجود تھی۔ ینگ نے اسے ساتھ لیا اور گاڑی میں بٹھا کر روانہ ہو گیا۔

"آپ مجھے کہاں لے جا رہے ہیں؟" اس نے کمزور سی آواز میں پوچھا۔

"تمہارے گھر۔" ینگ نے اختصار سے جواب دیا۔ تب ایک لمحے کے لئے چنبیلی کے چہرے پر حیرت نمودار ہوئی۔

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا، میں کس طرح آپ کا شکریہ ادا کروں۔" وہ بولی

"تمہیں شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں...... البتہ مجھے تم سے معذرت کرنی چاہیے کہ تمہارے ساتھ یہ سلوک ہوا۔" ینگ اس کی طرف دیکھے بغیر بولا۔

"کمال ہے صاحب جی...... آپ مجھ سے معافی مانگ رہے ہیں؟" حیرت اور بے یقینی سے چنبیلی کی آنکھیں پھیل گئیں۔ "آپ تو سچ مچ بہت ہی عجیب آدمی ہیں...... کسی اور دنیا سے آئے ہوئے لگتے ہیں؟"

پھر ایک گہری سانس لے کر وہ بولی۔ "ہمارے دیش کے ہر تھانے میں آئے دن یہی کچھ ہوتا ہے مگر ہر تھانے میں کوئی فریڈی ینگ نہیں پہنچ سکتا۔"

"یہ تم ٹھیک کہہ رہی ہو......" ینگ نے ٹھنڈی سانس لی۔ "کاش میں ہر انگریز کو اپنی طرح سوچنے پر مجبور کر سکتا...... لیکن یہ ممکن نہیں ہے۔"

چنبیلی نے پہلو بدلنے کی کوشش کی تو اس کے منہ سے ہلکی کراہ نکل گئی۔ ینگ نے فوراً پوچھا۔ "کیا میں پہلے تمہیں کسی ڈاکٹر کے پاس...... یا اسپتال لے چلوں؟"

"اس کی ضرورت نہیں صاحب جی......!" وہ گویا اپنی تکلیف ضبط کر کے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

"ہم جیسے لوگوں کے پاس بس اپنے ہی کچھ دیسی نسخے اور ٹوٹکے ہوتے ہیں۔ ہم انہی کے سہارے لوٹ پوٹ کر ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ بھگوان کا لاکھ لاکھ شکر ہے آپ جلدی پہنچ گئے...... ورنہ پتا نہیں میرا کیا حشر ہوتا۔"

"حشر تو خیر یہ سب کچھ کرنے والوں کا بھی اچھا نہیں ہوگا......" ینگ نے گہری سانس

لے کر کہا۔ "زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر انہیں اس دنیا میں ہی اپنے ہر ظلم کا حساب ضرور چکانا پڑے گا۔"

"پتا نہیں......" چنبیلی نے دھیمے اور قدرے مایوس سے لہجے میں کہا اور سیٹ کے پشتے سے ٹیک لگا لی۔



فریڈی ینگ اس وقت اپنے چند خاص ماتحتوں کے ساتھ میٹنگ میں مصروف تھا۔ جاوید ملک بھی وہاں موجود تھا۔ ینگ کو معلوم ہو چکا تھا کہ آئی جی صاحب نے جاوید ملک کے مشورے پر چنبیلی کی گرفتاری کا زبانی حکم دیا تھا۔ تاہم ینگ نے جاوید ملک پر ظاہر نہیں کیا تھا کہ اسے یہ بات معلوم ہو چکی ہے۔ اس کی آئی جی اور کمشنر صاحب سے بات ہو چکی تھی اور اس نے انہیں سمجھا دیا تھا کہ وہ چنبیلی کی گرفتاری کو ایک بیکار اور خلاف مصلحت کام سمجھتا ہے، اس لئے وہ اسے تھانے سے چھڑا کر لے گیا تھا۔ آئی جی اور کمشنر صاحب نے اس کے اس اقدام کا برا نہیں منایا تھا اور کسی قسم کی ناراضگی ظاہر نہیں کی تھی لیکن جاوید ملک کو جب سے یہ بات معلوم ہوئی تھی اس کا منہ بنا ہوا تھا۔ وہ میٹنگ میں بھی گویا بادل ناخواستہ بیٹھا ہوا تھا۔

ابھی انہیں بات چیت کرتے ہوئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ فون کی گھنٹی بجی۔ ینگ نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف مراد آباد کا ایک پولیس انسپکٹر بول رہا تھا۔ وہ متوحش لہجے میں بولا۔

"سر...... وہ بری خبر آپ تک پہنچی؟"

"کون سی خبر......؟" ینگ نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

جس تھانے میں چنبیلی کو رکھا گیا تھا اس پر رات کے پچھلے پہر سلطانہ ڈاکو اور اس کے گروہ نے دھاوا بولا تھا۔ انہوں نے تھانے کے سب دروازے بند کر کے اس پر کنستروں سے پٹرول چھڑک کر آگ لگا دی اور جس نے بھی باہر نکلنے کی کوشش کی اسے گولی مار دی۔ بھوپندر سنگھ سمیت، عملے کے سارے لوگ مارے گئے۔ تھانہ راکھ اور ملبے کا ڈھیر بن گیا۔ سب لوگوں کی لاشیں بھی جل گئیں ان لوگوں کے لئے تو تھانہ جیتے جی شمشان گھاٹ بن گیا۔" انسپکٹر نے بتایا۔

ینگ ایک لمحے کے لئے سناٹے میں آ گیا۔ اسے سلطانہ کے کسی قسم کے ردعمل کا خطرہ تو تھا لیکن یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ ردعمل اتنی جلدی ظاہر ہو جائے گا۔ اس کا مطلب تھا کہ سلطانہ کا جاسوسی کا نظام شاید پولیس سے بھی زیادہ تیزی سے کام کرتا تھا۔ پورے تھانے کو بند کر کے آگ

لگانے کا مطلب یہ تھا کہ سلطانہ کو یہ اطلاع بھی مل گئی تھی کہ چنبیلی وہاں موجود نہیں تھی ورنہ وہ پہلے اسے نکالنے کی کوشش کرتا۔

"ٹھیک ہے...... میں مراد آباد پہنچ رہا ہوں۔" ایک لمحے کی خاموشی کے بعد ینگ نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

اس نے خاص طور پر جاوید کی طرف رخ کر کے یہ خبر سنائی۔ وہ گویا اسے احساس دلانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اگر اس نے چنبیلی کے بارے میں آئی جی صاحب کو غلط مشورہ نہ دیا ہوتا تو اتنا بڑا سانحہ رونما نہ ہوتا۔ جاوید نے کوئی خاص ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ وہ صرف کندھے اچکا کر رہ گیا۔ اسے گویا اپنے عمل پر کوئی پچھتاوا نہیں تھا۔

وہ لوگ مختلف گاڑیوں میں بیٹھ کر مراد آباد پہنچے۔ جائے وقوعہ پر پہنچ کر انہوں نے جب تھانے کا معائنہ کیا تو ینگ کو ایسا لگا جیسے اس کی تباہی اور آتشزدگی ڈاکوؤں کے محض ایک گروہ کے ہاتھوں عمل میں نہیں آئی تھی بلکہ یہ کسی چھوٹی موٹی فوج کی وحشیانہ کارروائی کا نتیجہ تھا۔ تھانے کی اینٹ سے اینٹ بج گئی تھی اور ہر وہ چیز جل گئی تھی جو جل سکتی تھی۔ عملے کی لاشیں جل کر کوئلہ ہو گئی تھیں۔ کوئی لاش پہچانی نہیں جا رہی تھی۔ فضا میں ابھی تک جلتے ہوئے گوشت کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ مقامی پولیس ضابطے کی کارروائی میں مصروف تھی۔ آئی جی اور کمشنر صاحب کو واقعے کی اطلاع دی جا چکی تھی لیکن وہ جائے وقوعہ پر نہیں آئے تھے۔

چنبیلی کا مکان وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ ینگ کو کچھ خیال آیا اور وہ اکیلا اس طرف روانہ ہو گیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے گاڑی میں بیٹھے بیٹھے کچھ دور سے ہی دیکھ لیا کہ چنبیلی کے گھر کے دروازے پر بڑا سا تالا لٹکا ہوا تھا۔ اس کے باوجود وہ گھر تک گیا۔ اس نے چاروں طرف گھوم پھر کر مکان کا جائزہ لیا۔ کھڑکیوں سے بھی جھانکنے کی کوشش کی لیکن وہ مضبوطی سے بند تھیں۔ اس نے مقفل دروازے پر دستک بھی دی اور زور زور سے آوازیں دے کر بھی پوچھا کہ گھر میں کوئی ہے یا نہیں؟ لیکن اسے کوئی جواب نہیں ملا۔ مکان کے اندر اور اس کے اردگرد ایسا سکوت پھیلا ہوا تھا جیسے وہاں عرصے سے کوئی نہ رہا ہو۔ ینگ کو پہلے ہی اندیشہ تھا کہ اسے چنبیلی کے مکان پر پہنچ کر یہی کچھ دیکھنے کو ملے گا۔

آخر کار اس نے قدرے مایوس سے انداز میں گہری سانس لی اور اپنی گاڑی میں بیٹھ کر واپس روانہ ہو گیا۔

✦......✦......✦

سلطانہ کے ڈیرے پر اس کے تمام ساتھی بڑے کمرے میں جمع تھے۔ سلطانہ کے تخت پر آج اس کے برابر ڈھیلے ڈھالے کپڑوں میں ملبوس ایک نوجوان بھی بیٹھا تھا جس کے سر پر سرمئی رنگ کی پگڑی تھی۔ اس کے چہرے پر آنکھوں کے نیچے نیل نظر آرہے تھے۔ اس کے ٹخنوں پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ سلطانہ کے سب ساتھی متجسس سی نظروں سے اس اجنبی نوجوان کی طرف دیکھ رہے تھے اور منتظر تھے کہ سلطانہ اس کے بارے میں کچھ بتائے۔ اس کا خیال یہی تھا کہ شاید وہ گروہ میں شامل ہونے کا خواہشمند کوئی نوجوان تھا لیکن جس طرح سلطانہ نے خاص احترام سے اسے اپنے برابر تخت پر بٹھا رکھا تھا اس پر انہیں حیرت تھی۔

"میں نے اسی کے بارے میں بات کرنے کے لئے تم لوگوں کو یہاں بلایا ہے......" سلطانہ نے ان کے متجسس چہروں کا جائزہ لیتے ہوئے اور نوجوان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ ہمارے گروہ میں شامل ہونا چاہتا ہے لیکن اس کے لئے مجھے تم سب کی اجازت اور منظوری کی ضرورت ہے۔ اگر تم سب لوگ اجازت دو گے تبھی میں اسے گروہ میں شامل کروں گا ورنہ مجھے اسکا کوئی اور بندوبست کرنا پڑے گا۔"

"لیکن آج سے پہلے تو تم نے کسی کو گروہ میں شامل کرتے وقت ہم سے اجازت نہیں لی......" بھورے حیرت سے بولا۔ "یہ فیصلہ تو تم خود ہی کرتے ہو۔"

"ہاں...... تم ٹھیک کہہ رہے ہو......" سلطانہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ "لیکن یہ معاملہ ذرا الگ ہے کیونکہ یہ نوجوان دراصل چنبیلی ہے۔"

سلطانہ کے سب ساتھیوں کے منہ سے کوئی نہ کوئی حیرت بھری آواز نکلی۔ پھر بھورے بولا۔

"میں بھی سوچ رہا تھا کہ یہ کیسا نوجوان ہے...... اس کے تو داڑھی مونچھ بالکل ہی نہیں ہے...... بالکل ہی صفاچٹ ہے...... اور اس کی شکل بھی کچھ جانی پہچانی سی لگ رہی تھی لیکن شاید مردانہ حلیے کی وجہ سے ہم اسے پہچان نہیں پا رہے تھے۔"

"ویسے بھی ہم نے اسے کافی عرصہ پہلے صرف ایک بار ہی دیکھا تھا۔" پریتم سنبھل کر بولا۔

"پچھلے دنوں جو واقعات پیش آئے ہیں وہ سب تم لوگوں کو معلوم ہیں...... سلطانہ اصل موضوع پر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "چنبیلی اپنے مکان میں رہنا نہیں چاہتی اور اس کے

دل میں پولیس اور اس سماج کے خلاف سخت نفرت بھی پیدا ہو چکی ہے۔ اس کی خواہش ہے کہ یہ اب ہمیشہ کے لئے میرے ساتھ ہی رہے اور ایک ڈاکو کے طور پر زندگی گزارے۔ اس کے لئے یہ مردانہ روپ دھار کر رہے گی اور میرے سوا باقی سب لوگ اسے مرد ہی سمجھیں گے اور اسی طرح پیش آئیں گے جس طرح ہم سب ایک دوسرے کے ساتھ پیش آتے ہیں۔ یہ اسلحہ استعمال کرنا اور باقی سب کام بھی چند دن کے اندر اندر سیکھ لے گی۔ اس کا وعدہ ہے کہ یہ کسی بھی معاملے میں ہم سے پیچھے نہیں رہے گی۔''

سب لوگ خاموش رہے۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد سلطانہ بولا۔ ''اس کا یہ بھی کہنا ہے کہ یہ کبھی ہمارے لئے پریشانی کا کارن نہیں بنے گی...... لیکن میں اس لئے تم لوگوں کی اجازت کے بغیر اسے یہاں رہنے کی اجازت نہیں دے سکتا کیونکہ میں نے اب تک تم میں سے کسی کو بھی اپنی بیوی یا کسی اور عورت کو یہاں رکھنے کی اجازت نہیں دی تھی...... لیکن اب میں...... یا شاید چنبیلی...... یا پھر ہم دونوں ہی ایک ایسی مشکل میں پھنس گئے ہیں کہ ہمیں تمہاری اجازت کی ضرورت آن پڑی ہے۔ اجازت مل گئی تو میں تم سب کا احسان مانوں گا۔ اجازت نہیں دو گے تو کسی سے کوئی شکوہ نہیں کروں گا۔''

کمرے میں گہری خاموشی چھا گئی۔ چنبیلی سر جھکائے بیٹھی تھی۔ بھورے نے سوالیہ نظروں سے باری باری سب کے چہروں کی طرف دیکھا۔ ان میں مشورہ اسی طرح ہوتا تھا ان کی آنکھیں ان کی دل کی بات کہہ دیتی تھیں یا پھر وہ خفیف سے اشارے کے ذریعے اپنا مقصد واضح کر دیا کرتے تھے۔ اس وقت سب نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اثبات میں جواب دے دیا تھا۔

بھورے نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور بولا۔ ''سلطانہ...... کسی ساتھی کو اس بات پر اعتراض نہیں...... اور میرے خیال میں تو یہ بہت ہی اچھا ہوگا۔ میرا دل کہہ رہا ہے کہ چنبیلی عورت ہونے کے باوجود ہمارے لئے بہت اچھی ساتھی ثابت ہوگی۔ ہمیں اس لئے بھی اس کے تمہارے ساتھ رہنے پر اعتراض نہیں کہ تم نے بھی ہمیں بہت سی آزادیاں دے رکھی ہیں۔ اب ہم میں سے کسی کو بھی عورت کی کوئی خاص کمی محسوس نہیں ہوتی۔''

سلطانہ اور چنبیلی دونوں ہی کے چہرے کھل اٹھے۔ چنبیلی نے ہاتھ جوڑ کر سب کا شکریہ ادا کیا۔ بھورے بولا۔ ''سلطانہ اگر تم اجازت دو تو میں چنبیلی کا مردانہ نام بھی رکھ دوں؟''

''ضرور...... ضرور...... سلطانہ نے مسرور لہجے میں کہا۔

''پھول سنگھ کیسا ہے؟'' بھورے مسکراتے ہوئے بولا۔ ''اس کا نام چنبیلی ہے...... یعنی یہ ابھی بھی ایک پھول ہی ہے۔ جب اس کا نام پھول سنگھ ہوگا تب بھی یہ پھول ہی رہے گی۔''

''بھئی واہ بھورے...... تمہارا جواب نہیں۔'' سلطانہ گویا اس کی بات پر جھوم اٹھا۔

''تم ہم سب سے زیادہ عقلمند ہو۔ یہ میں ہمیشہ سے کہتا آیا ہوں۔''

''لیکن تمہاری عقل کے بغیر ہم سب کی عقل کسی کام کی نہیں۔'' بھورے بولا۔

سلطانہ نے قہقہہ لگایا۔ وہ بہت خوش نظر آرہا تھا۔ کن انکھیوں سے چنبیلی کی طرف دیکھ کر بولا۔

''یوں سمجھ لو، اب میرے جتنی عقل ہمارے گروہ میں اور آگئی۔''

''یہ تو آگے چل کر ہی پتا چلے گا۔'' بھورے مسکرایا۔

''بس...... آٹھ دس دن ٹھہر جاؤ...... پھر تم اس کے کام دیکھنا۔'' سلطانہ بولا۔ اسکا لہجہ بتا رہا تھا کہ اسے چنبیلی پر کتنا فخر تھا اور اس سے کتنی امیدیں تھیں۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد سلطانہ کو جیسے اصل کام یاد آیا اور وہ پہلو بدل کر سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔ ''بھورے! اگلے ڈاکے کی کچھ تیاری کر لی یا نہیں؟ میں نے کہا تھا کہ اب ہمیں میاں پور پر دھاوا بولنا ہے۔ مخبری ہوئی ہے کہ وہاں دو چار ٹھاکروں کے پاس بڑا مال ہے اور گاؤں کا مکھیا سندر لال بھی بہت موٹی آسامی ہے۔ بہت زمین ہے اس کے پاس...... اور تھوڑے ہی دن ہوئے اسے رائے بہادر کا خطاب بھی ملا ہے۔''

''ہاں...... یعنی وہ ترقی پا کر تمہارے کتے کے برابر آگیا ہے۔'' بھورے ہنس کر بولا۔ سلطانہ نے بھی قہقہہ لگایا اور بولا۔ ''بس تو پھر جلدی سے گاؤں کے خاص خاص گھروں کا صفایا کرنے کی تیاری کرو۔''

''تھوڑے دن ٹھہر جاؤ۔ گنے کی فصل کٹ رہی ہے۔ کٹائی ختم ہو جائے گی تو ان گھروں میں اور مال آجائے گا۔ بھورے بولا۔

''بس...... تو پھر اس ڈاکے میں چنبیلی...... میرا مطلب ہے، پھول سنگھ بھی ہمارے ساتھ ہوگا۔'' سلطانہ بولا۔

''ہاں...... یہ تو پکی بات ہے۔'' بھورے نے سر ہلایا۔



دس بارہ دن بعد چنبیلی مکمل طور پر صحت یاب بھی ہو چکی تھی اور اس نے ذرا بھاری ہتھیاروں کا استعمال بھی سیکھ لیا تھا۔ پستول چلانا اور گھڑ سواری اسے پہلے ہی آتی تھی جو اس نے محض اپنے شوق کی خاطر نوعمری میں ایک رئیس زادے سے سیکھی تھی۔ اب اس نے بارہ بور کی بندوقوں اور رائفل کا استعمال بھی سیکھ لیا۔ دوڑتے گھوڑے پر بیٹھ کر چاروں طرف فائر کرنا اور اس حالت میں بھی زیادہ سے زیادہ صحیح نشانہ لگانا بہت مشکل کام تھا لیکن ''پھول سنگھ'' نے جان توڑ محنت کر کے چند دن میں اس میں بھی خوب مہارت حاصل کر لی۔ سلطانہ اسے اس کامیابی سے اپنی تربیت مکمل کرتے دیکھ کر خوشی سے پھولا نہ ساتا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ اسے اپنا جانشین بنانے کی تیاری کر رہا تھا۔

اس کی طرف سے مطمئن ہوتے ہی سلطانہ نے میان پور پر دھاوا بولنے کا فیصلہ کر لیا۔ اسے پتہ چلا تھا کہ مراد آباد کے ایک تھانے کے اس کے پورے عملے سمیت جلانے کے واقعے نے علاقے میں اسکی دہشت میں زبردست اضافہ کر دیا تھا۔ اس رات وہ پوری تیاریوں سے میان پور کی طرف روانہ ہوئے تو چنبیلی عرف پھول سنگھ سمیت سب نے خوب ٹھنڈائی بھی پی تھی اور اس کے بعد چرس کے سگریٹ بھی پیئے تھے۔ سب کے دماغ ہواؤں میں اُڑ رہے تھے۔

رات کے اندھیرے میں جب ان کے گھوڑے میان پور میں داخل ہوئے تو وہاں سناٹا پھیلا ہوا تھا لیکن چند لمحے بعد ہی یوں لگا جیسے ان کی آمد کی خبر گاؤں کے ایک سرے سے دوسرے تک پھیل گئی تھی۔ ویسے تو لوگ بدستور اپنے گھروں میں ہی دبکے ہوئے تھے لیکن اِدھر اُدھر سے نعروں کے سے انداز میں آوازیں سنائی دینے لگی تھیں۔ ''سلطانہ ڈاکو کی جے...... سلطانہ ڈاکو کی جے......''

سلطانہ کے آدمیوں نے جب کلہاڑیوں سے گاؤں کے مکھیا کی حویلی کا چوبی دروازہ توڑنا شروع کیا تو اندر سے عورتوں کی آہ و پکار کی آوازیں آنے لگیں۔ پھر دروازہ خود بخود ہی کھل گیا اور کسی نے چابیوں کا ایک گچھا ان کے سامنے پھینکتے ہوئے کانپتی آواز میں کہا۔ ''دیکھو کسی کے ساتھ ظلم نہ کرنا...... یہ سارے گھر کی چابیاں ہیں......''

سلطانہ نے دیکھا وہ موٹا سا ایک بنیا تھا جس کے جسم پر اس وقت صرف دھوتی اور بنیان تھی۔ اس کی بڑی سی توند خوف کے باعث دھیرے دھیرے تھل تھل کر رہی تھی۔ سلطانہ نے گھوڑے پر بیٹھے ہی بیٹھے اسے ایک لات رسید کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے اس گھر کی چابیاں نہیں

چاہئیں...... مال کہاں ہے؟ مجھے بس یہ بتاؤ...... سونا چاندی...... روپیا پیسا...... زیور گہنا......''

''غلہ خانہ میں...... بنیے نے ایک طرف اشارہ کیا۔

یہ کوئی تعجب کی بات نہیں تھی۔ زیادہ تر ساہوکاروں کا مال غلہ خانے میں ہی ہوتا تھا۔ سلطانہ اور گجندر سنگھ گھوڑوں سمیت اندر داخل ہو گئے۔ حویلی کا دروازہ کافی اونچا تھا اور اس کا صحن کم از کم ایک بیگھے میں پھیلا ہوا تھا۔ سلطانہ نے کچھ ساتھی دوسرے گھروں کو لوٹنے چلے گئے تھے جو انہوں نے پہلے ہی منتخب کر رکھے تھے۔ کچھ ساتھیوں نے گاؤں اور بیشتر گھروں کی باہر سے کنڈیاں لگا دی تھیں تا کہ ان کے مکین مکھیا وغیرہ کی مدد کے لئے نہ نکل آئیں۔ سلطانہ اور گجندر غلہ خانے کے دروازے پر پہنچ کر گھوڑوں سے اترے تو انہوں نے اسے اندر سے بند پایا۔ انہوں نے اس بات کو کوئی خاص اہمیت نہ دی اور یہی سمجھا کہ اندر سے بھی غلہ خانے میں آنے کا کوئی راستہ ہو گا اور کسی نے اندر کی کنڈی بند کر دی ہو گی۔

دروازہ معمولی ہی تھا۔ گجندر سنگھ نے اس پر دو لاتیں رسید کیں تو وہ ٹوٹ گیا۔ سلطانہ سے پہلے گجندر اندر داخل ہوا۔ دوسرے ہی لمحے اس تاریک کمرے میں ایک شعلہ سا لپکا، زور دار دھماکا ہوا اور گجندر اچھل کر چاروں شانے چت گر گیا۔ اس کے سینے سے بھل بھل خون ابلنے لگا۔ ایک لمحے کے لئے تو سلطانہ کی سمجھ میں ہی نہ آیا کہ ہوا کیا تھا۔ اس کا دماغ اب بھی گویا ہواؤں میں ہلکورے لے رہا تھا۔ گجندر کو ساکت دیکھ کر اسے جھٹکا سا لگا اور اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اندھیرے کمرے میں دیکھا۔ تب اسکی سمجھ میں آیا کہ وہاں ایک آدمی چھپا ہوا تھا جس نے فائر کیا۔

اگر گجندر کے بجائے سلطانہ آگے ہوتا تو یقیناً گجندر کی جگہ اس کی لاش ہوتی۔ گجندر کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں اور ساکت تھیں۔ وہ یقیناً مر چکا تھا۔ سلطانہ کے دماغ کو اگر ٹھنڈائی اور چرس کا نشہ نہ چڑھا ہوتا تو شاید اس سے پہلے ہی تاریک کمرے کا منظر صاف نظر آ جاتا کیونکہ اس نے اپنے آنجہانی دادا گلفی کے خاص نسخے والا سرمہ لگایا ہوا تھا۔ اب اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا تو اسے اندازہ ہوا اندر چھپے ہوئے آدمی نے ابھی تک دوسرا فائر کیوں نہیں کیا تھا۔

دراصل اس کے پاس توڑے دار بندوق تھی جس میں ایک ہی کارتوس ڈالا جاتا تھا۔ اب وہ کانپتے ہاتھوں سے بندوق کو دوبارہ لوڈ کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اندھیرے اور اپنی گھبراہٹ کی وجہ سے کامیاب نہیں ہو پا رہا تھا۔ سلطانہ کے دماغ میں گویا آتش فشاں پھٹ پڑا۔

اس کے حلق سے ایک عجیب غیظ آلود سی آواز نکلی جو شیر کی دھاڑ سے ملتی جلتی تھی۔ اس کے ہاتھ میں حالانکہ رائفل موجود تھی لیکن وہ اسے زمین پر پھینک کر ایک جست لگا کر اندر پہنچا۔

اس نے اس نامعلوم شخص کو بندوق سمیت ہاتھوں پر اٹھایا اور پوری طاقت سے زمین پر پٹخ دیا۔ پھر اٹھایا اور ایک دیوار کے ساتھ دے مارا۔ وہ اسے یوں اٹھا اٹھا کر پٹخ رہا تھا جیسے وہ روئی کا گڈا ہو۔ اس کی کھوپڑی ٹوٹ گئی۔ بندوق دو ٹکڑے ہوگئی۔ چوتھی بار زمین پر پٹخنے کے بعد سلطانہ نے ایک مڑے تڑے ساکت وجود کا پیچھا چھوڑا اور دروازے پر آ کر گجندر کی لاش پر سر رکھ کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

''گجندر...... تو میرا بھائی ہے...... تو مجھے چھوڑ کر کیسے جاسکتا ہے۔'' وہ اس طرح پھٹی پھٹی آواز میں بین کر رہا تھا جیسے کوئی بھیڑیا آسمان کی طرف منہ کر کے رو رہا ہو۔ اندر کمروں میں گھر کی عورتیں رو رہی تھیں مگر ان کی آوازوں پر سلطانہ کی آواز غالب تھی۔ اس کے کچھ اور ساتھی دوڑتے آئے۔ گجندر کی موت نے چند لمحوں کے لئے انہیں بھی دم بخود کر دیا۔

اچانک سلطانہ اٹھ کھڑا ہوا اور پھٹی پھٹی آواز میں چلایا۔ ''بھورے...... سب ساتھیوں سے کہو، اس گاؤں کو آگ لگا دیں...... سب سے پہلے اسی حویلی کو لگائیں......'' اس نے اس حویلی کے در و دیوار کی طرف اشارہ کیا جس میں وہ کھڑے تھے۔ ''اب یہاں سے کچھ نہیں لوٹنا ہے...... مجھے کچھ نہیں چاہیے...... اس گاؤں نے مجھ سے میرا بھائی چھین لیا ہے۔ میں اسے سزا دوں گا...... جلا کر راکھ کر دو اسے...... لوگوں کو بتا دو کہ سلطانہ کے بھائی کو مارنے والوں کا انجام کیا ہوتا ہے۔''

بھورے نے ایک لمحے کے لئے یوں اس کی طرف دیکھا جیسے اسے شک ہو کہ سلطانہ ذہنی توازن کھو بیٹھا تھا لیکن چونکہ بھورے سمیت وہ سب لوگ بے چوں چراں اس کے حکم کی تعمیل کرنے کے عادی تھے اس لئے اس نے سلطانہ کا حکم ان ساتھیوں تک بھی پہنچا دیا جو وہاں سے کچھ دور تھے۔ گجندر کی لاش کو انہوں نے وہیں چھوڑ دیا۔ ڈاکوؤں کا اصول تھا کہ ساتھی کی لاش جہاں گرتی تھی اسے وہیں چھوڑ دیتے تھے۔

وہ دیوالی کی رات تھی۔ اسی خوشی میں ان سب لوگوں نے اس رات زیادہ ٹھنڈائی اور چرس پی تھی۔ دیوالی کے موقع پر جو چراغ جلائے گئے تھے ان میں سے سینکڑوں چراغ اب بھی مکانوں کی منڈیروں، طاقچوں اور چبوتروں پر روشن تھے۔ وہی چراغ، مکانوں کو آگ لگانے کے لئے

ان کے کام آنے لگے۔ ہر جگہ ایسی بہت سی چیزیں موجود تھیں جو آسانی سے آگ پکڑ سکتی تھیں۔

دیکھتے ہی دیکھتے گاؤں میں چاروں طرف شعلے بلند ہوئے دکھائی دینے لگے۔ بہت سے چھوٹے موٹے مکانوں کی چھتوں میں نرسل یا سرکنڈا بہت زیادہ استعمال ہوا تھا۔ یہ خشک سرکنڈے جب جلتے تھے تو اچھے خاصے دھماکے بھی ہوتے تھے کیونکہ ان کے کھوکھلے حصے تپش سے پھٹتے تھے۔ پٹاخے چلنے جیسی یہ آوازیں تواتر سے آنے لگیں تو یوں لگنے لگا جیسے چاروں طرف مسلسل فائرنگ ہو رہی تھی۔ ہر طرف ایک شور برپا تھا۔ لوگ اپنا چھوٹا موٹا سامان اور بچے اٹھائے گھروں سے نکل آئے تھے اور بدحواسی میں اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔

سلطانہ اور اس کے آدمی گلیوں میں گھوڑے دوڑاتے اور گولیاں چلاتے ادھر سے اُدھر جا رہے تھے۔ سلطانہ کا حکم تھا کہ جو سامنے نظر آئے اسے گولی ماری جائے۔ ایسی وحشت اور درندگی اس پر اس سے پہلے کبھی سوار نہیں ہوئی تھی۔ بہت سے لوگ جو شعلوں کا لقمہ بننے سے بچ گئے تھے وہ ڈاکوؤں کی گولیوں کا نشانہ بن رہے تھے۔ کچھ اِدھر اُدھر کونے کھدروں یا کسی چیز کی آڑ میں چھپ کر جانیں بچانے کی کوشش کر رہے تھے۔ کچھ اس مقصد میں کامیاب ہو رہے تھے اور کچھ گولیوں کی زد میں آ رہے تھے۔ گاؤں کے لوگوں نے دیوالی منا کر تھک ہار کر سوتے وقت شاید سوچا بھی نہیں ہوگا کہ رات کے پچھلے پہر ان پر ایسی قیامت ٹوٹ پڑے گی۔

ایسا لگتا تھا کہ سلطانہ کی وحشت اس کے ساتھیوں میں بھی منتقل ہوگئی تھی۔ انہوں نے تباہی، بربادی اور ہلاکت کے دائرے کو کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ وسیع کر دیا تھا۔ ہوا کیساتھ پھیلتے کثیف دھویں اور خوفناک شعلوں کے درمیان جلتے ہوئے گوشت کی بو بھی پھیل رہی تھی۔ کچھ جگہوں پر شاید لاشیں آگ کی لپیٹ میں آگئی تھیں اور کچھ مکانوں یا کوٹھریوں میں بند ہونے کی وجہ سے شاید لوگ زندہ ہی جل گئے تھے۔ ایک چھوٹی موٹی قیامت کا سا منظر تھا۔ سلطانہ اور اس کے ساتھی موت کے ہرکاروں کی طرح اِدھر اُدھر گویا اُڑتے پھر رہے تھے۔ بعض جگہوں پر ان کے گھوڑے لاشوں یا شعلوں کو پھلانگنے کے لئے اونچی اونچی چھلانگیں لگا رہے تھے۔

آخر کار سلطانہ نے جب محسوس کیا کہ گاؤں میں پھیلنے والی تباہی کو روکنا اب کسی کے بھی بس کی بات نہیں تھی تو اس نے اپنے ساتھیوں کو واپس روانہ ہونے کا حکم دیا۔ شعلوں کی بھینٹ چڑھتے گاؤں کو پیچھے چھوڑ کر وہ لوگ واپس چل دیئے۔ اس وقت صبح کاذب کے آثار نمودار

ہور ہے تھے۔ ایک وادی نما میدان عبور کر کے وہ چڑھائی پر پہنچے تو دور نشیب میں انہیں کچھ گھڑ سوار آتے دکھائی دیئے۔ ملگجے اندھیرے میں وہ محض ہیولوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے لیکن سلطانہ کی نظران سب سے تیز تھی۔ اس نے دیکھ لیا وہ پولیس والوں کا گھڑ سوار دستہ تھا۔ شاید کسی قریبی قصبے یا پولیس چوکی تک میاں پور میں ٹوٹنے والی قیامت کی خبر پہنچ گئی تھی۔



گھوڑوں پر سوار آٹھ دس پولیس والے تیزی سے آگے آرہے تھے لیکن سلطانہ نے اپنے ساتھیوں کو راہ فرار اختیار کرنے کا حکم نہیں دیا۔ چنانچہ وہ وہیں بلندی پر گھوڑے روکے کھڑے رہے۔ پولیس والوں کو انہوں نے نشانے پر لے رکھا تھا لیکن ابھی کسی نے فائر نہیں کیا تھا۔ وہ بلندی پر کھڑے تھے اس لئے وہ آسانی سے پولیس والوں کو نشانہ بنا سکتے تھے۔ پولیس والوں کی فائرنگ سے بچنے کے لئے وہ پیچھے جا کر نشیب میں ٹیلوں کی آڑ میں ہو سکتے تھے۔ پولیس والوں کو بھی یقیناً اندازہ ہو چکا تھا کہ ڈاکو اس وقت ان سے بہتر پوزیشن میں تھے اور انہیں آسانی سے ہلاک کر سکتے تھے۔ اس کے باوجود وہ بے خوفی سے آگے بڑھتے چلے آرہے تھے۔

سلطانہ کے لئے ان کا یہ اندازہ حیرت انگیز تھا۔ شاید سلطانہ کے لئے وہ رات ایک نہیں بلکہ بہت سی حیرتیں لے کر آئی تھی۔ ابھی وہ پولیس والوں کو اس طرح دلیری سے آگے آتے دیکھ کر ہی حیران تھا کہ اسے مزید حیرت کا سامنا کرنا پڑا۔ پولیس والوں نے ان پر فائرنگ بھی شروع کر دی۔ سلطانہ ان کی بے وقوفی پر مزید حیران ہوا۔ یہ تو صریحاً خودکشی کرنے والی بات تھی۔ پولیس والے تعداد میں بھی کم تھے، اگر سلطانہ اور اس کے ساتھی چند سیکنڈ کے لئے بھی گولیوں کی بوچھاڑ کرتے تو وہ سب کے سب مارے جاتے۔

سلطانہ کے لئے مزید حیرت کی بات یہ تھی کہ پولیس والوں کی چلائی ہوئی گولیاں ان کے دائیں بائیں سے گزرتی چلی گئیں۔ ان میں سے کسی بھی ڈاکو کو کسی گولی سے خراش تک نہیں آئی۔ سلطانہ سب کچھ صاف طور پر دیکھ رہا تھا اور اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ وہ اپنے سب ساتھیوں سے آگے کھڑا تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ پر بھورے اور بائیں ہاتھ پر چنبیلی تھی جس کا آدھا چہرہ ڈھاٹے میں چھپا ہوا تھا اور وہ بھی سلطانہ کے دوسرے ساتھیوں کی طرح مکمل طور پر ایک ڈاکو ہی نظر آرہی تھی۔ وہ تینوں گویا اپنے باقی ساتھیوں کی ڈھال بنے کھڑے تھے لیکن

گولیاں ان کے دائیں بائیں بہت دور سے گزر گئی تھیں۔

سلطانہ نے اب بھی خود کوئی جوابی فائر کیا اور نہ ہی اپنے ساتھیوں کو فائرنگ کا حکم دیا۔ اگر وہ خود ایک گولی بھی چلا دیتا تو یہ گویا اس کے ساتھیوں کے لئے فائرنگ شروع کرنے کا ایک اشارہ ہوتا۔ اس وقت جو صورتحال تھی اور جس انداز میں وہ کھڑے تھے اس میں انہیں ضروری محسوس ہو رہا تھا کہ سلطانہ کی اجازت کے بغیر کوئی قدم نہ اٹھائیں جبکہ سلطانہ شاید حیرت کے باعث دم بہ خود سا تھا۔ اس سے پہلے ہمیشہ یہی ہوا تھا کہ اگر ان کا کبھی پولیس والوں سے سامنا ہوا تھا اور وہ تعداد میں ان سے کافی کم تھے یا ذرا بھی خطرے کی زد میں تھے تو انہوں نے پسپائی یا راہ فرار ہی اختیار کی تھی۔ انہوں نے کبھی اپنی جان یقینی طور پر خطرے میں ڈال کر سلطانہ ڈاکو کے گروہ کا مقابلہ نہیں کیا تھا۔

پولیس والے جب کافی قریب آ گئے تب بھی وقفے وقفے سے چلائی ہوئی ان کی گولیوں میں سے کوئی بھی کسی کو نہ لگی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی انجانی اور پُراسراری طاقت ان کی حفاظت کر رہی تھی۔ آخر سلطانہ گویا خواب کی سی کیفیت سے نکلا اور پولیس والوں کو ایک موٹی سی گالی دیتے ہوئے گرجا۔ ''بولو...... سلطانہ ڈاکو کی جے......''

پولیس والوں نے اس کی ہدایت پر عمل نہیں کیا اور بدستور آگے بڑھتے رہے۔ اب وہ بھی چڑھائی چڑھ رہے تھے اس لئے ان کی رفتار بہت کم ہو گئی تھی۔ ان میں سے بعض اب بھی اِکا دُکا فائر کر رہے تھے لیکن انداز ایسا ہی تھا جیسے انہیں سلطانہ اور اس کے ساتھی نظر ہی نہیں آ رہے تھے۔ وہ گویا کسی اور پر فائرنگ کر رہے تھے۔ انہوں نے شاید سلطانہ کی آواز بھی نہیں سنی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ نیند کی حالت میں گھوڑوں پر سوار ہوں۔ صبح کاذب کے ملگجے اندھیرے میں یہ سارا منظر بہت عجیب لگ رہا تھا۔ پیچھے کافی دور جلتے ہوئے گاؤں سے اب بھی شعلے بلند ہو رہے تھے یوں لگ رہا تھا جیسے تاریک افق پر آگ بھڑک رہی ہو۔

سلطانہ نے ایک بار پھر گرج کر پولیس والوں کو حکم دیا۔ ''بولو...... سلطانہ ڈاکو کی جے......''

انہوں نے اب بھی گویا سنی اَن سنی کر دی۔ اب وہ کافی قریب آ گئے تھے۔ سلطانہ اور اس کے ساتھی اب ان کے چہرے بھی دیکھ سکتے تھے جو پتھرائے ہوئے سے لگ رہے تھے۔ بالکل ایسا لگ رہا تھا جیسے کچھ لاشوں کو پکڑ کر گھوڑوں پر بٹھا دیا گیا ہو اور وہ کسی انجانی منزل کی طرف چلی جا رہی ہوں۔ سلطانہ اور اس کے ساتھی ان کی اس حالت کی وجہ سمجھنے سے قاصر تھے لیکن اب

بھی انہوں نے ڈاکوؤں کی طرف نہیں دیکھا۔ وہ گویا وہاں ان کی موجودگی سے ہی بے خبر تھے۔ وہ شاید ناک کی سیدھ میں اسی گاؤں کی طرف جا رہے تھے جہاں تباہی و بربادی ان کے استقبال کے لئے موجود تھی۔

ان کے انداز پر سلطانہ حیران تو تھا ہی...... لیکن اب وہ غصے میں بھی آ گیا۔ اسی طرح گاؤں میں اپنی آنکھوں کے سامنے گجندر سنگھ کو مرتے دیکھ کر بھی اس پر غیظ و غضب کا دورہ پڑا تھا جس کے نتیجے میں وہ لوگ گاؤں کو تباہ و برباد تو کر کے آ گئے تھے لیکن انہوں نے وہاں سے لوٹا کچھ نہیں تھا۔

سلطانہ نے اپنی رائفل کا ٹریگر دباتے ہوئے گرج کر اپنے ساتھیوں کو حکم دیا۔ ''مار دو ان سب کو......!''

دوسرے ہی لمحے ویرانہ گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے گونج اٹھا۔ تمام پولیس والے زمین پر گر پڑے۔ بعض کے گھوڑے بھی ان کے ساتھ ہی زمین پر ڈھیر ہو گئے۔ بعض گھوڑے جو زندہ بچ گئے لیکن ان کے سواروں کی پشت سے گر چکے تھے، بدک کر اِدھر اُدھر بھاگ کھڑے ہوئے۔ دس پولیس والوں کی لاشیں آڑی ترچھی زمین پر پڑی تھیں اور چاروں طرف خون بہتا دکھائی دینے لگا تھا۔ سلطانہ کے سر پر شاید آج خون سوار تھا۔ اس نے وحشیانہ سے انداز میں ایک بلند آہنگ قہقہہ لگایا اور اپنے ساتھیوں کو آگے بڑھنے کا اشارہ کرتے ہوئے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ ان کا گروہ آندھی طوفان کی طرح اپنے ٹھکانے کی طرف واپس روانہ ہو گیا۔

☆......☆......☆

فریڈی ینگ اس وقت واقعی اپنے آپ کو شرمندہ محسوس کر رہا تھا۔

کمشنر ونڈہم کے دفتر میں جاری اس میٹنگ میں ینگ، جاوید ملک اور آئی جی ایش ڈاؤن کے علاوہ کئی دوسرے پولیس آفیسرز بھی موجود تھے۔ میاں پور والے واقعے کو چند دن گزر چکے تھے لیکن اس کی بازگشت پورے ہندوستان میں اب بھی محسوس کی جا رہی تھی اور سلطانہ کا نام صرف روہیل کھنڈ اور اس کے اردگرد کے علاقے میں ہی نہیں بلکہ پورے ہندوستان میں خوف و دہشت کی علامت بن گیا تھا۔ اس کے تذکروں میں بہت سے قصے، افسانے اور مفروضے بھی شامل ہونے لگے تھے۔ لوگ محفلوں اور چوپالوں میں بیٹھتے تو اس کے بارے میں جھوٹی سچی اور کہی سنائی باتوں کے ساتھ ساتھ اپنی طرف سے گھڑے ہوئے قصے بھی بیان کر جاتے۔ اسٹیج پر اس

کے بارے میں ڈرامے اور ناٹک پیش کیے جانے لگے تھے۔

"خدا کی پناہ......!" کمشنر صاحب کہہ رہے تھے۔ "ہم کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ایک ڈاکو کے حوصلے اتنے بڑھ جائیں گے۔ ایک پورے گاؤں کو جلا دیا گیا......گاؤں کیا، اچھا بھلا قصبہ تھا......وہاں کے کافی لوگ خوشحال تھے......فی الحال تو سب کے سب ہی برباد ہو گئے ہیں۔ انہیں سنبھلنے اور اپنے پیروں پر کھڑا ہونے میں کافی وقت لگے گا۔ حکومت ان کی ہر ممکن مدد کر رہی ہے لیکن حکومت ان چوالیس آدمیوں، عورتوں اور بچوں کو اس دنیا میں واپس نہیں لا سکتی جو اس بھیانک کارروائی میں زندہ جل گئے یا گولیوں کا نشانہ گئے۔ وہ دس پولیس والے ان کے علاوہ ہیں جنہیں کسی نے وہاں جانے کا حکم بھی نہیں دیا تھا۔ وہ اصل میں پولیس والوں کا ایک چھوٹا سا قافلہ تھا جو کسی اور کام کے سلسلے میں قریبی علاقے سے گزر رہا تھا۔ ایک دیہاتی کی طرف سے یہ غیر مصدقہ اطلاع بھی ملی ہے کہ مسافر پولیس والے اس رات کچھ عجیب سی حرکتیں کر رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ ان پر کسی آسیب کا سایہ ہو گیا ہے۔ گاؤں دیہات میں اس قسم کے مفروضے گردش کرتے رہتے ہیں۔"

انہوں نے ایک لمحے توقف کیا پھر گہری سانس لے کر بولے۔ "بہرحال......مجموعی طور پر یہ سب کچھ بہت بھیانک ہے۔ اس ڈاکو کا حوصلہ بہت بڑھ چکا ہے۔ اگر ہم نے اس کا سر نہ کچلا تو ایک دن ایسا بھی آئے گا جب یہ پورے ہندوستان میں آگ لگا دے گا۔ اس تازہ ترین واقعے کی بازگشت برطانیہ میں بھی سنی گئی ہے۔ وہاں کے اخبارات میں یہاں سے بھی زیادہ بھیانک انداز میں اس کی تفصیلات چھپی ہیں اور یہاں مجھے وائسرائے صاحب کا خط موصول ہوا ہے جس میں انہوں نے سلطانہ ڈاکو کے بارے میں تشویش کا اظہار کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر ہمارے راج میں یہاں اس قسم کے واقعات ہوں گے تو پھر انڈیا میں ہماری بادشاہت کی بنیادیں ہل جائیں گی۔"

کمشنر صاحب کی اس "تقریر" کے دوران فریڈی ینگ کا سر ذرا جھکا ہوا تھا اور اس کی نظریں اپنے سامنے میز پر جمی ہوئی تھیں لیکن جب کمشنر صاحب نے براہ راست اسے مخاطب کیا تو اسے سر اٹھانا پڑا۔ "مسٹر ینگ! مجھے افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ جو مہم آپ کے سپرد کی گئی تھی اس سلسلے میں ابھی تک آپ نے کوئی کارکردگی نہیں دکھائی۔ میں نے اس سلسلے میں آئی جی صاحب سے بھی بات کی تھی جو یہاں موجود ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ذرا ٹیڑھے قسم کے کاموں

میں آپ کا اپنا ایک طریقہ کار ہوتا ہے لیکن ہم نے طریقہ کار کا معاملہ آپ پر چھوڑ کر بھی نتائج کا انتظار کر کے دیکھ لیا لیکن نتائج سامنے نہیں آئے۔ اگر آپ کو مزید فورس، مزید وسائل کی ضرورت ہے تو وہ بھی آپ کو مہیا کیے جا سکتے ہیں لیکن اگر اس کے باوجود آپ محسوس کرتے ہیں کہ یہ کام آپ کے بس کا نہیں......تو آپ ہمیں صاف صاف بتا دیں تا کہ ہم یہ ذمے داری کسی اور تجربہ کار آفیسر کو سونپیں؟"

ینگ نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور دھیمے لہجے میں بولا "معذرت خواہ ہوں کہ میں آپ کی اور آئی جی صاحب کی توقعات پر پورا نہیں اتر سکا۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو اس کے لئے مجھے مزید ایک ماہ کی مہلت دے دیں۔ مجھے پوری امید ہے کہ میں ایک ماہ کے اندر اندر سلطانہ ڈاکو کے گروہ کا قلع قمع کر دوں گا۔ مجھے اس کے لئے مزید کچھ فورس اور چند دوسرے تجربہ کار آفیسرز وغیرہ کی ضرورت تو بہرحال پڑے گی۔ اگر میں مزید وسائل کے ساتھ ایک ماہ میں بھی یہ کام نہ کر سکا تو آپ بلا تاخیر کسی بھی اور آفیسر کے سپرد کر دیجئے گا اور اگر آپ مجھے مزید مہلت دینے کے حق میں نہ ہوں تو آپ اسی وقت اس کیس کا چارج مجھ سے لے سکتے ہیں۔"

"آپ کیا کہتے ہیں مسٹر ایشن ڈاؤن؟" کمشنر صاحب نے آئی جی صاحب کی طرف دیکھا۔

آئی جی صاحب جواب دیتے ہوئے کچھ ہچکچاہٹ کا شکار ہو گئے لیکن پھر گویا دل ہی دل میں فیصلے پر پہنچتے ہوئے بولے۔ "میرا خیال ہے مسٹر ینگ کو مزید ایک ماہ کی مہلت دے دینی چاہیے۔ میں ان سے مکمل طور پر مایوس نہیں ہوں۔"

"اس ایک ماہ کے دوران سلطانہ ڈاکو نہ جانے کیا کچھ کر گزرے۔" کمشنر صاحب کے لہجے میں تشویش تھی۔

"پچھلے کئی ماہ کے دوران اس کی یہی ایک بڑی اور وحشیانہ کارروائی ہے۔" ینگ بولا۔

"لگتا ہے اس پر کسی قسم کا جنون سوار ہوا تھا ورنہ پچھلے کئی ماہ کے دوران تو اس نے کوئی بڑا ڈاکا بھی نہیں مارا۔"

یہ گویا امید کی ایک کرن تھی جس کی طرف ینگ نے کمشنر صاحب کی توجہ دلانے کی کوشش کی تھی۔ وہ چند لمحے خاموش رہے پھر گویا فیصلے پر پہنچتے ہوئے بولے۔ "ٹھیک ہے......میں آئی جی صاحب کے فیصلے کی تائید کرتا ہوں۔"

☆......☆......☆

سلطانہ اوراس کے ساتھیوں کو احساس تھا کہ کوئی بڑا ہاتھ مارے انہیں کافی دن گزر گئے تھے اور کہیں سے مال آتا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اخراجات بے حساب تھے۔ جنگل میں زندگی گزارنے کے باوجود ان کے بہت خرچے تھے۔ اپنی اور گھوڑوں کی خوراک پر بہت خرچ ہوتا تھا۔ اس مد میں بنیوں کو کافی پیسہ جاتا تھا۔ کپڑے لتے کے لئے بزاز اور درزی کو ادائیگی ہوتی تھی۔ جن ذرائع سے ہینڈ گرینیڈ، گولیاں، پٹرول، مٹی کا تیل آتا تھا، انہیں بھاری ادائیگی کی جاتی تھی۔ تمام دکانداروں اور بیچ کے آدمیوں کا منہ بند رکھنے کے لئے وہ انہیں اصل قیمتوں سے کہیں زیادہ ادائیگی کرتے تھے۔

اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی تھی کہ ڈاکوؤں کا سلسلہ چلتا یا نہ چلتا، سلطانہ کی سخاوت کا سلسلہ چلتا رہتا۔ اسے راہ چلتے بھی کوئی ضرورت مند مل جاتا تو وہ اس کی خاطر خواہ مدد کئے بغیر نہ رہتا۔ مخبروں کا بھی ایک جال پھیلا ہوا تھا۔ انہیں بھی رقمیں جاتی تھیں اور وہ دوسرے ضرورت مندوں کے بارے میں بھی خبریں لاتے رہتے تھے۔ ان کی مدد کرنا بھی سلطانہ کے لئے ضروری ہوتا تھا۔ یوں بے حساب اخراجات ہوتے رہتے تھے۔

مال تو ان کے پاس اب بھی کچھ کم نہیں تھا اور وہ مختلف شکلوں میں ڈیرے پر ہی مختلف جگہوں پر پوشیدہ تھا۔ ان تمام جگہوں کا نقشہ بھی ایک جگہ محفوظ تھا لیکن جس طرح وہ بہت دنوں سے وہ ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے تھے اور جس ایک آدھ جگہ پر ڈاکا ڈالنے گئے بھی تھے، وہاں سے جس طرح خالی ہاتھ آئے تھے اس سے اندیشہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ اپنا خزانہ بھی بیٹھے بیٹھے نہ کھا جائیں۔

ادھر جن علاقوں تک ان کی رسائی تھی ان میں وہ دور دور تک ایسی ہر جگہ پر کم از کم ایک مرتبہ ڈاکا ضرور ڈال چکے تھے جہاں سے کچھ مال ہاتھ آنے کی امید ہوئی تھی۔ اب وہ پورے روہیل کھنڈ اور اس کے اردگرد کے علاقوں کے نقشے پر تصور ہی تصور میں نظر ڈالتے تھے تو ایسا لگتا تھا کہ کوئی بھی ایسی قابل ذکر جگہ نہیں بچی تھی جہاں وہ ڈاکا نہ ڈال چکے ہوں۔ سلطانہ اور بھورے سنجیدگی سے سوچ رہے تھے کہ اب انہیں کچھ اور دور دراز کے علاقوں کا رخ کرنا چاہیے اور اپنی سرگرمیوں کا دائرہ بڑھانا چاہیے۔ اسی سوچ بچار اور منصوبہ بندی میں دن گزرتے جا رہے تھے۔

اسی دوران خبر آئی کہ ہردوار کے قریب ایک چھوٹے سے گاؤں پونم میں ایک ٹھاکر نے

رولز رائس کار خریدی تھی۔ سلطانہ اور اس کے ساتھی یہ خبر سن کر حیران رہ گئے۔ رولز رائس جیسی کاریں تو راجے مہاراجے اور نواب ہی خریدتے تھے۔ پورے صوبے میں شاید وہ چار ہی رولز رائس کاریں تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ چھوٹے سے ایک گاؤں کا ٹھاکر راجوں، مہاراجوں اور نوابوں کی برابری کر رہا تھا؟ اس کا دوسرا مطلب یہ تھا کہ ایک چھوٹے سے گاؤں کے ٹھاکر کے پاس بھی ٹھیک ٹھاک دولت تھی۔ ایسا آدمی بھلا اب تک سلطانہ کی ''نظرِ عنایت'' سے کیسے بچا ہوا تھا؟

انہوں نے فوراً پونم نام کے اس گاؤں پر دھاوا بولنے کا منصوبہ بنالیا۔ ٹھاکر جمان سنگھ کو تو لوٹنا ہی تھا لیکن گاؤں میں اور بھی دو چار گھروں سے کچھ مال ہاتھ آ سکتا تھا جن کے مکین خوشحال تھے۔ پونم گاؤں چند سال پہلے تک ہموار زمین پر آباد تھا لیکن وہاں ہر سال بارشوں کے موسم میں سیلاب آ جاتا تھا۔ چنانچہ گاؤں لوگ قریب ہی ایک کچی پہاڑی پر منتقل ہو گئے تھے جس کے اوپر کافی بڑا رقبہ سطح زمین کی طرح تھا۔ وہاں انہوں نے نئے سرے سے اپنا گاؤں آباد کیا تھا اور ہر سال چند دن کے لئے آنے والے سیلاب سے محفوظ ہو گئے تھے۔

سلطانہ اور اس کے ساتھی جب پونم پر دھاوا بولنے کے لئے روانہ ہوئے تو ان دنوں بھی بارشیں ہو چکی تھیں لیکن کچھ زیادہ نہیں ہوئی تھیں۔ ان کے راستے میں ایک ندی آ گئی۔ ندی زیادہ چوڑی نہیں تھی لیکن دو فرلانگ کے آگے جا کر اس کا پاٹ بہت چوڑا ہو گیا تھا جہاں سے ڈاکو اسے عبور کرنے لگے تھے، وہاں ندی کا پاٹ تو زیادہ چوڑا نہیں تھا لیکن اس میں پانی خوب زور و شور سے بہہ رہا تھا۔ چند لمحے انہوں نے اس کا جائزہ لینے کے بعد گھوڑے پانی میں ڈال دیئے۔ ندی کے وسط میں پہنچ کر انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا۔

ندی کی گہرائی کے بارے میں ان کا اندازہ غلط ہو گیا تھا۔ وسط میں ندی کافی گہری تھی۔ مزید خرابی یہ ہوئی کہ اسی دوران پانی کے تیز ریلے آنے لگے۔ شاید پیچھے کہیں اس سے زیادہ بارشیں ہوئی تھیں جتنی اس علاقے میں ہوئی تھیں۔ انہیں اندیشہ محسوس ہوا کہ شاید وہ سب گھوڑوں سمیت پانی میں بہہ جائیں گے اور آگے کہیں جا کر ڈوب جائیں گے۔

کسی نہ کسی طرح وہ جانیں بچانے اور گھوڑوں سمیت دوسرے کنارے پر پہنچنے میں تو کامیاب ہو گئے لیکن اس دوران ان کی حالت خراب ہو گئی اور کچھ نقصان بھی ہو گیا۔ کئی ڈاکوؤں کی رائفلیں پانی میں گر گئیں اور غائب ہو گئیں۔ ہینڈ گرینیڈز کے دو تھیلے ان کے پاس

تھے، وہ غائب ہوگئیں۔ کچھ پٹرول اور مٹی کے تیل کے ڈبے بھی وہ ساتھ لے کر چلتے تھے کہ اگر کہیں آگ لگانے کی ضرورت پڑے تو کام آئیں۔ شروع میں آگ تیزی سے بھڑکانے کے لئے وہ کارآمد رہتے تھے بعد میں تو ہوا سے آگ خود بہ خود ہی پھیلتی چلی جاتی تھی مگر اب وہ ڈبے بھی ان کے پاس نہیں رہے تھے۔

مزید ستم یہ ہوا تھا کہ ان کی رائفلوں اور بندوقوں میں بھی خوب پانی بھر گیا تھا۔ خطرہ یہ تھا کہ اب ان سے فائر نہیں کیا جاسکے گا...... اور اگر ایسی کوشش کی گئی تو وہ پھٹ نہ جائیں۔ انہوں نے ندی تو پار کر لی تھی اور سب اپنے گھوڑوں سمیت دوسرے کنارے پر پہنچ گئے تھے لیکن ان کی ''تیاریاں'' ادھوری رہ گئی تھیں۔ ساتھی شش و پنج میں پڑ گئے کہ پونم پر چڑھائی کی جائے یا نہیں؟ مسئلہ یہ تھا کہ سلطانہ جب کہیں دھاوا بولنے کا ارادہ کر لیتا تھا تو پھر وہ ملتوی نہیں ہوسکتا تھا۔ وہ اپنی یہ روایت توڑنا نہیں چاہتا تھا اور اس کا حکم کوئی ٹال نہیں سکتا تھا۔ چنانچہ چند منٹ رکنے کے بعد وہ آگے روانہ ہوگئے۔ سلطانہ کا خیال تھا کہ بندوقیں استعمال کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ کسی چھوٹے سے گاؤں کو لوٹنے کے لئے تو اس کی دہشت ہی کافی تھی۔ ویسے بھی ان کے پاس بندوقوں کے علاوہ کلہاڑیاں اور خنجر بھی تھے۔ وہ تو ان سے بھی بہت قتل و غارت کر سکتے تھے اور تباہی پھیلا سکتے تھے۔

وہ شام کا اندھیرا پھیلنے سے پہلے پہاڑی کے پاس پہنچ گئے۔ انہوں نے کوشش یہی کی تھی کہ دن کے اجالے میں اپنا کام کر گزریں۔ رات کے اندھیرے میں پہاڑی پر چڑھنا، اترنا دشوار ہوتا۔ وہاں پہنچ کر انہیں کچھ اور چیزیں اپنے اندازوں اور امیدوں کے برعکس نظر آئیں۔ پہاڑی زبردست چکنی مٹی کی تھی اور بارشوں کی وجہ سے ابھی تک ان پر بے پناہ پھسلن تھی۔ گھوڑے ان پر چڑھنے کی کوشش ہی شروع کرتے تو لگتا کہ پھسل کر اوندھے منہ گر جائیں گے اور ٹانگیں تڑوا بیٹھیں گے۔ یہ اور بھی زیادہ سنگین مسئلہ ہوتا۔

وہ سب حیرت سے سوچ رہے تھے کہ بارشوں کے دنوں میں گاؤں کے لوگ پہاڑی سے کیسے اترتے چڑھتے ہوں گے اور ٹھاکر اپنی رولز رائس کیسے استعمال کرتا ہوگا؟ ابھی ان کی یہی حیرت دور نہیں ہوئی تھی کہ انہیں مزید ایک حیرت کا سامنا کرنا پڑا۔ پہاڑی کی مسطح چوٹی کے کنارے پر چالیس پچاس آدمی نمودار ہوتے دکھائی دیئے۔ ان سب کے پاس بندوقیں تھیں۔ شاید گاؤں والوں کو ڈاکوؤں کی آمد کی اطلاع مل گئی تھی۔ انہوں نے بے دریغ فائرنگ شروع

کر دی۔ سلطانہ اور اس کے ساتھیوں کے پاس جو بچی کھچی بندوقیں تھیں ان کا استعمال مخدوش تھا، انہیں اپنی جانوں کے لالے پڑ گئے۔

پہاڑی کی بلندی پر لوگوں کی تعداد کچھ اور بڑھ گئی۔ ان میں سے کچھ نے اوپر سے بڑے بڑے پتھر لڑھکانے شروع کر دیئے۔ ایسا لگتا تھا کہ ان لوگوں کو اس قسم کی صورتحال کا اندیشہ رہا تھا اور وہ اس کے لئے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ آخر کار سلطانہ اور اس کے ساتھیوں کو پسپائی اختیار کرنا پڑی ورنہ پہاڑی کے نیچے کھلے میدان میں وہ مارے بھی جاسکتے تھے۔ ناکام و نامراد وہ واپس روانہ ہوگئے۔ تاہم سلطانہ نے عہد کیا کہ وہ کبھی خشک موسم میں، رات کے اندھیرے میں اس گاؤں پر ضرور دھاوا بولے گا اور اسے تاخت و تاراج کر دے گا۔

سلطانہ سخت شرمندگی اور خجالت محسوس کر رہا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے سارا قصور صرف اسی کا تھا۔ اس کا کوئی منصوبہ اس سے پہلے اس طرح ناکام نہیں ہوا تھا۔ ڈیرے پر واپس پہنچ کر بھی اس نے دو دن تک کسی سے نظر نہیں ملائی اور نہ ہی کوئی خاص بات چیت کی۔ چنبیلی اس دوران اس کی دلجوئی کرتی رہی۔ تب جا کر وہ ناکامی کے اس صدمے کو بھولا۔

پھر ایک روز باتوں باتوں میں پریتم کہیں ذکر کر بیٹھا کہ پیر مخدوم ان دنوں مراد آباد کی طرف آئے ہوئے تھے اور مضافاتی علاقے میں اپنی مخصوص کٹیا میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ سلطانہ چونک اٹھا اور بولا۔ ''پریتم! تمہیں یاد ہے جب میری بیوی تپلی کے ہاں شادی کے بعد کئی سال تک اولاد نہیں ہوئی تو وہ پیر مخدوم ہی کے پاس گئی تھی؟ انہوں نے اسے کچھ تعویذ وغیرہ گھول کر پینے کے لئے دیئے تھے۔''

''ہاں...... مجھے یاد ہے۔'' پریتم سر جھکا کر دھیمے لہجے میں بولا۔ اس وقت کمرے میں ان دونوں کے سوا کوئی نہیں تھا۔

''تمہاری بیوی حالانکہ ان دنوں پہلے ہی امید سے تھی مگر پھر اس کی امید ختم ہوگئی تھی اور تپلی امید سے ہوگئی تھی، اس لئے میں کہا کرتا تھا کہ پیر مخدوم نے پریتم سے بچہ لے کر میری جھولی میں ڈال دیا تھا اور اسی لئے میں راجکمار کو اپنا بچہ کم...... اور تمہارا بچہ زیادہ سمجھتا ہوں۔ مجھ سے زیادہ اس پر تمہارا حق ہے۔''

''ارے بھئی...... یہ لڑکپن کی باتیں ہیں...... میں تو بھول بھال گیا ہوں۔'' پریتم نے جان بوجھ کر ایسا جواب دیا۔ پھر خوش دلی سے بولا۔ ''راجکمار میرا کیا...... ہم سب ہی کا بچہ ہے۔ ہم

سب اس کے چچا تایا ہیں اور چچا تایا بھی تو باپ ہی کے برابر ہوتے ہیں۔"

سلطانہ چند لمحے خاموش رہا۔ اس کی نظریں ہوا میں کسی غیر مرئی چیز کو تلاش کر رہی تھیں اور چہرے پر عجیب سے جذبات کا پرتو تھا۔ اچانک سلطانہ بول اٹھا۔ "پریتم! آج رات صرف میں اور تم پیر مخدوم سے ملنے چلتے ہیں۔"

"کیوں......؟" پریتم چونکا۔ "کیا تم چاہتے ہو کہ اب تمہارے ہاں چنبیلی سے بھی اولاد ہو جائے؟"

"نہیں......نہیں...... یہ تو میں ہرگز نہیں چاہتا۔" سلطانہ اِدھر اُدھر دیکھ کر بولا۔ "میں تو پیر مخدوم سے کسی اور کام کے لئے تعویذ لینا چاہتا ہوں۔ آج کل ہمارے حالات کچھ ٹھیک نہیں جا رہے۔ ایسی ناکامیاں ہو رہی ہیں جن کے بارے میں ہم نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ ہمارا بچپن کا یار جگندر بھی مر گیا۔ میں پیر صاحب سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ ہمارے لئے آگے بھی اچھے دن لکھے ہیں یا نہیں۔"

"ٹھیک ہے...... آج رات چلے چلتے ہیں۔" پریتم بولا۔ "میں نے پیر صاحب کی کٹیا دیکھی ہوئی ہے۔ ہندو مسلم، سکھ، عیسائی بھی ان کے پاس آتے ہیں اور ان کے بارے میں طرح طرح کی باتیں مشہور ہیں۔ سنا ہے کافی عرصے تک وہ ایسے تختے پر سوتے رہے ہیں جس میں الٹی کیلیں لگی ہوئی تھیں۔ ایک بار انہوں نے چھ مہینے تک ایک ٹانگ پر کھڑے ہو کر عبادت کی تھی ایک بار وہ تین مہینے تک ایک درخت پر رہے تھے اور نیچے نہیں اترے تھے۔ اتنے دنوں تک انہوں نے صرف اسی درخت کے پھول، پھل اور پتے کھا کر گزارا کیا تھا۔ ہندو تو یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ ان کا ساتواں جنم ہے۔ پہلے جنم میں وہ کوئی دیوتا تھے۔ مسلمان اس بات کو نہیں مانتے۔ بڑے بڑے لوگ ان کے پاس آتے ہیں۔ ایس پی، ڈی ایس پی بھی آتے ہیں۔ زیادہ تر لوگ اولاد کے لئے تعویذ لینے آتے ہیں۔"

سلطانہ یہ سب کچھ سن کر بے حد مرعوب...... بلکہ سحر زدہ سا دکھائی دینے لگا۔ پھر اس نے پوچھا۔ "رات کو وہ ہم سے مل لیں گے؟ وہ ان کے آرام کا وقت تو نہیں ہو گا؟"

اس سوال پر پریتم بھی ایک لمحے کے لئے سوچ میں پڑ گیا لیکن پھر بے پروائی سے سر جھٹک کر بولا۔ "فکر نہ کرو...... کسی نہ کسی طرح مل ہی لیں گے۔ ویسے وہ حاجت مندوں سے ملنے کے لئے ہی تو مراد آباد آتے ہیں، ورنہ ان کی اصل رہائش تو ہردوار کے قریب کہیں ہے۔

وہاں وہ کسی سے نہیں ملتے۔"

اس رات سلطانہ اور پریتم کسی کو اصل بات بتائے بغیر کسی اور کام کا بہانہ کر کے پیر مخدوم سے ملنے روانہ ہو گئے۔ سلطانہ نے چنبیلی کو بھی نہیں بتایا تھا کہ وہ کسی پیر سے ملنے جا رہا تھا۔ جب وہ اس ویرانے میں پہنچے جہاں پیر صاحب کی کٹیا تھی تو انہوں نے اپنے گھوڑے اس سے کچھ دور ہی ایک درخت سے باندھ دیئے اور پیدل وہاں تک پہنچے۔ پیر صاحب کی کٹیا ایک بہت پرانے اور تناور برگد کے نیچے تھی جس کی جڑیں کٹیا کے اوپر اور آس پاس لٹکی ہوئی تھیں۔ اس کٹیا کے گرد ایک نیچی سی چار دیواری بھی تھی جس کے ذریعے کافی بڑی زمین گھیر لی گئی تھی۔ اس چار دیواری میں لکڑی کا دروازہ بھی تھا۔

اس دروازے کے سامنے دو لحیم شحیم آدمی چار پائیاں بچھائے لیٹے تھے۔ وہ آدھی رات کا وقت تھا لیکن وہ دونوں آدمی یقیناً جاگ رہے تھے۔ سلطانہ اور پریتم کی ہلکی سی آہٹ سنتے ہی وہ اٹھ بیٹھے۔ سلطانہ کو یہ دیکھ کر کچھ حیرت ہوئی کہ ان دونوں کے سرہانے پستول رکھے ہوئے تھے جو انہوں نے آہٹ سنتے ہی اٹھا لئے تھے۔

"کون ہو تم؟" انہوں نے پستول سیدھے کرتے ہوئے پوچھا۔

سلطانہ اور پریتم خاموشی سے ان کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ وہ قد کاٹھ میں ان آدمیوں سے بھی نکلتے ہوئے تھے۔ ان کا حلیہ ان کے کندھے پر لٹکی ہوئی رائفلیں، گولیوں کی پیٹیاں اور ان کا بے خوف انداز...... یہ سب کچھ ان دونوں آدمیوں کو مرعوب کرنے کے لئے کافی تھا جو پیر صاحب کی کٹیا کی ایک طرح سے چوکیداری کر رہے تھے۔

"ہمیں پیر صاحب سے ملنا ہے۔" سلطانہ نے نرم آواز میں کہا۔

"اس وقت تو پیر صاحب کسی سے نہیں ملتے۔" ان میں سے ایک آدمی نے کہا لیکن اب اس کے لہجے میں رعب کے بجائے ہلکا سا خوف تھا۔

سلطانہ نے خاموشی سے اپنی انگلیوں سے سونے کی دو بھاری انگوٹھیاں نکال کر ان کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔ "یہ میری طرف سے نذرانہ قبول کرو اور جا کر پیر صاحب کو جگا دو۔"

انگوٹھیاں دیکھ کر دونوں آدمیوں کے چہروں پر رونق آ گئی۔ سونے کی ان بھاری انگوٹھیوں میں خاصے بڑے نیلم بھی جڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے فوراً ہی ایک ایک انگوٹھی لے کر اپنی جیب میں ڈالی اور پلٹ کر چار دیواری کا دروازہ کھول دیا۔ چار دیواری اتنی نیچی تھی کہ اگر وہ

دونوں آدمی چوکیداری نہ کر رہے ہوتے تو سلطانہ اور پریتم اطمینان سے اسے پھلانگ کر بھی اندر جاسکتے تھے۔

دروازہ کھلنے کے بعد ایک آدمی ان کی طرف مڑتے ہوئے باچھیں پھیلا کر بولا۔ ''آئیں ......آئیں بھائی صاحب......ہم اکٹھے ہی اندر چل کر پیر صاحب کو جگاتے ہیں۔''

سلطانہ اور پریتم ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرائے اور ان کے پیچھے چل دیئے۔ جھونپڑی کا دروازہ کھلا ہی تھا۔ اندر پیر صاحب بڑی سی ایک چارپائی پر آرام دہ گدے پر چت لیٹے خراٹے لے رہے تھے۔ ان کی چارپائی کے گرد مچھر دانی لگی ہوئی تھی۔ اندر عود، عنبر اور لوبان کی ہلکی سی مہک محسوس ہو رہی تھی۔ پیر صاحب کے ایک محافظ نے مچھر دانی اوپر اٹھا کر اچھا خاصا جھنجھوڑ کر پیر صاحب کو جگایا او جب وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے تو اس نے باچھیں کھلاتے ہوئے کہا۔ ''پیر صاحب...... یہ دو مسافر کوئی سوال لے کر بہت دور سے آپ سے ملنے آئے ہیں...... بہت ضد کر رہے تھے اس لئے ہم نے آپ کو اٹھا دیا۔''

پیر صاحب نے آنکھیں مل کر پٹرومیکس لیمپ کی روشنی میں سلطانہ کی طرف دیکھا اور ہڑبڑا کر چارپائی سے گرتے گرتے بچے۔ ان کے منہ سے سرسراتی سی آواز نکلی۔ ''سلطانہ ڈاکو ......'' پھر وہ تھر تھر کانپنے لگے۔

''آپ نے مجھے کیسے پہچان لیا پیر صاحب......؟'' سلطانہ اپنی حیرت کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے نہایت نرمی سے بولا۔ وہ یہی سمجھا تھا کہ پیر صاحب نے اپنی روحانی قوت کے ذریعے اسے پہچان لیا تھا ورنہ ان کا تو کبھی آمنا سامنا نہیں ہوا تھا۔

وہ اپنا لرزتا ہوا ہاتھ غیر ارادی سے انداز میں اپنی بڑی سی داڑھی پر پھیرتے ہوئے بولے۔ ''کئی بڑے بڑے شہروں میں، ڈاکخانوں اور ریلوے اسٹیشنوں پر تمہاری قلمی تصویر والے بڑے بڑے پوسٹر لگے ہوئے ہیں۔ کیا تمہیں پتا نہیں؟''

سلطانہ نے نفی میں سر ہلایا اور سادگی سے بولا۔ ''مجھے پتا نہیں تھا۔ میں اتنا مشہور ہو چکا ہوں۔ میں نے آج تک اپنی تصویر والا کوئی پوسٹر نہیں دیکھا...... لیکن ...... خیر...... اس بات کو چھوڑیں، یہ بتائیں، آپ مجھے دیکھ کر اتنے ڈر کیوں گئے؟ میں آپ کو لوٹنے تو نہیں آیا [illegible] اور آپ کے پاس ہے بھی کیا، جو میں لوٹ کر لے جاؤں؟''

یہ سن کر پیر صاحب کی گویا جان میں جان آئی اور وہ سنبھل کر بیٹھتے ہوئے [illegible] بارعب لہجے

میں بولے۔ ''کہو کیسے آئے ہو؟''

سلطانہ نے پہلے تو انہیں مختصراً اپنے بیٹے اور پریتم کی اس اولاد کا قصہ سنایا جو دنیا میں نہیں آسکی تھی۔ وہ اپنی دانست میں پیر صاحب کی روحانی قوتوں پر ان کی مدح سرائی کر رہا تھا لیکن وہ بے زاری سے ہاتھ ہلا کر بولے۔ ''بھئی مجھے چار دن پہلے کی باتیں یاد نہیں رہتیں۔ میں برسوں پہلے کی باتیں کہاں یاد رکھوں گا۔ میرے پاس تو روزانہ سیکڑوں لوگ اس قسم کے مسئلے لے کر آتے ہیں۔ یہ بتاؤ اب کیا چاہتے ہو؟''

''پیر صاحب...... مجھے کچھ ایسا لگ رہا ہے جیسے میرا کچھ برا وقت چل رہا ہے۔'' سلطانہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ''وہ پہلے جیسی بات نہیں رہی...... یہ بتائیں، کیا اب اسی طرح چلتا رہے گا......کہیں اس سے بھی برا وقت تو آنے والا نہیں ہے؟ یا پھر حالات اچھے ہو جائیں گے؟ میرا مطلب ہے میں ذرا آگے کے حالات جاننا چاہتا ہوں۔''

''اپنا ہاتھ دکھاؤ مجھے۔'' پیر صاحب نے حکم دیا۔

سلطانہ نے ہاتھ آگے کر دیا۔ پیر صاحب بغور اس کے ہاتھ کا جائزہ لیتے ہوئے سر ہلاتے رہے اور ہنکارے بھرتے رہے، پھر اس کے چہرے پر نظر گاڑ کر بولے۔ ''نہیں برخوردار...... برا وقت تو تم پر دور دور تک نہیں ہے۔ تم کبھی جیل نہیں جاؤ گے......اور یہ برا وقت بہر حال تھوڑے دنوں کا ہے......اگر تم اس دوران زیادہ وقت گھر پر......میرا مطلب ہے اپنے ٹھکانے پر گزارو گے تو تمہارا کچھ نہیں بگڑے گا۔ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔''

سلطانہ کی ڈھارس بندھی اور اس کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔ اس کے لئے سب سے زیادہ اطمینان کی بات یہ تھی کہ وہ کبھی جیل نہیں جائے گا۔ دوسرے ہی لمحے پیر صاحب نے اس کا چھوڑا ہوا ہاتھ دوبارہ پکڑ لیا اور ایک بار پھر ہاتھ کی لکیریں غور سے دیکھنے لگے۔ ایک آدھ جگہ انہوں نے ہاتھ پر انگلی بھی پھیری۔ ان کی کشادہ پیشانی پر شکنیں ابھر آئی تھیں۔ سلطانہ کے دل کی دھڑکنیں کچھ تیز ہو گئیں۔

''ایک مسئلہ ہے۔'' آخر وہ بولے۔ ''تمہاری زندگی میں ایک عورت آئے گی...... یا شاید آچکی ہے۔ اس کا ساتھ تمہارے لئے کچھ اچھا نہیں رہے گا۔''

سلطانہ کو اپنے دل کی دھڑکنیں کچھ رکتی ہوئی سی محسوس ہوئیں۔ اس کا ذہن فوراً چنبیلی کی طرف گیا۔ ''کیا اس کا ساتھ میرے لئے برا ثابت ہونے والا ہے؟'' اس نے وحشت سے

سوچا۔ مگر وہ تو دنیا میں مجھ سے سب سے زیادہ محبت کرنے والی ہستی ہے۔ اتنی محبت تو مجھ سے تپلی نے بھی نہیں کی تھی۔ کسی کی محبت بھلا کسی کے لئے بری کیسے ہوسکتی ہے؟ اتنی محبت کرنے والی ہستی کی وجہ سے بھلا کسی پر برا وقت آسکتا ہے؟''

پھر اس نے مزید سوچا تو اس کا دماغ چکرا کر رہ گیا۔ پیر صاحب ایک ہی وقت میں دو طرح کی باتیں کررہے تھے۔ ایک طرف وہ کہہ رہے تھے اس پر برا وقت نہیں آئے گا۔ دوسری طرف کہہ رہے تھے کہ ایک عورت کی وجہ سے برا وقت آ بھی سکتا ہے، تاہم سلطانہ کو دل ہی دل میں یہ اعتراف تو کرنا پڑا کہ پیر صاحب پہنچے ہوئے بزرگ تو تھے۔ انہیں عورت کے بارے میں معلوم تو ہو گیا تھا۔

''آپ میرے آنے والے دنوں کے بارے میں اور کچھ بتائیں گے؟'' سلطانہ نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

''سب کچھ تو بتا دیا اب اور کیا بتاؤں؟'' پیر صاحب گویا جلال میں آتے آتے رہ گئے۔ ''تمہاری ساری زندگی کا نقشہ تو تمہارے سامنے رکھ دیا ہے۔''

''ٹھیک ہے جی...... آپ کی بہت مہربانی...... دھنے واد......'' سلطانہ ہاتھ جوڑتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

''جا رہے ہو؟'' پیر صاحب نے اسے جانے کے لئے تیار دیکھ کر ترچھی نظروں سے اس کا سرتاپا جائزہ لیا۔ ''پتا نہیں، کس کس کو لوٹ کر کنگال کر چکے ہو...... اور ہمارے پاس خالی ہاتھ چلے آئے؟ کوئی چھوٹا موٹا نذرانہ بھی نہیں لائے؟''

''اوہ......!'' سلطانہ چونکا۔ اس پہلو کی طرف اس کا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔ شاید پیر صاحب کا رہن سہن دیکھ کر اس کے ذہن میں لاشعوری طور پر خیال بیٹھ گیا تھا کہ وہ کسی سے کچھ نہیں لیتے ہوں گے۔ وہ متانت سے بولا۔ ''سلطانہ کبھی خالی ہاتھ نہیں ہوتا۔''

اس نے اپنے ڈھیلے ڈھالے کرتے کے نیچے واسکٹ میں ہاتھ ڈالا اور سونے کا ایک قیمتی ہار نکالا جس میں کئی سچے موتی بھی پروئے گئے تھے۔ اس نے ہار دونوں ہاتھوں پر رکھ کر ادب سے پیر صاحب کو پیش کیا۔ انہوں نے بے تابی سے ہار اٹھا لیا اور اچھی طرح اس کا جائزہ لینے کے بعد ان کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔

''خوش رہو...... آباد رہو......'' وہ لہک کر بولے لیکن پھر جیسے کچھ یاد آ گیا۔ انگلی اٹھا کر

خبردار کرنے والے انداز میں بولے۔ ''بس...... اس عورت سے ہوشیار رہنا جو تمہاری زندگی میں آ چکی ہے یا آنے والی ہے۔ یہ مجھے نہیں معلوم کہ وہ عورت کون ہے؟''

سلطانہ نے سر ہلایا اور پیر صاحب کے آدمیوں کے ساتھ باہر آ گیا۔ چار دیواری سے باہر آ کر اس نے یونہی گپ شپ کے انداز میں ایک محافظ سے پوچھا۔ ''ہردوار میں پیر صاحب کی کٹیا کہاں ہے؟''

''کٹیا......؟'' محافظ استہزائیہ سے انداز میں ہنسا۔ ''وہاں تو ان کی بہت بڑی حویلی ہے۔ بیسیوں نوکر، خدمت گار اور چوکیدار ہیں...... لیکن تم وہاں ان سے ملنے نہ چل دینا۔ وہاں وہ کسی سے نہیں ملتے۔'' پھر جیسے اسے کوئی اور خیال آیا۔ سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ ''اور ہاں...... کہیں پیر صاحب کو ہی لوٹنے نہ چلے جانا۔''

''کیسی بات کر رہے ہو؟'' سلطانہ اسے گھور کر کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولا۔ ''پیر صاحب کو لوٹنے کا بھلا کون سوچ سکتا ہے؟'' پھر اس نے پوچھا۔ ''کیا تم دونوں بھی وہاں ان کے ساتھ ہی حویلی میں چلے جاتے ہو؟''

''نہیں...... ہم ان کے جانے کے بعد بھی یہیں موجود رہتے ہیں۔ ہم اس جگہ کی حفاظت کرتے ہیں۔'' اس نے کافی بڑے رقبے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

سلطانہ نے سر ہلایا اور انہیں پرنام کر کے پریتم کے ساتھ اس طرف روانہ ہو گیا جدھر انہوں نے گھوڑے باندھے تھے۔ ڈیرہ پر واپس پہنچ کر سلطانہ کئی دن تک گم صم سا رہا۔ وہ جب بھی چنبیلی کی طرف دیکھتا اس کے کانوں میں پیر صاحب کے الفاظ گونجنے لگتے۔ چنبیلی گو کہ ہمیشہ مردانہ روپ میں ہی ہوتی تھی لیکن سلطانہ جب بھی اس کی طرف دیکھتا اس کا تصور اسے اس کا زنانہ روپ ہی دکھاتا۔ مگر جب سے وہ پیر صاحب سے مل کر آیا تھا تب سے چنبیلی کے لئے اس کی گرمجوشی میں کمی آ گئی تھی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ چنبیلی نے اس تبدیلی کو محسوس کیا تھا یا نہیں...... بہرحال اس کے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ وہ اسی طرح جاں نثارانہ انداز میں سلطانہ کے گرد منڈلاتی رہتی تھی جیسے پروانہ شمع کے گرد منڈلاتا ہے لیکن یہاں معاملہ الٹ تھا۔ یہاں شمع پروانے کے گرد منڈلاتی تھی۔

بڑی مشکل سے سلطانہ نے پیر صاحب کی بات کو ذہن سے جھٹکا۔ چند دن گزرنے پر ویسے بھی اس کا اثر کچھ کم ہو گیا۔ اسی دوران ایک مخبر ایک ایسی خبر لایا جسے سن کر صرف سلطانہ کے

وجود میں ہی نہیں، پورے گروہ میں نئی زندگی کی لہرسی دوڑ گئی اور خاصے عرصے کے بعد ان سب نے اپنے آپ کو نہایت پُر جوش محسوس کیا۔ خبر یہ تھی کہ مراد آباد، بجنور، نجیب آباد اور بریلی میں حکومت کے محصولات میں جمع ہونے والی ایک بہت بڑی رقم جو لاکھوں میں تھی، اور سونے کی بہت سی سلاخیں جن کا وزن منوں میں تھا ریزرو بینک آف انڈیا میں جمع کرانے کے لئے مراد آباد سے دلّی بھیجی جا رہی تھیں۔

انتظامیہ اپنی دانست میں ہوشیاری یہ کر رہی تھی کہ یہ ساری رقم اور سونا جو ایک بہت بڑے خزانے سے کم نہیں تھا، لوہے کے ٹرنکوں میں سربمہر کر کے ڈاک کی آڑ میں ایک عام مسافر ٹرین کے ڈاک والے ڈبے میں بھیج رہی تھی۔ صرف دو گارڈ اس کی حفاظت کے لئے تعینات کئے جانے تھے۔ رقم اور سونا اکٹھا کر کے ٹرنکوں میں جمع کرنے کا کام بڑی رازداری سے مراد آباد کے بڑے ڈاکخانے میں ہی ہو رہا تھا جہاں کام کرنے والا ایک معمولی ملازم سلطانہ کے لئے مخبری کرتا تھا۔

اسے اتفاقاً ایک روز یہ کام ہوتا نظر آ گیا تھا لیکن پھر اسے ڈانٹ ڈپٹ کر اس ہال سے نکال دیا گیا تھا جہاں یہ کام ہو رہا تھا۔ نوٹوں کی گڈیاں اور سونے کی سلاخیں لوہے کے ان ٹرنکوں میں بھری جا رہی تھیں جو ڈاک کے کچھ مخصوص پارسل وغیرہ بھیجنے کے لئے استعمال ہوتے تھے۔ ان پر محکمے کا نام اور مخصوص نشان بھی ثبت تھا۔ ڈاکخانے کے ملازم نے اس سلسلے میں چپکے چپکے معلومات حاصل کی تھیں اور اس بات کا خیال رکھا تھا کہ کسی کی توجہ اس کی طرف مبذول نہ ہو۔

اس نے یہ معلومات سلطانہ کے ایک اور مخبر کو دی تھیں جو یہ خبر لے کر سلطانہ کے پاس آیا تھا۔ ابھی یہ طے نہیں ہوا تھا کہ یہ ٹرنک کس ٹرین سے بھیجے جانے تھے لیکن ڈاکخانے کے ملازم نے یقین دلایا تھا کہ اس بات کی اطلاع بھی وہ ایک دن پہلے بھجوا دے گا۔ اگر ان کا ٹرین سے یہ خزانہ لوٹنے کا پروگرام بن سکتا تھا تو انہیں پہلے سے تیار رہنا چاہیے تھا۔ سلطانہ نے فیصلے پر پہنچنے میں ایک لمحہ بھی نہیں لگایا۔

وہ تو کافی عرصے سے یہی سوچ رہا تھا کہ کیا اسے کوئی بڑا ہاتھ مارنے کے لئے اب روہیل کھنڈ اور اس کے اطراف کے علاقوں سے باہر نکلنا پڑے گا؟ جتنے بڑے خزانے کی خبر آئی تھی اتنے بڑے خزانے کے تو وہ صرف خواب ہی دیکھتا تھا اور اسے امید نہیں تھی کہ اتنی زیادہ دولت کبھی اس کے ہاتھ لگ سکتی ہے۔ اب اس کا امکان نظر آیا تو وہ سنجیدگی سے سوچنے لگا کہ یہ خزانہ

ملنے کے بعد وہ ڈاکا زنی چھوڑ دے گا اور کسی دور دراز علاقے میں جا کر حلیہ بدل کے چنبیلی کے ساتھ بیاہ کر کے آباد ہو جائے گا اور شرافت کی زندگی بسر کرے گا۔

کافی مال ان کے پاس پہلے ہی موجود تھا۔ اس متوقع خزانے کے حصے بخرے ہونے کے بعد تو بےفکری ہو سکتی تھی کہ اگر وہ زندگی بھر بیٹھ کر بھی کھائیں گے تب بھی کوئی تنگی نہیں ہوگی۔ سلطانہ کا ارادہ یہی تھا کہ اتنا مال آنے کے بعد وہ ساتھیوں سے کہہ دے گا کہ وہ سرداری چھوڑ رہا ہے، اس کی طرف سے سب آزاد ہیں، اگر کچھ ساتھی ڈاکا زنی جاری رکھنا چاہتے ہیں تو وہ نئے سرے سے اپنا گروہ بنا لیں اور اپنا نیا سردار چن لیں۔ سلطانہ کا ارادہ تھا کہ وہ انہیں اپنی آئندہ کی زندگی کے ارادوں کے بارے میں کچھ بتائے بغیر نامعلوم منزلوں کی طرف روانہ ہو جائے۔ ایک ڈاکو کی حیثیت سے اس نے اپنی زندگی کا یہ انجام سوچا ہوا تھا اور اس کا دل کہہ رہا تھا کہ اب اسے عملی شکل دینے کا وقت آ گیا ہے۔ شاید قدرت ہی اسے اس کا موقع فراہم کر رہی تھی۔

اس نے مخبر سے تصدیق چاہی۔ ”خبر پکی ہے نا، تم نے اپنے طور پر بھی سب پتا کر لیا ہے؟“

”خبر پتھر پر لکیر کی طرح ہے۔“ مخبر بولا۔ ”میں خود جا کر اپنے ڈاکخانے والے آدمی سے ملا تھا۔ پھر میں نے دور دور سے خود بھی ڈاکخانے پر نظر رکھی اور سن گن بھی لی۔ وہاں چپکے چپکے یہ خفیہ کارروائی چل رہی ہے۔ میں نے خاص طور پر دلّی سے آنے والے ایک انگریز افسر کو بھی دیکھا۔ وہ ریزرو بینک آف انڈیا کا افسر تھا۔ وہ شاید اپنی نگرانی میں ٹرنکوں کو سیل کروانے آیا تھا۔ دو تین گھنٹے بعد وہ چلا گیا۔ بس آج کل میں ٹرنک روانہ کئے جانے والے ہیں تم فوراً تیاری کر لو۔“

”تیاری میں کون سی دیر لگتی ہے۔“ سلطانہ مسکرایا۔ پھر اس نے مخبر کو اسکا انعام دے کر رخصت کر دیا۔ وہ اور بھورے اپنے ڈیرے سے دور ایک مخصوص پہاڑی کے دامن میں اس سے ملنے آئے تھے۔

ڈیرے پر واپس پہنچ کر سلطانہ نے یہ خبر ساتھیوں کو سنائی تو ان کے جسموں میں جیسے بجلی سی دوڑ گئی۔ ٹرین پر حملے کا منصوبہ بننے لگا۔ نقشے وغیرہ بنانے میں صادق سب سے ہوشیار تھا۔ ٹرین کے روٹ کا نقشہ تیار کیا گیا۔ نقشے میں سلطانہ نے ایک جگہ کی نشاندہی کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ کچھ پہاڑی سا علاقہ ہے۔ مراد آباد سے دلی جانے والی ٹرین کے راستے میں یہاں تھوڑی سی چڑھائی

آتی ہے اور ٹرین کی رفتار بہت کم ہو جاتی ہے۔"

"بھورے نے بھی اس بات کی تصدیق کی۔ سلطانہ سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے بولا۔

"یہاں آس پاس پہاڑیاں بھی ہیں جن کے پیچھے ہم چھپے رہیں گے، جونہی ٹرین کی رفتار کم ہوگی ہم اسکے پاس پہنچ جائیں گے۔ ہمیں ٹرین کے دونوں طرف سے دھاوا بولنا ہوگا۔ میں اور بھورے انجن پر چڑھ جائیں گے اور وہاں موجود تین آدمیوں کو قابو میں کر کے یا جان سے مار کر ٹرین روک دیں گے۔ یہ کوئی زیادہ مشکل کام نہیں ہے۔ آٹھ آدمی خاص طور پر ڈاک کے ڈبے پر دھاوا بولیں گے۔ باقی لوگ ٹرین کے مسافروں کو ڈرا کر خاموش بٹھانے کے لئے فائرنگ کریں گے اور اگر ضرورت پڑی تو کچھ لوگوں کو مار بھی دیں گے۔"

یہ کہتے ہوئے سلطانہ نے مشورہ طلب انداز میں بھورے کی طرف دیکھا۔ بھورے نے تائید میں سر ہلایا۔



سلطانہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا......"ہمیں نوٹوں اور سونے سے بھرے صندوق لاد کر لانے کے لئے ایک چھوٹی سی اور ہلکی گھوڑا گاڑی کا بھی بندوبست کرنا ہوگا۔ اسے بھی ہم پہاڑیوں کی اوٹ میں چھپا دیں گے۔ ڈاک کے ڈبے پر حملے کے دوران اگر اندر زیادہ گارڈ نظر آئے تو کچھ اور ساتھی بھی مدد کے لئے پہنچ جائیں گے۔ ویسے فی الحال تو مخبروں کی اطلاع یہی ہے کہ ڈبے میں صرف دو گارڈ اور ایک ریلوے کا آدمی ہوگا کیونکہ انتظامیہ کا خیال ہے ان کا یہ ڈراما کامیاب رہے گا کہ دوسرے تھیلوں وغیرہ کی طرح ان ٹرنکوں میں بھی ڈاک ہی ہے۔"

وہ بیٹھ کر دیر تک منصوبے کی نوک پلک سنوارتے رہے۔ آخر کار سب کچھ طے پا گیا۔

دوسرے دن ایک چھوٹی سی گھوڑا گاڑی کا بندوبست بھی کر لیا گیا۔ چنبیلی کو یہ ذمے داری سونپی گئی کہ جب لوٹ کا مال گھوڑا گاڑی میں لاد دیا جائے گا تو وہ اسے ڈیرے تک لائے گی اور بھورے اس کے پیچھے پیچھے حفاظت کے لئے آئے گا۔ اسی طرح دوسرے تمام ساتھیوں کو بھی ذمے داریاں سونپ دی گئی تھیں۔ کسے کہاں رہنا تھا اور کن حالات میں کیا کرنا تھا یہ سب کچھ طے ہو چکا تھا۔ سلطانہ نے یہ ہدایت بھی کی تھی کہ جب تک کوئی مسافر ان کے راستے کی دیوار نہ بنے یا ان پر حملہ آور نہ ہو تب تک اسے ہلاک نہ کیا جائے۔ یوں سب تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ اب انہیں صرف اس اطلاع کا انتظار تھا کہ وہ ٹرین مراد آباد سے دلی کے لئے کب روانہ ہوگی جس میں وہ خزانہ ہوگا جو سرکار کے لئے تو شاید معمولی تھا لیکن سلطانہ اور اس کے گروہ کے لئے بہت بڑا تھا۔

مخبروں کو ٹرین کی روانگی کی اطلاع دینے میں ذرا تاخیر ہوگئی کیونکہ اس کے بارے میں بہت زیادہ رازداری برتی جارہی تھی۔ اگر سلطانہ اس سلسلے میں ساری تیاریاں کئے نہ بیٹھا ہوتا تو شاید اس کے لئے موقع سے فائدہ اٹھانا ممکن نہ ہوتا۔ ان کے پاس صرف تین گھنٹے تھے۔ تین

گھنٹے بعد ٹرین کو چڑھائی والے اس نیم پہاڑی علاقے سے گزرنا تھا جہاں اس کی رفتار بہت کم ہوجاتی تھی۔ وہ خاصی بھگدڑ اور افراتفری میں اپنی مہم کے لئے روانہ ہوئے۔

وہ جب ویرانے میں اپنے مطلوبہ مقام پر پہنچے تو دور دور تک ٹرین کی آمد کے کوئی آثار نہیں تھے۔ سلطانہ نے چاندی کی پتلی سی زنجیر سے بندھی گھڑی جیب سے نکال کر دیکھی۔ انہوں نے جو حساب کتاب لگایا تھا اس کے مطابق ٹرین کی آمد میں ابھی کم از کم آدھا گھنٹہ باقی تھا۔ اس نے اطمینان کی سانس لی۔ تمام تر بھگدڑ اور افراتفری کے باوجود وہ صحیح وقت پر پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کے پیچھے پناہ لے لی اور اپنے گھوڑوں کو بٹھا دیا۔

مراد آباد کی سمت میں تقریباً ایک میل آگے ٹرین کی پٹڑی میں نیم دائرے جیسا گھماؤ تھا۔ اس سے آگے پٹڑی پہاڑیوں اور درختوں کی آڑ میں چھپی ہوئی تھی۔ سلطانہ اور اس کے ساتھیوں میں سے جو بھی وہاں تک دیکھ پا رہے تھے ان کی نظریں ادھر ہی جمی ہوئی تھیں اور وہ سب خاموش تھے۔ ان کے اعصاب پر تناؤ تھا۔ سلطانہ کے دل کی دھڑکنیں بھی معمول سے کچھ تیز تھیں۔ اسے اپنی کامیابی کا تقریباً سو فیصد یقین تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ اس واردات کے بعد اس کا نام شاید ہندوستان کے ڈاکوؤں کی تاریخ میں امر ہوجائے گا کیونکہ یہ اب تک کی سب سے بڑی اور انوکھی واردات ہوگی۔ اپنی ڈکیتیوں کے ریکارڈ میں یہ حرف آخر درج کرنے کے بعد اسے ویسے بھی اس پیشے کو خیر باد کہہ دینا تھا۔ اس سے زیادہ بھلا کوئی ڈاکو کیا کرسکتا تھا؟ وہ اپنے اس فیصلے پر بے حد مطمئن تھا۔

وہ نیم پتھریلی زمین پر سینے کے بل لیٹا ہوا تھا۔ بھورے اس کے دائیں ہاتھ پر تھا اور چنبیلی بائیں ہاتھ پر۔ اچانک انہیں کہیں دور سے انجن کے وسل کی نہایت مدھم سی آواز سنائی دی اور وہ سب چوکنا ہوگئے۔ پھر انہوں نے پہاڑیوں اور درختوں کے عقب سے دھواں بلند ہوتے اور ہوا میں تحلیل ہوتے دیکھا۔ ان کے اعصاب کچھ اور تن گئے۔ پھر ٹرین نیم دائرے میں گھومتی پٹڑی پر نمودار ہوتی دکھائی دی۔ چڑھائی شروع ہوچکی تھی اور سیاہ انجن دھواں اگلتا چھک چھک کرتا گویا دشواری سے آگے بڑھ رہا تھا۔ سلطانہ کو یوں لگا جیسے اس کے ساتھیوں نے شاید غیر ارادی سے انداز میں سانسیں بھی روک لی تھیں۔

اس نے دوربین آنکھوں سے لگالی اور منظر کچھ واضح ہوگیا۔ ٹرین کی بعض کھڑکیوں سے رنگا رنگ آنچل بھی لہراتے نظر آرہے تھے۔ شاید وہ زنانہ کمپارٹمنٹ تھے۔ ٹرین جوں جوں

چڑھائی کی طرف آرہی تھی اس کی رفتار مزید کم ہورہی تھی۔ آخر کار دھیرے دھیرے وہ اس مقام پر پہنچ ہی گئی جس کے بارے میں سلطانہ اور اس کے ساتھیوں نے طے کیا تھا کہ اس کے وہاں پہنچتے ہی وہ پہاڑیوں کی اوٹ سے نکل آئیں گے اور آدھے ساتھی پٹڑی عبور کرکے دوسری طرف پہنچ جائیں گے تاکہ ٹرین کو دونوں طرف سے گھیرا جاسکے۔

انہوں نے اپنے گھوڑوں کو اٹھایا پھرتی سے ان پر سوار ہوئے اور انہیں دوڑاتے ہوئے پٹڑی کی طرف چل دیئے۔ ٹرین ابھی کچھ دور تھی جب ان کے آدھے ساتھی پٹڑی عبور کرتے ہوئے دوسری طرف چلے گئے۔ سلطانہ نے گھوڑا روک لیا اور منتظر رہا کہ انجن اس کے قریب آئے تو وہ اس میں چڑھ جائے۔ چنبیلی اور بھورے کو بھی اسکے ساتھ ہی انجن کے کیبن میں داخل ہونا تھا۔

سلطانہ نے ڈاک کی بوگی دور سے ہی دیکھ لی تھی۔ وہ سرخ رنگ کی تھی اور اس کے دروازے سے ذرا اوپر محکمہ ڈاک کا مخصوص نشان بھی بنا ہوا تھا۔ اس کا دروازہ بند تھا۔ اس میں وہ خزانہ موجود تھا جسے حاصل کرنے کے بعد سلطانہ کو اپنی زندگی کا راستہ بدل لینا تھا۔ ٹرین قریب آئی تو سلطانہ نے اسی کے رخ پر گھوڑا دوڑانا شروع کیا۔ انجن ان کے قریب آیا تو اس کی رفتار بالکل کم ہوچکی تھی۔

سلطانہ، چنبیلی اور بھورے کو انجن پر چڑھ کر ٹرین کو روکنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ ٹرین خود بخود ہی رک گئی اور پھر سلطانہ کو کچھ یوں لگا جیسے اَن گنت دھماکوں کے ساتھ آسمان اس پر ٹوٹ پڑا ہے۔ انجن میں عام طور پر دو یا زیادہ سے زیادہ تین آدمی موجود ہوتے تھے لیکن اس انجن میں سات آٹھ آدمی موجود تھے اور ان سب کے پاس دور مار رائفلیں تھیں۔ وہ سب مختلف چیزوں کی آڑ لئے ہوئے تھے۔

سلطانہ اور اس کے ساتھیوں کو ابھی فائر کرنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا کہ ان پر گویا قیامت ٹوٹ پڑی۔ پوری ٹرین کی کھڑکیوں سے ان پر گولیوں کی بارش ہورہی تھی۔ سلطانہ نے اپنے قریب ہی بھورے کو گھوڑے سے گرتے ہوئے دیکھا۔ اس نے تیزی سے گھوڑے کو موڑا اور انجن کے عین آگے چلا گیا۔ وہاں کم از کم کوئی اسے براہ راست نشانہ نہیں بنا سکتا تھا۔ اس نے دیکھا چنبیلی نے گھوڑے سے چھلانگ لگادی تھی اور لڑھکتی ہوئی ٹرین کے پہیوں کے قریب آگئی تھی۔ یہ اس نے عقلمندی کی تھی۔ اسے کم از کم آڑ میسر آگئی تھی۔ وہ اوپر کھڑکیوں کی طرف فائرنگ

کرنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن کوئی بھی اس کی زد پہ نہیں آ رہا تھا۔

چشم زدن میں سلطانہ کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ وہ زندگی کا سب سے بڑا دھوکا کھا گیا تھا جس کا خمیازہ شاید اسے جان دے کر بھگتنا تھا۔ وہ گھوڑے سے انجن کے اگلے حصے پر چڑھ گیا اور وہاں سے چھت پر چلا گیا۔ انجن لمبوترا اور گول تھا۔ اس کی بڑی سی چمنی سے سیاہ کثیف دھواں اب بھی خارج ہو رہا تھا اور نیچے دہکنے والے کوئلوں کی تپش اوپر تک پہنچ رہی تھی۔ سلطانہ کا دم گھٹ رہا تھا لیکن ایک آگ اس کے سینے میں بھی بھڑک رہی تھی۔ وہ اپنے آپ کو ایک زخمی درندہ محسوس کر رہا تھا۔

اس کا دل چاہ رہا تھا کہ ساری دنیا کو آگ لگا دے لیکن اس کا بس نہیں چل رہا تھا۔ اس نے ٹرین کے دونوں طرف اپنے ساتھیوں کو یکے بعد دیگرے گھوڑوں سے گرتے دیکھا۔ کئی ساتھی گھوڑوں سمیت گر گئے تھے۔ بچنے والے اِدھر اُدھر گھوڑے دوڑاتے ہوئے ٹرین پر اندھا دھند فائرنگ کر رہے تھے مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ لوہے کے کسی قلعے سے سر پھوڑ رہے تھے جبکہ وہ خود کھلے میدان میں تھے اور نہایت آسانی سے گولیوں کا نشانہ بن رہے تھے۔

ٹرین میں شاید ایک بھی مسافر نہیں تھا۔ وہ ساری کی ساری پولیس والوں ...... یا پھر شاید فوجیوں سے بھری ہوئی تھی۔ سیکڑوں گولیاں ضائع کرنے کے بعد اچانک سلطانہ کو کوئی خیال آیا۔ اس نے کمر سے بندھے ہوئے تھیلے میں سے ایک دستی بم نکالا اور دانتوں سے پن نکال کر قریب ترین کمپارٹمنٹ کی چھت پر پھینکا۔ چھت کے کچھ حصے کے پرخچے اُڑ گئے اور اس میں ایک بڑا شگاف ہو گیا۔

اسے دوسرا ہینڈ گرینیڈ پھینکنے کی مہلت نہیں ملی کیونکہ اسی اثناء میں اس کی آنکھوں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ انجن سے کچھ دور جس بوگی کی چھت پر سلطانہ نے بم پھینکا تھا اس سے اگلی بوگی کی جگہ درحقیقت مال گاڑی کا کھلا ڈبا لگا ہوا تھا جس پر ترپال پڑی ہوئی تھی یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ سامان کی نقل وحمل کے لئے بعض مسافر گاڑیوں میں اس طرح مال گاڑی کے ایک دو ڈبے بھی جوڑ دیئے جاتے تھے لیکن اچانک اس ڈبے کی ترپال ہٹ گئی اور تب سلطانہ کو پتہ چلا! کہ وہ ڈبا بھی درحقیقت باربرداری وغیرہ کے لئے ہرگز نہیں تھا۔

سلطانہ نے اس میں بڑی سی نال والی ایک عجیب وغریب بندوق نصب دیکھی۔ اس میں

گولیوں کی لمبی سی پٹی لٹکی ہوئی تھی۔ نال کے نیچے ڈرم نما گول حصہ تھا۔ اس گن کی نال آہستگی سے چاروں طرف گھومنے لگی۔ اور تڑتڑاہٹ کی مزید بھیانک آواز کیساتھ گولیاں اگلنے لگی۔ سلطانہ خود ان گولیوں کی زد میں آتے آتے بچا۔ وہ پھرتی سے ٹرین کے انجن پر اوندھا لیٹ گیا۔ اس لمحے اس کی سمجھ میں آ گیا کہ وہ مشین گن تھی۔ اس نے اس سے پہلے مشین گن نہیں دیکھی تھی البتہ تذکرہ سنا تھا کہ کچھ عرصہ پہلے ایک ایسی گن ایجاد ہوئی ہے جو چاروں طرف گھومتے ہوئے گولیوں کی بارش کرتی چلی جاتی ہے۔

اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ آج اسے مشین گن سے بھی واسطہ پڑے گا۔ مشین گن کافی اونچائی پر نصب تھی اور اس کا مقصد شاید یہی تھا کہ ڈاکو اگر ٹرین کی چھتوں پر چڑھنے میں کامیاب ہو جائیں تب بھی انہیں مار کر گرایا جا سکے۔ اسی دوران سلطانہ نے اس کی نالی نیچی ہوئی بھی دیکھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ اوپر نیچے کی طرف اور ہر زاویے سے فائر کر سکتی تھی۔

پھر یہ دیکھ کر اس کا دل بیٹھ گیا کہ ویسی ہی ایک مشین گن بہت پیچھے تقریباً آخری ڈبے میں بھی لگی ہوئی تھی۔ اس پر سے بھی ترپال ہٹ چکی تھی۔ اس گن کی سلطانہ صرف جھلک ہی دیکھ پایا تھا لیکن اسے اس کی تباہ کاری کا اندازہ ہو رہا تھا۔ اس کے تقریباً سبھی ساتھی مر چکے تھے۔ انہیں سنبھلنے یا کہیں پوزیشن لینے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ اس قسم کے حالات کا سامنے ہونے کے بارے میں شاید انہوں نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ یہ یقیناً فریڈی ینگ کی منصوبہ بندی تھی۔ انگریز نے آخر کار اپنی حکمت عملی دکھا ہی دی تھی۔

کافی دنوں تک نرمی دکھا کر آخر کار اس نے بھرپور قوت کے ساتھ فیصلہ کن وار کیا تھا۔ اس کے انتظامات کچھ ایسے تھے جیسے وہ ایک باقاعدہ فوج سے مقابلہ کرنے نکلا ہو۔ جال بھی اس نے خوب بچھایا تھا۔ سلطانہ واقعی بے وقوف بن گیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس کے مخبروں نے اسے دھوکا نہیں دیا تھا۔ مخبروں کے سامنے پوری طرح ڈراما رچایا گیا ہوگا۔ انہیں نوٹوں اور سونے کے انبار کی جھلک بھی دکھائی گئی ہوگی۔

ٹرین کے دونوں طرف ڈاکوؤں اور گھوڑوں کی لاشیں بکھری ہوئی تھیں لیکن ویرانہ ابھی تک زبردست فائرنگ کے دھماکوں سے لرز رہا تھا اور سلطانہ کو اپنے کانوں کے پردے پھٹتے محسوس ہو رہے تھے۔ پھر اس نے ایک گھڑ سوار کو ایک سمت میں فرار ہوتے دیکھا۔ وہ غالباً نگینہ تھا' جو جان بچا کر فرار ہونے میں کامیاب ہوتا دکھائی دے رہا تھا' لیکن پھر سلطانہ کی آنکھوں نے

ایک اور حیرت انگیز منظر دیکھا۔

شاید کسی بوگی کا دروازہ کھلا تا اور اس میں سے ایک تختہ زمین پر ٹکایا گیا تھا۔ اس تختے پر دوڑتے ہوئے کئی گھوڑے آگے پیچھے باہر آئے جن پر سوار بھی موجود تھے۔ ان کے سروں پر فوجیوں جیسی لوہے کی ٹوپیاں تھیں۔ شاید ان کے لباسوں کے نیچے زرہ بکتر بھی موجود ہو۔ وہ سب نکلیشر کے تعاقب میں روانہ ہو رہے تھے۔ شاید انہوں نے عہد کیا تھا کہ وہ ایک ڈاکو بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔

چنبیلی اسے نظر نہیں آ رہی تھی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ زندہ بھی تھی یا نہیں۔ اس نے تھیلے سے ایک گرینیڈ نکال کر مشین گن والے ڈبے پر پھینکنے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ انجن کے بالکل قریب ایک گرینیڈ آ کر گرا اور زمین پر پھٹ گیا۔ گرد و غبار اور ٹوٹتے پتھروں کا ایک چھوٹا موٹا طوفان سا اٹھا۔ اس کا مطلب تھا کہ انجن کے اوپر کسی کو اس کی موجودگی کا احساس ہو گیا تھا۔ گرینیڈ یقیناً اس پر پھینکا گیا تھا' لیکن سلطانہ کی خوش قسمتی تھی کہ وہ انجن کی چھت پر گرنے کے بجائے نیچے گر گیا تھا۔ اسی نامعلوم سمت سے گرنے والا دوسرا گرینیڈ اس کی موت کا پروانہ بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ نیچے انجن کے کیبن میں بھی نہ جانے کتنے مسلح افراد موجود تھے۔ وہ بھی اوپر کا رخ کر سکتے تھے۔ ضروری نہیں تھا کہ سلطانہ سبھی کو ہلاک کرنے میں کامیاب ہو جاتا۔ گویا اس وقت درحقیقت خود اس کی اپنی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔

اب مقابلہ کرنے کا کوئی مقصد نہیں رہا تھا۔ اس نے جان بچانے کا فیصلہ کیا۔ وہ انجن کے سامنے کی طرف سے نیچے پھسل آیا۔ جہاں سے اسے دیکھا نہیں جا سکتا تھا۔ اپنی جان کے علاوہ اب اسے صرف چنبیلی کی فکر تھی۔ اس نے ابھی تک چنبیلی کی لاش نہیں دیکھی تھی۔ شاید ابھی قسمت اس کا تھوڑا بہت ساتھ دے رہی تھی۔ وہ نیچے اترا تو انجن کے عین سامنے اپنا گھوڑا زندہ سلامت کھڑا نظر آیا اور چنبیلی انجن کے نیچے دبکی ہوئی تھی۔ اس نے بڑی اچھی جائے پناہ تلاش کی تھی۔ تاہم اس دوران اس کی پگڑی کہیں گر گئی تھی جس کی وجہ سے وہ کٹے ہوئے بالوں کے باوجود کافی حد تک عورت دکھائی دینے لگی تھی۔

اس وقت کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ سلطانہ کے تقریباً تمام ساتھیوں کے مارے جانے کے باوجود فائرنگ میں کوئی خاص کمی نہیں آئی تھی۔ ایسا لگتا تھا وہ لوگ کسی میں سانس کی رمق بھی باقی نہیں چھوڑنا چاہتے تھے۔ سلطانہ نے چنبیلی کو اپنے پیچھے گھوڑے پر سوار

ہونے کا اشارہ کیا۔ انجن کے بالکل آگے ہونے کی وجہ سے وہ شاید چند لمحوں کے لئے کسی کی نظر میں آنے سے محفوظ تھے۔ چنبیلی انجن سے نکلی اور اچھل کر گھوڑے پر سوار ہو گئی۔ سلطانہ پہلے ہی بیٹھ چکا تھا۔

سلطانہ نے گھوڑے کو پٹریوں کے درمیان ہی انجن کی سیدھ میں رکھا۔ گو کہ پتھروں اور پٹریوں کے تختوں پر اس کا دوڑنا خطرناک تھا' لیکن چیتک پھر بھی برق رفتاری سے دوڑتا چلا گیا۔ اس طرف شاید کسی کی نظر نہیں تھی۔ اس لئے وہ کچھ دور تک نکلتا چلا گیا' لیکن پھر گولیاں اس کے تعاقب میں آنے لگیں۔ اس نے گھوڑے کو پٹریوں کے درمیان سے ہٹا لیا اور ایک سمت میں روانہ ہو گیا۔ اس کی خوش قسمتی تھی کہ چند سیکنڈ میں ہی وہ گولیوں کی رسائی سے دور نکل گیا۔

مزید چند فرلانگ دور جانے کے بعد چنبیلی نے اسے بتایا کہ ان کا تعاقب ہو رہا تھا۔ اس نے گردن گھما کر دیکھا اور حیران رہ گیا۔ سات آٹھ گھڑسوار ان کے تعاقب میں آ رہے تھے۔ ان کے سروں پر بھی لوہے کی ٹوپیاں تھیں۔ انہوں نے گولیاں بھی چلائیں' لیکن وہ شاید سلطانہ تک نہیں پہنچیں۔ تعاقب جاری رہا۔ پولیس والوں کے گھوڑے شاید رفتار میں چیتک کا مقابلہ نہ کر پاتے' لیکن اپنی پیٹھ پر ایک کے بجائے دو انسانوں کا بوجھ ہونے کی وجہ سے دھیرے دھیرے چیتک تھکنے لگا اور اس کی رفتار کم ہونے لگی۔ ادھر پولیس والوں نے شاید تہیہ کیا ہوا تھا کہ وہ ہر قیمت پر سلطانہ تک پہنچیں گے۔ رفتہ رفتہ فاصلہ کم ہونے لگا۔

پولیس والوں نے ایک بار پھر فائرنگ شروع کر دی۔ ایک گولی چیتک کی ران کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ گھوڑے کی ران سے خون بہنے لگا لیکن وہ جس طرح بھاگ رہا تھا اسی طرح بھاگتا رہا۔ ایک اور گولی سلطانہ کے کندھے کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ سلطانہ کو یوں لگا جیسے کوئی انگارہ اس کے کندھے سے رگڑ کھاتا ہوا گزر گیا ہو۔ چنبیلی نے اسے بتایا۔ ''جو لوگ ہمارا پیچھا کر رہے ہیں ان میں سب سے آگے ڈی ایس پی جاوید ملک ہے...... اسی کے کہنے پر آئی جی صاحب نے میری گرفتاری کا حکم دیا تھا۔''

''ہوں......'' سلطانہ کسی درندے کی طرح غرایا۔ اس کے دانت سختی سے ایک دوسرے پر جمے ہوئے تھے۔ پھر اس نے اچانک گھوم کر فائر کئے۔ تعاقب میں آنے والوں میں سے تین آدمی گھوڑوں پر سے لڑھک گئے۔ چنبیلی نے بھی ایک ہاتھ سے سلطانہ کو تھام کر رکھتے ہوئے ذرا گھوم کر فائر کئے۔ ایک آدمی اور گرا' مگر اسی دوران ایک گولی سلطانہ کی ٹانگ میں لگی۔ اس کی

پنڈلی میں آگ سی بھر گئی اور چند سیکنڈ بعد ہی خون کی بوندیں زمین پر ٹپکنے لگیں۔ درد کی ایک لہر سلطانہ کے پورے وجود میں دوڑنے لگی۔ وہ دانت پر دانت جمائے گھوڑے کو دوڑاتا رہا۔

مزید کچھ دیر گولیوں کا تبادلہ ہوتا رہا' لیکن دونوں طرف کسی کو گولی نہیں لگی۔ اس دوران وہ ایک ندی تک جا پہنچے۔ جسے پر چڑھنے کے لئے موٹے رسوں اور لکڑی کے تختوں سے بنا ہوا ایک پل جھول رہا تھا۔ جس کے سرے دونوں کناروں پر دو نوکیلی چٹانوں سے بندھے ہوئے تھے۔ اس پر گھوڑا نہیں چل سکتا تھا' کیونکہ تختوں کے درمیان تھوڑا تھوڑا فاصلہ تھا اور تختے زیادہ چوڑے نہیں تھے۔ سلطانہ نے دل پر پتھر رکھ کر چیتک کو وہیں چھوڑ دیا اور چنبیلی کو آگے رہنے کی ہدایت کرتے ہوئے تیزی سے پل عبور کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

اس نے پلٹ کر دیکھا تو گھڑسوار کافی قریب آ چکے تھے۔ اب وہ تعداد میں صرف چار رہ گئے تھے۔ سب سے آگے وہی تھا جو اس کے اندازے کے مطابق جاوید ملک تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ ایک جنون کے سے عالم میں اس کا تعاقب کر رہا تھا اور کسی قیمت پر اس کا پیچھا چھوڑنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ سلطانہ نے چنبیلی کو پل کے تختے پھلانگ کر آگے بڑھتے رہنے کی ہدایت کی اور خود ایک گھٹنے کے بل بیٹھ کر پولیس والوں پر ایک فیصلہ کن وار کرنے کی کوشش کی۔ وہ لوگ بھی سلطانہ اور چنبیلی پر فائرنگ کر رہے تھے لیکن ان کی خوش قسمتی تھی کہ وہ اس کی زد میں نہیں آ رہے تھے۔

سلطانہ نے اپنی خصوصی مہارت کے ساتھ نشانے پر لے کر فائر کئے تو جاوید کے تینوں ساتھی گھوڑوں سے گر گئے اور جہاں گرے تھے وہیں پڑے رہ گئے۔ ان کے گھوڑے بھی شاید زخمی ہو گئے تھے' مگر اِدھر اُدھر بھاگ گئے۔ جاوید ملک کو بھی غالباً ٹانگ میں گولی لگی' لیکن وہ گھوڑے سمیت گرنے کے باوجود ساکت نہیں ہوا۔ وہ گھٹنوں کے بل چلتا ہوا جلدی سے ایک پتھر کی اوٹ میں ہو گیا۔

سلطانہ نے اسے اس کے حال پر چھوڑا اور چنبیلی کے پیچھے بھاگا۔ تختے ایک دوسرے سے کچھ فاصلے پر تھے۔ اس کے تیز دوڑنے کی وجہ سے پل دھیرے دھیرے کسی جھولے کی طرح ہلکورے لینے لگا تھا۔ ٹانگ میں شدید تکلیف کی وجہ سے اسے پل کے وسط میں رکنا پڑا۔ اس نے گردن گھما کر پیچھے دیکھا تو حیران رہ گیا۔ جاوید ملک بری طرح لنگڑاتا اور گرتا پڑتا پل کے قریب آ گیا۔ پھر وہ ایک شکاری چاقو سے پل کے موٹے رسے کو کاٹنے لگا۔ اس کے ذہن نے خوب کام کیا تھا۔ اگر وہ پل کے دونوں رسے کاٹ دیتا تو پل چوڑی ندی میں لٹک جاتا۔ سلطانہ

اور چنبیلی پل سے گر جاتے یا پھر کوئی تختہ پکڑ کر لٹک جاتے لیکن آخر وہ کب تک لٹکے رہ سکتے تھے؟

سلطانہ نے ایک بار پھر جاوید کو گولی کا نشانہ بنانے کی کوشش کی لیکن اس کی گن خالی ہو چکی تھی اور اسے دوبارہ لوڈ کرنے کا وقت نہیں تھا' کیونکہ جاوید کے پاس گن بھی تھی۔ وہ رسا کاٹنے کے بجائے ان پر فائر بھی کر سکتا تھا۔ اسے احساس نہیں ہوا تھا کہ سلطانہ کی گن کا کلپ خالی ہو گیا تھا۔ سلطانہ ایک بار پھر اپنی شدید تکلیف کو ضبط کرتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ چنبیلی اس وقت تک دوسرے سرے پر پہنچ چکی تھی۔ اس ساری بھگدڑ اور افراتفری میں ان کی گن کہیں گر چکی تھی۔ وہ ندی کے دوسرے کنارے پر پہاڑی پر چڑھ گئی۔

عین اسی لمحے جاوید ملک دونوں طرف کے موٹے رسے کاٹنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ پل یکدم نیچے کی طرف جھول گیا۔ اگر سلطانہ بروقت ایک تختہ پکڑ کر نہ لٹک جاتا وہ نیچے ندی میں گر چکا ہوتا۔ عین ممکن تھا کہ اتنی بلندی سے گرنے پر ندی کی تہہ میں کسی پتھر سے ٹکرا کر اس کا سر پاش پاش ہو جاتا۔ اس نے اپنے عقب میں جاوید کے مجنونانہ سے قہقہے کی آواز سنی' جو اس تک پہنچتے پہنچتے ذرا مدھم ہو گئی تھی۔ وہ شخص واقعی ایک جنون کی سی کیفیت میں اس کے پیچھے لگا ہوا تھا۔

سلطانہ ایک کے بعد دوسرا تختہ پکڑ کر تیزی سے اوپر پہنچنے کی کوشش کرنے لگا' جہاں چنبیلی چٹان پر بہ مشکل پاؤں جما کر اس کی طرف جھکی ہوئی تھی اور اس کا ہاتھ تھامنے کے لئے ہاتھ بڑھائے ہوئے تھی۔ سلطانہ کی گن ندی میں گر چکی تھی۔ جاوید نے ایک بار پھر گن استعمال کرنا شروع کر دی۔ اس نے فائر کیا اور گولی سلطانہ کے کان کے قریب سے گزرتی ہوئی چٹان سے ٹکرائی۔ پتھروں کا کچھ حصہ ٹوٹ کر ندی میں جا گرا۔ سلطانہ نے سانس روک لی' لیکن اوپر چڑھنے کی جدوجہد جاری رکھی۔ وہ کسی بھی لمحے جاوید ملک کی چلائی ہوئی گولی کا نشانہ بن سکتا تھا۔

ایک گولی اس کی پگڑی کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ اس وقت تک وہ اوپر پہنچ چکا تھا۔ چنبیلی کا ہاتھ تھامنے کی وجہ سے بھی اسے سہارا ملا اور وہ چٹان پر چڑھ گیا۔ وہ گھٹنوں کے بل کھڑا بری طرح ہانپ رہا تھا کہ اچانک چنبیلی نے تیزی سے آگے ہو کر اسے اپنی اوٹ میں لے لیا۔ اسی لمحے ایک اور فائر ہوا۔ چنبیلی اس کے قریب ہی ڈھیر ہو گئی۔ تب سلطانہ کی سمجھ میں آیا کہ چنبیلی نے یقیناً جاوید کو اس کا نشانہ لیتے دیکھ لیا تھا اور وہ اس کی ڈھال بن گئی تھی۔ اگر وہ آگے نہ آئی ہوتی تو یہ گولی یقیناً سلطانہ کو لگتی اور شاید اس کے لئے موت کی پیامبر ثابت ہوتی۔

سلطانہ کے دل میں جیسے کسی نے خنجر اتار دیا۔ گولی چنبیلی کی پسلیوں میں لگی تھی۔ وہ یقیناً

موت کے منہ میں جارہی تھی' لیکن آنکھیں بہ مشکل کھولتے ہوئے سلطانہ کی طرف دیکھ کر مسکرانے کی کوشش کررہی تھی۔ سلطانہ اسے جلدی سے گھسیٹ کر چٹان کی اوٹ میں لے گیا۔ اب وہ جاوید ملک کی چلائی ہوئی گولیوں سے محفوظ رہ سکتے تھے۔ اسی دوران چنبیلی کے منہ سے بھی خون ابل پڑا۔

"یہ تم نے کیا کیا چنبیلی؟" سلطانہ گلوگیر آواز میں بولا۔ "تمہیں میری ڈھال بننے کی کیا ضرورت تھی؟"

"مجھے پریتم نے بتایا تھا...... تم کچھ عرصے پہلے...... پیر مخدوم سے...... ملنے گئے تھے۔" چنبیلی ٹوٹتی سانسوں کے درمیان سرگوشی کے سے انداز میں بولی۔ "اور انہوں نے کہا تھا کہ کسی عورت کا ساتھ...... تمہارے لئے منحوس ثابت ہوگا......" تب سے میں سوچ رہی تھی کہ...... وہ عورت شاید میں ہی ہوں...... میں نے سوچا...... اپنی جان کا بلیدان کر کے...... اپنا جیون تم پر نچھاور کر کے...... یہ نحوست تم پر سے دور کردوں...... اس سے زیادہ تمہارے لئے کچھ کرنا میرے بس میں نہیں تھا...... ورنہ وہ بھی ضرور کرتی......"

اس نے سلطانہ کے دونوں ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لئے۔ عالم نزع میں اسے ایک جھٹکا سا لگا۔ پھر اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ سلطانہ اس کی لاش پر سر ٹکا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ بالکل اسی طرح وہ پتلی کی لاش پر بھی رویا تھا' لیکن آج اس کی حالت اس وقت سے زیادہ خراب تھی۔ آج تو جیسے وہ خود بھی اندر سے مرگیا تھا۔ بہت دیر تک روتے رہنے کے بعد اس کا دل تو ہلکا ہوگیا' لیکن ٹانگ کی تکلیف ابھر آئی۔ اس کی پنڈلی میں سے گولی پار ہوگئی تھی۔ غنیمت تھا کہ ہڈی ٹوٹنے سے بچ گئی تھی۔ کافی خون بہہ گیا تھا۔ اب ذرا رکا تھا' لیکن وہ ٹانگ کو حرکت دیتا تھا تو تھوڑا تھوڑا خون اب بھی رسنے لگتا تھا۔

اس نے پہاڑی کے عقب سے جھانک کر دیکھا۔ جاوید ملک غائب ہو چکا تھا۔ پولیس والوں کی لاشیں وہیں ندی کے دوسرے کنارے سے ذرا آگے پڑی تھیں۔ سلطانہ کو معلوم تھا کہ اسے بھی چنبیلی کی لاش وہیں چھوڑ کر آگے روانہ ہونا پڑے گا۔ یہ طے تھا کہ جلد یا بہ دیر پولیس کی کمک یہاں پہنچے گی اور وہ لوگ کسی دوسری جگہ سے ندی عبور کر کے اس کی تلاش میں آئیں گے۔ وہ لنگڑاتا ہوا بڑی مشکل سے پہاڑی سے نیچے آیا۔ درخت کی ایک ٹوٹی ہوئی شاخ کو لاٹھی کے طور پر استعمال کرتے ہوئے وہ ایک طرف بڑھنے لگا۔

اس کے پاس ایک پستول اور دوربین اب بھی موجود تھی۔ باقی چیزیں گر چکی تھیں۔ پستول دکھا کر اس نے راستے میں ایک دیہاتی سے اس کا گھوڑا چھینا۔ وہ ایک مریل سا گھوڑا تھا' لیکن اس وقت وہ بھی غنیمت تھا۔ اس پر بیٹھ کر وہ سست رفتاری سے ڈیرے کی طرف روانہ ہوا۔ کئی گھنٹے کے سفر کے بعد وہ ڈیرے کے کچھ قریب پہنچا تو اسے شبہ ہوا کہ شاید ڈیرے میں آگ لگی ہوئی تھی۔ اسے اس سمت میں دھواں بلند ہوتا دکھائی دیا تھا۔ ہوا میں کچھ چیزوں کے جلنے کی بو بھی موجود تھی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ پہلے کسی اونچی جگہ سے ڈیرے کا جائزہ لینا چاہئے۔ وہ بمشکل گھوڑے کو ایک ریتیلی سی پہاڑی پر چڑھانے میں کامیاب ہوا۔

اونچائی پر پہنچ کر اس نے دوربین آنکھوں سے لگائی تو اس کا دل بیٹھ گیا۔ بہت دور نشیب میں اس کے ڈیرے سے خوفناک شعلے بلند ہورہے تھے اور بہت سے پولیس والے اس کے گرد گھیرا ڈالے کھڑے تھے۔ وہ اپنی بندوقیں ہوا میں بلند کرتے ہوئے خوشی سے نعرے لگا رہے تھے۔ ایک طرف کھلی جگہ میں نگکیشر کی لاش کسی حقیر اور بے کار چیز کی طرح پڑی ہوئی تھی۔ سلطانہ کو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ پولیس ڈیرے تک کیسے پہنچی تھی۔

جب وہ لوگ اپنی دانست میں ٹرین سے خزانہ لوٹنے پہنچے تھے اور وہاں موت ان پر جھپٹ پڑی تھی' تو سلطانہ نے نگکیشر کو وہاں سے فرار ہوتے دیکھا تھا۔ وہ یقیناً یہی سوچ کر بھاگا تھا کہ گروہ تو اب تقریباً ختم ہی ہو چکا تھا کیوں نہ ڈیرے پر جا کر ساری دولت نکال کر کہیں اور کا رخ کیا جائے...... لیکن شاید وہ اپنی گھبراہٹ میں یہ اندازہ نہیں کرسکا تھا کہ پولیس اس کے پیچھے لگ گئی تھی۔ پولیس اس کا پیچھا کرتی ہوئی ڈیرے تک پہنچ گئی تھی اور شاید اس کے مزید کمک بھی منگوا لی تھی۔ گویا نگکیشر نے ایک طرح سے خود ڈیرے تک پولیس کی رہنمائی کردی تھی۔ پھر سلطانہ نے افسردگی سے سوچا، بات صرف اتنی تھی کہ برا وقت آیا تھا، تو بس آتا ہی چلا گیا تھا۔ نگکیشر نہ صرف پولیس کو اپنے پیچھے لگا لایا تھا' بلکہ خود بھی انہی کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ پولیس نے ڈیرے کو آگ لگا کر اس میں پوشیدہ مال بھی برباد کردیا تھا۔

سلطانہ نے اب واقعی اپنے آپ کو شکست خوردہ محسوس کیا۔ اس کے کندھے جھک گئے اور اسے یوں لگا جیسے وہ اچانک ہی بوڑھا ہوگیا تھا۔ جب تک اس کا ڈیرہ سلامت تھا وہ کچھ ایسا محسوس کرتا تھا جیسے غیبی طاقتوں نے اسے اپنے حصار میں لیا ہوا تھا۔ آج جیسے وہ تپتے صحرا میں بے اماں کھڑا رہ گیا تھا۔ دھیرے دھیرے وہ اونچائی سے اتر آیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اب وہ

کہاں جائے۔ ٹانگ کی تکلیف سے بھی اس کا برا حال تھا۔ کچھ دیر تک وہ بے مقصد انداز میں مریل گھوڑے کو ایک طرف چلاتا رہا۔ اس کے سامنے کوئی منزل نہیں تھی۔

پھر اچانک اسے برکھا کا خیال آیا' جس کے گھر میں اس کا بیٹا پرورش پا رہا تھا۔ کاشی پور کی اس عورت کے گھر میں اسے کم از کم چند دن کے لئے تو پناہ مل سکتی تھی۔ تب تک وہ فیصلہ کرسکتا تھا کہ اب اسے کیا کرنا چاہئے۔ اس دوران شاید اس کی ٹانگ کا زخم بھی ٹھیک ہو جاتا۔ اس نے فوراً اپنے مریل گھوڑے کا رخ کاشی پور کی طرف موڑ دیا۔

وہ رات کے پچھلے پہر جب گرتا پڑتا برکھا کے گھر پہنچا' تو وہ لوگ اس کی حالت دیکھ کر حیران رہ گئے۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ کسی بھی لمحے گرے گا اور دم توڑ دے گا۔ برکھا اور اس کے شوہر نے اسے ایک کوٹھری میں لٹایا۔ گرم پانی سے اس کے زخم دھوئے اور ان پر پٹیاں باندھیں۔ پھر اسے کچھ کھانے پینے کے لئے دیا تو اس کی حالت کچھ سنبھلی اور اس نے اپنی پوری بپتا انہیں سنائی۔ وہ تین چار دن اس گھر میں پناہ گزیں رہا۔ برکھا اور اس کے شوہر نے اس کا ہر ممکن خیال رکھا۔ اس کا بیٹا بھی اس دوران اس کے ساتھ رہا جس سے اسے بڑی راحت ملی' لیکن اس دوران اس کی ٹانگ کا زخم بگڑ گیا۔

برکھا ایک رات چوری چوری ایک وید کو بھی بلا کر لائی' لیکن اس نے زخم کی حالت دیکھ کر کہا کہ اسے کسی ہسپتال لے جانا ضروری تھا' ورنہ اس کی ٹانگ کاٹنے کی ضرورت پیش آسکتی تھی۔

سلطانہ کے لئے اب چلنا پھرنا دشوار تھا۔ اسے یہ بھی احساس تھا کہ برکھا اور اس کے شوہر کو دھڑکا لگا ہوا تھا کہ اس کی گرفتاری پر بھاری انعام کی وجہ سے کوئی مخبری نہ کردے اور اس کے ساتھ ان کا پورا خاندان بھی مصیبت میں نہ پھنس جائے۔

سلطانہ کوٹھری میں پڑا ہر وقت کسی گہری سوچ میں گم نظر آتا۔

ایک روز اس نے برکھا کو بلایا اور دھیمے لہجے میں اس سے کہا...... "میں تمہیں ایک کام بتا رہا ہوں۔ یہ کام تم جیسی جی دار اور ہوشیار عورت ہی کرسکتی ہے۔ کسی بھروسے کے آدمی کے ذریعے فریڈی ینگ کو پیغام بھجواؤ کہ سلطانہ تم سے اسی پہاڑی پر ملاقات کرنا چاہتا ہے' جہاں اس سے پہلے بھی ایک مرتبہ ملا تھا۔ طریقہ وہی...... اور شرائط بھی وہی ہوں گی جو پہلے تھیں۔ تم اکیلے آؤ گے۔ سلطانہ دور سے تمہیں دیکھ رہا ہوگا۔ اگر تمہارے ساتھ کوئی ہوا تو تم بھی مارے جاؤ گے اور وہ بھی...... اگر منظور ہو تو جواب بھجوا دو اور اگلے منگل وار کو دوپہر بارہ بجے آجاؤ۔"

برکھا نے پیغام بھجوانے کا بندوبست کر دیا۔ ینگ نے فوراً ہی اثبات میں جواب بھجوا دیا۔

وقت مقررہ پر وہ سلطانہ کی شرائط کے عین مطابق تنہا آن پہنچا۔ اس کے پاس پستول تک نہیں تھا۔ تاہم وہ پولیس کی وردی میں تھا۔ سلطانہ ایک پتھر سے ٹیک لگائے اپنی زخمی اور پٹیوں میں لپٹی ٹانگ کو تہہ بند میں چھپائے ٹانگیں پسارے بیٹھا تھا۔ ایک نئی رائفل اس کی گود میں تھی۔ وہ مضمحل تھا' مگر اس کا چہرہ اب بھی کسی شیر کی طرح بارعب تھا۔

"مجھے خوشی ہے کہ تم آگئے ینگ......!" وہ گونجیلی آواز میں بولا۔ اس کے لہجے میں ہلکی سی افسردگی تھی۔ "میں ایک بار پھر یہی کہوں گا کہ تم واحد انگریز ہو جس پر میں اعتماد کرسکتا ہوں...... حالانکہ تم نے بھی انگریزوں کی روایتی مکاری سے ہی کام لیتے ہوئے مجھے شکست دی' لیکن تمہاری بہرحال اپنی مجبوری تھی۔ ایک پولیس افسر کے طور پر تمہیں بھی اپنا فرض ادا کرنا تھا اور اپنی سرکار کے سامنے سرخرو ہونا تھا۔ مجھے تم سے شکوہ نہیں ہے۔"

"مجرم کتنا ہی طاقتور ہو جائے...... اگر قانون کے محافظ دیانتداری سے اپنے فرائض انجام دے رہے ہوں تو فتح آخر کار قانون ہی کی ہوتی ہے سلطانہ!" ینگ سنجیدگی سے بولا۔ "میں نے تمہیں قانون کے سامنے ہار ماننے کے لئے کئی موقع دیئے۔ بولو...... اب کیا کہتے ہو؟"

"اگر تم میری ایک خواہش پوری کرنے کا وعدہ کرو تو میں گرفتاری دے دیتا ہوں۔ تمہیں یہ اعزاز حاصل ہو جائے گا کہ تم نے سلطانہ کو زندہ گرفتار کیا تھا۔" سلطانہ بولا۔

"میرے بس میں ہوا تو میں تمہاری خواہش ضرور پوری کروں گا۔" ینگ سینے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

"میرا ایک بیٹا ہے...... راجکمار...... ابھی صرف چار سال کا ہے۔ اسے کچھ زیادہ سمجھ نہیں ہے۔ وہ کاشی پور کے ایک گھر میں پرورش پا رہا ہے۔ میری گرفتاری کے بعد، ظاہر ہے، مجھے تو پھانسی ہو جائے گی۔ میں چاہتا ہوں میرے بیٹے کی پرورش تم کرو...... اور بہت اچھے طریقے سے کرو...... جب تم ولایت واپس جاؤ تو اسے بھی ساتھ لے جاؤ۔ اسے پڑھا لکھا کر بہت بڑا آدمی بناؤ۔ اپنے سے بھی زیادہ بڑا آدمی...... اسے پتا نہیں چلنا چاہئے کہ اس کا باپ ایک ڈاکو تھا۔ ابھی تک اسے یہ بات معلوم نہیں ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ بڑا ہو کر ڈاکو بنے یا اسے پتا چلے کہ اس کا باپ ڈاکو تھا۔"

"یہ کوئی مشکل کام نہیں...... اس کا میں تم سے وعدہ کرسکتا ہوں......" ینگ بلاتامل بولا۔

"تمہاری گرفتاری پر مجھے جو انعامی رقم ملے گی وہ بھی میں اس کی پرورش اور تعلیم و تربیت پر لگا دوں گا۔ یوں سمجھو اگر میرا اپنا کوئی بیٹا ہوتا وہ جس طرح پرورش پاتا اس سے کہیں زیادہ اچھے انداز میں تمہارا بیٹا پرورش پائے گا۔ میں اسے چند دنوں کے اندر اندر ہی ولایت بھیج دوں گا۔ میں اسے یہاں رکھوں گا ہی نہیں...... یہاں کوئی بات اس کے کان میں پڑ سکتی ہے۔"

یہ سن کر سلطانہ کو جیسے قرار سا آ گیا۔ ٹانگ کے بگڑے ہوئے زخم کے باوجود اس کے چہرے پر سکون اور شانتی پھیل گئی۔ ایک لمحے کے لئے اس نے پیچھے پتھر سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ جب اس نے آنکھیں کھولیں تو دو آنسو اس کے رخساروں پر ڈھلک آئے لیکن اس نے اپنے کرتے کی آستین سے جلدی سے انہیں صاف کر لیا۔ پھر وہ مسکراتے ہوئے دونوں ہاتھ آگے بڑھا کر بولا......

"تمہارا مجرم حاضر ہے ینگ......اسے ہتھکڑی پہنا دو۔"

"میرے پاس ہتھکڑی نہیں ہے۔" ینگ بولا۔

"رسی تو ہوگی......رسی سے باندھ لو۔" سلطانہ بولا۔

"اس کی ضرورت نہیں......" ینگ بولا۔ "تم بغیر کسی ہتھکڑی ......بغیر کسی بندش کے......اپنے گھوڑے پر بیٹھ کر میرے گھوڑے کے پیچھے پیچھے آؤ گے......اور ہم اسی طرح کمشنر صاحب کے دفتر چلیں گے۔" ینگ بولا۔

"چلو......ٹھیک ہے ڈی ایس پی صاحب......!" سلطانہ گہری سانس لے کر بولا۔ "اگر تمہاری مرضی یہ ہے تو ایسے ہی سہی......" اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو لڑکھڑا گیا۔ ینگ نے آگے بڑھ کر اسے سہارا دیا۔ اسی طرح سہارا دیئے وہ اسے پہاڑی سے نیچے لایا اور اسے اس کے گھوڑے پر بٹھا دیا۔

چند لمحے بعد وہ دونوں آگے پیچھے مراد آباد کی طرف روانہ ہو گئے!



"سلطانہ کی کہانی تو ختم ہو گئی......" الزبتھ کہہ رہی تھی۔ "ہر طرف تمہاری خوب واہ واہ ہو گئی......ترقی بھی ہو گئی......انعام ملنے کا اعلان بھی ہو گیا۔ اب تم کیا کرو گے؟"

"کیا تمہارے خیال میں میرے پاس اب کرنے کے لئے کوئی کام نہیں رہا؟" ینگ نے حیرت سے پوچھا۔ "میں اب بھی ایک پولیس آفیسر کے طور پر اپنے فرائض انجام دے رہا

ہوں۔"

وہ اس وقت جمخانہ کلب میں بیٹھے تھے اور کھانا آنے سے پہلے ایک مشروب سے دل بہلا رہے تھے۔ الزبتھ پہلو بدلتے ہوئے بولی۔ "میں نے تم سے کہا تھا ریٹائرمنٹ سے پہلے ایک اور ضروری کام بھی کر لو۔"

"وہ کیا......؟" ینگ بولا۔

"مجھ سے شادی......!" الزبتھ نے اطمینان سے جواب دیا۔

"پھر وہی بچوں والی باتیں......!" ینگ گہری سانس لے کر بولا۔ "میں کتنی بار تمہیں سمجھا چکا ہوں کہ یہ بچگانہ خیال دماغ سے نکال دو۔ تم ایک خوبصورت، نوجوان اور پڑھی لکھی لڑکی ہو۔ ایک روشن مستقبل اور نہ جانے کتنی لمبی زندگی تمہاری منتظر ہے۔ میری اور تمہاری عمروں میں بڑا فرق ہے۔ ابھی تم اپنے بچگانہ قسم کے عشق کی وجہ سے اس فرق کو اہمیت نہیں دے رہی ہو لیکن شادی کے سال دو سال بعد ہی عشق کا یہ بھوت سر سے اتر جائے گا۔ پھر میں تمہیں بہت برا لگنے لگوں گا......"

ینگ ایک لمحے کے لئے خاموش ہوا۔ الزبتھ ایک ٹک اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اداسی کی پرچھائیاں تھیں۔ ینگ نے مشفقانہ سے انداز میں سلسلہ کلام جوڑا۔ "میں پہلے بھی تمہیں مشورہ دے چکا ہوں......تم انگلینڈ واپس چلی جاؤ اور اپنے کسی ہم عمر نوجوان سے شادی کر لو۔ وہ تمہیں اچھا لگے یا نہ لگے، اس کی پروا مت کرو۔ بس انسان ذرا معقول ہونا چاہیے۔ تھوڑے عرصے بعد زندگی خود ہی ایک خاص ڈگر پر آ جائے گی اور سکھ چین سے گزر جائے گی۔"

"میرے لئے تمہارے پاس بس یہی ایک مشورہ ہے؟" الزبتھ نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔ "ہاں...... اور یقین کرو یہ تمہارے حق میں بہترین مشورہ ہے۔" ینگ بولا۔

الزبتھ نے افسردگی سے سر جھکا لیا۔ ینگ کے چہرے پر اذیت کے آثار تھے جیسے اسے بڑی اذیت اور کشمکش سے گزرنا پڑا ہو۔

چند لمحے بعد الزبتھ نے ایک بوجھل سی سانس لیتے ہوئے سر اٹھایا۔ ایسا لگتا تھا جیسے آخر کار اس نے ینگ کے فیصلے کو قبول کر لیا تھا۔ ایک لمحے کی مزید خاموشی کے بعد وہ بولی "چلو......ٹھیک

ہے......میں تمہارے مشورے پر عمل کرلوں گی۔" اس کے لہجے میں شکست خوردگی تھی۔ "مجھے لگتا ہے شاید اس کے سوا میرے لئے کوئی چارہ بھی نہیں ہے......لیکن تم کم از کم میرا ایک کام تو کردو۔"

"وہ کیا......؟" ینگ کے چہرے پر کچھ بشاشت آگئی جیسے اس کے ذہن سے کوئی بوجھ ہٹ گیا ہو۔

"تم مجھے سلطانہ ڈاکو سے ملوادو۔" الزبتھ بولی۔ ینگ اس کی فرمائش سن کر حیران رہ گیا۔

"تم اس سے مل کر کیا کروگی؟" اس نے پوچھا۔

"میں اس سے اس کی زندگی کی کہانی سن کر قلمبند کرنا چاہتی ہوں۔ انگلینڈ جا کر میں اسے چھپواؤں گی۔ اس سے پہلے کہ اسے پھانسی دے دی جائے تم مجھے اس سے ملوادو۔" الزبتھ کے لہجے میں التجا تھی۔

ینگ نے ایک لمحے سوچا۔ پھر وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "ٹھیک ہے......میں تمہیں اس سے ملوا دوں گا۔ ان دنوں وہ جیل کے ہسپتال میں ہے۔ اسے انتہائی خطرناک مجرموں کے وارڈ میں رکھا گیا ہے۔ اس کی ٹانگ کا زخم بگڑ گیا تھا۔ ٹانگ ٹھیک ہوتے ہی اسے پھانسی دے دی جائے گی۔"

"بس......ٹھیک ہے۔ میں دو چار دن اس کے پاس جاتی رہوں گی اور اس کی زندگی کی کہانی اس کی زبانی سن کر شارٹ ہینڈ میں نوٹ کرتی رہوں گی۔ انگلینڈ جا کر میں اطمینان سے اسے لکھوں گی۔ میں ڈیڈی سے یہ فرمائش نہیں کرسکتی کہ وہ مجھے سلطانہ سے ملوادیں۔"

ینگ دوسرے ہی روز الزبتھ کو سلطانہ سے ملوانے لے گیا۔ وہ ہسپتال کے اس خاص وارڈ میں اکیلا ہی تھا۔ وارڈ کا دروازہ آہنی سلاخوں والا تھا اور اس کے سامنے سخت پہرہ تھا۔ سلطانہ ہسپتال کے سفید کپڑوں میں سفید بستر پر نیم دراز تھا۔ اس کی ایک ٹانگ پر پٹیاں لپٹی ہوئی تھیں۔ اس کے باوجود وہ ینگ اور الزبتھ کو دیکھ کر بستر سے اتر کر دونوں پیروں پر کھڑا ہوگیا۔

"سلطانہ......یہ آئی جی صاحب کی بیٹی الزبتھ ہیں......" ینگ نے تعارف کرایا۔ سلطانہ نے دونوں ہاتھ جوڑ کر اسے پرنام کیا' لیکن الزبتھ آگے بڑھ کر اس کے گلے لگ گئی۔ سلطانہ گھبرا گیا اور لڑکھڑا کر لوہے کے بیڈ پر گرتے گرتے بچا۔

"یہ آپ کیا کررہی ہیں میم صاحب......!" وہ گڑبڑا کر بولا۔

"میں اپنی کتاب میں لکھنا چاہتی ہوں کہ میں اپنے عہد کے، ہندوستان کے سب سے نڈر آدمی سے گلے ملی تھی......" وہ پیچھے ہٹ کر مسکراتے ہوئے بولی۔ "مجھے نڈر لوگ اچھے لگتے ہیں۔ چاہے وہ ڈاکوؤں کے حلیے میں ہوں یا پولیس کی وردی میں......" یہ کہتے ہوئے اس نے باری باری ایک نظر سلطانہ اور ینگ کی طرف دیکھا۔ ینگ نے سلطانہ کو بتایا کہ الزبتھ اس کی زندگی کی کہانی سن کر قلمبند کرنے کے لئے اس کے پاس آئی تھی۔ سلطانہ اپنے مخصوص گونجیلے انداز میں ہنسنے لگا۔

"میری زندگی کی کہانی......؟" وہ بستر پر بیٹھتے ہوئے حیرت سے بولا۔ "یہ آپ کیا بات کررہی ہیں میم صاحب؟ زندگی کی کہانیاں تو بڑے لوگوں کی لکھی جاتی ہیں......اچھے، شریف اور بڑے لوگ......میں تو صرف ایک ڈاکو ہوں، جس کا نام لے کر بہت سی مائیں اپنے بچوں کو ڈراتی تھیں۔"

"تمہاری زندگی اگر کسی اور ڈگر پر آجاتی تو شاید تم بھی بہت بڑے آدمی ہوتے۔ شاید تم غریبوں کے ہمدرد، کوئی بڑے لیڈر ہوتے......شاید کوئی بڑے سماجی رہنما ہوتے......یا پھر شاید کچھ اور ہوتے۔ بہرحال......میں تمہاری زندگی کی کہانی لکھوں گی۔" الزبتھ مضبوط لہجے میں بولی۔

روزانہ چند گھنٹوں کے لئے سلطانہ کے بیڈ کے پاس ہسپتال میں بیٹھ کر چار دن میں الزبتھ نے سلطانہ کی داستان حیات مکمل کرلی۔ اس کے ایک ماہ بعد یکم دسمبر 1934ء کو سلطانہ ڈاکو کو ہلدوار جیل میں صبح، سورج طلوع ہونے سے پہلے پھانسی دے دی گئی۔ سلطانہ نے پھانسی کے تختے پر وہ سیاہ نقاب پہننے سے انکار کردیا' جو پھانسی کی سزا پانے والے ہر مجرم کو پہنایا جاتا تھا۔ پھانسی کا پھندا اس نے جلاد کے ہاتھوں سے لیکر خود اپنی گردن میں ڈالا۔

مرنے سے پہلے اس نے وصیت کی۔ "ماؤں اور باپوں سے میری التجا ہے......حالات چاہے کتنے بھی خراب ہوں......لیکن وہ اس بات کا خیال رکھیں کہ ان کے بچے ڈاکو نہ بننے پائیں......ڈاکو کی زندگی کوئی زندگی نہیں ہوتی۔"

اس کے پھانسی پانے کی خبر سن کر صرف الزبتھ ہی پھوٹ پھوٹ کر نہیں روئی' بلکہ ینگ کی آنکھوں میں بھی نمی آگئی۔

(تمت بالخیر)